ہمارے جوش صاحب



خورشید علی خاں

ذیشان کتاب گھر

ہمارے جوش صاحب

خورشید علی خاں

ذیشان کتاب گھر

جملہ حقوق بحقِ مصنف محفوظ

نام کتاب	:	"ہمارے جوش صاحب"
مصنف	:	خورشید علی خاں
ناشر	:	ذیشان کتاب گھر
کمپوزنگ	:	آئی جے ایس کمپیوٹرز
سال اشاعت	:	جنوری ۱۹۹۶ء
طباعت	:	ماس پرنٹرز۔ کراچی
قیمت	:	۲۵۰ روپے
	بیرون ملک :	۳۰ درہم / ریال
		۱۵ ڈالر

تقسیم کنندگان:

- خورشید علی خاں — بی ۸۰۔ بلاک اے۔ شمالی ناظم آباد، کراچی۔ فون ۶۶۳۰۳۹۷
- ذیشان کتاب گھر — بی ۱۵۔ بلاک این۔ شمالی ناظم آباد، کراچی۔ فون ۶۶۳۰۱۹۹
- ادبی دائرہ کراچی — بی ۳۳۹۔ سیکٹر ۱۱۔ اے۔ نارتھ کراچی۔ فون۔ فون ۶۹۹۸۸۳۸
- دبئی، امارات میں "ہمارے جوش صاحب" کا حق اشاعت و تقسیم کیپٹن پرویز علی خاں سلمٰہ کے پاس ہے۔ پوسٹ بکس ۲۹۹۰۔ فون ۳۸۳۳۵۰
- ہندوستان میں "ہمارے جوش صاحب" کا حق اشاعت شوکت اعظمی سلمہا کے پاس ہے۔
  ۲۵۔ جان کی کٹیر، جوہو، بمبئی بھارت۔ فون ۶۱۳۳۹۸۳

آیاتِ "صفات" کی تلاوت نہ کرو
جویندگیٔ "ذات" میں غفلت نہ کرو
لفظِ "اللہ" پردہ ہے، جلوہ نہیں
اس حرفِ غلافی پہ قناعت نہ کرو



نعمت اللہ خان مرحوم

maablib.org

اِنتساب

اپنے پیارے بھائی نعمت اللہ خان مرحوم کے نام

جس کے وجود کی خوشبو آج بھی میرے لیے

حرارتِ حیات ہے۔ جس کی فکر و خیالات

کی بلندی اور عظمت کے حضرت جوش ملیح آبادی

بھی معترف و مدّاح تھے۔

maablib.org

علّت کا، نہ معلول و قضا کا منکر
حاشا! نہ خبر، نہ مبتدا کا منکر
یاروں نے تشخّص کا تراشا ہے جو بُت
الحاد ہے صرف اُس خدا کا منکر

اس دُھن میں کہ دِل عقل کے شیدا ہو جائیں
آفاق کے اسرار ہویدا ہو جائیں
مدت سے گرا رہا ہوں تخمِ افکار
شاید کہ نئے درخت پیدا ہو جائیں

اے نوعِ بشر، عقدہ کشائے فردا
اے مشعلِ محرابِ سرائے فردا
ہاں جلد قدم اٹھا سوئے منزلِ "کن"
اے بندۂ امروز و خدائے فردا

maablib.org

فہرستِ مضامین

maablib.org



بے جان بولتا ہے مسیحا کے ہاتھ میں

گزارش احوال واقعی

"ہمارے جوش صاحب" حضرت جوش ملیح آبادی سے میری بارہ سالہ دوستی کے واقعات کی روداد ہے، جو میں نے زیادہ تر اپنی ڈائریوں سے اور کچھ جوش صاحب کی تحریروں اور کتابوں سے اور کچھ آڈیو کیسٹس اور کچھ اپنے حافظے سے مرتب کی ہے۔ اس کتاب میں واقعات اسی ترتیب سے بیان کیے گئے ہیں جس ترتیب سے وہ پیش آئے اس لیے یہاں ایک ہی مضمون مختلف انداز میں مختلف مقامات پر ملے گا۔ وہ خواہ خدا کا تصور ہو یا جبر و قدر کا مسئلہ۔ مراثی اور مسدس کی بحث ہو یا اسرار خودی اور رموز بے خودی کے مسائل اسی طرح سائنس، فلسفہ، الہیات، نفسیات، ادب، شاعری غرض کوئی فکری، جذباتی، اخلاقی، رومانی، مابعد الطبیعاتی یا روحانی موضوع ایسا نہ تھا جو ہماری محفلوں میں زیر بحث نہ آتا ہو اور جس پر جوش صاحب یا اس وقت کی محفل کے شرکا میں سے کوئی صاحب اپنی رائے کا اظہار نہ کرتے ہوں یہ تمام مسائل اسی محفل کے حوالے سے بیان کیے گئے ہیں جن میں شرکائے محفل نے اظہار خیال کیا۔ یہ انداز بیان کسی سوچی سمجھی تکنیک کے تحت اختیار نہیں کیا گیا بلکہ جو واقعہ جس طرح پیش آیا اپنی ڈائری کو سامنے رکھ کر بیان کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک اور اہم بات جس کو واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں یہ ہے کہ جوش صاحب کے ساتھ میرا حلقہ احباب بہت محدود تھا۔ اس لیے ہماری محفلوں میں بار بار صرف چند حضرات ہی کے نام ملیں گے اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ جوش صاحب کی ملاقات صرف انہی احباب تک محدود تھی۔ جوش صاحب انتہائی کثیر الاحباب انسان تھے۔ ان کے دوستوں اور پرستاروں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ وہ جس محفل میں

جاتے ہر مکتب فکر و خیال کے لوگ ان کو گھیر لیتے۔ ان تمام اصحاب کا ذکر مجھ جیسے گوشہ نشین آدمی کے لیے ممکن نہ تھا۔ بلکہ ان محفلوں میں بھی جن میں خود میں شریک تھا صرف چند احباب ہی کے نام میرے حافظے میں محفوظ رہ سکے حالانکہ ان میں بہت سے اہم لوگ شریک ہوتے تھے۔

جوش صاحب کی جس خوبی نے مجھے بے حد متاثر کیا وہ ان کی صاف گوئی تھی۔ جوش صاحب آئینہ کی طرح شفاف شخصیت کے حامل تھے وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کسی قسم کے تکلفات کے قائل نہیں تھے۔ آپ ان سے ہر موضوع پر بلاتکلف گفتگو کر سکتے تھے۔ صرف ایک موضوع ایسا تھا جس میں اکثر شاعرانہ افسانہ طرازی سے کام لیتے تھے اور وہ تھے ان کے معاشقے۔ اس معاملے میں وہ اپنی بیگم کے سامنے جھوٹی قسمیں بھی کھا سکتے تھے اور اپنی محبوبہ کی معرفت کی پردہ پوشی میں بڑے بڑے افسانہ نگاروں کو مات دے سکتے تھے۔

جوش صاحب کے دوستوں میں ایک بہت ہی محدود حلقہ ایسا تھا جو ان کی خلوت و جلوت کا محرم راز تھا۔ ان کی زندگی کے آخری بارہ سالوں میں اس خوش قسمت حلقے کا ایک رکن میں بھی تھا بلکہ شاید دوسروں کے مقابلے میں مجھے زیادہ قرب اس لیے بھی حاصل تھا کہ میں فکری اور علمی موضوعات میں بہت حد تک ان کا ہم خیال تھا۔ ہماری ذہنی ہم آہنگی کا یہ عالم تھا کہ اکثر محفلوں میں بعض علمی موضوعات پر گفتگو کے دوران بعض احباب کے سوالات پر جوش صاحب مجھ سے فرماتے تھے کہ میں ان کا جواب دوں اور وہ میرے جوابات کی تائید فرماتے تھے۔ اسی لیے جوش صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا تھا کہ ان کی فکر اور خیالات کے متعلق ان کے احباب میں صرف مجھ ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ میں ان پر ایک کتاب لکھوں۔ یہ کتاب بہت بڑی حد تک جوش صاحب کی اسی خواہش کی تکمیل میں لکھی گئی ہے۔ اس میں میں نے جوش صاحب کی فکر کے تقریباً تمام گوشوں کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں یہ بات بھی واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جوش صاحب کی زندگی، شخصیت اور فکر کا یہ میرا بالکلیہ شخصی تجزیہ ہے۔ گو میں نے حتی الامکان معروضی انداز اختیار کیا ہے لیکن بہرحال یہ ایک شخصی تاثر ہے جو اپنے حدود رکھتا ہے۔ ممکن ہے بعض حضرات کو میرے نقطہ نظر سے اختلاف ہو تو یہ ان کا حق ہے۔ لیکن میں نے اپنی بساط کے مطابق انتہائی دیانتداری سے جوش صاحب کے خیالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنی اس کوشش میں کس حد تک کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا فیصلہ

قارئین کرام خود فرمائیں گے۔

آخر میں جن محترم حضرات نے اپنی بے انتہا مصروفیت میں سے وقت نکال کر اس کتاب کی تصنیف کے سلسلے میں اپنے قیمتی اور مفید مشوروں سے میری رہنمائی فرمائی ان میں جناب راغب مراد آبادی جنھوں نے پروف ریڈنگ کے علاوہ کتاب کے متعلق ایک مضمون "ہمارے جوش صاحب" تحریر بھی فرمایا۔ محترم جناب پروفیسر سحر انصاری صدر شعبۂ اردو جامعہ کراچی جنھوں نے نہ صرف پروف ریڈنگ کی زحمت اٹھائی بلکہ "جوش شناسی کا نیا زاویہ" کے عنوان سے اپنی قیمتی رائے بھی تحریر فرمائی۔ جناب ڈاکٹر محمد علی صدیقی ڈائرکٹر قائد اعظم اکیڈمی پاکستان جن کی ہدایت پر میں نے "دیباچہ" کے عنوان سے جوش صاحب کے پاکستان آنے سے پہلے کے واقعات تحریر کیے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے کتاب کا "مقدمہ" تحریر فرمایا اور جناب مشفق خواجہ جنھوں نے "حرفے چند" کے عنوان سے اپنی قیمتی رائے سے میری ہمت بندھائی۔ ان تمام دانشور حضرات کا میں دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں کیونکہ اگر ان کی رہنمائی مجھے حاصل نہ ہوتی اور قدم قدم پر یہ میری ہمت نہ بندھاتے تو شاید مجھ سے یہ ذمہ داری کماحقہٗ ادا نہ ہو سکتی۔

ان کے علاوہ جناب جعفر رضا، جناب ذہین عالم، جناب سید ساجد علی ساجد کے لیے بھی میں سراپا سپاس ہوں جنھوں نے اس کتاب کی کمپوزنگ اور طباعت کے سلسلے میں اپنے عملی تعاون اور مشوروں سے میری مدد فرمائی۔

خورشید علی خاں
بی۔۸۹، بلاک اے، شمالی ناظم آباد
کراچی

maablib.org



جناب ڈاکٹر محمد علی صدیقی

maablib.org

مقدمہ

مقام مسرت ہے کہ جوش ملیح آبادی کے سلسلہ میں ضروری نگارشات کی ابتداء ہو چکی ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں پاکستان اور ہندوستان میں متعدد تصنیفات اور تالیفات شائع ہوئی ہیں۔ جن سے جوش فہمی میں اضافہ ہونے کی امید ہے۔ زیر نظر تصنیف "ہمارے جوش صاحب" کو جوش صاحب کے ایک پر خلوص نیازمند اور دوست خورشید علی خاں کی بے تکلف رفاقت کی ایک ایسی روئیداد قرار دیا جا سکتا ہے جس میں جوش کی زندگی اور فکر کے بعض کم روشن پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔

اردو دنیا کی ایک بڑی قدآور لیکن بعض حلقوں میں متنازع فیہ شخصیت ہونے کے باعث، جوش صاحب کی شخصیت، فن، فکر اور تاریخی حیثیت کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے بعض حضرات کے لیے ان کی شخصیت ایک معما ہے۔ کیا وہ کھلی ہوئی کتاب تھے یا صرف اپنے چند دوستوں ہی پر پوری طرح منکشف ہو سکے تھے؟ کیا ان کی شاعری غیر روایتی تھی..... اگر جواب "ہاں" میں ہے تو کیونکر؟ جوش صاحب نے نظم آزاد یا نظم معری یا نثری نظم میں سے کسی بھی جدید / مغربی "آزادی" کو درجہ قبولیت نہ بخشا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں وہ اس قدر بھی جدید نہ تھے جس قدر مولانا الطاف حسین حالی، جنھوں نے مقدمہ شعر و شاعری میں ردیف اور قافیہ کی شرائط کو "ناروا" قرار دیا تھا۔ رہا سوال جوش کا تو اس کی نظم گوئی بھی غزل کی روایت ہی کی مرہون منت ہے۔ جوش کی وجہ سے اردو شاعری نے گل و بلبل کے مضامین سے ہٹ کر زندگی کے بعض ایسے گوشوں کی جانب بھی دیکھا جو ابھی تک محض

انگریز رومانوی شعراء اور شاعری کے دبستان خیال کے ساتھ مخصوص تھے ۔ ہر چند کہ اقبال، شرر، طباطبائی، برج نرائن چکبست اور سرور جہاں آبادی کی شاعری میں مواد اور ہیئت کی نئی نئی کونپلیں پھوٹتی نظر آرہی تھیں لیکن ان متذکرہ بالا شاعروں میں جوش سب سے زیادہ رومانوی اور پرجوش تھے ۔ اپنی مخصوص افتاد طبع اور خاندانی پس منظر کی وجہ سے جوش " مواد اور ہیئت " کے معاملہ میں خود کو بڑی سے بڑی بغاوت پر چشم زدن میں تیار کر سکتے تھے ۔ یہ ضرور ہے کہ جوش صاحب اپنی عمر کے اوائل حصہ میں ٹیگوریت کے زیر اثر تھے ۔ جوش اس زمانہ میں روحانی سرمستی اور انسان دوستی کے نشہ سے سرشار تھے ۔

جوشؔ صاحب کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ جاگیردارانہ نظام سے قدرتی وابستگی کے باوجود مغرب کی خرد افروزی سے متاثر تھے ۔ وہ ایک طرف ابن عربی، کنیدی، پیرومی، حافظ، جامی، عراقی اور عمر خیام کے لیے تڑپتے تھے تو دوسری طرف افلاطون، ارسطو، نیوٹن، ڈارون، اسپنسر، برگساں، مارکس اور برنارڈ شاہ کے عاشق تھے ۔ ان کے یہاں مشرق اور مغرب کے بہترین اذہان کی فکر اس طرح یکجا ہو چکی تھی کہ لامحالہ طور پر، جوش کو وہی کچھ ہونا تھا، جو وہ ہوئے ۔ جمال پسندی، جوش کے یہاں، قدرت کی جلوہ آفرینی سے حظ اندوزی کا جبلی رجحان تھا، جو بمنزلہ روحانیت کے تھا ۔

میرا خیال ہے کہ جوشؔ کی شاعری کا مطالعہ اگر متذکرہ بالا پیراگراف کی روشنی میں کیا جائے تو جوشؔ کی شاعری میں نظر آنے والے متعدد تضادات از خود حل (Resolve) ہوتے جائیں گے اور یہ بھی کہ ان کی بعض طویل نظموں میں ایک ایک لفظ کے دس دس متبادل الفاظ کی بھرمار بھی قصیدہ فہمی کی روایت کا لازمہ تھی تاکہ ان کی طاقت لسانی کا جادو تسلیم کر لیا جائے ۔ جوشؔ ان شاعروں میں سے ہیں جو پڑھنے کے بجائے سننے میں زیادہ مزا دیتے ہیں ۔ جن جدید شعراء نے شاعری کی روایت سے اجتناب برتا ہے وہ کفایت لفظی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور ہیں ۔ بھلا جوشؔ ایسا کیوں کرتے وہ اپنی " گل بدنی گل بدنی " کی مخصوص مترنم طرز ادا سے مترادف الفاظ میں بھی معنوں کے باریک فرق تراشتے تھے اور اسی طرح اپنے تجربات کی دنیا کے بے پناہ تموّل اور شکوہ کا جیتا جاگتا نمونہ بن جاتے تھے ۔ بس آج کی نسل جوشؔ کے کلام میں حشو و زوائد کی " نشاندہی " کے ذریعے اپنے تجربات کی کم مائیگی

پر صاد تو نہیں کر رہی؟

میں جوش کے بارے میں شائع ہونے والی ہر کتاب کو اسی معیار پر پرکھتا ہوں کہ آیا یہ کتاب جوش فہمی میں اضافہ کا موجب یا اس کی راہیں مسدود کرنے کا سبب بنے گی؟ مجھے خوشی ہے کہ جوش مرحوم کے بارے میں منفی تحریریں بھی جوش کی زندگی کے بعض مثبت پہلوؤں کو لائے بغیر مکمل نہ ہو سکیں گی۔ شاید ایسے کسی جوش کی تصویر کشی ممکن نہ ہو سکے جو صرف اہرمن کا چہیتا ہو۔ جوش میں یزداں صفت عنصر کے لیے بڑا تپاک ہے۔ بشرطیکہ اسے حسن، خیر اور عدل کے زاویوں سے دیکھا جائے۔

جوش صاحب کی شخصیت واقعتاً بڑی دلچسپ تھی۔ اگر وہ اپنے اہل خاندان کے لیے ایک شفیق سرپرست تھے تو وہ دوسری طرف راغب مراد آبادی، خورشید علی خاں، ذہین شاہ تاجی، منور عباس اور اپنے دیگر بے تکلف دوستوں کی محفلوں میں سب سے "کم عمر" کھلنڈرے حسن پرست نظر آتے تھے۔ ایک شفیق سرپرست کی رو سے اپنے بیٹے سجاد خلیہ خروش اور بیٹی کے خاندانوں کی کفالت کے لیے وہ اپنے وقت میں سے تجارت و صنعت کے اہم شعبے کے "نوابوں" یا افسرانِ بالا کی تالیف قلب کے لیے نکالتے اور پھر اپنے دوستوں کے ساتھ ایسی شاموں کے انتظار میں رہتے جہاں عمر خیام بھی دنیا دار نظر آ سکتا تھا۔

اس حقیقت میں کیا کلام ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں جوش صاحب کو مالی طور پر مستحکم کرنے کی خاطر حتی الامکان نوازا گیا۔ سنیما، پٹرول پمپ اور مکان کے لیے پلاٹ کے حصول سے لے کر جوش نے کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی بھی قائم کی۔ وزارت تعلیم میں ایک اعلیٰ ملازمت کی۔ اس پر مستزاد جوش صاحب جہاں تک کہ شنیدہ و دیدہ ہے۔ فضول خرچ نہ تھے۔ پیسے کی قدر کرتے تھے۔ انھیں داد و دہش کے طور پر جو کچھ بھی ملا وہ اہل خاندان ہی پر خرچ ہوا۔ لیکن جوش صاحب کے مقابلہ میں کم حیثیت افراد نے بھی خود کو زیادہ مستحکم کر لیا۔ جوش بہرحال اپنے حاصلات کو مستحکم نہ کر سکے اور مالی بد انتظامی کی وجہ سے ان کی معاشی زندگی میں ٹھہراؤ نہ آ سکا۔

آج ان کے صاحبزادے کا خاندان نواب فقیر محمد خاں گویا کے وارث کے شایانِ شان نظر نہیں آتا۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ جوش صاحب جس مالی و معاشی استحکام کی تگ و دو

میں سرگرداں رہا کرتے تھے، انھیں کیوں کر نصیب نہ ہوسکا؟

میں نے جوش ملیح آبادی مرحوم کو رئیس امروہوی، سید محمد تقی، ذہین شاہ تاجی، حکیم محمد علی طیب اور کبھی کبھی فیض احمد فیض کے ساتھ کسی اجڑی ہوئی ریاست کے باغ و بہار راجہ کی مانند گل افشانی گفتار کرتے دیکھا ہے۔ اس طرح کہ طلوع ہونے کے مناظر بھی سامنے ہیں اور اختتام صحبت کے بھی۔ شاید ہی کوئی ایسا فلسفیانہ مسئلہ ہو جس پر جوش صاحب کے بندھے خیالات نہ ہوں۔ رئیس امروہوی صاحب کے گھر کی محفلیں خاص نوعیت کی ہوتی تھیں، ہرچند کہ ان محفلوں میں راغب مراد آبادی، خورشید علی خاں اور منور عباس کے نام لکھے گئے خطوط میں مندرج "ہوش ربا" معاملات ..... جو امرد پرستی اور "حسن حسینہ (لولتیا) پرستی" پر محیط ہیں ..... سامنے نہ آسکے لیکن ان صحبتوں میں کائنات کے رازہائے سربستہ کھولنے کی مشقیں ضرور ہوا کرتی تھیں۔ میں نے راغب صاحب اور خورشید علی خاں کو ان محفلوں میں شامل نہ دیکھا۔ مجھے اس زمانے میں یہ علم بھی نہ ہوسکا تھا کہ جوش صاحب نے راغب اور خورشید علی خاں کو جن موضوعات کے لیے "رازدار" بنایا ہے، جوش کی زندگی کے اہم منطقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور اب جب کہ خورشید علی خاں کی یادداشتیں میرے سامنے ہیں، میں ان کی آنکھوں سے جوش صاحب کے بارے میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب بگڑے رئیس کی طرح اپنے ندیموں کے لیے ایک رخ اور اپنے ہم فکر جلیسوں کے لیے دوسرا رخ رکھتے تھے۔

خورشید علی خاں سے جوش مرحوم کی قربت، ہر قسم کی قربت، ان خطوط سے آشکارا ہوتی ہے جو راغب مراد آبادی کی کتاب "خطوط جوش" میں شامل ہیں۔ درجنوں خطوط خورشید علی خاں کی تحویل میں ہیں۔

خورشید علی خاں کسٹم سروس کے جہاندیدہ افسر ہیں۔ ریاست حیدرآباد (دکن) کے ایک صاحب ثروت و اقتدار خاندان کے فرد ہیں۔ کیفی اعظمی کی بیگم اور شبانہ اعظمی کی والدہ، شوکت خانم ان کی بہن ہیں۔ حیدرآباد کے مشہور ترقی پسند صحافی روزنامہ "پیام" کے مدیر اور شاعر اختر حسن بھی ان کے بہنوئی ہیں۔ فکری مسائل پر غور و فکر کرتے رہتے ہیں اور

وہ جب بھی کسی مسئلہ پر بولتے ہیں تو واضح اور دو ٹوک انداز میں بولتے ہیں۔ جوش صاحب کو پاکستان آتے ہی جن چند نفوس سے قربت ذہنی حاصل ہوئی ان میں سے خورشید علی خاں اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ جوشؔ ان سے خلوت اور جلوت کے مسائل یکساں سہولت اور طمانیت قلب کے ساتھ بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ جوش صاحب نے "فتنۂ آخر الزماں" کے حوالہ سے ...... جس سے واقف ہوئے بغیر جوش کا تازہ مجموعہ "محراب و مضراب" کا ایک حصہ چیستاں بنا رہے گا۔ خورشید علی خاں کو جس نوعیت کی معلومات فراہم کی ہیں۔ ان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ بجا طور پر جوشؔ ملیح آبادی کے پاکستانی دور کے نفس ناطقہ ہیں۔

زیر نظر کتاب جوشؔ کے نفس ناطقہ خورشید علی خاں کے غیر سینسر شدہ مشاہدات کی ایک ایسی دستاویز ہے جس کے مطالعہ سے جوشؔ کے مذہب، جوش کے خدا، جوش کے "آخری عشق" اور جوش کی معاشی لحاظ سے خودکشی ہونے کے لیے کاوشوں کی ایک قابل اعتبار دستاویز ہمارے سامنے آتی ہے اور یہ دستاویز ایک ایسے فرد کی خامہ فرسائی کی مرہون منت ہے جس نے جوش صاحب سے اپنی پہلی ملاقات کے واقعہ سے لے کر... جس کے بعد خورشید علی خاں اور ان کے بھائی کی جوش سے بے محابا عقیدت کے مناظر سامنے آتے ہیں۔ جوشؔ کے آخری وقت کا ایک خط (جو شامل اشاعت ہے) انتہائی پر اعتماد رفاقت کا ثبوت ہے۔ جوش اور خورشید علی خاں کے مراسم مائل بہ ارتقا رہے ہیں۔ جوش وہ شخصیت ہیں جو "یادوں کی برات" کی رائلٹی وغیرہ کے سلسلہ میں روشن علی بھیم جی اور سید سبط حسن سے بھی متردد ہو گئے تھے۔ (جیسا کہ خورشید علی خاں کے نام ایک خط سے ظاہر ہے)۔ یوں لگتا ہے کہ جوش صاحب اپنے پاکستانی دور میں حسن اور پیسہ کی احتیاج سے گلو خلاصی نہ پا سکے۔ حسن ایک جمال پسند شاعر کا خام مواد ہے لیکن مقام حیرت ہے کہ وہ آخری عمر میں عاشق صادق کے طور پر نظر آتے ہیں۔ عشق کے قائل نظر آتے ہیں عاشقی کے نہیں۔

خورشید علی خاں نے جوشؔ ملیح آبادی کے سلسلہ میں اپنی یادداشتوں کو اس طرح منضبط کیا ہے کہ جوشؔ صاحب سے پہلی ملاقات کی روئیداد سے پہلے سرزمین پاکستان پر قدم رکھنے سے قبل جوش کی زندگی اور تخلیقات کے بارے میں ایک طائرانہ جائزہ پیش کر دیا ہے تاکہ

نوواردانِ جوش شناسی اس باب سے بنیادی معلومات حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد انھوں نے
مقالہ نگاری کے کسی مخصوص (Pattern) کی تقلید سے اجتناب برتتے ہوئے جوش صاحب کے
بارے میں اپنے مشاہدات کو اسی ترتیب سے رقم کر دیا ہے جس ترتیب سے مشاہدات پیش
آتے رہے اور اس طرح اس کتاب کی تدوین کے لیے اگر اس اصول پر متفق ہوا جائے کہ
واقعات موضوعات کے تحت بیان کیے جائیں تو اس کتاب کا تانا بانا مختلف انداز کا ہو سکتا
تھا۔ میرا خیال ہے کہ خورشید علی خاں نے جس بے تکلفی کے ساتھ جوش صاحب کے ماہ و سال
کی رفاقت کو رقم کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک خاصہ کی چیز ہے اس نوع کی یادداشت نویسی اسی وقت
ممکن ہو پاتی ہے جب مصنف کو اپنے (Subject) سے اس درجہ شیفتگی اور مناسبت طبعی ہو کہ وہ
اس کی بابت اپنی یادوں کی تہذیب کی پیشہ ورانہ ضرورت کو بھی "دخل در معقولات" سمجھتا ہو
اور اسے یقین ہو کہ اس کے بیان کردہ واقعات اور مشاہدات میں ایک معنوی اور متنی ربط موجود
ہے اور ان ہر دو کی بظاہر بے ربطی میں بھی وہ ارتباط موجود ہے جو (Subject) کی زندگی اور فکر میں
بذاتہٖ موجود ہے۔

خورشید علی خاں کی زیرِ نظر تصنیف، جوش ملیح آبادی پر شائع ہونے والے تنقیدی
مضامین کے مجموعوں، شعری انتخابات اور خطوط کے مجموعوں کی بھیڑ سے یکسر مختلف ہے۔
جوش جیسے قد آور شاعر کے لیے جس نے "شامِ اودھ" کے افق کے قریب انیسویں صدی کے
متعدد تابندہ معیار زار و زبوں دیکھے تھے، اکیسویں صدی میں داخل ہونے والی نئی نسل کے لیے
بہت کچھ لکھا ہے۔ یوں لگتا ہے کہ ہماری بیسویں صدی اور خصوصیت کے ساتھ اس کا نصف
آخر مغربی تہذیب کے ردِ عمل میں قرونِ وسطیٰ کی عرب تہذیبی اقدار و تہذیب کی بازیافت
کے لایعنی کام میں گزرا ہے اور وہ بھی معتزلہ فکر کی آزاد فضاؤں کے مقابلے میں اشاعرہ کے
تا صبحِ قیامت سربمہر بند افکار اور آرا کی سربلندی کے لیے جس نے ہمیں جدید تہذیب کے
دائرہ سے خارج (Drop-out) اور اس کے بد مقابل لا کھڑا کیا ہے۔ جوش کی پسندیدہ فکر کا
صحت مند حصہ اکیسویں صدی کے لیے درکار فکری صلابت اور نظری استقامت کے لیے ہنوز
زادِ راہ کا کام دے سکتا ہے۔ اس فکر میں نوعِ انسانی کے چیدہ چیدہ بزرگ مذہبی اور سیاسی
مفکروں کے یہاں کی فکر میں جاری و ساری کہنگی اور فرسودگی کے خلاف احتجاج کی ایک توانا

بازگشت ہے اور بازگشت ہی زندگی ہے اور یہی زندگی کی وہ توانائی ہے جس کے بغیر انسانی فکر کا جدلیاتی عمل ایک نقطہ پر آ کر رک جاتا ہے۔ افراد کی طرح انسانی قبائل اور اقوام بھی مفلوج ہو سکتی ہیں۔ خاص طور پر اس لمحہ جب وہ جبر ابقا کی جنگ میں شکست کھا چکی ہوں اور ان کی غیر عقلی جذباتیت غور و فکر اور تحلیل و تجزیہ کی استعداد سے شکست کھا چکی ہو۔

خورشید علی خاں کی تصنیف جوش فہمی میں ایک گراں قدر سنگ میل ثابت ہوگی۔ یہ تصنیف جوش کی شاعری کے پس پشت فکر کے بعض مقامات کے "اسرار" کھولتی ہے۔ جوش کی شاعری میں خدا، کائنات، مذہب، انسان اور انقلاب "سر دلبراں" کی جس زبان میں بیان ہوئے ہیں اس میں الیاس و خضر بھی قبض و بسط کی حالتوں کے اشارے ہیں۔ جوش نے انسان کو تنزلات کا آخری مرتبہ قرار دینے کے بجائے (صوفیا کا یہ عقیدہ کہ انسان کے بعد کوئی چیز پیدا نہیں ہوتی) مظہر عین ظہور بنا دیا۔

ظلوی و جہول ضد نور اند
ولیکن مظہر عین ظہور اند

یوں لگتا ہے کہ جوش کے یہاں صوفیا کی اصطلاح کے طور پر بادہ کا وہ مطلب جو "حقیقی" بتایا جاتا ہے یکساں طور پر "مجازی" ہو چکا ہے۔ "بادہ" محبت و عشق الٰہی کا وہ فیضان ہے جو عالم غیب سے سالک کے دل پر وارد ہوتا ہے اور اسے مست و بے خود بنا دیتا ہے۔ بادہ فروش مرشد، پیر، شیخ اور ہادی طریقت ہے، باراں نزول رحمت ہے، بت مظہر عشق یا تجلی ہے، چشم محبوب پیالہ ہے اور حیات بذات خود آگاہی، شعور اور ظہور ہے۔

اس کتاب میں خورشید علی خاں، جوش سے ان کی انتہائی ذاتی زندگی کے مسائل کے ساتھ تفرید اور تجرید کے موضوعات پر جگہ جگہ بحث کرتے ملتے ہیں۔ خورشید علی خاں نے ان صحبتوں کا اندوختہ آپ کے سامنے پوری دیانت کے ساتھ پیش کر دیا ہے۔ حیران کن بات یہ ہے کہ جوش بظاہر صوفی نہیں لیکن ان کے یہاں خدائے مشخص کے بجائے محبوب حقیقی کا تجریدی تصور واضح طور پر موجود ہے۔ جب محبوب حقیقی یعنی تجرید اپنے بندہ کے خانۂ دل میں آباد ہو جاتا ہے تو اس محبوب کے سارے خزانے اور اس کا سارا جاہ و جلال اور قدرت و عظمت غرضیکہ وہ سب کچھ جو محبوب حقیقی کا ہے بندہ کے دل میں اتر آتا ہے اور بندہ اپنی

صفات کو فنا کر کے حق تعالیٰ کی ذات وصفات سے زندہ اور باقی رہتا ہے۔ جوش کا خدا صوفی کا خدا ہے، متصوف کا خدا نہیں ہے۔ وہ مرد خود آگاہ کا خدا ہے، تعینات کے گرداب میں مستغرق مرد کم نگاہ کا خدا نہیں۔

خورشید علی خاں نے جوش کی شعری لغت کی قاموس فراہم کرنے کے بجائے جوش کے فکری نظام کو یوں شرح وبسط سے بیان کر دیا ہے کہ وہ قارئین کے دلوں میں ممکنہ طور پر پیدا ہونے والے شبہات بھی بیان کرتے چلے گئے ہیں۔ تاکہ جوش کی طرف سے اپنے دوست کو بے تکلفی کے عالم میں دیے گئے جوابات معترضین جوش کو مطمئن کر سکیں اور وہ خدا اور مذہب کے بارے میں جوش کے خیالات پر لعن طعن کرنے سے پہلے سوچیں کہ آیا جوش پر لگائے گئے الزامات خود ان کی کج فہمی اور غلط اندیشی پر دال تو نہیں؟

خورشید علی خاں جوش سے محبت کرتے ہیں لیکن انھوں نے جوش کے بارے میں بعض ایسی باتیں بھی لکھ دی ہیں جن پر جرات رندانہ کا گمان گزرتا ہے۔ یہ رجحان قابل داد ہے اور جوش شناسی کی ضرورت ہے۔

خورشید علی خاں نے جوش پر ایک ادیب کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک پرستار ایک دوست کی حیثیت سے قلم اٹھایا ہے اور حق تو یہ ہے کہ جوش کا یہ خیال غلط نہیں تھا کہ خورشید علی خاں ہی ان کی ذات وفکر کے بارے میں محرمانہ طور پر لکھ سکتے ہیں۔ جوش اس باب میں کس قدر بجا تھے، اس کتاب سے کلی طور پر عیاں ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔ جوش اس صدی کی ایک اہم ادبی وتہذیبی شخصیت تھے اور محققین اور نقادوں کے لیے امتداد زمانہ کے ساتھ ان کے بارے میں ہر قسم کے مواد کی ضرورت ہوگی۔ ہر کتاب ایک نئی کتاب کا پیش خیمہ ہوتی ہے اور کیا عجب کہ خورشید علی خاں کی یہ کتاب جو جوش فہمی کے لیے ناگزیر اہمیت کی حامل کتاب ہے۔ جوش کے دیگر دوستوں سے بہت کچھ لکھوائے۔ ویسے اب جوش کے بے تکلف دوست نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ ہندو پاکستان میں جوش کی محفلوں کے حاشیہ پر بیٹھے ہوئے حضرات تو خاصی بڑی تعداد میں موجود ہوں گے لیکن ان میں سے کن حضرات کو جوش کا مکتوب علیہ ہونے کا شرف حاصل ہوگا؟ ظاہر ہے کہ نہ ہونے کے برابر۔ اور اس وجہ سے خورشید علی خاں کی اس تصنیف کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے

خورشید علی خاں نے جو جوش کے ہم مسلک ضرور ہیں لیکن ہم مشرب نہیں ۔ جوش مرحوم کا حق رفاقت ادا کیا ہے اور اس کتاب کے بعد جوش کے خلاف اُٹھنے والے سنگ ہائے ملامت کی تعداد کم سے کم ہو جائے گی ۔ جوش مرحوم زندہ ہوتے تو خورشید علی خاں کی اس کتاب سے یقینی طور پر خوش ہوتے اور

You, too, Brutus

کے بجائے

Oh, you Khurshid

کہہ کر ان کا ماتھا چوم لیتے ۔ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ جب تک جوش مرحوم کے بارے میں مخلصانہ تحریریں سامنے آتی رہیں گی اس وقت تک یہ امید بندھی رہے گی کہ ہم بھی زندہ قوموں کی طرح ادب و فنون کی اہم شخصیتوں کے ساتھ انصاف کرنے کے قابل ہو سکیں گے ۔

جوش، بہرحال، اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں ۔ ان کے ماننے والوں میں جوش کو "مقدس گائے" قرار دینے یا انھیں اعلیٰ روحانی مقام دینے کا رجحان نہیں ہے ۔ جوش کے سلسلے میں یہ صورت حال جوش کے بارے میں منفی اور مثبت تحریروں کے لیے خاصی سازگار ہے اور اس طرح بڑی شخصیت کے سایہ دار درخت کی پھیلتی اور بڑھتی ہوئی شاخوں کی تراش خراش ہوتی رہے گی اور صرف وہی جوش باقی رہ جائے گا جو اپنی شاعری کی انفرادیت کی بنا پر زندہ ہے گا ۔

میں خورشید علی خاں کی کتاب کا نہ صرف استقبال کرتا ہوں بلکہ یہ امید کرتا ہوں کہ جوش مرحوم کے دیگر بے تکلف دوست اور ان کی محفلوں کے بے تکلف جلیس بھی جوش پر قلم اٹھائیں گے ۔ افسوس کہ ان حضرات کی تعداد اب انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے ۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، وامق جونپوری، جگن ناتھ آزاد، آل احمد سرور، ڈاکٹر محمد حسن، سید محمد تقی، ڈاکٹر قمر رئیس، ڈاکٹر آغا سہیل اور متعدد دیگر محبانِ جوش پر بھی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ جوش اور سماج کے مقدمہ میں اپنی اپنی گواہی پیش کریں کہ یہی وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ علم و ادب کے ساتھ اپنے مسلک کی بہتر طور پر وکالت کی جا سکتی ہے ۔

خورشید علی خاں نے بلاشک و شبہ ایک اہم کام انجام دیا ہے۔ یہ کام اس لیے اور بھی قابل داد ہے کہ یہ ایک ایسے شخص کی تصنیف ہے جو ستر کے سنگ میل کو پار کر چکا ہے اور جس نے جوش اور کیفی پر قلم اٹھا کر بہت دیر سے ہی سہی لیکن ناخن کا قرض ادا کر دیا ہے۔

"ہمارے جوش صاحب" ایک تاریخی دستاویز ہے اور اسے "جوش شناسی" کے سلسلے میں "یادوں کی برات" کے بعد سب سے اہم نثری ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد علی صدیقی
جامعہ کراچی
ڈائرکٹر قائداعظم اکیڈمی پاکستان
کراچی

"ہمارے جوش صاحب"

یادش بخیر حضرت جوش ملیح آبادی پر کام کرنے کی ضرورت تو اس وقت بھی تھی جب وہ افق شاعری سے مہر نصف النہار کے مانند اپنے اشعار آب دار کی شعاعوں سے اس کارگاہ ہستی کو منور کر رہے تھے۔ لیکن ان کی وفات حسرت آیات کے بعد یہ ناگزیر ہے کہ ان کے خیالات، نظریات، میلانات، معتقدات، مرغوبات، مکروہات، مختارات، متروکات، تاویلات، ترغیبات، ممنوعات، ماکولات، مشروبات، اختراقات، معمولات، منقولات، ترجیحات، اعلانات اور تاملات کو بھی جہاں تک ممکن ہو محفوظ کر لیا جائے۔ ان کی فکر قلزم آشام کا ہر گوہر تاب دار، تحریر کے رشتے میں پرو دیا جائے۔ ان کے محامد و محاسن اور فضائل و مکارم اور تقریباً پون صدی پر محیط منفرد و مثالی علمی و شعری خدمات اور ان کے کارناموں کا جائزہ لیا جائے اور تعصب و تنگ نظری کی عینک اتار کر انھیں تحقیقی اور معیاری زبان میں پیش کیا جائے تاکہ جوش کی علمی عبقریت اور فضل و کمال کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

جب جناب جوش کی زندگی اور شعری و ادبی کارناموں پر اقبال و غالب کی طرح سینکڑوں مقالے اور کتابیں منظر عام پر آئیں گی اس وقت جوش کے مقام کا تعین ممکن ہو گا۔ ماضی بعید سے قطع نظر اگر ورود پاکستان سے ان کے انتقال پر ملال تک پچیس چھبیس سالہ مدت پر ایک نظر ڈالیں تو ایسا لگتا ہے کہ ہنوز روز اول است۔ ان کی پاکستان میں آمد پر ان کے مخالفین، معترضین اور معاندین نے جو حشر برپا کیا تھا وہ ابھی تک معدوم نہیں ہوا۔

جوش صاحب کے خلاف غلط پروپیگنڈے اور بے سروپا الزامات کی اشاعت میں مرحوم



جناب راغبؔ مرادآبادی

maablib.org

کے سینکڑوں بدخواہان سطح بین و تنگ ظرف مصروف عمل شر انگیزی ہیں لیکن وہ دن دور نہیں جب اس عظیم شاعر کی خداداد عظمتوں کا آفتاب عالمتاب چڑھتا ہی چلا جائے گا اور اہل علم و دانش، ارباب فضل و کمال بے ساختہ کہیں گے:

آفتاب آمد دلیل آفتاب

الحمد اللہ علیٰ احسانہٖ کہ حضرت جوش کے ایک مخلص و بے لوث قدر شناس، نکتہ سنج و جوش فہم نے "ہمارے جوش صاحب" جیسی نادر کتاب لکھ کر حقِ رفاقت و محبت کما حقہٗ ادا کیا ہے۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ:

"ہمارے جوش صاحب" حضرت خورشید کا راحب
ادب کو جس پہ کیا کیا ناز ہے وہ کارنامہ ہے
جو سجتا ہے بہر انداز، فرق جوشش اعظم پر
تعالیٰ اللہ یہ بے ریب و گماں ایسا عمامہ ہے

حضرت جوشش سے محبی خورشید علی خاں کی ملاقات پہلی بار ۱۹۶۹ء کے اواخر میں ہوئی تھی۔ اس وقت جناب جوش ۱۲۰ فیڈرل ۔بی" ایریا کراچی کے دو منزلہ مکان میں رہا کرتے تھے جو ایک ہزار گز کے قطعہ زمین پر بنا ہوا تھا۔ اب تو اس مکان کا نام و نشان بھی باقی نہیں۔ مدت ہوئی اسے خریدنے والے نے منہدم کر دیا تھا۔ کاش اس مکان کی کوئی تصویر ہی ہوتی جسے اس کتاب میں شائع کیا جا سکتا۔

جوش و خورشید کے ربط و تعلق کی مدت تقریباً بارہ سال ہے۔ اس مدت میں خورشید علی خاں نے حضرت جوش کی بعض تحریروں، آڈیو (سمعی) کیسٹس، ڈائریوں اور حافظے کی مدد سے واقعات کو ترتیب سے بیان کیا ہے۔ گفتگو ہر موضوع پر کھل کر ہوتی تھی۔ جناب جوشش بے تکلف احباب کی محفلوں میں تحفظات (Reservations) کے قطعی پابند نہیں تھے پھر بھی خورشید علی خان نے بعض باتوں کو جو برہنہ گفتاری کے زمرے میں تھیں بڑی احتیاط اور سلیقے سے بیان کیا ہے اور حقائق کا چہرہ بالکل مسخ نہیں ہوا۔ جوش کے سلسلے میں اپنی یادداشتوں کو اس نہج پر منضبط کیا کہ موصوف سے پہلی ملاقات سے آخری ملاقات تک کے واقعات (گفتنی و ناگفتنی) محفوظ ہو گئے۔ مختصر یہ کہ اپنی ۱۲ سالہ صحبتوں کا اندوختہ، کامل دیانت سے قارئین

کے سامنے رکھ دیا ہے۔

اس کتاب میں جو واقعات، محفلوں کے تذکرے، دعوتوں، ادبی، شعری نشستوں اور بعض شخصیات سے ملاقاتوں کا ذکر ہے ان میں نہ تو مبالغہ آرائی ہے نہ کتربیونت اور کسی حقیقت و صداقت کا جزوی یا کلی اخفا۔ لیکن ان خوبیوں کے علاوہ بھی اس کتاب میں اور بہت سی خوبیاں ہیں لیکن ان سب کا احاطہ اس مختصر سے اظہاریے میں ممکن نہیں۔ مثلاً حرف آخر کے اقتباس۔ یہ ایک طویل منظوم ڈرامہ ہے جو کئی حصوں پر مشتمل ہے۔ حصہ اول میں، تخلیق کائنات و آدم و حوا (قدیم روایات کی روشنی میں) حصہ دوم میں تخلیق کائنات جدید سائنسی ارتقا کی روشنی میں وغیرہ وغیرہ۔ خورشید علی خاں نے منظوم اقتباسات دیے ہیں جو نہ تو آپ کو جوش صاحب کی کسی کتاب میں ملیں گے اور نہ یہ کسی اور ناقد و مورخ کی کتاب میں۔ جوش نے مجھ سے دو تین بار اس طویل منظوم ڈرامے کے بارے میں گفتگو کی تھی۔ وہ اس پر نظرثانی اور ترمیم و اضافہ کرنا چاہتے تھے اس لیے کہ سائنس نے گذشتہ نصف صدی میں جو ترقی کی ہے، اس کی روشنی میں یہ ضروری تھا۔ لیکن موت نے انھیں اتنی مہلت نہ دی کہ وہ کام کر جاتے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

اللہ سے چھیڑ چھاڑ فارسی اور اردو کے بیشتر شعرا نے کی ہے۔

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

غالب

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

غالب

گفتنی نیست کہ برغالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ آں بندہ خداوند نداشت

غالب

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہے

اقبال

خاموش نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک

ترے شیشے میں مے باقی نہیں ہے
بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اقبال

آپ کو ٹال دے تبھی جانیں
دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے
کھیل بندے کا ہے خدا کیا ہے

مرزا یگانہ

جوش صاحب کو دراصل اُس خدا سے اختلاف رہا ہے جسے مذہبی پیشواؤں نے سلاطین اور شاہانِ کج کلاہ کی طرز پر تراشا ہے۔ چناں چہ جوش صاحب واشگاف الفاظ میں لکھتے ہیں۔

یاروں نے تشخص کا تراشا ہے جو بت
الحاد ہے صرف اسی خدا کا منکر

خورشید علی خاں نے نقد و نظر اور تحقیق و تلاش کا ایک نیا دروازہ بھی کھول دیا ہے۔ یادوں کی برات میں حضرت جوش نے حیدر آباد دکن میں دارالترجمہ میں اپنی ملازمت کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ممکن ہے قارئین جوش اب تذبذب و تشکیک میں مبتلا ہو جائیں اور بیان جوش انھیں قابل قبول نہ ہو۔ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی نے حکومت اتر پردیش (یو۔پی) بھارت کے مالی تعاون سے ایک کتاب۔ جوش اور دیارِ دکن "سرفراز پریس لکھنو سے ۱۹۸۳ء میں شائع کی ہے۔ اس میں جوش صاحب کی زندگی کے ان پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو اب تک پس پردہ تھے۔ اس کتاب کے مصنف جناب جوش کی بہن کے داماد مائل ملیح آبادی ہیں۔ اس میں بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جو حضرت جوش کے کسی مجموعہ کلام میں شامل نہیں ہیں۔ مائل صاحب نے شوکت عثمانی کے نام سے ایک دستاویز کا بھی ذکر کیا ہے۔ چوں کہ اس کتاب میں جوش صاحب کی کسی بھی متعلقہ تحریر کا عکس نہیں اسے صدفی صد صحیح تسلیم کرنے میں تامل ہو سکتا ہے۔ مائل صاحب کی اس کتاب میں جوش صاحب کی

ایک نظم "فقیر کی صدا" بھی ہے جو بقول مائل حضرت نظام کے روبرو پہلی یا دوسری حاضری کے موقع پر خود پڑھی تھی۔ بقول مائل جیسا کہ اس میں شامل نظم جوش اور درخواست جوش سے مترشح ہے۔ فردوسی کے شاہ نامے کی طرز پر تاریخ دکن کو نظم کا جامہ بے مثل و مثال پہنانا چاہتے تھے۔ رزمیہ اور بزمیہ اشعار کے نمونے خورشید علی خان نے دیے ہیں۔

المختصر "ہمارے جوش صاحب" خورشید علی خان کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ میرے خیال میں اس کتاب کو بھی ماہ نامہ افکار کے جوش نمبر کی طرح ایم اے اردو کے نصاب میں برائے مطالعہ شامل ہونا چاہیے۔ میں خورشید علی خان کو اپنے دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

راغب مرادآبادی

۱۲-۱۰-۹۵

حرفے چند

جوش صاحب کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت کے حسن نے بھی ایک عالم کو مسحور کر رکھا ہے۔ انھوں نے اپنے کردار کی کرشمہ سازیوں کی وجہ سے پرکشش افسانوی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ان کے گرد پسند و ناپسند کا وسیع حلقہ قائم ہے۔ بہت سے لوگ جن محاسن کی وجہ سے ان کی مدح سرائی کرتے ہیں، بعض دوسرے انھیں محاسن کو معائب گردانتے ہوئے ان کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے۔ اردو ادب کی تاریخ کا یہ ایک نادر واقعہ ہے کہ جوش کی زندگی میں ان کے خلاف ایک ادبی رسالے کا ضخیم جوش نمبر شائع ہوا جس میں درجنوں معاصرین نے جوش کے ان عیبوں کی نشان دہی کی جو اگر جوش میں نہ ہوتے تو ہم ایک طرح دار اور رنگارنگ شخصیت سے محروم رہ جاتے۔ جوش کی شخصیت کے عیوب و محاسن پر اب تک جو گفتگوئیں ہو چکی ہیں، ان کے پیشِ نظر یگانہ کے اس شعر پر گمان گزرتا ہے جیسے جوش ہی کو سامنے رکھ کر کہا گیا ہو:

نکالے عیب میں سو حسن، حسن میں سو عیب
خیال ہی تو ہے جیسا بندھے جدھر گزرے

جوش صاحب کو اپنے خلاف فضا پیدا کرنے میں خود بھی مزہ آتا تھا۔ اسے ان کی سادگی کہیے یا کردار کی مضبوطی کہ غلط یا درست جو بات ان کے دل میں ہوتی تھی، وہ زبان پر آجاتی تھی۔ وہ اس سلسلے میں نفع و نقصان کی پروا نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا خالص نفع تو ان کی شاعری تھی، باقی جو کچھ تھا خسارہ ہی خسارہ تھا۔

تخلیقِ شعر کے لمحات کو چھوڑ کر، ان کی پوری زندگی مجلس آرائیوں میں گزری۔ ان



maablib.org

جناب مشفق خواجہ

مجلسوں میں زیادہ تر ایسے لوگ شریک ہوتے تھے جن کی ذہنی سطح مشاعروں میں واہ وا کرنے والوں کی ذہنی سطح سے بلند نہیں ہوتی تھی۔ گفتگو کا معیار اسی وقت بلند ہوتا تھا جب شرکائے مجلس میں خورشید علی خاں جیسے اہل نظر شامل ہو جاتے تھے۔ خورشید صاحب بارہ برسوں تک جوش صاحب کے قریب رہے۔ اتنے قریب کہ جوش صاحب کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے پوشیدہ نہ تھا۔ وہ صحیح معنوں میں خلوت و جلوت کے ہم راز تھے۔ ان سے جیسے محبان بے ریا جوش صاحب کی زندگی میں کم ہی آئے ہیں۔

خورشید صاحب بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ اردو اور فارسی ادب پر ان کی نظر بہت گہری ہے۔ علوم عمرانی کا مطالعہ بھی بہت وسیع ہے۔ ان کے علم و نظر کا صحیح اندازہ اس وقت ہو گا جب ان کی لکھی ہوئی غالب کے ان اشعار کی شرح شائع ہوگی جو متداول دیوان میں موجود نہیں ہیں۔ خورشید صاحب کی خوش ذوقی کا یہ حال ہے کہ انھیں ہزارہا اچھے شعر یاد ہیں اور جوش صاحب کا تو تقریباً پورا کلام حفظ ہے۔

جوش صاحب کی محفلوں میں عموماً لطیفہ گوئی ہوتی تھی لیکن خورشید صاحب کی موجودگی سے رنگ محفل بدل جاتا تھا۔ گفتگو کا معیار بلند ہو جاتا تھا اور ادب اور زندگی کے سنجیدہ مسائل زیر بحث آتے تھے۔ یقیناً یہ خورشید صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں جوش صاحب کی رفاقت میسر ہوئی، لیکن جوش صاحب بھی کم خوش قسمت نہیں تھے کہ انھیں خورشید صاحب سے تبادلہ خیال کے ذریعے جدید زمانے کے بہت سے فکری مسائل و مباحث سے آگاہی ہوئی۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جوش صاحب جو ایک عرصے سے مطالعہ کتب سے دستبردار ہو چکے تھے، ان کی زندگی کے آخری چند برسوں میں نئے خیالات سے آگاہی کے لئے جو دریچہ کھلا، وہ خورشید علی خاں ہی کی صورت میں کھلا۔

جوش صاحب کی وفات کے بعد خورشید صاحب کی زندگی میں جو خلا پیدا ہوا، اس کی تلافی انھوں نے اس طرح کی کہ جوش صاحب کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کو از سر نو گزارنا شروع کر دیا یعنی جو کچھ یاد تھا، اسے تحریری طور پر محفوظ کرنا شروع کر دیا۔ کئی برسوں کی محنت کے بعد زیر نظر کتاب وجود میں آئی جسے جوش شناسی کی راہ میں سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں جوش صاحب کی زندگی کے آخری دس بارہ برسوں کی تفصیلات ہی نہیں ملتیں بلکہ

جوش صاحب کے ان خیالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے جو عام حالات میں ہوا میں تحلیل ہو جاتے مگر اب خورشید صاحب کی توجہ سے صفحہ قرطاس پر محفوظ ہو گئے۔ یہی نہیں، اس کتاب میں جوش صاحب کی بعض نظموں کے پس منظر اور مطالب پر بھی فکر انگیز مباحث ملتے ہیں اور اس طرح یہ کتاب ہمارے عہد کے ایک بڑے شاعر کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے کا ایک ایسا وسیلہ بن گئی ہے جسے جوش کا کوئی سوانح نگار، کوئی نقاد اور کوئی عام قاری نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مشفق خواجہ

۱۶-۱۱-۹۵ء

maablib.org

جوش شناسی کا ایک نیا زاویہ

دنیا کی ایسی ہستیاں جو اپنی صلاحیتوں سے اپنے عہد میں کوئی غیر معمولی کارنامہ انجام دیتی ہیں اور کسی نہ کسی عنوان سے تاریخ کا حصہ بن جاتی ہیں۔ خط مستقیم کی شخصیتیں نہیں ہوتیں اسی لیے ان کو گرفت میں لینے کے لیے مختلف جہات کی واقفیت ایک لازمی شرط بن جاتی ہے۔ ایسی ہی منفرد اور غیر معمولی ہستیوں میں سے ایک حضرت جوش ملیح آبادی بھی تھے۔

ہر چند کہ جوش صاحب خود کو ایک کھلی کتاب کی طرح پیش کرنے کی سعی کرتے تھے اور انھوں نے نظم و نثر میں کھل کر اپنی زندگی کے نشیب و فراز اور گرم و سرد کا تذکرہ بڑے تسلسل کے ساتھ کیا ہے لیکن ان ساری تحریروں اور دستیاب حقائق کی مدد سے بھی کوئی ایک فرد جوش صاحب کی شخصیت کی مکمل تصویر بنا لینے کا دعوا نہیں کر سکتا۔ ایسا دنیا کی غیر معمولی شخصیتوں کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔

سودا نے ایک کمال کا شعر کہہ دیا ہے۔

جو حال ہے سودا ترا، اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

اس میں معروضیت (OBJECTIVITY) اور موضوعیت (SUBJECTIVITY) کی جدلیات اور اس سے تعلق رکھنے والی نفسیات کا بڑا خوبصورت اظہار ملتا ہے۔ اور اس سماجی اضافیت کی سمت بھی نشان دہی ہوتی ہے جو انسانی روابط و تعلقات میں ناگزیر ہے۔ دراصل



پروفیسر سحر انصاری

maablib.org

معروض اور موضوع کا باہمی رشتہ اپنی ایک الگ منطق اور جداگانہ روش رکھتا ہے۔

خورشید علی خاں صاحب ایک ادب دوست شخصیت ہیں۔ انھیں شعر و شاعری، ادب، فلسفہ اور نفسیات سے گہرا لگاؤ ہے۔ غالب اور جوش کے تو وہ عاشق ہیں۔ غالب سے بالمشافہ ملاقات کا کوئی امکان نہیں۔ پس انھوں نے دیوان غالب ہی کو "دیوان ملاقات" بنا رکھا ہے۔ جوش صاحب سے البتہ ان کا ایک مرتبہ تعارف ہو ہی گیا اور ایسا ہوا کہ جوش صاحب کے انتقال کے بعد بھی خورشید صاحب اسی طرح جوش شناسی کا حق ادا کرنے کے پیرایے ڈھونڈا کرتے ہیں جس طرح جوش صاحب کی زندگی میں ان کا طریقہ تھا۔

جیسا کہ میں نے ابتدا میں عرض کیا ہے۔ جوش ملیح آبادی کی شخصیت اور فن کا احاطہ کسی ایک فرد یا ایک زاویے کے ذریعے نہیں کیا جا سکتا۔ مرزا غالب کے بارے میں حالی کی کتاب پڑھ کر اکثر یہ گمان ہوتا ہے کہ اگر انھیں ڈاکٹر جانسن کی طرح کوئی باسویل یا گوئٹے کی طرح کوئی ایکرمان مل جاتا تو نوعیت کتنی مختلف ہوتی۔ جوش صاحب کے ضمن میں بھی یہی خیال آتا ہے کیوں کہ جوش صاحب کی محفلیں ہر لحاظ سے ایک بڑے تخلیقی ذہن کی محفلیں ہوتی تھیں۔ جوش صاحب شاعرانہ اوصاف کے علاوہ خوش گفتاری کا ہنر بھی رکھتے تھے۔ باتوں باتوں میں ایسے خیالات ایسے سجے سجائے الفاظ میں ادا کر دیتے تھے جو بہتوں کے لیے بہت غور و خوض کے بعد بھی ممکن نہیں ہوتا۔ نکتہ آفرینی، لفظوں کا تخلیقی برتاؤ اور بذلہ سنجی ان کی ہر نشست کی خصوصیات میں شامل تھی۔

خوش قسمتی سے خورشید علی خاں صاحب کو ایک خاص مدت تک جوش صاحب سے روزانہ ملاقات کا موقع میسر آ گیا اور انھوں نے اپنے بھائی کے ہمراہ گھنٹوں جوش صاحب سے ایسے سوالات کیے جن سے جوش صاحب کی شاعری، طرز حیات اور افکار و خیالات کے متعدد اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ خورشید صاحب اپنے ماحول میں واپس آ کر اس ساری گفتگو کو قلم بند بھی کر لیتے تھے۔ اس طرح جوش صاحب کے بارے میں، انھی کے الفاظ میں، ایک اچھا خاصا دفتر اکٹھا ہو گیا ہے۔ خورشید علی خاں صاحب کا حافظہ نہایت عمدہ ہے اور انھیں مطالعے یا مشاہدے میں آ جانے والی کسی بھی بات کو اس کی جزئیات کے ساتھ من و عن بیان کر دینے کا ملکہ حاصل ہے۔

خورشید علی خاں صاحب نے جوش صاحب کے تعلق سے جو یہ کتاب "ہمارے جوش صاحب" لکھی ہے وہ ان کی روزانہ ڈائری لکھنے کے شغف جوش صاحب سے عقیدت و محبت اور قوی حافظے کا نتیجہ ہے۔ خورشید صاحب پختہ سن و سال کی منزل پر فائز ہونے کے بعد تصنیف و تالیف کی سمت متوجہ ہوئے ہیں۔ مضامین تو وہ ایک مدت سے لکھ رہے ہیں لیکن اب تواتر اور تسلسل سے کتابوں کی باری ہے۔ اسی سال وہ مشہور شاعر کیفی اعظمی کے بارے میں "جشن کیفی" (دہلی) کے موقع پر ایک کتاب پیش کر چکے ہیں جو بلاشبہ ایک یادگار تصنیف ہے۔ اب جوش صاحب پر خورشید صاحب کی کتاب منصہ شہود پر آیا ہی چاہتی ہے اور غالب کی تفہیم کے ضمن میں ایک ضخیم کتاب منتظر اشاعت ہے۔

جوش صاحب کے بارے میں اس کتاب کا جہاں تک تعلق ہے۔ اس کی چند انفرادی خصوصیات تو ایک مطالعے ہی میں واضح ہو جاتی ہیں۔ اس کتاب میں جوش صاحب سے انسان کائنات اور خدا جیسے بنیادی موضوعات پر سوال کیے گئے اور ان کے باب میں جوش صاحب کے افکار و خیالات قلم بند کیے گئے ہیں۔ جوش صاحب کا مفکرانہ ذہن زندگی کے مختلف مسائل کے ضمن میں کیا اور کس سطح سے سوچتا تھا اس کا ایک مربوط اور فکر انگیز احوال اس کتاب میں ملتا ہے۔

جوش ملیح آبادی نے انقلاب، شباب، سیاست، مذہب، سائنس، نفسیات، تہذیبی و معاشرتی اقدار۔ غرض ہر زاویہ حیات سے اپنا گہرا اور زندہ تعلق قائم رکھا اور ہر ایک شعبے پر خلاقانہ دسترس کے ساتھ سوچا اور لکھا ہے۔ پھر ان کی شاعرانہ تمثالیں اور لفظیات اپنا ایک جداگانہ رنگ و آہنگ رکھتی ہے۔ ان کی فکر اور تخیل کی پرواز جب ان کے مخصوص ڈکشن میں ڈھل جاتی ہے تو اس تک رسائی حاصل کرنا بھی ہر شخص کے بس کی بات نہیں رہتی۔ خود جوش صاحب نے ایک جگہ کہا ہے۔

الفاظ کے سر پر نہیں اڑتے معنی
الفاظ کے سینوں میں اتر کر دیکھو

اس نکتے کو خورشید صاحب نے پوری توجہ اور بصیرت کے ساتھ ملحوظ رکھا ہے چناں چہ اس کتاب میں ایک طرف تو جوش صاحب کے کلام کا خاصا اہم انتخاب بھی شامل ہے جس میں

بیشتر منظومات غیر مطبوعہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ "حرف آخر" کا جتنا حصہ خورشید صاحب نے "ہمارے جوش صاحب" میں شامل کیا ہے، اتنا اس سے پہلے کہیں اور شائع نہیں ہوا۔ پھر اس پوری کتاب میں جگہ جگہ خورشید صاحب نے کلام جوش کی تشریحات بھی کی ہیں۔ بیشتر نظموں کے پس منظر بیان کیے ہیں اور اکثر فکری گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔

خورشید صاحب کی یہ تمام تر مساعی یقیناً جوش شناسی کی راہ کو روشن تر کر رہی ہے۔ جوش پر تحقیق کرنے والوں کے لیے ان کی یہ کتاب ناگزیر ماخذ کی حیثیت اختیار کر سکتی ہے۔ خورشید علی خاں صاحب کا انداز تحریر نہایت شگفتہ اور شستہ و رواں ہے۔ اور یہی ہر اچھی کتاب کی پہلی شرط ہوتی ہے کہ وہ (READABLE) ہو۔ "ہمارے جوش صاحب" جوش شناسی کے خزانے میں ایک اہم اضافہ ہے۔

۹ اگست ۱۹۹۵ء

سحر انصاری
صدر شعبہ اردو
کراچی یونیورسٹی

maablib.org

آندھی جاگی ہے شاخ سار ہُشیار
ذرّات بھڑک رہے ہیں تار ہُشیار

اک زلزلۂ وہم شکن راہ میں ہے
اے دیر و کلیسا کے منار ہُشیار

دیباچہ

ہندوستان کے شہر لکھنؤ سے تقریباً تیرہ میل کے فاصلے پر سرسبز و شاداب کھیتوں اور آم کے گھنے باغوں کے درمیان سرحدی پٹھانوں کی ایک چھوٹی سی بستی ملیح آباد ہے۔ اب تو لکھنؤ نے بڑھ کر ملیح آباد کو اپنے دامن میں اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ وہ اس کا ایک محلہ معلوم ہوتا ہے مگر ہم جس زمانے کی بات کر رہے ہیں اس وقت لوگ ملیح آباد سے لکھنؤ ریل کے ذریعے جایا کرتے تھے جیسے ایک بستی سے دوسری بستی کو جاتے ہیں۔

ہندوستان میں ملیح آباد اپنی دو چیزوں کی وجہ سے مشہور تھا۔ ایک تو وہاں کے آم اور دوسرے حضرت جوش ملیح آبادی۔

جوش صاحب اپنی سوانح حیات "یادوں کی برات" میں ملیح آباد کے متعلق لکھتے ہیں۔

"آم کے باغوں کی رومانی اور گھنیری چھاؤں میں جھومتا، بور کی بوئے مستانہ سے مہکتا، کوئلوں کی کوکو اور پپیہوں کی پی ہو سے چہکتا ملیح آباد ہندوستان کی تہذیبی جنت یعنی لکھنؤ سے فقط تیرہ میل کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ خالص پٹھانوں کی بستی ہے جس کے ایک گوشے میں ہم لوگ یعنی درہ خیبر سے آئے ہوئے آفریدی اور دوسرے گوشے میں قندھار سے آئے ہوئے قندھاری آباد ہیں"۔

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی کے پردادا نواب فقیر محمد خاں گویا کے دادا یار بیگ خاں درہ خیبر کے آفریدی سرداروں میں سے تھے۔ ان کے چھوٹے بیٹے محمد بلند خاں اپنے دو بیٹوں محمد عوض خاں اور فقیر محمد خاں کو ساتھ لے کر ہندوستان آ گئے تھے۔

فقیر محمد خاں گویا:

محمد بلند خاں لکھنؤ کی سرکار میں ملازم ہو گئے۔ ان کے بیٹوں میں فقیر محمد خاں نے بڑا نام پیدا کیا۔ اور لکھنؤ کی سرکار سے تہور جنگ حسام الدولہ نواب فقیر محمد خاں کے خطابات سے نوازے گئے۔ انھوں نے لکھنؤ کے مضافات میں جائے داد پیدا کی اور ملیح آباد میں اپنے محلات تعمیر کروائے۔ شاعر تھے اور گویا تخلص کرتے تھے۔ صاحب قلم بھی تھے اور صاحب سیف بھی اس طرح بزم اور رزم دونوں جگہ ان کی شہرت بے مثال تھی۔ ان کا دیوان "دیوان گویا" کے نام سے کئی مرتبہ شائع ہو چکا ہے مگر اب کم یاب ہے۔ ان کا انتقال ۱۸۵۱ء میں ہوا۔ (مطابق "صاحب سیف و قلم" از جعفر ملیح آبادی) ان کا ایک شعر:

ولولہ جوش جنوں کا تھا مجھی تک گویا
نظر آیا نہ کوئی آبلہ پا میرے بعد

نواب محمد احمد خاں:

گویا کے بیٹے اور جوش صاحب کے دادا نواب محمد احمد خاں بھی صاحب دیوان شاعر تھے احمد تخلص کرتے تھے۔ ان کا دیوان "مخزن آلام" کے نام سے شائع ہوا۔ یہ کسمنڈی خورد کے تعلقہ دار تھے اور بقول جوش صاحب "جسمانی اور جنسی طاقت کے اعتبار سے ایک غیر معمولی انسان تھے۔ ان کی (۲۵) (۳۰) بیویوں سے ایک سو بارہ (۱۱۲) بچے پیدا ہوئے"۔ اتنے بچوں میں ان کی آبائی جائے داد کا جو حشر ہوا اس کو جوش صاحب نے یوں بیان کیا ہے کہ "جس طرح ململ کی چادر کو ببول کے اوپر ڈال کر اور پھر زور سے کھینچ کر تار تار کر دیا جائے اسی طرح انھوں نے اپنی جائے داد کے ٹکڑے اڑا کر رکھ دیے"۔ ان کا انتقال ۱۹۰۳ء میں ہوا۔

نواب بشیر احمد خان:

نواب احمد خاں کے بیٹے نواب بشیر احمد خاں جوش صاحب کے والد تھے۔ ان کا شمار بھی ملیح آباد کے رؤسا میں تھا۔ ورثے میں دو مواضعات محمد نگر اور سیدا پور اور اس کے علاوہ متعدد قطعات اراضی ملے تھے۔ نواب بشیر احمد خاں بھی شاعر تھے اور بشیر تخلص کرتے تھے

ان کا دیوان "کلام بشیر" کے نام سے شائع ہوا۔ بہت سادہ اور سلیس زبان میں شعر کہتے تھے۔
ان کا ایک شعر ہے۔

ہم بھی کل ان کو دیکھ آئے بشیر
واقعی دیکھنے کی صورت ہے

ان کی شادی آگرے کے ایک رئیس گھرانے میں بسم اللہ بیگم سے ہوئی جن کی والدہ راجپوت تھیں مگر انھوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ نواب بشیر احمد خاں کا انتقال چوالیس (۴۴) سال کی عمر میں ۱۹۱۹ء میں ہوا۔ جوش صاحب کی والدہ بسم اللہ بیگم شیعہ عقائد رکھتی تھیں اور عظمت اہل بیت کی قائل تھیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کے بادشاہ اور امراء شیعہ تھے اس لیے شیعہ عقائد لکھنؤ کی ثقافت کا ایک اہم حصہ بن گئے تھے۔ چنانچہ بسم اللہ بیگم کی خواہش پر ملیح آباد میں پہلا امام باڑہ قائم کیا گیا۔ جہاں محرم میں تعزیے بٹھائے جاتے اور مجالس عزا منعقد کی جاتی تھیں۔ جوش صاحب کے عقائد کی تشکیل میں اس ماحول اور ان کی والدہ کا اثر نمایاں معلوم ہوتا ہے۔

نواب بشیر احمد کا خاندان:

نواب بشیر احمد خاں اور بسم اللہ بیگم کی سات اولادیں تھیں۔

(۱) افسر جہاں
(۲) شفیع احمد خاں
(۳) شبیر حسن خاں (جوش ملیح آبادی)
(۴) انیس جہاں
(۵) رئیس احمد خاں
(۶) حشمت خاں
(۷) شوکت جہاں

جوش صاحب ملیح آباد میں ۵ دسمبر ۱۸۹۸ء کو صبح چار بجے پیدا ہوئے۔ اپنی سوانح حیات "یادوں کی برات" میں جوش صاحب نے اپنے حصول علم کے متعلق جو تفصیل

بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کالج کی تعلیم حاصل نہ کر سکے تھے مگر عربی، فارسی، اردو اور ادب کا علم اس دور کے نہایت مستند اساتذہ سے حاصل کیا تھا۔ شاعری میں اصلاح کے لیے والد صاحب نے حضرت عزیز لکھنوی کو ان کا استاد مقرر کر دیا تھا۔ جوش صاحب تقریباً پانچ چھ سال تک ان کے شاگرد رہے۔ اس تعلق سے جوش صاحب نے لکھا ہے۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت عزیز بہت اچھے استاد اور بہت ذی علم بزرگ تھے اور جہاں تک زبان کی صحت اور لہجے کی نجابت کا تعلق ہے ان کی ذات سے مجھ کو نہایت کثیر فائدہ حاصل ہوا لیکن جب مجھ کو واضح طور پر یہ محسوس ہونے لگا کہ میری فکر کا جادہ ان سے مختلف ہے اور ہم دونوں کی تخیل ایک ہی سمت سفر نہیں کر رہی ہے اور ان کی اصلاح سے اشعار کا لفظی رنگ و روغن تو ضرور ابھر آتا ہے لیکن معنویت دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے تو میں نے اصلاح لینا ترک کر دیا"۔

جوش صاحب کی ابتدائی تعلیم پہلے گھر پر پھر سیتاپور کے اسکول میں اس کے بعد لکھنو کے حسین آباد ہائی اسکول میں ہوئی۔ ۱۹۱۲ء میں علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے مگر کچھ ہی دن بعد لکھنو آ گئے۔ اس کے بعد آگرے کے سینٹ پیٹرز کالج میں داخل کر دیے گئے تاکہ سینئر کیمبرج پاس کر لیں مگر ۱۹۱۹ء میں جب ان کے والد کا انتقال ہو گیا تو یہ سلسلہ بھی ختم کر دیا گیا اور وہ اپنے گھر آ گئے۔ اس وقت ان کی عمر بیس (۲۰) برس کی تھی۔ یہاں آ کر انھوں نے زمیندار کی حیثیت سے اپنے قصبہ ملیح آباد میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ ۱۹۲۰ء میں اپنے وطن میں ایک مکان تعمیر کروایا جس کا نام قصر سحر رکھا۔ اس زمانے میں انھوں نے خود کو عبادت و وظائف میں مشغول کر لیا۔ داڑھی رکھ لی اور نہایت پابندی سے نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگے۔ انتہا ہی نہیں بلکہ نمازوں کے وقت کمرہ بند کر کے عود اور اگر سلگاتے اور اس قدر طویل رکوع و سجود کے ساتھ نمازیں پڑھتے کہ قرون اولیٰ کے سچے مسلمانوں کی روح وجد کرنے لگتی۔

قصر سحر کی سکونت کے زمانے میں وہ اپنے حصے میں ملے باغوں کی دیکھ بھال اور ۳۰ بیگھے مزروعہ زمینوں پر نئے باغ لگا کر ان کی پرورش اور نگرانی کرنے لگے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ان کی شاعری اور نثر کی کتابیں بھی منظر عام پر آنے لگیں۔ ۱۹۲۱ء میں ان کی شاعری کی پہلی کتاب

"روح ادب" شائع ہوئی جس پر اس دور کے ادیب اور دانشور رفیع احمد خاں ام۔اے نے مقدمہ لکھا اور حضرت اکبر الہ آبادی نے اپنی تعریفی رائے لکھی۔ علامہ عبدالماجد دریا بادی اور علامہ اقبال نے ان کے خیالات اور شاعری کی تعریف کی۔ ملک کے نامور مشاہیر نے روح ادب پر تبصرے لکھے۔ اس زمانے میں ان کے نثری مضامین کے مجموعے مقالات زریں، اوراق سحر بھی شائع ہوئے۔ دو طویل نظمیں "جذبات فطرت" اور "آوازہ حق" بھی ۱۹۱۸ء کی لکھی ہوئی ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئیں۔ بعد میں ان کو "شعلہ و شبنم" میں شامل کر لیا گیا۔ اس طرح ۱۹۲۱ء تک جوش صاحب ہندوستان کے علمی اور ادبی حلقوں میں تو مشہور ہو ہی گئے تھے، اسی کے ساتھ ساتھ وہ ملک کی تمام سیاسی شخصیتوں سے بھی متعارف ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۸ء میں وہ کانگریس کے احمد آباد والے اجلاس میں شریک ہوئے اور وہاں ان کی ملاقات مہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، وجے لکشمی پنڈت، مدن موہن مالویہ، مولانا محمد علی، شوکت علی جیسے ہندوستان کے چوٹی کے لیڈروں سے ہوئی۔ گو اس اجتماع میں بھی جوش صاحب کی دلچسپی سیاست سے زیادہ حسن پرستی ہی سے معلوم ہوتی ہے اور یہاں بھی وہ ایک دلنشیں دوشیزہ کا دیوانہ وار بوسہ لینے سے نہیں چوکے۔ اور احمد آباد سے واپسی پر راستے میں ایک اسٹیشن کے باہر سگنل نہ گرنے کی وجہ سے جب ریل جنگل میں کچھ دیر کے لیے رکی تو یہ "جنگل کی ایک شاہزادی" کو دیکھ کر ریل سے اتر پڑے اور ریل چل دی۔۔۔۔

کراچی میں ایک نجی محفل میں جوشس صاحب نے اپنی یہ نظم جنگل کی شاہزادی سنائی تھی تو میں نے ان سے دریافت کیا تھا کہ جب ریل چلی گئی اور آپ اس حسینہ کے ساتھ جنگل میں اکیلے رہ گئے تو پھر کیا ہوا؟ تو جوشس صاحب نے فرمایا کہ اس جگہ سے اسٹیشن قریب تھا اور چونکہ رات ہو چکی تھی اس لیے وہ لڑکی ان کو لے کر اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں آ گئی، جہاں وہ دونوں صبح تک باتیں کرتے رہے اور صبح کی گاڑی سے اجمیر روانہ ہوئے۔ واللہ عالم۔

جوشس صاحب کا ایک شعر ہے۔

ہر اسٹیشن پہ دو اک زخم کاری دل پہ کھاتے ہیں
سفر کرتے ہیں یا ہم جنگ کے میداں میں جاتے ہیں

اجمیر سے جب لکھنؤ آئے تو وہاں ان کی ملاقات رابندر ناتھ ٹیگور سے ہوئی اور انھوں

نے جوش صاحب کو شانتی نکیتن آنے کی دعوت دی۔ چنانچہ وہ چھ مہینے تک شانتی نکیتن میں بھی رہے اور ٹیگور کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ اس کے بعد جب بیگم نے تار دے کر ان کو ملیح آباد بلوا لیا تو واپس آ کر اپنی جائے داد کی دیکھ بھال میں مشغول ہو گئے۔ مگر جوش صاحب کا مزاج اور طبیعت کی افتاد ایسی تھی کہ زمینداری کے پیچیدہ معاملات ان کے بس کا روگ نہ تھے۔ ان کو قدرت نے تفکر، شاعری اور علم و ادب کی گتھیاں سلجھانے کے لیے پیدا کیا تھا۔ چنانچہ جب بیوی نے یہ محسوس کیا کہ ان کی جائے داد کی آمدنی ان کے اخراجات کی کفیل نہیں ہو پا رہی ہے تو انھوں نے جوش صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کہیں ملازمت تلاش کر لیں تاکہ معاش کی طرف سے کچھ اطمینان نصیب ہو۔

اتفاق سے انھیں دنوں میں جوش صاحب کو کسی حیدر آبادی خاتون سے عشق ہو گیا جس سے مجبور ہو کر انھوں نے ریاست حیدر آباد میں نوکری تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اس سلسلے میں سفارشات فراہم کرنا شروع کر دیں۔ اس واقعہ پر جوش صاحب "یادوں کی برات" میں اس طرح روشنی ڈالتے ہیں کہ "یہ واضح کر دینا بھی ضروری ہے کہ سفر دکن خالی ایک معاشی مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ میری ایک رومانی گتھی بھی ایسی تھی جو حیدر آباد جائے بغیر کھل ہی نہیں سکتی تھی"۔ اس کے بعد حاشیے میں فرماتے ہیں کہ "حیدر آباد پہنچ کر میں نے "تیرے لیے" کی سرخی سے ایک نظم بھی کہی تھی" جو حسب ذیل ہے۔

"تیرے لیے"

دیکھ کیوں کر جی رہا ہوں دل ربا تیرے بغیر
ہر نفس ہے اک حدیث کربلا تیرے بغیر
مانگتا ہوں بھیک درویشوں سے تیرے واسطے
شاہ کے کوچے میں دیتا ہوں صدا تیرے لیے
ڈھونڈتا پھرتا ہوں میں اپنے کو تیری راہ میں
پوچھتا پھرتا ہوں میں اپنا پتا تیرے لیے
میں کہ آغوشِ سکوں میں پا چکا تھا آپ کو
پھر محیطِ کشمکش میں کھو گیا تیرے لیے

حسرتیں دل کی رواں ہیں کارواں در کارواں
ہر نفس ہے بحر میں بانگ درا تیرے لیے
آہ گو اک عمر سے ہوں میں رئیس ابن رئیس
بن کے نکلا ہوں گدائے بے نوا تیرے لیے
شرع سے درخواست کرتا ہوں کشود کار کی
کھٹکھٹاتا ہوں در دارالقضا تیرے لیے
آہ اک فتوے کی خاطر کہنا پڑتا ہے مجھے
شیخ سے نااہل کو مرد خدا تیرے لیے
جاہلان بے خرد کے ناسزا اقوال کو
ماننا پڑتا ہے بے چون و چرا تیرے لیے
چاک کرکے میں نے آبائی امارت کا لباس
زیب تن کی ہے غلامی کی قبا تیرے لیے
شرط پوری ہو چکی للہ اب تو رحم کر
دیکھ کیا تھا جوشؔ اور کیا ہو گیا تیرے لیے

غرض تلاش معاش اور وصال محبوب کی خواہش کے علاوہ جوش ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں کہ ایک رات رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے خواب میں تشریف لائے اور ان کو ریاست حیدرآباد میں نظام دکن کے پاس جانے کا حکم دیا اور وہاں دس برس تک رہنے کی بشارت دی۔ جوش صاحب نے اپنی بیگم سے یہ خواب بیان کرکے اگر ایک طرف حیدرآباد جانے کی اجازت حاصل کی تو دوسری طرف جب وہ حیدرآباد پہنچے تو نظام دکن کو اس خواب کے ذریعے اس قدر متاثر کیا کہ انھوں نے جوش صاحب کی مرضی کے مطابق ان کا تقرر پہلے انگریزی ادب کے مترجم کے طور پر کیا اور پھر ان کو مشیر ادب کے عہدے پر فائز کر دیا۔

بہرحال جوش صاحب خواہ اپنی معاشی مجبوری کے تحت حیدرآباد گئے ہوں یا کسی محبوبہ کے عشق میں گرفتار ہو کر دل کے ہاتھوں مجبور ہوئے ہوں یا دونوں ہی وجوہ سے انھیں ترک وطن کرنا پڑا ہو وہ ۱۹۲۴ء میں ملیح آباد سے رخصت ہو کر حیدرآباد پہنچے تھے۔ وہاں ان کی

رسائی نظام دکن نواب میر عثمان علی خاں کے دربار میں کیسے ہوئی اور ان کو جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ میں ملازمت کیسے ملی ان تمام باتوں کی تفصیل خود جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں بیان کر دی ہے اور ممکن ہے وہ سب باتیں بالکل اسی طرح سے واقع ہوئی ہوں جیسے انھوں نے بیان کی ہیں مگر ان کی بہن کے داماد جناب مائل ملیح آبادی نے جو واقعات اپنی کتاب "جوش اور دیار دکن" میں بیان کیے ہیں وہ ایک اور ہی نقشہ پیش کرتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۸۲ء میں سرفراز پریس لکھنؤ سے فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش کے مالی تعاون سے چھپ کر منظر عام پر آئی ہے۔ مجھے یہ کتاب حیدرآباد دکن کے ایک بک اسٹال سے ملی ہے اور اس میں جوش صاحب پر کام کرنے والوں کے لیے بعض بہت مفید معلومات ہو سکتی ہیں اور حیات جوش کے بعض ایسے پہلو بھی اجاگر ہو سکتے ہیں جو ابھی تک منظر عام پر کم از کم پاکستان میں نہیں آئے۔ اس کتاب میں بعض ایسی نظمیں بھی ہیں جو جوش صاحب کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہیں۔ مائل صاحب نے اپنی کتاب میں جوش صاحب سے منسوب ایک غیر مطبوعہ دستاویز کا ذکر کیا ہے جو "شوکت عثمانی" کے نام سے کسی خوش خط کاتب نے لکھی ہے۔ کتاب پر جوش صاحب کے قلم کی کوئی تحریر نہیں ہے نہ اس پر ان کے دستخط ہیں لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوش صاحب نے اس کتاب کی کئی نقلیں تیار کروائی تھیں اور ان کو مشاہیر دکن کی خدمت میں پیش کر کے ان میں سے بعض کی آرا کو کتاب کے آخری حصے میں شامل کر دیا۔

نواب مہدی یار جنگ کے والد نواب عمادالملک جن کے سفارشی خط کا جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں ذکر کیا ہے، "شوکت عثمانی" میں ان کا بھی تبصرہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جوش صاحب کی اس وقت تک کی تقریباً تمام تخلیقات سے نہ صرف واقف تھے بلکہ ان کا مطالعہ بھی کر چکے تھے۔ انھوں نے لکھا ہے

"آپ کے بے نظیر رسائل اردو روح ادب، مقالات زریں، اوراق سحر، جذبات فطرت اور آوازۂ حق پہونچے"۔

اس پر جناب مائل ملیح آبادی لکھتے ہیں "یعنی جوش صاحب حیدرآباد گئے تو ان کے یہ رسائل اور کتابیں بھی حیدرآباد پہنچ چکی تھیں اور اہل نظر میں تقسیم کی جا چکی تھیں۔ اسس

طرح جوش صاحب پوری تیاری کے ساتھ حیدرآباد پہونچے تھے اور کسی کی سفارش یا کوشش کی جگہ اپنی علمی لیاقت اور شاعرانہ عظمت کا لوہا منوانا چاہتے تھے۔ کچھ بھی ہو ہمارے پاس جوش صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب "شوکت عثمانی" میں وہ تفصیلی پروگرام ہے جو جوش صاحب نے نظام دکن کے سامنے پیش کیا تھا۔ انھوں نے پہلی یا دوسری حاضری کے وقت جو نظم پڑھی تھی وہ ہم نیچے لکھ رہے ہیں جو آج تک کہیں طبع یا شائع نہیں ہوئی ہے۔

"فقیر کی صدا"

قریب ہے کہ ڈبو دے مجھے ہوائے فساد
سنبھال جلد سفینہ دکن کی باد مراد

گھرا ہوا ہوں کچھ اس طرح آفتوں میں کہ ہے
ہلال عید مرے سر پہ تیشہ فرہاد

مرا ز جوہر تکمیل شاعری افسوس
مرا ز دست ہنر ہائے خویشتن فریاد

بزرگ تر ز ہنر در زمانہ عیبے نیست
زمن مپرس کہ ایں عیب برتو چوں افتاد

در ایں زمانہ چو فریاد رس نمی بینم
مرا رسد کہ رسانم بگوش شہ فریاد

اگرچہ قوت تخییل و زور فکر سے آج
مرے دماغ پہ قائم ہے شعر کی بنیاد

مگر تباہ ہوں اس حد کا میں کہ نادم ہے
مرے وجود کی نسبت سے قوم آدم زاد

مجھے فلک نے دیا ٹھیکرا گدائی کا
کبھی تھے صاحب جاہ و حشم مرے اجداد

مگر یہ بات نرالی نہیں ہے دنیا میں
ہمیشہ فقر پہ رہتی ہے فضل کی بنیاد

پسند ہوتی ہے جس زاغ کی خوش الحانی
اسی پہ دام بچھاتا ہے ڈھونڈ کر صیاد

ابلتے رہتے ہیں جن کے دلوں سے چشمۂ نور
انھیں کو رکھتی ہے لب تشنہ بخت کی بیداد

جو سر جھکے ہوئے فکر سخن میں رہتے ہیں
انھیں پہ تیغ اٹھاتا ہے چرخ کج بنیاد

نگاہ غور سے تاریخ پر جو کی تو کھلا
کمال فن ہے حسینؑ اور زمانہ ابن زیاد

نہ تنگ کرتی جو دنیا تو اس گدائی کو
قبول کرتی نہ شاعر کی فطرت آزاد

مگر یہ میں نے سمجھا کیا؟ میری حقیقت کیا
ترے حضور تو خم ہے سر غرور قباد

فروغ شمع تبسم ترا ہر ایک سخن
نسیم باغ ترنم ترا ہر اک ارشاد

غبار راہ ترا غازۂ رخ ہستی
نشان پا ہے ترا تاج عالم ایجاد

ازل میں تجھ کو بنا کر جمال مطلق نے
بیاض حسن پہ تیری کیا ہے آنکھ سے صاد

نہیں ہے تیرے برابر جہاں میں کوئی ادیب
نہیں ہے تجھ سا کوئی فن شعر میں استاد

عطا ہوئی ہے وہ تجھ کو نظر کہ تیری طرح
نہ ہو گا دہر میں باریک بیں کوئی نقاد

ترے قلم کی ہے جنبش کہ رقص باد سحر
تری رقم ہے کہ ہے نقش مانی و بہزاد

ترے جلال سے محکم ہے سلطنت کا نظام
ترے جمال سے رنگیں ہے گلشن ایجاد

تری نگاہ سے تابندہ محفل رنداں
تری جبیں سے درخشندہ مجلس زہاد

اگر تو مختلف اجزا کو جوڑنا چاہے
مصالحت کے لیے جمع ہوں ابھی اضداد

خیال باد بہاری جو آئے دل میں ترے
خزاں کے دور میں چلنے لگے نسیم مراد

جو شوق ہو تجھے ویرانیاں مٹانے کا
تو عاشقوں کے دلوں کی ہوں بستیاں آباد

ترے دکن کی دل آویزیوں پہ قرباں ہے
نسیم خاک مصلےٰ و آب رکنا باد

بجائے طعنہ اگر تیغ می زند دشمن
ز شاہ ، دست ندارم ہرچہ بادا باد

دلم کہ مخزن اسرار بود دست قضا
درش بہ بست و کلیدش بہ دست عثماں داد

تو تا بروے من اے شہر یار در بستی
دگر جہاں در شادی بروے من نکشاد

ستم ہے تیرے زمان عطاؤ بخشش میں
ہو ایک شاعر خوش گو کی زندگی برباد

شکستہ وار بہ درگاہت آدم کہ طبیب
بہ موسیائی لطف تو ام نشانی داد

ملا تھا پھر سے زلیخا کو جس طرح سے شباب
ہوا تھا قید سے جس طرح ماہ مصر آزاد

اسی طرح مجھے حاصل ہو مدعا میرا
یونہی برار کی بابت بر آئے تیری مراد

خجل نہ ہونے دے مجھ سے مرے کمالوں کو
ادھر بھی ایک نظر اے امیر نیک نہاد

بہا وہ فیض کا دریا جو اپنی رو میں چلے
اچھالتا ہوا موتی سوئے ملیح آباد

دعا پہ ختم کر اے جوش اب یہ نظم طویل
کہ شہر یار دکن کامراں و زندہ باد

اس کے بعد جناب مائل لکھتے ہیں کہ "یہ درخواست جوش صاحب نے نظام کو سنائی یا پیش کی۔ ہمارے پاس کوئی معلومات نہیں ہیں لیکن یہ نظم "شوکت عثمانی" میں ہے۔ اسی شوکت عثمانی میں جوش صاحب کی ایک درخواست بھی ہے جو پہلے دن اپنی "فقیر کی صدا"

سنانے کے بعد پیش کی ہوگی یا پیش کرنا چاہتے ہوں گے۔ وہ اس طرح شروع ہوتی ہے۔

اعلیٰ حضرت ظلِ سبحانی، حامیِ دین و ملت، خسرو دارا صولت،
عارف نکتہ شناس، حامیِ ارباب کمال، تاجدار سکندر جلال
حضرت سرکار عالی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ

بہ بارگاہ انجم سپاہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ می رساند

مشرقی تہذیب و شرافت کا معیار مادہ پرست یورپ کے آداب و تہذیب و آئین تمدن سے ہمیشہ مختلف رہا ہے۔ ایشیائی زبان و قلم سے اپنی ثنا و صفت کا اظہار ایک ایسا فعل مکروہ ہے جو کسی طرح بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

(۱) اور اسی بنا پر عریضہ نگار یہ عرض کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی ناچیز اور غیر مستند شخصیت کو جامعہ عثمانیہ کی مستقل خدمت کے واسطے کیوں ہر طرح قابل انتخاب سمجھتا ہے۔

(۲) اور اسی طرح اس کے وجوہ بھی نہیں بیان کر سکتا کہ تاریخ دکن کو فردوسی کی سی قوت بیان کے ساتھ شاہ نامے کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے وہ اپنی ذات کو کن اسباب خاص کی بنا پر اس درجہ موزوں تصور کرتا ہے۔

(۳) جامعہ عثمانیہ کی خدمت کے متعلق عجیب نادر خیالات عریضہ نگار کے دل میں تڑپ رہے ہیں۔ اگر قسمت نے مساعدت کی وہ اپنے مقدور کے اندر دکھا دے گا کہ ایک ایسے دار العلوم سے جس کی بنیاد خاص زبان اردو پر ہو اور جس کا سنگ بنیاد دکن کے موجودہ بیدار مغز اور صاحب فکر تاجدار نے رکھا ہے، کس غیر معمولی لیاقت کے طالب علم برآمد کیے جا سکتے ہیں؟

نیز تاریخ دکن کے متعلق بھی اس کے دل میں خاص جذبات موجیں مار رہے ہیں اور صدہا عجیب و غریب روشنیاں اس کے دماغ میں رقص کر رہی ہیں۔ وہ تاریخ دکن کو صرف

نظم کا نادر لباس ہی نہ پہنائے گا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے اوراق کو دکن کے موسموں کی رنگین تصاویر، دکن کی قابل ذکر ہستیوں کے فوٹو، دکن کے قدیم وجدید رسم و رواج اور عمارات کے نقشوں سے اس طرح آراستہ و پیراستہ کر دینے کی تمنا رکھتا ہے کہ زمانے کا کوئی انقلاب حوادث کی کوئی زبردست بارش اس کے ایک نقش کو بھی دھندلا نہ کر سکے۔

اس کے علاوہ یہ خادم دکن کا ماضی و مستقبل، دکن کے کارنامے اور خدمات، دکن کی جائے وقوع اور دکن کی سیاسی اہمیت پر بھی اس طرح روشنی ڈالنا چاہتا ہے کہ ادبی لطافتوں کے دوش بدوش یہ مجموعہ ایک انتہائی "کارآمد" اور "مفید" تصنیف کا خطاب بھی حاصل کر سکے۔

(۴) جامعہ عثمانیہ اور تاریخ دکن ان دونوں کی خدمات کا ولولہ تو اس ناچیز عریضہ نگار کے دل میں ضرور ہے لیکن ان چیزوں کے واسطے اپنی اہلیت ثابت کرنے کے لیے اس کے منہ میں زبان نہیں۔ ہرچند اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ نقاد فن تاجدار کی بارگاہ میں اپنی خصوصیات کے متعلق کچھ عرض کرے مگر انکسار کے نازک جذبات کو ٹھیس لگتے دیکھ کر اس کی زبان دہن میں اس طرح جنبش کر کے رہ جاتی ہے جس طرح نسیم سحر کی نرم رو میں گلاب کی پنکھڑی یا جذبات کی کشاکش اور کلام کے ذوق میں گونگے کے لب۔

(۵) غریب شاعر ایوان شاہی میں داخل ہوتا ہے۔ سر جھکائے مودب اور خاموش اس کے ایک ہاتھ میں اس کی ناچیز تصانیف ہیں مع ان تنقیدوں کے جنھیں ملک کے مسلم الثبوت ارکان علم و ادب نے اس کے مزخرفات کے متعلق لکھا ہے اور دوسرے ہاتھ میں وہ قلم برداشتہ (رزمیہ بزمیہ) نظمیں ہیں جنھیں تاریخ دکن کے موضوع پر اس نے بطور نمونہ پیش گاہ اقدس میں گزرانے کے لیے اس مختصر قیام حیدرآباد کے اثنا میں تحریر کیا ہے۔ اور یہ دونوں نتائج افکار جوہر شناس نظر میں خود فیصلہ کر دیں گے کہ ان کا پیش کرنے والا اپنے میں ان دونوں خدمتوں کے انجام دینے کی کس حد تک اہلیت رکھتا ہے۔ بارگاہ خسروی کا جلال شکستہ دل شاعر کی رگ رگ پر چھایا ہوا ہے۔ آنکھیں جھکی ہوئی ہیں اور دل دھڑک رہا ہے مگر اس کی مطالعہ فطرت کرنے والی آنکھیں تاجدار دکن کی نکتہ شناس نگاہوں کی طرف ایک عجیب امید و بیم کے ساتھ اٹھی ہوئی ہیں۔

ع   جوہرے دارم و صاحب نظرے می جویم

گزارندہ

خاکسار شبیر حسن جوش ملیح آبادی

اس کے بعد جناب مائل لکھتے ہیں "جوش صاحب نے جس انداز اور زبان میں یہ درخواست گزاری ہے، بالکل قدرتی ہے۔ نظام دکن کے سامنے درخواستیں گزارنے کا جو طریقہ تھا اور جن القاب و آداب سے انھیں مخاطب کیا جاتا تھا، جوش صاحب اس سے مستثنیٰ نہیں کیے جا سکتے تھے۔ اگر اس انداز مخاطبت پر کوئی اعتراض کرے تو وہ ان حالات سے ناواقفیت کی بنا ہی پر کر سکتا ہے جو اس دور میں ضروری تھے۔

اس درخواست میں جوش صاحب نے اپنے لیے دو خدمتیں منتخب کی ہیں۔ ایک تو جامعہ عثمانیہ کی خدمت اور دوسری تاریخ دکن کو فردوسی کے شاہنامے کی طرح نظم میں ترتیب دینا اور اردو زبان میں وہی زور بیان پیدا کرنا جو فردوسی نے فارسی زبان میں شاہنامے کے اندر پیدا کر کے حیات جاوداں حاصل کر لی ہے۔ اس درخواست کے ساتھ جوش صاحب نے جو نمونے پیش کیے ہیں اور جو "شوکت عثمانی" میں موجود ہیں وہ اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر نامعلوم اسباب کی بنا پر تاریخ دکن کا سلسلہ بہ طرز شاہنامہ فردوسی ٹوٹ نہ جاتا تو آج اردو ادب کا دامن ان جواہرات سے بھی بھرا ہوتا جو جوش ملیح آبادی اس کے خزانے میں ڈالنا چاہتے تھے۔

نیز مائل صاحب نے اپنی کتاب میں "شوکت عثمانی" کی جو تفصیل بیان کی ہے، اس کی رو سے اس کی ترتیب آئندہ صفحات پر بیان کی جا رہی ہے۔

نمونہ

(سرورق)

شوکت عثمانی
یعنی
تاریخ دکن، شاہنامے کے طرز پر

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی نبیرہ حسام الدولہ تہور جنگ
نواب فقیر محمد خاں گویا

(صفحہ دوم)

فہرست مضامین

ب ۱ "شوکت عثمانی" پر حیدر آباد کے ارباب علم و فضل کی رائیں
۲ مقدمہ کتاب
۳ نظمیں

اصل کتاب :

گزارش احوال واقعی
بیداری قلم
نمونہ رزم (معرکہ حضور آصف جاہ اول و باجی راؤ ۱۱۴۰ھ)
نمونہ بزم
نمونہ واقعہ نگاری (افق دکن پر شعاع اسلام ۹۰ھ)

ج روح ادب کی تنقیدیں

(تصانیف) روح ادب کا انگریزی ترجمہ
(متعلقات تصانیف) عریضہ نگار کی مطبوعہ تصانیف کے نسخے

جوش صاحب فردوسی کے شاہنامے کی طرز پر جو دکن کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔ اس کے متعلق انھوں نے "مقدمہ برائے ارباب تنقید" کے عنوان سے شوکت عثمانی کے ایک باب میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ ہم اس کے ذکر سے شروع کرتے ہیں۔

maablib.org

شوکت عثمانی

از

جوش ملیح آبادی

(مقدمہ برائے ارباب تنقید)

"تاریخ" حیات انسانی کا وہ زبردست اور اہم شعبہ ہے جس کی عظمت سے کوئی عقل مند انکار نہیں کر سکتا۔

تاریخ کیا چیز ہے اور ہمیں کیا سکھاتی ہے اور تاریخ نگاری کی بہترین شکل کیا ہو سکتی ہے یہ سوال ہے جس کا جواب ان چند سطور میں نہیں دیا جا سکتا۔ اگر حالات نے مساعدت کی تو انشاء اللہ اس موضوع پر کافی روشنی ڈالنے کی ہر ممکن سعی عمل میں لائی جائے گی۔

صوبہ دکن ہندوستان کی قدیم شہنشاہیت کا سب سے درخشاں صوبہ ہے اور زمانہ دراز سے اپنی عظمت و رفعت کے لحاظ سے تمام ہندوستان میں ایک ممتاز اور نمایاں وقار کا مالک ہے۔ یہاں کے واقعات اور کارنامے اگر وہ سلیقے کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیے جائیں تو بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ دنیا کی آنکھیں خیرہ ہو کر رہ جائیں اور اپنی دیرینہ عظمت سے بے خبر موجودہ نسلیں غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائیں۔ افسوس کہ اس عظیم صوبے کی تاریخیں جو ابھی تک لکھی گئی ہیں اور جو اب تک میرے مطالعے سے گزری ہیں، نہایت ناکافی اور غیر دلچسپ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ دکن کے تمام واقعات ضبط تحریر میں آ گئے ہیں لیکن فاضل مورخ مجھے معاف فرمائیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ پتھروں کے بڑے بڑے ٹکڑے اوپر نیچے چن دیئے گئے ہیں جن میں علاوہ بنیادی کمزوری کے، نہ دلکشی ہے نہ حسن ترتیب اور یہ بات بھی حیرت سے خالی نہیں کہ اس موضوع پر ابھی تک کسی نے توجہ بھی نہیں کی۔ میں اپنی کم مائیگی اور بے علمی کی حدود سے بخوبی واقف ہوں اور اسی بنا پر میری ہمت نہ پڑتی تھی کہ اس زبردست خدمت کا بار اپنے کمزور شانوں پر اٹھاؤں لیکن طبیعت کی امنگ بھی عجیب چیز ہوتی ہے۔

ایک روز تاریخ دکن کا مطالعہ کر رہا تھا کہ دفعتاً دماغ میں ایک بجلی سی چمکی اور معاً خیال پیدا ہوا کہ بعض واقعات کو نظم کا لباس پہناؤں اور دیکھوں کہ وہ کیا شکل اختیار کرتے ہیں۔ خیال آتے ہی قلم لے کر بیٹھ گیا اور ایک گھنٹے کے اندر ایک مختصر سی نظم تیار ہو گئی۔ دیکھا تو

وہ اتفاق سے کچھ ایسی بری بھی نہ تھی۔ ہمت ہوئی کچھ اور لکھوں۔ چنانچہ دو ایک نظمیں اور بھی لکھیں۔ جنھیں آئندہ صفحوں پر آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس راہ میں میری سعی کہاں تک مشکور ہوئی ہے۔ یہ آپ کی رائے پر چھوڑتا ہوں۔

دکن کی تاریخ سے متعلق میرے دماغ میں بہت سے خیالات تڑپ رہے ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ اگر یہ خدمت مجھ سے بن پڑی تو دراصل ایک عجیب نادر اور یادگار چیز ہو گی اور زبان اردو میں ایک سبق آموز اور دلچسپ تصنیف کا اضافہ ہو گا۔

دراصل وہ دنیا کا بڑا آدمی تھا۔ جس نے کہا ہے کہ اگر تمہیں کسی قوم کے عروج و زوال کا مطالعہ کرنا ہو تو اس کے مقبروں میں جاؤ۔ اس مقولے سے اس کا یہ مقصد ہے کہ اگر قوم عروج کی طرف جا رہی ہو گی تو اپنی تاریخی عظمت سے واقف ہونے کی بنا پر اپنے اسلاف کے مقبروں کو آراستہ و پیراستہ رکھے گی۔ اگر زوال پذیر ہے تو عدم واقفیت کے باعث اس کے مقبرے ویران اور اجاڑ ہوں گے۔ بیشک قومی ترقی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ ہم کم از کم اپنے اسلاف کے کارناموں اپنے ملک کے واقعات، ان کے جوڑ توڑ، اپنے قدیم و جدید تمدن و رسم و رواج اور حوادث کے اسباب و نتائج سے کما حقہٗ واقف اور آگاہ ہوں۔ یہاں ایک نکتہ اور بیان کر دینے کے قابل ہے اور شاید وہ اس سوال کا جواب ہو گا کہ نثر کے کشادہ میدان کو چھوڑ کر تاریخ کے واقعات کو نظم کرنے کا خیال کیوں پیدا ہوا۔ دنیا کا کتنا ہی زبردست سے زبردست واقعہ لیجیے اور الجھے طرز بیان بے جوڑ لفظوں، کمزور اور پست لہجے میں بیان کیجیے اور دیکھیے کہ کتنے دماغوں پر آپ کی تقریر نے گہرا اور پائیدار اثر چھوڑا اور اس کے بعد آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ واقعے کی خطا نہ تھی بلکہ آپ کے طرز بیان کی خطا تھی۔ برخلاف اس کے اگر طرز بیان کی شستگی و سلاست لہجے کی شیرینی و مناسبت اور الفاظ کی سجاوٹ آپ کے قبضے میں ہے تو دنیا کی حقیر سے حقیر داستان آپ کی زبان سے ادا ہو کر زمانے میں ایک گونج پیدا کر دے گی۔ نثر اور نظم میں یہی فرق ہے۔ فارسی میں فردوسی نے شاہنامہ لکھ کر جن چیزوں کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا اور جن بعض معمولی واقعات کے سروں پر اس نے تاج جاوداں رکھ دیا اگر تمام عالم کے سنجیدہ مورخ نثر میں یہ خدمت انجام دینا چاہتے تو عمریں صرف ہو جاتیں اور کامیاب نہ ہوتے۔ اردو میں میر انیس اعلی اللہ مقامہ، نے واقعات کربلا کو جس شکل سے نظم فرمایا اور جو

مستقل اثر وہ مذہب اور ادب پر چھوڑ گئے ہیں اگر روئے عالم کے تمام ذاکر نثر میں صدیوں کوشش کرتے، قیامت تک یہ بات پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ بیشک یہ خیال بہت مبارک ہے کہ تاریخ دکن کو نظم کا لباس پہنایا جائے اگر توفیق الہٰی شامل حال ہے تو باوجود اپنی بے مائیگی کے حتی الوسع اس خدمت جلیلہ کو بوجہ احسن انجام تک پہونچا کر رہوں گا اور مجھے امید ہے کہ اگر یہ کام مجھ ایسے بے بضاعت سے بن پڑا تو یہ خدمت ہندوستان کے واسطے بالعموم اور ریاست حیدرآباد کے لیے بالخصوص ایک نہایت دلچسپ مفید اور سبق آموز خدمت ہوگی۔ اب مضمون کا دروازہ بند کرتے ہوئے کچھ ان نظموں کے متعلق بھی سن لیجیے، جنھیں آپ چند لمحوں بعد ملاحظہ فرمائیں گے۔

یہ نظمیں سرسری فکر کا نتیجہ ہیں۔ غور و تامل اور عمیق فکر کی کاوش و کاہش کو ان میں دخل نہیں۔ اس لیے کہ یہ جو کچھ ہے وہ صرف نمونے کے طور پر ہے اور ظاہر ہے نمونے مختصر ہی اچھے ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ ان نظموں کو اسی نقطہ نظر سے دیکھیں گے۔

غزل کہہ لینا اور چیز ہے اور تاریخ کے پیچیدہ واقعات کو ربط کے ساتھ نظم کرنا چیزے دیگر۔ جن حضرات کو کبھی ایسے اتفاقات پیش آئے ہیں، وہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہ وہ میدان ہے کہ محمود نے فردوسی کے سپرد جب یہ خدمت کی تو حکم دیا کہ فردوسی کو ایوان شاہی کے قریب ایک مکان دیا جائے جو تمام ضروری ساز و سامان سے آراستہ ہو اور آلات جنگ اور اسلحہ حرب، شاہان عجم کے مرقعوں اور پہلوانوں کی تصاویر سے دیواریں سجا دی جائیں۔ ایک ایک شعر پر ایک ایک اشرفی صلہ مقرر ہوا اور حکم ہوا کہ جب ہزار شعر تک نوبت پہونچ جائے تو ہزار اشرفیاں دے دی جایا کریں۔ لیکن باوجود اس قدر سامان قدردانی اور حوصلہ افزائی فردوسی نے کامل پینتیس (۳۵) برس میں یہ میدان طے کیا۔ جیسا کہ خود اس کے اشعار سے ثابت ہے۔

بسے رنج بردم بہ امید گنج　　سی و پنج سال از سرائے سپنج

نبد حاصلے سی و پنج مرا　　چو برباد دارند گنج مرا

خاکسار

شبیر حسن خاں جوش ملیح آبادی

جوش صاحب نے۔ تاریخ دکن کے سلسلے میں آصف جاہ اول کے صوبیدار دکن ہو کر دلی سے آنے اور مرہٹہ سردار باجے راؤ کو شکست دے کر دکن کا انتظام سنبھالنے کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم

شوکت عثمانی

زیرِ سرپرستی

اعلیٰ حضرت سکندر صولت، دارا حشمت، پشت و پناہ ارباب کمال
سلطان العلوم، حضور پرنور نواب میر محمد عثمان علی خاں
تاجدار دکن خلد اللہ ملکہٗ و سلطنتہٗ

نمونۂ رزم

حضور آصف جاہ اول و باجے راؤ
۱۱۳۰ھ

جن ایام نواب عالی تبار — بلادِ دکن کے ہوئے صوبیدار
بھرا تھا شریروں سے دامان کوہ — لٹیروں کے پھرتے تھے ہر سو گروہ
مرہٹہ تھا اک باجے راؤ شریر — بدی میں نہ تھا جس کا کوئی نظیر
جدھر دیکھیے ظلم کا راج تھا — سبب تیغ خوں ریز پر تاج تھا
فنِ ظلم و بدعت میں وہ طاق تھا — نہایت خطرناک قزاق تھا
کسی سے بھی ہوتا نہ تھا انسداد — وہ ظالم نے برپا کیے تھے فساد
کہ دلی سے اک حق پسند و دلیر — جھپٹتا ہوا آ گیا مثلِ شیر
وہ نواب روئیں تن[1] و قلعہ گیر — دبکتے تھے سامنے سے جس کے شریر
مٹاتا ہوا ظالموں کے نشاں — در آیا ستم گاروں کے درمیاں
زباں پر صدائے تکبیر و بزن — لیے پشت پر لشکرِ صف شکن

۱؎ وہ جس کے جسم پر تیغ و تیر کارگر نہ ہو۔

چپ و راست تیغ آزما شہ سوار
اڑاتے ہوئے جنگلوں میں غبار

وہ کرنوں میں خنجر دمکتے ہوئے
وہ برچھے فضا میں چمکتے ہوئے

وہ تیور نبرد آزما، خشمگیں[1]
وہ ساونت الٹے ہوئے آستیں

کمر سے وہ تیغیں لٹکتی ہوئی
وہ نیزوں کی ڈانڈیں چمکتی ہوئی

وہ دل فتح مندی میں اٹکے ہوئے
وہ گھٹنوں تلک ہاتھ لٹکے ہوئے

وہ سینوں کو تانے ہوئے پہلواں
وہ دانتوں میں دابے ہوئے داڑھیاں

وہ ہتیار باہم کھڑکتے ہوئے
وہ مرکب دروں میں بھڑکتے ہوئے

اچھلتے چٹانیں ہلاتے ہوئے
دہانوں کو بہم چباتے ہوئے

غضب کا تھا لشکر قیامت کی فوج
زمیں ہل رہی تھی کہ دریا کی موج

بھرا تھا پھریروں میں آندھی کا زور
وہ گھوڑوں کی ٹاپیں وہ قرنا کا شور

ہلے کوہ شیروں کی للکار سے
فلک کانپا تیغوں کی جھنکار سے

فضا کو پھریروں سے بجتے ہوئے
بڑھے بادلوں سے گرجتے ہوئے

لرزنے لگی روح بہرام و گور
اٹھا باجے راؤ کے لشکر میں شور

ملے آ کے اقبال و بخت دژم
مقابل ہوئے آ کے لشکر بہم

وہ گھوڑوں کی چل بل نے روندی زمیں
اڑی گرد تا حد چرخ بریں

ادھر کھنچ کے تلواریں بل کھا گئیں
ادھر قسمتیں بڑھ کے ٹکرا گئیں

نیاموں سے خنجر ابلنے لگے
بہم چھوٹ کے ہاتھ چلنے لگے

قیامت کی تیغیں تھیں سرگرم کار
پہاڑوں سے جھنکار جاتی تھی پار

کوئی گرز کھا کر جبیں پر گرا
کوئی تیر کھا کر زمیں پر گرا

پراگندہ خاطر تھی فوج شریر
ابلتی تھیں تیغیں برستے تھے تیر

شریروں کا تلواریں خوں چاٹتی
سروں میں در آئیں جھلم[2] کاٹتی

کمانیں قضا کی کڑکنے لگیں
مرہٹوں کی لاشیں پھڑکنے لگیں

بڑھے گھوڑے للکارتے جب شریر
اتر آئے ڈھاٹوں سے جبڑوں میں تیر

---

۱ خشمگیں: آشفتہ، افسردہ

۲ لوہے کی کڑیوں کی بنی ہوئی نقاب جو تلوار کی جنگ کے زمانے میں منھ پر ڈال لیتے تھے۔

ادھر سے بڑھا وہ بہ تیر و کماں — ادھر سے چلا یہ بہ تیغ و سناں
ادھر اس کی چٹکی ہی میں تیر تھا — ادھر اس کا خنجر گلوگیر تھا
ادھر رہ گیا شوق صید افگنی — ادھر پھونک دی اس نے بڑھ کر انی
زمیں گرم تھی آسماں پر غبار — کمند اس نے پھینکی بصد اضطرار
ہوئی اس طرف تیغ براں بلند — گرے کٹ کے سب حلقہ ہائے کمند
کہ اتنے میں اک ہیل تن پہلواں — گرجتا ہوا آیا کف در دہاں
اکڑتا ہوا شور کرتا ہوا — تہمتن[1] کی صورت بپھرتا ہوا
قریب آ کے گھوڑے کو کاوا دیا — بڑھا اور پھر بڑھ کے دھیما کیا
کیا وار تلوار کا جھوم کر — ادھر ایک غازی نے رخ کی سپر
ادھر داہنی سمت وہ آ گیا — ادھر دست چپ کی طرف یہ ہٹا
جھکیتی ادھر کچھ نہ اس کی چلی — ادھر اس نے بڑھ کر کہا یا علی
شرر بار تیغ دو سر تول کر — لگائی سر فرق بے داد گر
گزرتی ہوئی پشت دیوار سے — زمیں پر گری فرق غدار سے
یکایک ادھر اک دھماکا ہوا — ادھر شور "احسنت[2]" برپا ہوا
گئی گرد اڑ اڑ کے افلاک پر — مرہٹہ تڑپنے لگا خاک پر
تڑپ کر ہوئی لاش دم بھر میں سرد — ہوا رنگ قزاق زادوں کا زرد
شجاعت کے بخیے ادھڑنے لگے — قدم خوف جاں سے اکھڑنے لگے
بڑھے یاں دلیران صولت نشاں — بہ شمشیر و خنجر بہ تیر و کماں
جھنجھوڑا پچھاڑا گرایا انھیں — نتیجے میں آخر بھگایا انھیں
تعاقب میں دوڑے بصد اضطرار — لگاموں کو کھینچے ہوئے شہسوار
ہر اک مرد غازی گرجتا ہوا — لہو کنکھیوں سے ٹپکتا ہوا
چلے جا رہے تھے برابر دلیر — جھپٹتا ہے روباہ پر جیسے شیر
ہوئے گم چٹانوں کے انبوہ میں — مرہٹوں کے دل چھپ گئے کوہ میں

---

۱ دلاور۔ رستم کا لقب — ۲ بہت اچھا کیا تو نے

نبرد آزما مسکراتے ہوئے
پلٹ آئے گھوڑے کداتے ہوئے

خطاب بہ شہریار دکن

ہوا مظہر حق دیار دکن
ترے واسطے شہریار دکن

مشیت کی در پردہ تائید تھی
تری سلطنت کی یہ تمہید تھی

برسنے لگا گھر کے ابر کرم
سنا تھا کہ آئیں گے تیرے قدم

جو آواز پا تیری آنے لگی
زمین دکن مسکرانے لگی

اس نمونہ رزم کے بعد جوش صاحب نے دوسرا "نمونہ بزم" بھی شوکت عثمانی میں پیش کیا ہے۔ اسے بھی دیکھیے۔

نمونۂ بزم

پلا ساقیا بادۂ تند و تیز
کہ پھر ہے نسیم چمن عطر بیز

ملا دے مرے لب سے لبریز جام
کہ پھر جلوہ گستر ہے ماہ تمام

اٹھا چوم کر ساغر زرنگار
کہ آیا ہے پھر موسم نوبہار

صبا رنگ کلیوں میں بھرتی ہوئی
چلی آتی ہے رقص کرتی ہوئی

چمن روح افزا ہوا خوشگوار
فرح بخش سبزہ لب جوئبار

ترنم سے لبریز ہے پھر ہوا
چھلکتے ہوئے جام لا ساقیا

پپیہوں کی دھن، قمریوں کی پکار
خوشا وقت شادی خوشا روزگار

ہوا چلتی ہے دل لبھاتی ہوئی
دلہن کی طرح سے لجاتی ہوئی

یہ کلیاں چمن میں چٹکتی ہوئی
یہ پھولوں کی شاخیں لچکتی ہوئی

قیامت کا چھایا ہوا ہے خمار
ذرا دیکھ تو پوتے کی بہار

شب ماہ ہے یا کوئی نازنیں
ہے زینت آسمان و زمیں

ٹہلتی ہے آنکھیں جھکائے ہوئے
ستاروں کی افشاں لگائے ہوئے

اٹھا بربط اے ساقی دل نواز
کہ چھیڑا ہے بیلے کی کلیوں نے ساز

نفاست میں ڈوبی ہے موج صبا
مٹا ساتیا جلد تکلیف ہوش
گلے میں سبک ہار ڈالے ہوئے
عیاں خال و خط سے بہار چمن
کمر لوچ کھاتی ہوئی بار بار
لگاوٹ میں ڈوبی ہوئی ہر نظر
نہ کیوں درد مندوں کے دل ہوں تباہ
تبسم لبوں پر ہے یوں موج زن
یہ آنکھوں کے ڈوروں میں رنگ شباب
نفس میں یہ جذبات کی برہمی
یہ رخسار پر ولولوں کی چمک
عجب پھول ہے عقل جس سے ہو دنگ

ادھر کامنی ہے ادھر موتیا
وہ دیکھو آ گیا کوئی گیسو بدوش
نزاکت سے دامن سنبھالے ہوئے
سر دوش گیسو شکن در شکن
صراحی سی گردن میں پھولوں کا ہار
نگہ میں پپیہے کی دھن کا اثر
کہ آنچل گلابی ہے زلفیں سیاہ
کہ غنچے میں اتری ہے پہلی کرن
جنھیں لوٹ دیتے کے پیچھے شراب
جبیں پر یہ دوشیزگی کی نمی
پسینے میں یہ کم سنی کی مہک
لڑکپن کی خوشبو جوانی کا رنگ

اس کے بعد ایک نظم ہے "موازنہ" جس کا پہلا شعر ہے۔

ادھر چرخ پر جلوۂ ماہتاب
لب جو ادھر کوئی مست شباب

اور اس کا آخری شعر ہے۔

وہ دے دے کہ آنے نہ پائے تھکن
کہ لکھنا ہیں حالات ملک دکن

اس کے بعد ایک طویل نظم ہے جس میں مسلمانوں کی دکن میں آمد سے متعلق حالات بیان کیے گئے ہیں اور یہاں آنے کے بعد ان پر کیا گزری اس کا اجمالی نقشہ پیش کر کے آخر میں "خطاب بہ شاہ دکن سے" یہ دو شعر درج ہیں۔

عیاں ذرے ذرے سے ایمان تھا
تری سلطنت کا یہ سامان تھا
کیے انجمن اپنی آراستہ
دکن دیکھتا تھا ترا راستہ

ان اشعار پر "شوکت عثمانی" کو ختم کر دیا۔
اس کے بعد جناب مائل ملیح آبادی لکھتے ہیں۔ "ہمیں معلوم نہیں کہ اس خواہش کا

نظام دکن نے کیا جواب دیا؟ یہ منصوبہ اور جوش صاحب کے اس والہانہ جذبے کو میر عثمان علی خاں تک رسائی بھی ہوئی یا نہیں لیکن ہم یہ جانتے ہیں کہ حیدرآباد اور دربار شاہی کے اہم امراء کے پاس "شوکت عثمانی" کی نقلیں پہونچ چکی تھیں۔ ہمارا خیال ہے کہ دربار نظام کے امراء نے جوش صاحب کو "حیات بیکن" کے ترجمے تک تو قبول کر لیا تھا لیکن اس سے آگے بڑھ کر ان کے فردوسی دکن کے منصب تک پہونچ جانے کو وہ برداشت نہیں کر سکتے تھے"۔ یہ تو جناب مائل کا خیال تھا لیکن ان کے صاحبزادے جناب ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی صدر شعبہ اردو و دیانت ہندو ڈگری کالج لکھنؤ نے جوش صاحب پر ایک تحقیقی مقالہ تحریر کیا ہے جو "کتاب جوش" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ یہ کتاب بھی فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ کے مالی تعاون سے "نامی پریس لکھنؤ" نے چھاپی ہے اور کراچی میں میرے کرم فرما جناب محسن اعظم ملیح آبادی نے مجھے بغرض مطالعہ عنایت فرمائی ہے۔ اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے جوش صاحب کا ایک خط شامل کیا ہے جو انھوں نے ۲ نومبر ۱۹۲۴ء کو حیدرآباد سے اپنے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں کو لکھا جس میں انھوں نے کہا ہے کہ ان کو منظوم تاریخ دکن لکھنے کے لیے ڈھائی سو روپے دیے جائیں گے۔ وہ خط ملاحظہ فرمائیے۔

"جان برادر! ایمان برادر! سلامت رہو۔ میری کامیابی پر خوش ہونے والے سلامت رہ۔ تجھ سے زیادہ آشفتہ مزاج اور دیوانے جوش کو کون چاہتا ہے اور کون چاہ سکتا ہے۔

تیری ذات میں فرزند کی سی اطاعت اور ماں کی سی محبت ہے۔ تیرا بھائی پانچ سو روپے کا ملازم ہو گیا ہے۔ دو صیغوں میں کام کرے گا۔ ڈھائی سو روپے ماہوار تو دارالترجمے سے ملیں گے اور ڈھائی سو روپے تاریخ دکن کو نظم کا لباس پہنانے کے واسطے مقرر ہوئے ہیں۔ بس اس قدر کافی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس نے خونی عزیزوں کی زہریلی پیشین گوئیوں کو غلط ثابت کر دکھایا۔

شبیر حسن جوش"

(آخر میں ڈاکٹر عصمت نے لکھا ہے کہ راقم الحروف کے پاس یہ خط محفوظ ہے)

اس خط کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے جوش صاحب کا ایک اور خط بھی نقل کیا ہے جس

ہیں۔ "مشیر ادب" کے عہدے پر ترقی حاصل کرنے میں پیش آنے والی دشواریوں کا تذکرہ کیا ہے۔

"جان برادر!

تمہارے دونوں خط آج ملے۔ حالات حاضرہ سے آگاہی ہوئی۔ میری ترقی کی کارروائی کا مختصر حال سنو اور پھر فیصلہ کرو کہ مجھے آنا چاہیے یا نہیں۔

میری درخواست اور ناظم شعبہ تالیف و ترجمہ کی رپورٹ ہوم آفس پہونچی، جس سے معلوم ہوا کہ اس جگہ کے واسطے دو بیرونی امیدوار بھی ہیں اور ارکان دارالترجمہ میں سے دو صاحبوں کی بابت ناظم نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ اس خدمت کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ میری بھی کسی حد تک سفارش کی ہے۔

ہوم آفس کے افسر اعلیٰ نواب اکبر یار جنگ بہادر نے اس کارروائی پر اپنی رائے لکھی جو سر تا پا میرے موافق ہے اور ایسے دلائل تحریر کیے جس سے تمام دوسرے امیدواروں کے واسطے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ رائے لکھ کر نواب صاحب موصوف نے اس کارروائی کو تمام اراکین کونسل کے پاس گشت کرایا اور آٹھ ممبروں میں سے چھ آدمیوں نے میری ہی رائے میں رائے دی۔ اب رہے دو ممبر۔ حیدری اور مسعود۔ یہ حضرات رخنہ ڈالنا چاہتے ہیں۔ ابھی ان کی رائیں موصول نہیں ہوئی ہیں۔ غالباً اس ہفتے کے اندر آ جائیں گی۔ اس وقت معلوم ہو گا کہ ان حضرات نے کون سا رخنہ ڈالا ہے اور کون سی چال چلی گئی ہے۔

اب اس موقع پر اگر میں وطن آتا ہوں تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ رخنہ انداز کامیاب ہو جائیں گے اور ہر چند کہ ممبروں میں سے چھ ممبروں کے ووٹ میری تائید میں ہیں لیکن اس قوت کے باوجود میری غیر حاضری اس معاملے کو خراب کر دے گی۔

حالات مندرجہ بالا پر غور کرو اور بتاؤ کہ اس وقت میرا یہاں موجود رہنا ضروری ہے یا نہیں؟

تمہارا جوش

۱۲ اگست ۱۹۲۶ء

دارالترجمہ، حیدرآباد دکن

نوٹ:

(یہ خط بھی جوش صاحب نے اپنے بھائی رئیس احمد خاں کو تحریر فرمایا تھا اور میرے پاس ہے۔ عصمت ملیح آبادی)

خیر "مشیر ادب" کے عہدے پر تو جوش صاحب کو ترقی مل گئی مگر تحقیق طلب سوال یہ ہے کہ دکن کی منظوم تاریخ لکھنے کی جو ذمہ داری جوش صاحب نے قبول کی تھی، اس کا کیا ہوا؟ کیونکہ "شوکت عثمانی" میں جو نمونہ کلام ملتا ہے اس کے علاوہ جوش صاحب نے تاریخ دکن پر کیا کام کیا؟ اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ شاید جوش صاحب پر تحقیق کرنے والے مستقبل میں اس کا جواب دے سکیں۔ لیکن سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اتنے اہم واقعہ کا ذکر جوش صاحب نے اپنی سوانح "یادوں کی برات" میں نہیں کیا یا ذکر کرنا بھول گئے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ "شوکت عثمانی" کے متعلق ڈاکٹر عصمت ملیح آبادی لکھتے ہیں کہ "وہ درخواست آج بھی ملیح آباد میں میرے ایک عزیز کے پاس محفوظ ہے"۔

مجھے احساس ہے کہ جوش صاحب کی حصول ملازمت کا ذکر "شوکت عثمانی" کے تعلق سے ذرا طویل ہو گیا ہے مگر چونکہ یہ ایک ایسی دستاویز ہے جس کا علم عام طور پر پاکستان کے علمی حلقوں میں نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے مناسب جانا کہ اس پر ذرا تفصیلی گفتگو ہو جائے۔

حیدر آباد دکن میں جوش صاحب کے دس برس بہت عیش و آرام سے گزرے۔ اس کے علاوہ وہاں کے علما کی صحبت سے انھوں نے جو فیض حاصل کیا، اس کا اعتراف کرتے ہوئے وہ "یادوں کی برات" میں لکھتے ہیں "میری یہ بڑی نمک حرامی ہوگی کہ اگر میں اس امر کا اعتراف نہ کروں کہ شعبہ دارالترجمہ کی وابستگی نے مجھ کو بے حد علمی فائدہ پہنچایا اور خصوصیت کے ساتھ علامہ عمادی، علامہ طباطبائی اور میرزا محمد ہادی رسوا کے فیضان صحبت نے مجھ بے سواد آدمی کو میرے جہل پر مطلع کر کے مجھ کو ذوق مطالعہ پر مامور کر دیا اور صحت الفاظ و نجابت لہجہ کا جو پودا میرے باپ اور میری دادی نے میرے وجود کی سرزمین پر لگایا تھا اگر طباطبائی، میرزا محمد ہادی اور عمادی کی مسلسل دس برس کی ہم نشینی کا مجھ کو موقع نہ ملتا تو وہ پودا کبھی شاداب اور بار آور نہ ہوتا۔ میرزا محمد ہادی صاحب میرے پڑوسی تھے۔ میں دکن آ کر پھر

ان سے پڑھنے لگا اور اس بار فارسی کے ساتھ ان سے انگریزی ادب اور فلسفہ کا بھی باقاعدہ درس لینا شروع کر دیا"۔ یہ تو تھا وہ علمی فائدہ جو جوش صاحب کو حیدر آباد کے قیام کے دوران میں حاصل ہوا۔ اب وہاں کی معاشرتی زندگی کا حال بھی خود جوش صاحب ہی کی زبانی سنیئے۔

"ہائے کیوں کر بیان کروں کہ اس وقت میرا حیدر آباد کیا چیز تھا۔ ارزانی اور اس پر دولت کی فراوانی۔ ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔ امرا کے دروازوں پر صبح و شام نوبت بجا کرتی تھی۔ آئے دن جلسے، مجرے، دعوتیں اور مشاعرے ہوتے تھے۔ متوسطین تک غرق نشاط رہا کرتے تھے۔ وہاں کا علمی و ادبی ماحول، موسمی اعتدال، مجلسی ابھار اور تہذیبی نکھار۔ ہائے کن کن باتوں کا ذکر کروں"۔

غرض اس علمی اور رومانی فضا میں جوش صاحب نے حیدر آباد دکن میں دس برس گزارے مگر کچھ اپنی افتاد طبع کے باعث اور کچھ درباری سازشوں کے نتیجے میں نظام کے مورد عتاب ہوئے اور حیدر آباد کو خیرباد کہنا پڑا۔ مگر وہاں سے نکلنے کے برسوں بعد بھی وہ خاک دکن کو یاد کر کے کہتے ہیں۔

شاید پلٹ آئے زندگانی میری	پھر گونج اٹھے ترانہ خوانی میری
میں خاک دکن نچوڑ کر تو دیکھوں	ممکن ہے ٹپک پڑے جوانی میری

حیدر آباد سے رخصت ہو کر مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے دلی پہنچے۔ یہ ۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔ دلی میں مسز سروجنی نائیڈو کے مشورے اور مالی اعانت سے ایک رسالہ "کلیم" نکالنا شروع کیا مگر اس میدان میں ناتجربہ کاری کی وجہ سے کلیم کو ترقی پسند ادب کے پرچے "نیا ادب" میں ضم کر کے اپنے وطن ملیح آباد آ گئے۔ وہاں اپنی تمیں بیگھ زمین اور ایک آموں کے باغ کی دیکھ بھال میں مشغول ہو گئے۔ اسی دوران میں جوش صاحب نے اپنی وہ مشہور نظم "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" لکھی، جس کو علی سردار جعفری صاحب نے "نیا ادب" میں شائع کر دیا۔ اس پر انگریزی حکومت نے اس نظم کی اشاعت پر پابندی لگا دی اور جوش صاحب کے گھر کی تلاشی بھی لی، جس پر جوش صاحب نے ایک اور نظم کہی جو "تلاشی" کے عنوان سے مشہور ہوئی۔ اس طرح جوش صاحب تمام ہندوستان میں انگریز دشمن اور آزادی کے ہیرو کی حیثیت سے مشہور ہو گئے۔ ۱۹۴۳ء میں کسی مشاعرے کے سلسلے میں

بمبئی گئے۔ وہاں سجاد ظہیر عرف بنّے بھائی کے کہنے پر ڈبلیو زیڈ احمد نے جوش صاحب کو فلمی صنعت سے وابستہ کر لیا اور وہ فلموں کے لیے گیت لکھنے پر گیارہ سو روپے ماہوار پر مامور ہو گئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب ڈبلیو زیڈ احمد پاکستان آ گئے تو جوش صاحب مولانا ابوالکلام آزاد اور جواہر لال نہرو کی سفارش پر رسالہ "آج کل" کے مدیر بن کر دہلی منتقل ہو گئے اور ان کو حکومت ہند کی سفارش پر صدر جمہوریہ ہند کی طرف سے "پدم بھوشن" کے اعلیٰ اعزاز سے نوازا گیا۔

۱۹۵۵ء میں کسی مشاعرے میں شرکت کے لیے پاکستان آئے۔ اس زمانے میں ان کے دوست ابو طالب نقوی جو اے۔ ٹی۔ نقوی کے نام سے مشہور تھے، کراچی کے چیف کمشنر تھے۔ انھوں نے جوش صاحب کو پاکستان کی شہریت قبول کرنے پر راضی کر لیا اور وہ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کے مستقل شہری بن گئے۔

اس وقت تک ہندوستان اور پاکستان میں جوش صاحب کی بہت سی انقلابی اور رومانوی نظمیں مشہور ہو چکی تھیں اور ان کے حسب ذیل مجموعے شائع ہو چکے تھے۔

۱۔ روح ادب۔ ۱۹۲۱ء لکھنؤ سے شائع ہوئی۔ نظم

۲۔ مقالات زریں۔ ۱۹۲۱ء لکھنؤ۔ نثری مجموعہ

۳۔ اوراق سحر۔ ۱۹۲۱ء لکھنؤ۔ نظم اور نثر، صبح کے متعلق

۴۔ اشارات۔ ۱۹۲۲ء دہلی۔ کلیم میں شائع ہونے والے مضامین کا مجموعہ

۵۔ نقش و نگار۔ ۱۹۳۶ء دہلی

۶۔ شاعر کی راتیں۔ ۱۹۳۳ء دہلی

۷۔ شعلہ و شبنم ۱۹۳۶ء

۸۔ فکر و نشاط۔ ۱۹۳۷ء جامعہ ملیہ دہلی

۹۔ جنون و حکمت۔ ۱۹۳۷ء دریا گنج دہلی، کلیم بک بورڈ

۱۰۔ حرف و حکایت۔ ۱۹۳۸ء دہلی

۱۱۔ آیات و نغمات۔ ۱۹۴۱ء لاہور

۱۲۔ عرش و فرش۔ ۱۹۴۴ء تاج آفس بمبئی

۱۳۔ رامش و رنگ۔ ۱۹۴۵ء بمبئی

۱۴۔ سنبل و سلاسل۔ ۱۹۴۳ء بمبئی

۱۵۔ سیف و سبو۔ ۱۹۴۷ء لاہور اور بمبئی سے ایک ساتھ شائع ہوئی

۱۶۔ سرود و خروش۔ ۱۹۵۳ء دہلی

۱۷۔ سموم و صبا۔ دہلی

غرض جوش صاحب جب اپنے اس ادبی سرمائے اور شہرت کے ساتھ پاکستان تشریف لائے تو یہاں کے حکومتی اور ادبی حلقوں میں ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا، اس کی تفصیل جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں بیان فرما دی ہے۔ جس کو دہرانے کا یہ موقع نہیں ہے۔

ہماری کتاب جہاں سے شروع ہوتی ہے وہ ۱۹۶۹ء کا وہ زمانہ ہے جب میں جوش صاحب کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوا اور اس کا اختتام اس وقت ہوا جب فروری ۱۹۸۲ء میں جوش صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

یہ کتاب میری ان یادداشتوں پر مشتمل ہے جو میری ڈائریوں میں درج ہیں۔ میں نے جوش صاحب کی زندگی کے آخری عشرے کے واقعات اور ان کی فکر کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی دیانت داری سے اپنی فہم کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں، میں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں، اس کا فیصلہ قارئین فرمائیں گے۔

خورشید علی خاں
بی۔ ۸۷ بلاک اے، شمالی ناظم آباد
کراچی



اربابِ ثلاثہ

خورشید علی خاں ـ حضرت جوش ملیح آبادی ـ اختر حسن

حرفِ آغاز

شبیر حسن خاں جوشؔ ملیح آبادی اردو ادب کے ان منتخب روزگار مشاہیر میں سے ہیں جنھوں نے فکر و دانش کے خزانوں سے اردو شاعری کو مالا مال کیا ہے۔ جوشؔ صاحب انتہائی قادرالکلام مفکر شاعر تھے۔ حیات انسانی کا کوئی پہلو، ذہن انسانی میں آنے والا کوئی خیال، آنکھوں کو دکھائی دینے والا کوئی منظر ایسا نہیں ہے جس کو جوش صاحب نے شعر کے سانچے میں نہ ڈھالا ہو۔ فکری اعتبار سے جوش صاحب حریت فکر کے علم بردار تھے اور ان کی شاعری کا مقصد ذہن انسانی کو ہر قسم کی ذہنی غلامی سے آزاد کروانا تھا کیونکہ یہ غلامی خواہ کسی نوعیت کی کیوں نہ ہو وہ خلافت الہٰی کے اس عظیم منصب کے منافی ہے جس پر آدم کو فائز فرمایا گیا ہے۔ اس لیے جوش صاحب ہر اس قدر کے مخالف تھے جو نسل انسانی کو اس کے شایان شان مقام حاصل کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنے۔ اس لیے ہم جوش کو شاعر انقلاب سمجھتے ہیں۔

جوشؔ صاحب کو یقین تھا کہ ہم تحقیق، تجسس اور علم کے ذریعے سے قوائے کائنات کو مسخر کر کے نہ صرف حیات ابدی حاصل کر سکتے ہیں بلکہ حسن اور شباب کو بھی دوام عطا کر سکتے ہیں۔ اس لیے جوشؔ شاعر شباب بھی ہیں اور شاعر حسن و محبت بھی۔ جوش صاحب نے ترقی پسند ذہن کی تخلیق میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ انھوں نے بیرونی استعماری طاقتوں اور ان کی آلہ کار اندرون ملک رجعت پرست قوتوں کے خلاف جو محاذ بنایا اس نے نوجوان نسل کے ذہنوں میں انقلاب برپا کر دیا۔

جوش صاحب سے تعارف :

جوشس صاحب سے میری باقاعدہ ملاقات ۱۹۶۹ء کے آخری مہینوں میں ہوئی۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں اور میرا چھوٹا بھائی نعمت اللہ خاں جو کراچی پولیس میں ڈی ایس پی کے عہدے پر فائز تھے، بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے کہ آج ہمارے دور میں فکری اعتبار سے دنیا کے بڑے بڑے آدمی کون کون ہیں۔ نعمت اللہ خاں کہنے لگے یورپ میں تو کئی لوگ ہیں جیسے برٹرینڈ رسل، جارج برنارڈ شا، آئین سٹائین یا چین میں ماؤزے تنگ وغیرہ۔ مگر خود ہمارے ملک میں حضرت جوشس ملیح آبادی ہیں جو عقل و دانشس میں کسی سے بھی کم نہیں اور خوش قسمتی سے وہ خود ہمارے شہر کراچی میں مقیم بھی ہیں اور ان سے سرسری سی کچھ تعارف بھی ہے۔ لہٰذا ہم دونوں بھائیوں نے یہ طے کیا کہ جوش صاحب سے تعلقات بڑھانے چاہییں کیونکہ

جوش قرنوں کے اندھیروں سے اماں پانے کو
قرب یک لمحۂ صاحب نظراں کافی ہے

چنانچہ ایک دن میں صبح آٹھ بجے ان کے گھر واقع ڈی۔ ۱۳۸ فیڈرل بی ایریا کراچی ۱۰ اپنی گاڑی میں پہنچ گیا۔ جوشس صاحب اس وقت محسن صاحب اعظم گوہی کے ہمراہ کہیں باہر جا رہے تھے اور ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔ میں فوراً ان کے قریب گیا اور اپنا تعارف کروایا۔ "میرا نام خورشید علی خاں ہے۔ میں آپ کے قریب ہی شمالی ناظم آباد میں رہتا ہوں۔ آپ کی شاعری اور فکر کا مداح ہوں اور اس وقت آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا مگر چونکہ آپ کہیں باہر تشریف لے جا رہے ہیں اس لیے پھر کسی وقت حاضری دوں گا"۔ یہ سنتے ہی جوش صاحب فوراً ٹیکسی سے اتر گئے۔ ٹیکسی والے کو کچھ دے دلا کر رخصت کیا اور مجھ سے فرمایا کہ "ہم لوگ اس وقت بابا ذہین شاہ تاجی سے ملنے لیاقت نیشنل ہسپتال جا رہے تھے، وہاں ان کا بیٹا علیل ہے مگر کوئی بات نہیں وہاں پھر کسی اور وقت چلے جائیں گے اور یہ کہہ کر مجھے اپنے گھر کے اندر لے جانے لگے۔ میں نے کہا آپ اپنا جانا ملتوی نہ فرمائیں بلکہ میری گاڑی میں تشریف رکھیں۔ میں آپ کو لیاقت نیشنل ہسپتال لیے چلتا ہوں۔ جوش صاحب کہنے لگے ارے آپ کیوں زحمت کرتے ہیں مگر میرے اصرار پر وہ دونوں میری گاڑی میں بیٹھ گئے اور ہم لوگ

ہسپتال روانہ ہو گئے ... جہاں بابا ذہین شاہ تاجی کے صاحبزادے کینسر کے علاج کے لیے داخل تھے۔ اسی دن بابا صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ عجیب پرکشش شخصیت تھی۔ بڑی سفید داڑھی، گورا اور پرنور چہرہ۔ سفید براق لباس، دراز قد، چوڑا چکلا جسم، صبر و استقامت کا پیکر ... بیٹا مرض الموت میں گرفتار مگر باپ ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی .... ہسپتال میں جوش صاحب مختلف ڈاکٹروں سے ملتے اور بابا صاحب کے صاحبزادے کے متعلق دریافت کرتے رہے۔ دو، ڈھائی بجے جب بابا صاحب دوا خانے سے رخصت ہوئے تو ہم لوگ بھی وہاں سے روانہ ہوئے۔ پہلے محسن اعظم گوحی کو ان کے گھر پہونچایا پھر جوش صاحب کے گھر آئے۔ راستے میں جوش صاحب سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی۔ میں نے ترقی پسند تحریک اور حریت فکر پر خود جوش صاحب کے بہت سے اشعار اور رباعیات سنائیں۔ سن کر بہت متاثر بھی ہوئے اور خوش بھی۔ اس مدت میں وہ مجھ سے اتنے بے تکلف ہو چکے تھے کہ انھوں نے مجھے اصرار سے شام کو دوبارہ اپنے گھر آنے کا وعدہ لے کر رخصت کیا۔ کہنے لگے کہ آپ سے مل کر بے حد مسرت ہوئی اب شام کو مزید باتیں ہوں گی۔ وہ وقت ہمارے طلوع ہونے کا ہوتا ہے۔ دیکھیے ٹال نہ جایئے گا۔ میں منتظر رہوں گا۔

مے خانۂ جوش:

میں جوشش صاحب سے رخصت ہو کر سیدھا نعمت اللہ خاں کے گھر گیا اور ان کو اس دن کی تمام روئیداد سنائی تو انھیں بے حد حیرت انگیز خوشی ہوئی۔ میں نے کہا کہ آج ہی شام کو جب میں جوشش صاحب کے گھر جاؤں گا تو تم کو ساتھ لے لوں گا تم تیار رہنا۔ چنانچہ شام کو میں اور میرا بھائی دونوں غروب آفتاب سے کوئی نصف گھنٹہ پہلے جوشش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی اٹھ کر گلے لگا لیا اور ہم دونوں بھائیوں کو بہت محبت سے اپنے قریب تخت پر بٹھا لیا۔ ہم نے دیکھا کہ مے خانہ سجا ہوا ہے۔ بلی مارکہ اگربتیوں کی خوشبو فضا میں مہک رہی ہے۔ ایک چنگیری میں چنبیلی کے پھول بھرے ہوئے ہیں۔ سامنے اسٹول پر ایک گھڑی رکھی ہوئی ہے جس پر ایک بلی کی تصویر ہے اور سکنڈ کی سوئی کے بجائے بلی کی آنکھیں ادھر ادھر گھوم رہی ہیں۔ اسی کے ساتھ تین کانچ

کے صاف ستھرے گلاس اور ان کے بیچ میں مینائے سے بجی ہوئی ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب، اس وقت آپ کی گھڑی دیکھ کر مجھے غالب کا ایک شعر یاد آ رہا ہے مگر تھوڑے سے تصرف کے ساتھ، اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔

جوش صاحب نے مسکرا کر فرمایا۔ ضرور ضرور۔

میں نے کہا:

ذرہ ذرہ ساغرِ مے خانۂ لبریز ہے
گردشِ ساغر بہ چشمکہائے گربہ آشنا

جوش صاحب سن کر ہنسنے لگے ..... فرمایا بہت خوب بہت خوب۔ آپ نے مجنوں کو ساغر سے لیلیٰ کو گربہ سے بدل کر ہمارے میخانے کی بہت دلچسپ اور مبنی بر حقیقت تصویر کھینچ دی ہے۔ بھئی بہت خوب۔

پھر میں نے اپنے بھائی کا تعارف کروایا۔ " جوش صاحب! یہ میرے بھائی ہیں نعمت اللہ خاں یہ بھی آپ کے چاہنے والوں میں ہیں۔ جامعہ عثمانیہ سے بی۔ اے ال ال بی کیا، اب یہاں کراچی میں پولیس کے محکمے میں ڈی ایس پی ہیں ..... جوش صاحب نے فرمایا۔ بہت خوب بہت خوب مگر یہ بتایئے کہ Is he a gentleman میں نے ان کے اس جملے کا مفہوم مجھے بغیر کہا کہ یہ پولیس کے محکمے سے متعلق ہونے کے باوجود بہت شریف آدمی ہیں۔

جوش صاحب نے فوراً کہا۔ نہیں نہیں، آپ میرا مطلب نہیں سمجھے۔ ہماری اصطلاح میں Gentleman کے معنی ہیں کہ یہ جام و سبو سے بھی شغل فرماتے ہیں یا نہیں۔ پھر خود ہی کہنے لگے کہ یہ اصطلاح پنڈت جواہر لعل نہرو استعمال کیا کرتے تھے۔ میں نے کہا، بد قسمتی سے اس معاملے میں ہم دونوں بھائی Gentlemen نہیں ہیں۔

جوش صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ارے تو کیا آپ بھی؟ اور کسٹم کے جیسے محکمے سے تعلق رکھنے کے باوجود۔ میں نے کہا۔ جی ہاں میں بھی ..... اور اسی وقت میز سے دو گلاس ہٹا دیئے گئے۔ اتنے میں آفتاب غروب ہو گیا تو جوش صاحب نے یہ رباعی پڑھی۔

دل کی جانب رجوع ہوتا ہوں میں
سر تا بقدم خضوع ہوتا ہوں میں
جب مہر میں غروب ہو جاتا ہے
پیمانہ بکف طلوع ہوتا ہوں میں

اس کے بعد جوش صاحب نے پیمانہ بھرا۔ گھڑی دیکھی اور جام اٹھا کر کہا "بیادِ فلاں بنت فلاں" اور ایک گھونٹ بھر کر گلاس میز پر رکھ دیا۔ جوش صاحب نے وہ ایک گلاس پچیس (۲۵) منٹ میں ختم کیا اور اس طرح کوئی ڈیڑھ گھنٹے میں چار جرعوں کے بعد شغل سے نوش اختتام پذیر ہوا ...اس دن چونکہ ہماری ملاقات کا پہلا دن تھا اس لیے زیادہ تر تعارفی باتیں ہی ہوتی رہیں۔ پھر ہماری فرمائش پر انھوں نے اپنا کلام سنایا، جن میں چند رباعیات یہ تھیں:

اس وقت سبک بات نہیں ہو سکتی ... توہینِ خرابات نہیں ہو سکتی
مجرے کے لیے آئے ہیں جبریل امیں ... کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

اک وعظ کی محفل سے پلٹ کر سرِ شام ... میں نے جو تجگ کے ساتھ اٹھایا کل جام
تیوری کے مشیت نے کہا اے مرے لال ... پی مردِ حلال پہ نہیں ہے یہ حرام

غنچے تری زندگی پہ دل ہلتا ہے ... بس ایک تبسم کے لیے کھلتا ہے
غنچے نے کہا کہ اس چمن میں بابا ... یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے

قطعہ

سنو اے ساکنانِ خاکِ پستی ... صدا کیا آ رہی ہے آسماں سے
کہ آزادی کا اک لمحہ ہے بہتر ... غلامی کی حیاتِ جاوداں سے

رباعی

ہر گام پہ ہے جنگ و جدل کی وادی ... ہر موڑ پہ ہے امن و اماں فریادی
آپ اور یہ عہدِ جہل و عصرِ وحشت ... افسوس ہے اے جوش ملیح آبادی

انگشت بہ دنداں ہے مری عمرِ دراز ... انجام کے چہرے پہ ہے رنگِ آغاز
رگ رگ میں گرج رہا ہے یوں ابرِ بہار ... رم جھم رم جھم کی آ رہی ہے آواز

غرض کوئی دو ڈھائی گھنٹے تک یہ دلچسپ محفل جاری رہی۔ جب جوش صاحب نے تیسرا پیگ ختم کر کے چوتھا شروع کیا تو ام الشعرا بیگم جوش تشریف لائیں اور تخت پر بیٹھ کر دریافت کیا۔

اے میاں کو تھا؟ جوش صاحب نے اسی لہجہ میں جواب دیا۔ اے بی بی چوتھا ۔۔۔ اس کے ساتھ ہی کہا، کھانا لاؤ۔ جوش صاحب نے چوتھا پیگ کھانے کے ساتھ ہی ختم کیا ۔۔۔ کھانے میں سیخ کباب، گوشت کا شوربا اور روٹی تھی۔ ہم سے کہنے لگے کہ آؤ، آپ لوگ بھی شریک ہو جاؤ مگر ہم بھائیوں نے معافی مانگ لی اور اجازت چاہی۔ جوش صاحب کہنے لگے اب دوبارہ آپ کے دیدار کب ہوں گے؟ ہم نے کہا، جب حکم ہو۔ کہنے لگے کل ضرور آیئے گا اور یہ کہہ کر بہت گرم جوشی سے ہاتھ ملا کر رخصت کیا۔

ہم دونوں بھائی جب گھر لوٹ رہے تھے تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ آج ہم اپنی محبوب ترین شخصیت سے مل کر آ رہے تھے۔

میں نے نعمت سے کہا .....

بہت جی خوش ہوا اے ہم نشیں اب جوش سے مل کر
ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

نعمت نے جوش صاحب کے والد کا شعر پڑھا ....

آج ہم ان کو دیکھ آئے بشیر　　　واقعی دیکھنے کی صورت ہے

اس کے بعد ہم دونوں بھائی بھی جوش صاحب کی محفلوں میں شریک ہونے لگے اور دوستی ایسے بڑھی کہ

خم دست نوازش بن گیا ہے طوق گردن کا

جوش صاحب کا حلقۂ احباب:

کراچی میں جوش صاحب کا حلقہ احباب بہت وسیع تھا ۔۔۔ زیادہ تر دوست ان کی شام کی محفل میں شریک ہوتے تھے مگر میرے سامنے جو اصحاب زیادہ تر جوش صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور جن کے نام اس وقت مجھے یاد ہیں ان میں راغب مراد آبادی، سرور بارہ بنکوی، فراست رضوی، سرور اقبال، حافظ مراد آبادی، سلامت علی خاں، ڈاکٹر عالیہ امام، مرزا عالمگیر قدر، منور عباس ایڈوکیٹ، ڈاکٹر یاور عباس، پروفیسر منظور حسین شور علیگ، ریاض مصطفےٰ اور ان کے بھائی فیاض مصطفےٰ تھے۔ ہماری محفلوں میں اکثر ایک نوجوان شاعر اور محقق ہلال نقوی بھی شریک ہوتے تھے جو

حضرت جوش ملیح آبادی احباب کے ساتھ

(بائیں سے) ناصر احمد خان ملیح آبادی، رئیس امروہوی، راغب مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، ساحل بلگرامی، شہزادہ غلام بیگ نیرنگ کے بھانجے اور رعنا ظفر

(دائیں طرف سے) راغب مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، میر علی احمد تالپور (وزیر دفاع)
یوسف جمال (سیکریٹری انفارمیشن، سندھ)



(دائیں طرف سے) راغب مرادآبادی، جوش ملیح آبادی، ابراہیم، میر علی احمد خان تالپور (وزیر دفاع) اور صادقین

کرسیوں پر (دائیں سے) جوش ملیح آبادی، شہزادہ مرزا عالمگیر قدر، ناصر احمد خان
استادہ راغب مراد آبادی، سید ظفر اقبال، رعنا ظفر



(دائیں طرف سے) راغب مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، میر علی احمد خان تالپور (سابق وزیر دفاع)
یوسف جمال (سابق سیکرٹری اطلاعات سندھ) اور صادقین (مشہور مصور)

جوش صاحب کے مراثی پر تحقیق کر رہے تھے اور جوش صاحب سے بہت عقیدت رکھتے تھے۔
ایک اور صاحب نسیم احمد بھی تھے جو بہت اچھے شاعر اور ترقی پسند خیالات رکھتے تھے۔
اور راغب صاحب کے محکمہ لیبر ولفیر میں ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز تھے۔ جوش صاحب
ان کے خیالات کو پسند کرتے تھے۔
ان کے علاوہ روشن علی بھیم جی، آغا حسن عابدی، میر علی احمد تالپور، میر رسول بخش تالپور،
مشتاق احمد یوسفی، بابا ذہین شاہ تاجی، جوش صاحب کے کرم فرماؤں اور عقیدت مندوں میں
سے تھے اور صبح ناشتے کے بعد اکثر جوش صاحب ان حضرات سے ملنے کے لیے ان کے مکان یا
دفتر جایا کرتے تھے۔ اکثر میں اور نعمت ان کے ساتھ ہوتے۔
ان دنوں میں بابا ذہین شاہ صاحب تاجی کا مکان پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس میں تھا اور
جوش صاحب زیادہ تر صبح کو ان ہی کے گھر جایا کرتے تھے۔ بابا صاحب کے گھر کے قریب ہی
فضل احمد کریم فضلی صاحب کا مکان "بیت الغزل" تھا اور جوش صاحب کبھی کبھی بابا صاحب
کے گھر سے فضلی صاحب کے گھر بھی چلے جاتے اور وہاں بہت پر لطف شعر و شاعری کی محفل جمتی۔

جوش صاحب کا خاندان:

جوش صاحب کے دو بچے ہیں۔ بیٹی سعیدہ خاتون اور بیٹا سجاد حیدر۔ سعیدہ خاتون صاحبہ
کی شادی التفات احمد صاحب سے دہلی میں ہو گئی تھی جو شاعر بھی تھے اور شہاب تخلص
کرتے تھے اور بیٹے سجاد حیدر صاحب ہیں ان کی شادی بمبئی میں انور خانم صاحبہ سے ہوئی تھی۔
سعیدہ خاتون مع اپنے بچوں کے جوش صاحب کے ساتھ ان کے گنبد والے مکان ۱۳۸ ڈی
فیڈرل بی ایریا میں رہتی تھیں۔ ان کے قبضے میں مکان کا نچلا حصہ تھا۔ جوش صاحب اور ان کی
بیگم اشرف جہاں بالائی منزل میں رہتے تھے۔
سعیدہ بہن کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اور ان کے سات بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں ....
جوش صاحب کی یہ عادت تھی کہ وہ اپنے عزیزوں کو عام طور پر ان کے اصلی نام سے پکارنے کے
بجائے خود اپنی عطا کردہ عرفیت سے مخاطب ہوتے تھے .... ان کے نواسہ نواسیوں کے نام مع
ان کی عرفیت کے حسب ذیل ہیں۔

۱۔ انور سعید خاں عرف میاں ۲۔ حیدر مسعود خاں عرف بنے
۳۔ پرویز شباب خاں عرف پپی یہ اسلام آباد میں جوش صاحب کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی ہر طرح خدمت کرتے تھے۔ ۴۔ صبوحی خاتون عرف بوئی۔ ان کے شوہر ناصر صاحب تھے۔ اچھا شعر کہتے تھے مگر افسوس جوانی میں انتقال ہوگیا۔ ۵۔ غزالہ خاتون عرف غزیا
۶۔ خسرو شباب خاں عرف بلو۔ یہ نانی کے بہت لاڈلے تھے اور بقول جوش صاحب نانی کے لاڈ نے انہیں بگاڑ دیا تھا۔ ۷۔ علی معظم خاں عرف علی کبھی کبھی ان کو مسکین شاہ بھی کہہ دیتے تھے۔
۸۔ فرخ جمال عرف قلندر ۹۔ سراج انور خاں عرف کپی

جوش صاحب کے صاحبزادے سجاد حیدر خاں لکھنو میں ۲۶ جون ۱۹۱۹ء کو پیدا ہوئے۔ شاعری ورثہ میں ملی تھی اور جوش کی مناسبت سے خروش تخلص کرتے تھے۔ اور بقول جوش صاحب اکثر آبدار شعر کہتے تھے۔ مگر خود خروش صاحب کا خیال تھا کہ جوش صاحب جیسے گھنیرے درخت کے سائے میں ان کی شاعرانہ بلند پروازی کو وہ قبولیت عام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ بجا طور پر مستحق تھے۔ موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ لکھنو کی بھاٹ کھنڈے یونیورسٹی سے موسیقی کی تعلیم حاصل کی اور شاندار کامیابی پر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ بمبئی کے قیام کے دوران سجاد صاحب نے محمد فقیہہ صاحب بیرسٹر اور نائب وزیر جوناگڑھ کی صاحبزادی انور خانم سے شادی کرلی تھی۔ شاعری اور موسیقی کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری بھی کرتے تھے۔ بمبئی میں فلمی صنعت سے بہ حیثیت موسیقار وابستہ رہے۔ پاکستان میں سجاد صاحب جوش صاحب کی سمنٹ کی ایجنسی کو چلاتے تھے لیکن ۱۹۶۷ء میں جب ایوب خاں صاحب صدر پاکستان نے یہ ایجنسی بند کردی تو سجاد صاحب نے ایک چھوٹی موٹی ورکشاپ قائم کرلی مگر چونکہ بہترین ستار نواز بھی تھے اور اس فن میں استاد کا درجہ رکھتے تھے اس لئے ریڈیو پاکستان والے ان کی خدمات سے استفادہ کیا کرتے تھے میں جس زمانے میں جوش صاحب کے "حلقہ ارادت" میں داخل ہوا ان دنوں میں سجاد صاحب ناظم آباد کے محلے اورنگ آباد کے مکان نمبر ۲/۲۱۷ میں رہتے تھے۔ میں نے جوش صاحب کو سجاد صاحب کی طرف سے فکر مند پایا۔ بات یہ تھی کہ ان کو بھی بنت العنب کا چسکا پڑ چکا تھا۔

ایک دن میں اور جوش صاحب سجاد صاحب کو دیکھنے ان کے مکان گئے وہ بیمار تھے اور پلنگ پر

لیٹے ہوئے تھے۔ مکان بہت چھوٹا تھا اور آنگن کی دیوار کا ایک حصہ گر گیا تھا اس ماحول میں میرے چہرے پر پریشانی کے آثار دیکھ کر سجاد صاحب نے اپنا ایک شعر پڑھا

ویرانیٔ دل دیکھ کے تم چیخ اٹھو گے
کیا دیکھ رہے ہو مرے اجڑے ہوئے گھر کو

جوش صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ انھوں نے سجاد صاحب کو کچھ رقم دی اور ہم لوگ تھوڑی دیر بیٹھ کر واپس آگئے۔ میں نے محسوس کیا کہ جوش صاحب ہمیشہ اپنی اولاد اور ان کے متعلقین کی طرف سے فکر مند رہتے تھے۔ وہ اتنے بڑے شاعر۔ مفکر اور دانشور تھے کہ برصغیر تو کیا تمام انسانیت ان پر ہمیشہ فخر کرے گی۔ وہ فکر انسانی کے ارتقا میں صدیوں تک نشانِ منزل بنے رہیں گے مگر اتنا عظیم انسان اپنے متعلقین کی معاش کی فکر میں اہل ثروت اور اہل اقتدار کی نگاہ التفات کا طالب رہتا تھا۔ ذرا ان کے اس کرب کو ملاحظہ فرمائیے۔

آفاق پہ خندہ زن ہے جس کا ایوان   جس کے آگے نظام شمسی حیران
بچو شاہد رہو کہ میں نے تم پر   اس عزت نفس کو کیا ہے قربان

جب جوش صاحب اسلام آباد میں منتقل ہو گئے تو انھوں نے سجاد صاحب اور ان کے بیوی بچوں کو اپنے پاس بلوالیا۔ اسلام آباد میں سجاد صاحب پاکستان کونسل آف آرٹس میں ملازم ہو گئے اور آخر تک اس ادارے سے وابستہ رہے۔۔۔ جوش صاحب کے انتقال کے بعد سجاد صاحب بارہ برس تک زندہ رہے مگر افسوس کہ جوش صاحب کے کلام اور ان کی تخلیقات کی اشاعت کی طرف کوئی توجہ نہ دے سکے۔

سجاد صاحب کی حسب ذیل اولادیں ہیں:۔

۱۔ ساجد حیدر خان۔ جوش صاحب ان کو ناٹر کہتے تھے۔ پاپوش نگر میں ان کی ورکشاپ ہے جہاں موٹر سائکلیں ٹھیک کرتے ہیں۔

۲۔ ناز خاتون۔ ان کو جوش صاحب ای کہتے تھے اور یہ جوش صاحب سے اسی طرح محبت اور ان کی خدمت کرتی تھیں جیسی ماں اپنے بچے کی کرتی ہے۔

۳۔ ترنم خاتون۔ عرف تاجدار۔

۴۔ تبسم خاتون ...... عرف چٹکنی ...... جب یہ بچی چھوٹی تھی تو بہت چیخ چیخ کر بات کرتی تھی۔ چونکہ سب بہن بھائیوں میں خوبصورت تھی تو سب لوگ پیار کرتے تھے .... بڑی ہو کر بہت باصلاحیت خاتون نکلیں۔ اسلام آباد میں بہت اچھے گھرانے میں شادی ہوئی اور اب صاحب اولاد ہیں۔ جوش صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت میں کوشاں ہیں۔ اب وہ اسلام آباد کی جوش میموریل کمیٹی کی صدر ہیں اور تبسم اخلاق ملیح آبادی کے نام سے مشہور ہیں .... ان کی کوششوں اور مولانا کوثر نیازی کے ہمہ جہتی تعاون سے جوش صاحب کا ایک غیر مطبوعہ مجموعہ کلام محراب و مضراب چھپ کر آ چکا ہے۔

۵۔ فواد حیدر ...... ان کی کمر پر بالوں کی ایک لکیر ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ چلی گئی ہے اس لیے جوش صاحب نے ان کو دمدار کی عرفیت عطا کی تھی۔ یہ جب چھوٹے سے تھے تو جب ہی سے جوش صاحب کی گاڑی چلانے کی مشق کیا کرتے تھے اور چھوٹی موٹی خرابی تک درست کر لیا کرتے تھے۔

نوٹ: جوش صاحب کے انتقال کے بعد سجاد حیدر خروش چند دن تو اسلام آباد ہی میں رہے مگر پھر کراچی واپس آ کر اپنے قدیم مکان واقع محلہ اورنگ آباد پاپوش نگر ناظم آباد میں مقیم ہو گئے۔ سعیدہ بہن کے انتقال کے بعد سجاد صاحب جوش صاحب کے مکان ۱۳۸ ڈی واقع فیڈرل بی ایریا میں منتقل ہو گئے مگر کچھ ہی دن بعد انھوں نے وہ مکان فروخت کر دیا اور بفرزون میں ایک چھوٹا سا مکان لے کر اسی میں رہنے لگے۔ صحت خراب رہنے لگی اور بالآخر ۸ نومبر ۱۹۹۳ء کو سجاد صاحب کا انتقال ہو گیا۔

اشرف جہاں (بیگم جوش):

کراچی میں جوش صاحب کی شام کی محفلیں بہت دلچسپ ہوتی تھیں۔ سردیوں کے دنوں میں وہ اپنے بالا خانے کے ہال میں بڑے تخت پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتے۔ تخت کے دوسرے سرے پر ایک دوسرے گاؤ تکیے کے سہارے ام الشعرا بیگم جوش بیٹھ جاتیں اور دونوں میاں بیوی میں بہت دلچسپ نوک جھونک ہوتی رہتی۔ جب سورج غروب ہو جاتا اور پیالے کو اذن بادہ کشائی مل جاتا تو ام الشعرا دو گلاسوں میں ایک ایک پیگ شراب

ڈالتیں ایک گلاس اپنے سامنے رہنے دیتیں اور ایک گلاس جوش صاحب کی طرف بڑھا دیتیں۔

ایک دفعہ وہ شراب میں پانی ملانا بھول گئیں اور ویسے ہی جام جوش صاحب کی طرف بڑھا دیا۔ جوش صاحب نے ان سے مخاطب ہو کر یہ شعر پڑھا۔

کشتی مے کو حکم روانی بھی بھیج دو
جب آگ بھیج دی ہے تو پانی بھی بھیج دو

بیگم جوش نے ٹھنڈے پانی کی بوتل سے پہلے تو اپنے گلاس میں پانی انڈیلا پھر وہی بوتل جوش صاحب کی طرف بڑھا دی۔ ایسے وقت میں جوش صاحب کوئی کام اپنے ہاتھ سے کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ بوتل اپنی جگہ رکھی رہی۔ میں نے جب جوش صاحب کے چہرے پر بے چینی کے آثار دیکھے تو فوراً آگے بڑھ کر بوتل اٹھالی اور جوش صاحب کے گلاس میں پانی ڈال دیا۔ جوش صاحب نے عجیب نظروں سے بیگم کی طرف دیکھا اور یہ رباعی پڑھی۔

کب راکھ پہ گرتے ہیں زمانے والے
شعلوں سے ہیں لاکھ لو لگانے والے
بوڑھا ہو کر وفات پاتا ہے جو عشق
ملتے نہیں اس کی لاش اٹھانے والے

بیگم صاحبہ کہنے لگیں۔ اے کیا تم خود کو بہت بڑا آدمی سمجھتے ہو؟ ہرجائی کہیں کے۔ جوش صاحب نے ایک گھونٹ لے کر کہا..... بی بی تمہارا قصور نہیں ہے یہ میاں بیوی کا رشتہ ہی بہت برا ہوتا ہے۔ میں نے آج تک کسی بیوی کو اپنے میاں کی تعریف کرتے نہیں سنا خواہ میاں پیغمبر ہی کیوں نہ ہو..... اسی لیے میں کہتا ہوں کہ یہ شادی کا ادارہ ہی ختم ہو جانا چاہیے۔

بیگم جوش۔ اے توبہ کرو توبہ کیوں کفر بک رہے ہو۔ شادی تو اللہ اور اس کے رسول کا حکم ہے..... تم اس ادارے ہی کو ختم کرنا چاہتے ہو..... کیا حرام کاری کو جائز کرنا چاہتے ہو۔

جوش صاحب۔ ارے بھائی میں نے حرام کاری کی بات کب کی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ عورت اور مرد کے درمیان سب سے مستحکم اور مقدس رشتہ عشق و محبت کا ہوتا ہے۔ جہاں شادی ہوئی وہ ایک دوسرے کی جائیداد بن جاتے ہیں اور وہ لطیف جذباتی رشتہ جسے عشق و

محبت کہتے ہیں، ٹھنڈا پڑنے لگتا ہے۔

بیگم جوش۔ ارے بس رہنے دو میرا منہ نہ کھلواؤ۔ تم نے کب ایک یا دو معاشقوں پر اکتفا کیا ہے۔ تم نے تو اپنی کیفیت خود اپنے منہ سے بیان کی ہے۔

راتیں گزارتے تھے ہم جوش گھر سے باہر
رہتے تھے مہ وشوں کے انفاس سے معطر
اور گھر میں جب پہنچتے تھے ہوتے سراسر
تو پوچھتی تھیں بیگم یہ صبح کو بگڑ کر
کیوں جی، قسم تو کھاؤ کل رات کو کہاں تھے

جوش صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جوان تھے

بیگم جوش۔ اچھا تو اب تم نے عاشقی سے توبہ کر لی ہے؟ اور یہ شعر کس کے ہیں۔

اس سن میں بھی پڑتی ہیں حسینوں پہ نگاہیں
اب بھی ہیں وہی شوق کی اگلی سی کراہیں
اب بھی یہ دعا ہے کہ ملیں پھول سی باہیں
مر جائیں ہم اے جوش بتوں کو جو نہ چاہیں
گھٹی میں پڑی عاشقی و برہمنی ہے

جوش صاحب۔ ارے اس کم بدنی کی بات کر رہی ہو۔ بیگم کاش تم میری جگہ مرد ہوتیں تو تمھیں حسن کی جادو گری کا پتا چلتا۔

با حسنش ایں جنوں کہ تو بینی تحمل است

بیگم جوش۔ اے میاں تم پر تو ہر حسینہ کا جادو اسی طرح سر چڑھ کر بولتا ہے۔ ہرجائی جو ٹھیرے۔ تمھیں اپنا وہ بند یاد ہے۔

چمن کو غرق سوز و ساز کر جاتا ہے جب بھنورا
نیاز عاشقی کو ناز کر جاتا ہے جب بھنورا

خموشی کو لطیف آواز کر جاتا ہے جب بھنورا
کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھنورا
اور اس کے بعد جب تا دیر ٹہنی تھر تھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ذرا سوچو تم کس خوبصورتی اور ڈھٹائی سے اپنی آوارگی کو دلکش انداز میں بیان کر جاتے ہو شاعر اعظم کہلاتے ہو۔

جوش صاحب اس وقت چوتھا پیگ ختم کر چکے تھے۔ کہنے لگے اچھا اب غصہ تھوک دو اور کھانا لاؤ۔

اتنے میں جوش صاحب کی صاحبزادی سعیدہ بیگم آ گئیں۔ انھوں نے اپنی بیٹی کو آواز دی جو جوش صاحب کے لیے کھانا لے آئیں۔ جوش صاحب نے تخت کے ساتھ رکھے ہوئے ایک دیو ہیکل اگالدان میں ہاتھ دھوئے اور کلیاں کر کے کھانا شروع کر دیا تو سب لوگ رخصت ہونے لگے۔ مجھ سے جوش صاحب نے کہا ارے میاں تم تو میرے ساتھ کچھ کھالو مگر میں نے بھی معذرت چاہی اور چلنے لگا تو کہنے لگے اگر کل صبح کوئی کام نہ ہو تو نو (۹) بجے آ جاؤ۔ ذہین شاہ کے وہاں جائیں گے۔ میں نے وعدہ کر لیا اور گھر آ گیا۔

بابا ذہین شاہ تاجی:

دوسرے دن جب میں ۹ بجنے میں پانچ منٹ کم پر جوش صاحب کے گھر پہنچا تو شیروانی پہنے ڈبیا ہاتھ میں لیے تیار بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے واہ واہ تم تو وقت کے انتہائی پابند نکلے ..... معلوم ہے؟ وقت کا پابند ہونا صحیح الدماغی کی علامت ہے۔ میں نے ایک رباعی میں کہا ہے۔

دنیا اسے کاندھا بھی نہ دے گی واللہ
لمحات کے دلدل پہ جو ہو گا نہ سوار

جوش صاحب نے اپنی دو تین بیاضیں ساتھ لیں اور ہم دونوں بابا صاحب کے آستانے پر پہنچ گئے۔ ایسا معلوم ہوا جیسے بابا صاحب ہمارا انتظار ہی کر رہے تھے۔ سفید براق

کپڑے۔ بڑے بڑے پائنچوں کا پاجامہ۔ سفید نورانی داڑھی۔ دانتوں پر پان کی اس قدر گہری سرخی کہ سیاہی میں تبدیل ہو گئی تھی ..... ہم دونوں کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور محبت سے مل کر اپنے قریب ہی شہ نشین پر بٹھا لیا۔ بہت سے مرید وہیں ہال میں فرش پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ لوگ آتے رہے، بابا صاحب کے ہاتھ کو عقیدت سے بوسہ دیتے رہے۔ بعض بعض لوگ خصوصاً عورتیں ان کے پیروں پر سر رکھ کر دعا کی طالب ہوتی رہیں۔ بابا صاحب ہر ایک کی خیریت دریافت کرتے، ان کی پریشانی سنتے اور دعا دیتے۔ اکثر لوگ بوتل میں پانی بھر کر لاتے تھے۔ بابا صاحب نے اس پانی پر دم کیا اور بوتل لوٹا دی۔ میں نے دیکھا کہ جب بابا صاحب پانی پر پھونک مار رہے تھے تو پان کی پیک بھی بوتل کے منہ پر گر رہی تھی، جس کو مرید تبرک سمجھ رہے تھے۔

میں اور جوش صاحب دلچسپی سے لوگوں کی معصوم نفسیاتی غلامی کا نظارہ کرتے رہے۔ بابا صاحب کے تخت کے قریب ایک بڑی میز پڑی ہوئی تھی جس پر انواع و اقسام کی مٹھائیاں اور پھلوں کی ٹوکریاں رکھی ہوئی تھیں۔ بابا صاحب کے اشارے پر وہ مٹھائیاں اور بہت سے پھل ہمارے سامنے رکھ دیے گئے۔ ہم نے ایک ایک کیلا کھایا۔ پھر بہت لذیذ چائے پیش کی گئی۔ جوش صاحب نے پھل کھانے سے پہلے اور چائے پینے کے بعد کلیاں کیں پھر پان کھا لیا۔ بابا صاحب کا پان کا بیڑا بڑا ہوا کرتا تھا جب کہ جوش صاحب بہت چھوٹے ٹکڑے کھاتے تھے۔ بابا صاحب کا قوام بھی بہت خوشبودار زعفرانی ہوا کرتا تھا جس کی خوشبو تمام کمرے میں مہکتی رہتی تھی۔

بابا صاحب کے آستانے پر لذت کام و دہن کا بندوبست کرنا ان کے مریدوں کی ذمہ داری تھی جس میں کسی قسم کی کوتاہی کی جرأت وہ اپنی آخرت کو خطرے میں ڈال کر ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے کون سی ایسی نعمت تھی جو وہاں موجود نہ ہو۔ بابا صاحب کے پاس ایک قوال بھی تھا جسے وہ اپنے ساتھ جے پور سے لائے تھے۔ سفید راجپوتی داڑھی، چوڑی دار پائجامہ، شیروانی، آنکھوں میں کاجل، درمیانہ قد مگر آواز میں غضب کا ترنم اور مٹھاس ..... وہ صرف بابا صاحب ہی کا کلام سنانے پر مامور تھا۔ بابا صاحب اور جوش صاحب جب ایک دوسرے کو اپنا اپنا کلام سنا چکے تو جوش صاحب کی فرمائش پر قوال صاحب طلب کیے گئے۔ وہ اپنے ہارمونیم



جناب سبطِ حسن

6

maablib.org

کے ساتھ آئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک دلکش موسیقی کی پھوار پڑتی رہی۔

تقریباً ایک بجے ہم نے اجازت چاہی۔ بابا صاحب نے بادل ناخواستہ رخصت کیا۔ راستے میں، میں نے جوش صاحب سے دریافت کیا کہ آپ کے اور بابا صاحب کے عقائد اور انداز فکر میں بعد المشرقین ہے پھر وہ کون سی بات ہے جس کے باعث آپ بابا صاحب کو اس قدر پسند کرتے ہیں؟

جوش صاحب نے کہا۔ دو باتیں مجھے بابا صاحب کی بہت پسند ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی قسم کی تنقید کا برا نہیں مانتے دوسرے وہ وسیع المشرب انسان ہیں جو ان کے بہت بڑے عالم ہونے کی دلیل ہے۔ ان کے دل میں کسی مذہب کسی فرقے کے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات نہیں ہیں بلکہ وہ ہر انسان سے صرف انسان ہونے کی جہت سے محبت کرتے ہیں۔ غرض ہم یہ باتیں کرتے ہوئے جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جوش صاحب نے گاڑی سے اتر کر کہا آپ مجھے اوپر تک نہیں پہنچائیں گے؟ میں فوراً ان کے ساتھ ہو لیا۔ اوپر اپنے کمرے میں جا کر جوش صاحب نے کپڑے بدلے تہہ بند باندھا اور اپنا پرس تہہ بند کے نیفے میں اڑس لیا۔ جوش صاحب کا ایک نواسہ تھا جس کو وہ بلو کہتے تھے۔ اس کے متعلق جوش صاحب کا خیال تھا کہ وہ ہر وقت ان کے پرس کی تاک میں رہتا ہے اور موقع ملتے ہی ان کی پونجی لے اڑتا ہے۔ جب میں چلنے لگا تو جوش صاحب نے کہا ارے بھئی ذرا سبط حسن کو ٹیلی فون کر کے پوچھ لو کہ میری کتاب "یادوں کی برات" طباعت کی کس منزل میں ہے۔ میں نے کہا کہ گھر جا کر ٹیلی فون کروں گا۔ اس کے بعد جوش صاحب سے رخصت ہو کر ڈھائی بجے گھر پہنچا۔

یادوں کی برات کی طباعت:

دوسرے دن میں سبط حسن صاحب کے دفتر گیا جو مری ویدر ٹاور کے قریب قمر ہاؤس اور اسٹیٹ لائف انشورنس کراچی کے دفتر کے درمیان کی عمارت میں واقع تھا۔ سبط حسن صاحب سے میں نے اپنا تعارف کروایا کہ کیفی اعظمی میرے بہنوئی ہیں اور میں یہاں کسٹم کے محکمے میں ملازم ہوں مگر اس وقت جوش صاحب نے مجھے بھیجا ہے وہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ ان کی کتاب "یادوں کی برات" طباعت کی کس منزل میں ہے؟ سبط حسن صاحب بہت محبت

سے ملے۔ مجھے اپنے پاس بٹھایا، چائے پلائی پھر کہنے لگے کہ کتاب چھپ کر آ گئی ہے اور اس کی جلد بندی بھی ہو گئی ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت ۳۰ روپے اور جلد کے بغیر ۱۵ روپے رکھی ہے۔ اس کتاب کی طباعت کے اخراجات کے لیے روشن علی بھیم جی صاحب سے بیس ہزار روپے قرض لیے گئے تھے اب یہ کتاب دوکانداروں کو دی جائے گی اور اس کی فروخت سے جو آمدنی ہوگی اس میں سے پہلے بیس ہزار روپیہ وضع کر کے بھیم جی صاحب کا قرض ادا کیا جائے گا پھر باقی رقم میں خود جوش صاحب کی خدمت میں پیش کر دوں گا۔ ویسے بھی یہ تمام حساب لکھ کر میں جوش صاحب کو بھجوا دوں گا۔ جب میں چلنے لگا تو سبط حسن صاحب نے کہا آپ سے مل کر خوشی ہوئی آپ ضرور ملتے رہا کیجیے گا۔ وہاں سے رخصت ہو کر میں اپنے دفتر گیا۔ شام چار بجے گھر پہنچا۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور پھر نعمت اللہ خاں کو ساتھ لے کر جوش صاحب کے گھر پہنچا۔ جوش صاحب غسل ثانی فرما کر سفید کرتے پاجامے میں ملبوس اپنے تخت پر براجمان ہو چکے تھے۔ ہم دونوں کو دیکھ کر کہنے لگے ارے واہ واہ بہت خوب وقت پر آئے۔ میں اب چائے پینے ہی والا تھا، اب آپ دونوں بھائی بھی میرے ساتھ شریک ہو جائیں۔ کم از کم چائے میں تو آپ میرے ہم پیالہ ہو جائیں۔ میں نے کہا جوش صاحب ہم دونوں تو چائے سے زیادہ چاہ کی خاطر آپ کے شیدائی ہیں۔ اتنے میں چائے آ گئی اور جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا اچھا اچھا پہلے چائے پیو پھر بتاؤ کہ سبط حسن سے ملے تھے؟ انھوں نے کیا کہا؟

میں نے سبط حسن صاحب سے ملاقات کی تمام تفصیل سنائی یہ سن کر تو جوش صاحب خوش ہوئے کہ "یادوں کی برات" چھپ کر آ چکی ہے مگر جب یہ سنا کہ پہلے قرض ادا ہو گا اور کتاب کی فروخت کے بعد باقی رقم جوش صاحب کے حصے میں آئے گی تو ان کے خوش و خرم چہرے پر کچھ ایسی کیفیت پیدا ہو گئی جیسے کوئی میٹھا بادام کھاتے کھاتے کڑوا بادام کھا لے۔ میں نے منھ کا مزا بدلنے کے لیے فوراً کہا کہ سبط حسن صاحب بہت جلد تمام تفصیل لکھ کر آپ سے ملیں گے اور آپ کے مشورے کے مطابق کام کریں گے۔ یہ بات ۱۹۷۰ء کی ہے۔

جوش صاحب کی پاکستان آمد:

ہم لوگ چائے ختم کر چکے تو دیکھا کہ غروب میں ابھی ڈیڑھ گھنٹہ باقی ہے۔ نعمت نے کہا جوش صاحب ہمارے لیے یہ بہت خوش قسمتی کی بات ہے کہ آپ پاکستان تشریف لے آئے ورنہ ہندوستان میں تو آپ سے ملاقات کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے مگر یہ بتائیے کہ:

کے کشیدہ دامن فطرت کہ جمیدا و سن آمدی؟
تو بہار عالم دیگری ز کجا بہ این چمن آمدی؟

جوش صاحب آخر وہ کیا حالات تھے جن کی بناء پر آپ نے جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے دوستوں کی صحبت ترک کی اور پاکستان آ گئے؟ اور جن مقاصد کو سامنے رکھ کر آپ نے ترک وطن کیا، کیا وہ پورے ہو گئے؟ نعمت کا سوال کافی طویل ہو گیا تھا مگر جوش صاحب خاموشی سے سنتے رہے اور جب نعمت خاموش ہوئے تو جوش صاحب نے پہلے تو گاؤ تکیے کا ٹیکا لیا پھر نہایت اطمینان سے بات شروع کی۔ میاں، جہاں تک بیدل کے اس شعر کے حوالے سے جو ابھی آپ نے پڑھا میرے دامن فطرت کو کھینچنے کا سوال ہے تو سچی بات تو یہ ہے کہ میں فطرتاً سیماب صفت انسان واقع ہوا ہوں۔ کسی نے اس شعر میں میری ہی فطرت کی عکاسی کی ہے۔

در ہیچ مقام نہ گزارد بہ درنگے
از بوئے بہ بوئے برد از رنگ بہ رنگے

میرے اندر کا شاعر مجھے کسی ایک مقام پر چین سے بیٹھنے نہیں دیتا اور ہر وقت ایک مقام سے دوسرے مقام پر لیے لیے پھرتا ہے۔ اور اس مسلسل گردش میں رہنے والے جہانیان جہاں گشت شاعر کو اگر کسی ایک مقام پر بند کر دیا جائے تو وہ خون تھوک تھوک کر مر جائے گا۔ میری یہی بے چین فطرت مجھے ملیح آباد سے لکھنؤ لے گئی وہاں سے میں حیدر آباد دکن چلا گیا کچھ دنوں بعد وہاں سے بھی دل بھر گیا تو میں بمبئی چلا گیا وہاں سے پونے منتقل ہو گیا۔ پھر دلی چلا آیا اور اب کراچی آ گیا ہوں مگر یہاں سے بھی بہت جلد اسلام آباد منتقل ہو جاؤں گا۔

میں نے عرض کی کہ جوش صاحب یہ تو رہی ایک شاعر کی حیثیت سے آپ کے سیماب صفت ہونے کی بات مگر اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ آپ کو آپ کے ہم عقیدہ ابوطالب صاحب نقوی نے جو اس زمانے میں کراچی کے چیف کمشنر تھے ایک بڑا پلاٹ سنیما کے لیے ایک پلاٹ آپ کے بنگلے کے لیے اور پچاس ایکڑ زمین آپ کے باغ کے لیے الاٹ کر دی تھی۔ اس کے علاوہ آپ کے اور آپ کے بچوں کے لیے معقول آمدنی کا بندوبست کرنے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

جوش صاحب نے کہا ہاں یہ بات صرف وعدے کی حد تک تو درست ہے مگر ابوطالب صاحب نقوی کی جس بات نے مجھے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا یہ استدلال تھا کہ ہندوستان میں اب اردو کا مستقبل بہت تاریک ہے۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں اردو رسم الخط سمجھنے والا کوئی متنفس باقی نہیں رہے گا۔ آپ کے کلام کو دیوناگری زبان میں لکھ کر لوگ پڑھا کریں گے اور شین کی جگہ سین اور قاف کی جگہ کاف پڑھیں گے اور آپ جو اس قدر صحت تلفظ پر زور دیتے ہیں، اپنا سر پیٹ کر رہ جائیں گے اور کچھ نہ کر سکیں گے۔ اس کے برعکس پاکستان میں اردو کو سرکاری سرپرستی حاصل ہو گی اور چونکہ یہاں کسی صوبے کی زبان اردو نہیں ہے اس لیے اردو سے محبت کرنے والے ہر ادیب اور شاعر کا فرض ہے کہ وہ پاکستان میں اردو کی ترقی کے لیے کوشش کرے۔ نقوی صاحب نے مزید کہا۔ جوش صاحب یہاں پاکستان میں آپ جیسے اردو زبان کے ماہروں کی ضرورت ہے تاکہ خواہ وہ حکومتی سطح پر ہو یا عوام میں ادبی سطح پر آپ لوگوں کی رہنمائی کر سکیں اور ہماری حکومت اور عوام آپ کی رہنمائی میں اپنی اصلاح کر سکیں۔ اس کے علاوہ آپ کی وہ تہذیب جس کے تعلق سے آپ اس قدر حساس واقع ہوئے ہیں کہ آپ اس محفل میں بھی شریک ہونا پسند نہیں کرتے جہاں آپ کے معیار کے مطابق لوگ مہذب نہ ہوں، وہ تہذیب اب آپ کو پورے ہندوستان میں کہیں نہیں ملے گی کیونکہ اس تہذیب کے حامل تمام انسان اب پاکستان منتقل ہو گئے ہیں۔ تو کیا یہ عظیم لسانی، مزاجی اور روایتی بربادی آپ کو پسند ہے؟ تو جناب ابوطالب صاحب نقوی کی اسی مدلل اور جذباتی گفتگو نے مجھے اس قدر متاثر کیا کہ میں نے پاکستان منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ ۱۹۵۵ء کا واقعہ ہے۔

نعمت نے کہا کہ جوش صاحب کیا اب آپ اپنے اس فیصلے سے مطمئن ہیں ؟
جوش صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

سفینہ جب کہ کنارے پہ آلگا غالب
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

اتنے میں راغب صاحب مرادآبادی ، فراست رضوی اور سرور اقبال آ گئے ۔ سورج غروب ہو چکا تھا ۔ ام الشعرا نے جو اتنی دیر سے ہماری گفتگو بڑی بیزاری سے برداشت کر رہی تھیں ، ایک جام بھر کر جوش صاحب کو دیا اور جوش صاحب نے " بیاد فلاں بنت فلاں " کہا اور ایک گھونٹ لے کر گلاس میز پر رکھ دیا ۔

فراست رضوی اور سرور اقبال خاصے ذہین نوجوان ہیں ۔ شعر اچھا کہتے ہیں ۔ خاص طور سے فراست رضوی کی شعر گوئی پر قدرت کو جوش صاحب بھی تسلیم کرتے ہیں ۔ یہ لوگ آ گئے تو گفتگو کا موضوع شاعری کی طرف منتقل ہو گیا ۔ جب جوش صاحب تیسرے پیگ پر پہنچے تو ہم دونوں بھائیوں نے اجازت چاہی اور رخصت ہو گئے ۔ راستے میں مجھ سے نعمت نے کہا کہ میں جوش صاحب سے مذہب اور خدا کے متعلق بھی ان کے خیالات معلوم کرنا چاہتا ہوں ۔ کسی دن شام کو ذرا جلدی ان کے گھر چلیں گے اور ان سے اس موضوع پر بھی باتیں کریں گے ۔ میں نے کہا پہلے ایک کام کرو کہ خدا کے متعلق جوش صاحب کا جتنا کلام ہے وہ پڑھ لو پھر اس کی روشنی میں سوالات کرنا ۔ میں بھی جتنا کلام مجھے ملے گا ، پڑھ کر آؤں گا ۔ اس کے بعد ہم لوگوں نے اس نقطہ نظر سے جوش صاحب کے کلام کا مطالعہ شروع کیا ۔ اس کے بعد کئی روز تک جوش صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی ۔

یادوں کی برات :

ایک دن میں اور نعمت جوش صاحب کے گھر گئے تو دیکھا کہ ان کی سوانح حیات " یادوں کی برات " کی کچھ جلدیں ان کے تخت پر رکھی ہوئی ہیں ۔ جوش صاحب نے مجھے ایک جلد دے کر کہا کہ آپ دونوں بھائی اسے پڑھ لیں ۔ ہم نے شکریہ ادا کر کے کتاب لے لی اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر گھر آ گئے ۔ یہ تقریباً ساڑھے سات سو صفحات کی بڑی ضخیم کتاب ہے

اور اس قدر دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں نے اس کتاب کو بہت غور سے پڑھا۔ میری دیانتدارانہ رائے یہ ہے کہ اس کا انداز بیان اردو زبان کے ادب عالیہ کا لافانی شاہکار ہے۔ اور جہاں تک اس کتاب کی ادبی حیثیت کا تعلق ہے یہ ایک بیش بہا ادب پارہ ہے۔ جس منظر کو بیان کیا اس کی تصویر کشی اس قدر فنکارانہ کی گئی ہے کہ اس منظر کو قاری کی آنکھوں سے دکھا دیا۔ جس شخصیت کا سراپا بیان کیا، اس کو قاری کے حافظہ میں امر بنا دیا لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ احساس بھی ذہن کا احاطہ کیے رہتا ہے کہ ان کی عظمت رفتہ کی نقش گری اور معاشقوں کی تفصیل کا ذکر مبالغہ آمیز شاعرانہ ہے۔

فسانے اپنی محبت کے سچ تو ہیں لیکن
بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لیے

اور کئی واقعات اس طرح بیان کیے گئے ہیں کہ حقیقت کے بجائے ان میں جوش صاحب کی اپنی خواہشات کی تکمیل کا عکس جھلکتا ہے۔ مگر اس کتاب سے جوش صاحب کے گھر کا ماحول، ان کے عقائد، ان کی تعلیم، لکھنؤ کی زوال آمادہ جاگیردارانہ تہذیب، اس سے پیدا ہونے والی نفسیاتی الجھنیں اور احساس کمتری جس کے ردعمل کے طور پر برتری کا دعوی شیعہ عقائد کی ذہن پر مضبوط گرفت، اپنی عظمت رفتہ کا شدید احساس اور اس کے نتیجے میں انگریز کی غلامی سے نفرت۔ اس دور کے نوابوں کی تقلید میں شراب و شباب کی بزم ہائے طرب کی طرف فطرت کا میلان اور کوچہ عیش و عشرت کی طرف جانے والی راہوں میں رکاوٹ ڈالنے والی مذہبی اقدار سے بغاوت اور اس بغاوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تعقل اور تنقید کی صلاحیت، غرض جوش کی شخصیت کے تمام اجزائے ترکیبی۔ یادوں کی برات " کے نوشہ کے چہرے پر شاعرانہ الفاظ کا سہرا باندھے اور رومانی جذبات اور عقل و دانش کے گلہائے رنگین و معطر میں ان کو لپیٹے نظر آتے ہیں۔ جوش صاحب کی ابتدائی تعلیم اس دور کے جاگیردار گھرانوں کے رواج کے مطابق زیادہ تر گھر پر ہی ہوئی۔ اس میں عربی، فارسی اور اردو کا معیار تو بہت بلند تھا مگر عصر حاضر کے سائنسی، معاشرتی اور معاشی علوم سے اس کا نصاب بے بہرہ تھا۔ جوش صاحب نے بھی ابتدائی جماعتوں کی حد تک تو اسکولوں میں داخلہ لیا مگر وہ کالج کے معیار کا علم حاصل نہ کر سکے اور جدید علوم میں گہری بصیرت حاصل کرنے کے لیے جس معیار کی انگریزی

زبان کے علم کی ضرورت ہوتی ہے، وہ بھی ان کو حاصل نہ تھا۔

مذہبی فکر کا ارتقاء:

لیکن جوش صاحب کا ذہن نابغۂ روزگار کا ذہن تھا۔ وہ کسی بات کو اس وقت تک تسلیم نہیں کرتے جب تک پوری طرح منطقی طور پر اس سے مطمئن نہ ہو جاتے۔ ان کا ذہن حقائق کا متلاشی تھا اور ہر محقق کی طرح وہ متشکک بھی تھے۔ مذہب اور کائنات سے متعلق ہزاروں سوالات ذہن میں پیدا ہوتے تھے۔ ایسے میں اگر خارجی دنیا کا معروضی سائنسی علم حاصل نہ ہو تو اس کے حقائق، اس کی پیچیدگیاں اور نظام حیات کی سماجی گتھیاں اور معاشی، سیاسی، عمرانی، اخلاقی اور مذہبی پابندیاں، معاشرتی رسم و رواج کی جکڑ بندیاں ان کے اسباب اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسیاتی پیچیدگیاں ان کی گہرائی اور گیرائی حدود نگاہ میں نہ ہوں تو انسان ظاہری رسوم ہی کی پابندیوں کو اصل مذہب سمجھ لیتا ہے اور مروجہ عقائد کی روشنی میں ذہنی تسلی کے لیے واہمے کے روایتی بت تراش کر ان کی پرستش کرنے لگتا ہے اور بڑی بڑی باتوں کو چھوڑ کر چھوٹی چھوٹی باتوں میں ذہنی آسودگی حاصل کرتا ہے اور صرف ظاہری رسوم کی تکمیل ہی کو مذہب کا اصل مقصد سمجھ بیٹھتا ہے۔

جوش صاحب نے بھی ابتدا میں روایتی مذہب کا سہارا لیا اور بقول ان کے "اس میں اس قدر شدت پیدا ہو گئی کہ میں بڑی سختی کے ساتھ نمازیں پڑھنے اور روزے رکھنے لگا" (یادوں کی برات)۔

تصور الٰہ:

یہ وہ زمانہ تھا جب ۲۱-۱۹۲۰ء میں ان کی پہلی تصنیف "روح ادب" شائع ہوئی تھی۔ مگر متجسس دماغ کبھی غیر منطقی روایات سے مطمئن نہیں ہو سکا۔ چنانچہ جوش صاحب لکھتے ہیں کہ "جب سن آگے بڑھا فکر کا میدان بھی وسیع ہو گیا۔ پورے نظام شمسی پر نظر پڑنے لگی اور اس بات کی لگن لگ گئی کہ "علت العلل" کا سراغ لگاؤ اور ذات و صفات کے تمام مسائل کو سمجھو۔ پھر انھوں نے اس کائنات کی تشکیل اور شکست و ریخت میں ایک

-توانائی مطلق- کی جلوہ گری کو محسوس کیا اور جیسے جیسے اس عظیم الشان طاقت کے متعلق ان کا شعور اور یقین واضح ہوتا گیا اور اس کے اشتثنیٰ ناآشنا قوانین علت و معلول کا ادراک پختہ ہوتا گیا۔ جوش صاحب پر مذہب کے پیش کردہ خدا کے شخصی تصور (Personified God) کا منطقی تضاد روشن ہوتا گیا تو انھوں نے خدا کے روایتی تصور سے بھی بغاوت کی اور نہ صرف مذہبی رسوم اور غیر منطقی عقائد کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا بلکہ مذہبی علما کی سطحی علمیت پر بھی اعتراضات کیے اور اس طرح خدا کے تصور کو انسانی ذہن کے محبس سے آزاد کیا۔ اس سلسلے میں ان کی حسب ذیل رباعیات قابل غور ہیں۔

اوج زاہد کو پست پایا میں نے
اوہام کا بندوبست پایا میں نے
خالق کو تشخص کا کیا ہے پابند
مومن کو بھی بت پرست پایا میں نے

علت کا نہ معلول و قضا کا منکر
حاشا نہ خبر نہ مبتدا کا منکر
یاروں نے تشخص کا تراشا ہے جو بت
الحاد ہے صرف اس خدا کا منکر

اس کے بعد جوش صاحب کا مذہب، مذہب انسانیت بن گیا اور عظمت، اخوت اور احترام انسانی کی راہ میں تمام رکاوٹوں کو دور کرنا ان کے فن کا نصب العین۔ جوش صاحب اپنی کتاب "حرف و حکایت" میں "دین آدمیت" کے عنوان سے ایک نظم میں عقائد گزیدہ ذہنوں کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں۔

نوجوانو! یہ بڑے بوڑھے نہ مانیں گے کبھی
صحت افکار سے خالی ہے ان کی زندگی
صبح کا جب نام آتا ہے تو سو جاتے ہیں یہ
روشنی کو دیکھتے ہی کور ہو جاتے ہیں یہ
ان کے شانوں پر تو ایسے سر ہیں اے اہل نگاہ
جن کا گودا جل چکا ہے جن کے خانے ہیں سیاہ
اور وہ خانے ہیں جن تک روشنی جاتی نہیں
آندھیوں کے وقت بھی جن میں ہوا آتی نہیں

بجھ چکے ہیں جہل کے جھونکوں سے ان کے سب چراغ
کب سے ہیں ضیق النفس میں مبتلا ان کے دماغ
ان کی عقل پوچ اک مدت سے ہے خلوت گزیں
فکر کی ٹھنڈی ہوا میں سانس لے سکتی نہیں
ذہن ان کے رینگتے پھرتے ہیں زیر آسماں
اپنی بغلوں میں دبائے وہم کی بیساکھیاں
ان سے بڑھ کر نور و حکمت کا کوئی دشمن نہیں
ان کے تہہ خانوں میں روشن دان کیا روزن نہیں

اس کے بعد جوش صاحب ان نام نہاد علما کا دین کے متعلق جو تصور ہے وہ پیش کرتے ہیں کہ یہ ناواقف رموز دین اپنی کم علمی اور عقائد پرستی کے سبب اس حد تک پستی میں گر گئے ہیں کہ ان کے نزدیک

دین کیا ہے، خوف دوزخ حرص جنت کے سوا
رسم تقوی کچھ نہیں جبن و تجارت کے سوا
اللہ اللہ یہ مقدس عالمان پرشکوہ
تاجروں کی ایک جماعت بزدلوں کا اک گروہ

سیکڑوں حوروں کا ہر نیکی پہ ہے ان کو یقیں
سود لینے میں "خدا" سے بھی یہ شرماتے نہیں
بند پانی سے انھیں کیا آ سکے بوئے فساد
یہ تو ہیں "شخصی خدا" کے بندگان خانہ زاد

جوش صاحب کی فکر اور منطقی استدلال نے انھیں اس نتیجہ پر پہنچایا کہ اگر ہم ہر انسان کو اس کی ذہنی صلاحیت کے مطابق خدا کا تصور قائم کرنے کی اجازت دے دیں تو ذہن انسان کی ناپختگی اور قوت ادراک کی محدود صلاحیت کی وجہ سے یہ بات ناممکن ہے کہ انسان کسی غیر مادی طاقت کا تجریدی تصور قائم کر سکے۔ خاص طور سے جب کہ اس وجود کی کوئی

صورت مثالی ممکن نہ ہو۔ بقول حافظ شیرازی:

در رہِ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرم راز   ہر کسے بر حسب فہم گمانے دارد

(ترجمہ۔ عشق کے راستے میں کوئی شخص بھی یقین کے ساتھ واقف راز نہیں ہو سکا۔ ہر شخص نے اپنی اپنی ذہنی صلاحیت کے مطابق گمان قائم کر رکھا ہے۔)

علامہ اقبال نے اپنے حواس کی محدودیت کا اس طرح شکوہ کیا ہے:

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ   اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو

جوش بھی اس مقام پر پہنچ کر یہ دعا مانگتے ہیں:

مجھ کو تو پیغمبری دے اور نہ شاہنشاہ کر
بن پڑے تو سرِ موجودات سے آگاہ کر
اپنے اصلی خال و خد سے آشنا کر دے مجھے
بندگی اک جہل مطلق ہے خدا کر دے مجھے

اور یہ دعا اس طرح قبول ہوتی ہے کہ جوش کو معرفت کا وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جہاں ہر قسم کا تشخص الٰہ ایک بُت بن جاتا ہے اور جوش ہر قسم کی اصنام پرستی کا مخالف بن کر شخصی تصور الٰہ کے خلاف بغاوت کر دیتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ:

جسے ہو ایک توانائی عظیم کی دھن   وہ کیا پرستش معبود خانہ ساز کرے

جوش صاحب کی نظم و نثر میں جہاں جہاں خدا کے خلاف خیالات ملتے ہیں وہ دراصل خدا کے اس تصور کے خلاف ہیں جو ناپختہ ذہن انسانی کا تراشیدہ "شخصی خدا" Personified God ہے۔ جوش صاحب نے ایک سائنس داں کی طرح اس کائنات میں لامحدود توانائی مطلق کو محسوس کیا ہے جو اپنے اٹل اور ناقابل تغیر قوانین کی رو سے خالق بھی ہے، حاکم بھی ہے۔ قابل ادراک بھی ہے اور اس میں تشخص کا شائبہ بھی نہیں اور اس کی حاکمیت مطلق میں کوئی دوسرا شریک بھی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ شخصی خدا کے تصور کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

ان کو اس اصلی "خدا" سے دور کی نسبت نہیں
جس کے قبضے میں زماں ہے جس کے قدموں پر زمیں

آج تک پہنچی نہیں جس اوج تک چشم خیال
ایک نامعلوم قوت ایک نادیدہ جلال
داغ شخصیت سے ہے ناآشنا جس کی جبیں
نوع انساں کے تعاون کی جسے حاجت نہیں
جس کا ہر تارا ہے مصحف جس کا ہر ذرہ کتاب
جس کے دفتر کی ہے زرّیں مہر قرص آفتاب
وہ خدا وہ طاقت مخفی وہ دارائے حیات
جس کی اک ادنیٰ سی جنبش کا لقب ہے کائنات
اس کی کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا
لیکن ان ارباب مذہب کا نرالا ہے خدا
وہ خدا جو آدمی سے چاہتا ہے بندگی
تشنگی جس کو بہت ہے خوشنما الفاظ کی

(دین آدمیت۔ حرف و حکایت)

مجھ کو پوجو مجھ کو چاہو کی صدا دیتا ہے جو
جو نہ چاہے اس کو دوزخ کی سزا دیتا ہے جو

اسی تصور کو علامہ اقبال نے ایک جگہ اس طرح پیش کیا ہے:

بسیتم باگدائے تو یا تو گدائے ماستی ۔۔۔ بہر نیاز سجدۂ در پس ما دویدہ ای
فتنہ دیر یک طرف شورش کعبہ یک طرف ۔۔۔ از آفرینش جہاں دردِ سرِ خریدہ ای

(ترجمہ۔ کیا میں تیرا بھکاری ہوں یا تو میرا بھکاری ہے، ایک سجدے کی خاطر میرے پیچھے بھاگا آ رہا ہے، ایک طرف دیر کا فتنہ تو ایک طرف کعبہ کی شورش۔ یہ جہاں پیدا کر کے تو نے اپنے لیے ایک دردِ سر خرید لیا ہے۔)

ظاہر ہے کہ جوش ہوں یا علامہ اقبال یہ صرف اُس "تصور" خدا کا مذاق اڑاتے ہیں جسے کوتاہ عقلوں نے اپنی جہالت کی وجہ سے اپنے اپنے ذہنوں میں تراش رکھا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک جگہ اس تصور کو بہت دلچسپ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔ ایک دن

آبادی میں یہ منادی کی گئی کہ آج دن میں فلاں وقت بھگوان اپنی رتھ میں شہر کی بڑی شاہراہ سے گزریں گے۔ میں بھی اپنا کشکول لے کر ایک چوراہے پر کھڑا ہو گیا۔ جب وقت مقررہ پر بھگوان کا رتھ وہاں سے گزرا تو پہلے اس کے کہ میں اپنا کشکول بڑھاتا میں نے دیکھا کہ رتھ کی کھڑکی کا پردہ ہٹا اور اس میں سے بھگوان کا ہاتھ باہر آیا جس میں خود ایک کشکول تھا جو بھگوان نے میری طرف بڑھا دیا۔ (غالباً اس لیے کہ بندہ اس میں کچھ صفات کی بھیک ڈال دے)۔
جوش ایسے ہی تصور خدا کے خلاف لکھتے ہیں۔

چار دن جو شاد ہے اور چار دن ناشاد ہے
یہ خدا تو آدمی کے ذہن کی ایجاد ہے
سخت حیراں ہوں یہ کیسا وہم کا طوفان ہے
اے عزیزو یہ خدا کے بھیس میں انسان ہے
مدتیں گزریں کہ عقل انجمن مدقوق ہے
دوستو ایسا خدا خالق نہیں مخلوق ہے

رابندر ناتھ ٹیگور ہوں یا علامہ اقبال یا جوش ملیح آبادی، انسانی ذہن کے خانہ کعبہ کو ہر قسم کے لات و منات سے صاف کر کے اس میں توانائی مطلق اور اس کے قوانین کا معروضی تصور پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ انسان میں خود شناسی کا شعور بیدار ہو اور وہ خارجی کائنات کو اس میں رائج علت اور معلول کے ناقابل تغیر قوانین کے حوالے سے سمجھ کر اور قوانین فطرت کو معلوم کر کے ان سے استفادہ کر سکے اور اس طرح اس کائنات کے تمام وسائل کو اپنے تصرف میں لاسکے۔

جوش صاحب نے اس معروضی توانائی مطلق کے تصور کو نہایت وضاحت سے اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ ایک جگہ "طلوع فکر" میں خدا کے متعلق لکھتے ہیں:

دنیا کو تو بتائے گا یہ نکتہ جمیل — یعنی ازل سے ایک توانائی جلیل
جس کی کوئی نظیر نہ جس کا کوئی عدیل — اس کارگاہ وقت گریزاں کی ہے کفیل

انفعال و انجذاب نہ وہ انعکاس ہے
دنیا سے دور ہے نہ وہ دنیا کے پاس ہے

سان کے مزاج کی اس میں نہیں ہے بو   وہ کچھ نہیں ہے کچھ بھی نہیں ہے سوائے ہو
وہ شاہ نرم طبع نہ سلطان تند خو   وہ دل نواز دوست نہ ہمت شکن عدو

وہ پابند رسم وفا و جفا نہیں
جذبات جس پہ ٹوٹ پڑیں وہ خدا نہیں

ہاں دل کو تو کرے گا سیہ رات سے جدا   ذہنی حقیقتوں کو روایات سے جدا
لہ کو تمام قیاسات سے جدا   اسماء و وصف و سمت و اشارات سے جدا

داغوں سے تو احد کے ورق کو بچائے گا
تشخص تعینات سے حق کو بچائے گا

پرکھے گا تیرا علم ہی اس کائنات کو   جانچے گی تیری عقل ہی خون حیات کو
وہ تو ہے جو کھرچ کے نقوش صفات کو   دیکھے گا اک حکیم کے مانند ذات کو

بے حد کو حبس خانہ حد سے چھڑائے گا
تو کبریا کو دام عدد سے چھڑائے گا

متذکرہ بالا اشعار میں جوش صاحب نے جس توانائی مطلق کا تصور پیش کیا ہے آج سائنس، علم طبیعیات کی رو سے جوہر میں بند اس توانائی مطلق تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف ہے جو " وحدت " کے چشمے سے نکل رہی ہے۔ طبیعیات دانوں نے جب اس مادی کائنات کے بنیادی جزو ترکیبی یعنی جوہر کا تجزیہ کیا تو وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ اس میں توانائی چار شکلوں میں ظاہر ہو رہی ہے۔ ایک طاقتور توانائی جسے انگریزی میں Strong Force کہتے ہیں وہ مرکزے یعنی NUCLEUS کے اندر پروٹون اور نیوٹرون کو متحد کر کے مرکزہ بناتی ہے۔ اس کے بعد الیکٹرون میں کمزور توانائی جسے انگریزی میں Weak Force کہتے ہیں۔ اس کے بعد وہ توانائی جو برقی مقناطیسی قوت میں ظاہر ہوتی ہے جسے انگریزی میں Electro Magnetic Force کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی چوتھی شکل قوت ثقل یا Gravitational Force ہے جو ایک مادی شے اور دوسری مادی شے کے درمیان پائی جاتی ہے لیکن سائنس دانوں نے سوچنا شروع کیا کہ گو ان چار صورتوں میں توانائی کا اظہار مختلف ہے مگر یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ چاروں طاقتیں توانائی کی وحدت کے چشمے سے نکل رہی ہوں۔ چنانچہ سائنس دانوں نے اپنی

تحقیقات کا دائرہ اور وسیع کرنا شروع کر دیا اور جوش صاحب ان کی ہمت بڑھاتے رہے۔

متاعِ کفر ملے یا سعادتِ ایماں
جلاؤ مشعلِ تحقیق ہرچہ بادا باد
غرض ہے علم سے اے جوش بت ملے کہ خدا
اٹھا بھی پردہ اسرار ہرچہ بادا باد

چنانچہ سائنس دانوں نے اپنی منزل مقصود اس کائنات میں "عظیم وحدت" کی تلاش کو بنایا جسے انگریزی میں Grand Unifying Theory(G.U.T) کہتے ہیں اور اب طبیعیات داں WeakForce اور Electro Magnetic Force کی وحدت کو معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جن میں ہمارے ملک پاکستان کے ڈاکٹر عبدالسلام کو نوبل انعام بھی مل چکا ہے اور اب طبیعیات داں Strong Force کی ماہیت تک تقریباً پہنچ چکے ہیں اور ان کو یقین ہو چلا ہے کہ وہ اس کو بھی وحدت کے سرچشمے سے ملا دیں گے۔ جوش صاحب ان کے ہم خیال ہو کر کہتے ہیں۔

سوسن کا نہ سنبل کا تمنائی ہوں
بلبل کا نہ اب گل کا تمنائی ہوں
مطلوب ہے حیثیت ذات مطلق
اجزا کا نہیں "کل" کا تمنائی ہوں

جدید طبیعیات اور ریاضی کے امامان فن آئن سٹائن اور برٹرینڈ رسل اس بات پر متفق تھے کہ یہ تمام کائنات ایک لامحدود توانائی مطلق کے صفاتی اظہار کی کرشمہ سازی ہے۔ چنانچہ علم طبیعیات کی رو سے جوہری ذرات ایک مقام پر پہنچ کر توانائی مطلق میں ضم ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ آئن سٹائن کا نظریہ یہ ہے کہ توانائی (Energy) کا جوہر کے ذرات (Particles of Atom) میں "اظہار" کوئی وجودی تبدیلی نہیں بلکہ واقعات کے تسلسل کا اظہار" ہے۔ جوش صاحب اسی تصور کو کس قدر بلیغ انداز میں ایک رباعی میں پیش کرتے ہیں۔

آوازۂ کن نشترِ فصاد نہیں
اک ذرہ بھی پروردۂ ارشاد نہیں
ممکن ہی نہیں عدم سے پیدا ہو وجود
عالم فقط "اظہار" ہے ایجاد نہیں

اس کائنات کے لباس مجاز زیب تن کرنے سے پہلے صرف توانائی مطلق کی جلوہ گری تھی جس کو مذہب خدا کا نام دیتا ہے اور سائنس انرجی (توانائی مطلق) کہتی ہے

بقول غالب:

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا

اس توانائی نے جب لطافت سے کثافت کا ارادہ کیا تو اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے عمل کو اسلام لفظ "کن" سے تعبیر کرتا ہے۔ جوش صاحب اسی تصور کو ایک رباعی میں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ لفظ "کن" توانائی کا وہ ارادہ ہے جس کے ذریعہ سے اس نے اپنی جلوہ گری کے لیے کن کی چٹکی سے عدم کی نقاب ہٹا دی اور لباس مجاز میں ظاہر ہو گئی..... لکھتے ہیں۔

پہلے ہی سے موجود تھا ہستی کا رباب
حرف کُن نے کیا ہے کار مضراب
یہ حکم نہیں اصل میں وہ چٹکی ہے
جس نے رخِ رنگیں سے الٹ دی ہے نقاب

برٹرینڈ رسل اپنی کتاب "مغربی فلسفہ کی تاریخ" (History of the Western Philosophy) میں ایک جگہ کہتا ہے۔

From all this it seems to follow that events, not particles, must be the stuff of physics . What has been thought of as particle, will have to be thought of as series of events .

اور پھر آگے چل کر لکھتا ہے

Physics has been making matter less material)

(ترجمہ۔ ان تمام باتوں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ علم طبیعیات کا موضوع مادی ذرات کے بجائے غیر مادی واقعات کی تحقیق ہے۔ اب تک جن کو ہم بنیادی حقیقت کے طور پر جوہر کے ذرات سمجھ رہے تھے، ان کو اب واقعات کے تسلسل سے تعبیر کرنے کی ضرورت ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ طبیعیات مادے کو غیر مادی وجود ثابت کر رہی ہے)

جوش صاحب اس اصول کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

چلتا نہیں کچھ زور تماشائی کا ۔۔۔ حافظ ہے بس اللہ ہی بینائی کا
ہر برف کی سل میں برق ہے پرافشاں ۔۔۔ ہر مادہ مرکب ہے توانائی کا

لیکن جیسے ہی یہ توانائی مادی لباس زیب تن کرتی ہے وہ انتہائی منظم اور ناقابل تغیر قوانین کو جنم دیتی چلی جاتی ہے اور اس طرح یہ توانائی ریاضی کے سے منظم قوانین کے ماتحت اپنا وجودی سفر جاری رکھتی ہے اور ان قوانین کا جبر اور ان کی طاقت بھی اس توانائی مطلق کے شعور اور وجود کی ناقابل تردید شہادت فراہم کرتے ہیں۔ جوش صاحب اس تمام حقیقت کو خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں اور جگہ جگہ اس کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

قانون نہیں ہے کوئی فطرت کے سوا　　دنیا نہیں کچھ نمود طاقت کے سوا
قوت حاصل کر اور مولیٰ بن جا　　معبود نہیں ہے کوئی قوت کے سوا

ایک اور جگہ اس سائنسی حقیقت کو معرفت کے رنگ میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

عامی نے حجابات سے تعبیر کیا　　عالم نے نشانات سے تعبیر کیا
اس ارض و سماء کے ذرے ذرے کو مگر　　عارف نے فقط ذات سے تعبیر کیا

یا

محروم تجلیات وافر ہو جائے　　خود سے بے گناہ جہل نافر ہو جائے
مومن نہ کرے سجدہ تو مسلم نہ رہے　　عارف جو کرے سجدہ تو کافر ہو جائے

اسی تصور کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے کہ

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں
توڑے ہے عجز تنک حوصلہ بر روئے زمیں
سجدہ تمثال وہ آئینہ کہیں جس کو جبیں

سائنس دان " Grand Unifying Theory " کے تحت جس ذات مطلق تک پہنچنا چاہتے ہیں، جوش صاحب ہر قدم پر ان کی ہمت بڑھاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

آیات صفات کی تلاوت نہ کرو　　جو زندگی ذات میں غفلت نہ کرو
لفظ اللہ پردہ ہے جلوہ نہیں　　اس حرف خلائی پہ قناعت نہ کرو

یا ایک نظم میں کہتے ہیں۔

تا جلوۂ مسبب اسباب دیکھ لیں
اسباب کی نقاب اٹھاتے رہیں گے ہم

جوش صاحب اپنی سوانح عمری "یادوں کی برات" میں "میرا دین" کے باب میں یقین بلکہ عین الیقین کی کس شدت کے ساتھ بہ بانگ دہل یہ اعلان کرتے ہیں کہ "ایک جری نسان کی مانند میں بآواز بلند یہ اعلان کرتا ہوں جو ادھر دیکھ رہا ہے وہ ادھر مڑ جائے۔ جو دور ہے وہ قریب آ جائے۔ جس نے اب تک نہ سنا ہو وہ کان کھول کر سن لے۔ جو اب تک مجھ کو مومن سمجھ رہا ہے وہ اپنے حسن ظن سے دست بردار ہو جائے اور جس کے نزدیک میں خدا کا منکر یعنی لفظ خدا کے لامحدود معنی میں منکر ہوں، وہ بھی اپنے سوء ظن سے توبہ کرلے کہ میرا دین خیابان ذہن انسانی کی تمنائے رنگ و بو، حصول علم و فقدان جہل کی آرزو اور محرک اولیں کی مسلسل جستجو کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے"۔

معرفت کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد جہاں تمام کائنات "ہمہ اوست" کے سوا کچھ نہیں رہتی۔ جوش صاحب کہتے ہیں۔

کیا مجھ کو بلا رہا ہے کعبے کی طرف
ہر سانس میں سو طواف کرتا ہوں میں

یک جگہ کہتے ہیں:

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں
پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زباں سے "میں" نکلتا ہے ندیم
اس پردے میں کائنات کہتا ہوں میں

جب اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس توانائی مطلق ہی کی ذات کا مظہر ہو تو پھر انسان اس ذات کی جلوہ گری سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر عارف بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے "لاموجود الا اللہ" اور جوش نعرہ زن ہوتے ہیں۔

ہر روز بپا جشن کریں گے اے جوش — پیمانہ سرِ خوشی بھریں گے اے جوش
کیا موت کی ہستی ہے کہ دامن چھو لے — اللہ مرا تو ہم مریں گے اے جوش

یہاں جوش صاحب بھگت کبیر داس کی آواز میں آواز ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

"ہر مرے تو ہم مریں۔ اپنی مرے بلا"

غالب نے کہا:

مشکل حکایتیست کہ ہر ذرہ عین اوست   اما نمی تواں کہ اشارت بہ او کنند

یہ دراصل میر تقی میر کے شعر کا فارسی میں ترجمہ ہے:

پایا نہ یوں کہ کریے اس کی طرف اشارہ

یوں تو جہاں میں ہم نے اس کو کہاں نہ پایا

الٰہ کے اس کائناتی تصور کے برعکس مذہبی پیشواؤں نے جو بادشاہوں اور شہنشاہوں کے طرز پر ایک جابر انسان کا بت تراش کر اس کا نام خدا رکھ دیا ہے جوش صاحب تمام عمر اس بت پرستی کے خلاف جہاد کرتے رہے اور ان کو اپنے استدلال کی صحت پر اس قدر یقین ہے کہ وہ اس صنم خانہ حیات میں اعلان حق کرنے سے نہیں گھبراتے اور کہتے ہیں:

خدا بصورت سلطاں نشستہ بر سر عرش

یہی جو بت شکنی ہے تو آذری کیا ہے

اپنی کتاب "الہام و افکار" میں جوش صاحب نے ایک طویل نظم میں اپنے اور نام نہاد مذہبی فکر کے تراشیدہ "شخصی خدا" کے درمیان ایک مکالمہ بیان کیا ہے۔ چونکہ یہ نظم جوش صاحب کے طرز فکر کو بالکل ٹھیک ظاہر کرتی ہے۔ اس لیے یہاں نقل کی جاتی ہے۔

"ایک مکالمہ"

(مابین بندہ و خدا)

خدا۔ "شاعر تیرے نصیب میں خلد بریں نہیں"

شاعر (جوش)۔ "مے خوار تشنہ لبن و انگبیں نہیں"

خدا۔ "بجز کا حریم قلب میں عشق و جنوں کی آگ"

شاعر۔ "عشق و جنوں کی آگ خیال آفریں نہیں"

خدا۔ "دل کی طرف رجوع ہو اے کشتۂ دماغ"

شاعر۔ "دل طفل کم نگاہ ہے آفاق بیں نہیں"

خدا۔ "مومن ہے شیوہ ہائے تقشف سے سرفراز"

شاعر۔ "ملحد بھی بر بنائے تجسس لعیں نہیں"

خدا۔ "کیا دل نشیں نہیں ہیں مقالات مقبلاں؟"

شاعر۔ "بے شبہ دل نشیں ہیں مگر سر نشیں نہیں"

خدا۔ "اٹھو غیب کی زمین پہ رکھو دین کی بناء"

شاعر۔ "مبنی جو غیب پر ہو وہ افسوں ہے دیں نہیں"

خدا۔ "اقوال پر نگاہ کر افکار پر نہ جا"

شاعر۔ "یہ خاکسار مولوی عبدالمتیں نہیں"

خدا۔ "رکھ دے حریم قدس کے در پر سر نیاز"

شاعر۔ "جھک جائے بے دلیل یہ ایسی جبیں نہیں"

خدا۔ "وجدان کی شراب سے چھلکا سبوئے دل"

شاعر۔ "بہر شراب وہم مرا ساتگیں نہیں"

خدا۔ "فطرت میں ہے کجی تو اسے مستقیم کر"

شاعر۔ "انساں تو کیا یہ طاقت روح الامیں نہیں"

خدا۔ "دیدار کی تڑپ ہے تو عرش بریں کو دیکھ"

شاعر۔ "کیا جلوہ گاہ ناز یہ فرش زمیں نہیں؟"

خدا۔ "اچھا، تو آسماں کی طرف ہی نظر اٹھا"

شاعر۔ "فدوی کے اقتدار میں اب تک زمیں نہیں"

خدا۔ "ہاتھوں سے دیکھ حبل متیں چھوٹنے نہ پائے"

شاعر۔ "محکم تر از خرد کوئی حبل متیں نہیں"

خدا۔ "۲۰۔ سوئے نور و طور و ظہور و قصور و حور"

شاعر۔ "میں مشہر ایماں کا ابھی مکیں نہیں"

خدا۔ "ایمان ہے نگین سلیمان زندگی"

شاعر۔ "ایمان، اک فریب نگیں ہے، نگیں نہیں"

خدا۔ "مرغان بے نوا پہ جھپٹ، سہر عشق ناز"

شاعر۔ "انسان ہوں، عقاب لئیم و لعیں نہیں"

خدا۔ "میں تجھ پہ خشم گیں ہوں اسیر دلیل و عقل"

شاعر۔ "حکمت پناہ! یہ روشش نکتہ بیں نہیں"

خدا۔ "دوزخ ترا مقام ہے اے عبد بے الہٰ"

شاعر۔ "نیت مری بخیر ہے میں سہم گیں نہیں"

خدا۔ "ہو گی سزا بروز جزا باوجود جبر؟"

شاعر۔ "سنتے ہیں آسماں پہ یہ رسم زمیں نہیں"

خدا۔ "کاشانہ خیال میں شمع یقیں جلا"

شاعر۔ "حکمت میں ڈوب کر جو نہ ابھرے یقیں نہیں"

خدا۔ "بندے! نظام دہر سے شاید حزیں ہے تو"

شاعر۔ "ہاں مجھ کو اعتراض ہے لیکن حزیں نہیں"

خدا۔ "کانوں سے رشتہ جوڑ عنان دلیل توڑ"

شاعر۔ "وہ مردہ ہے جو گرم چناں و چنیں نہیں"

خدا۔ "کیا دل مچل رہا ہے مرے قرب کے لیے"

شاعر۔ "اللہ رے عارفانہ تجاہل، نہیں نہیں"

خدا۔ "اے جوش دل میں ہے کہ جگر میں کہاں ہے درد"

شاعر۔ "اے شاہد بطون دو عالم، کہیں نہیں"

ایسا معلوم ہوتا ہے ان آخری دو اشعار میں جوش صاحب اپنے جذبات پر قابو نہ پا سکے اور جو عشق ان کو اس داراۓ حیات اور خالق کائنات سے تھا وہ بے قابو ہو کر چھلک پڑا ہے۔ وہ اس پوری نظم میں ایک سچے عاشق کی طرح اپنے محبوب کے چہرے سے وہ نقاب اٹھانے کوشش کرتے دکھائی دیتے ہیں جو مذاہب کے نام نہاد علما نے بر بنائے ناواقفیت اس پر

ڈال دی ہے۔ جوش صاحب کی تمام فکر اسی ذات مطلق کی تلاش میں سرگرداں دکھائی دیتی ہے جس کو وہ کہیں "سبب اول" اور کہیں "علت العلل" اور کہیں "توانائی مطلق" کے استعاروں سے یاد کرتے ہیں۔

غرض جب میں اور نعمت جوش صاحب کے تصور الٰہ اور دین کے متعلق اتنا مواد جمع کر چکے تو ایک شام کو جوش صاحب کے گھر گئے۔ جوش صاحب ہم دونوں کو دیکھ کر کہنے لگے ارے میاں تم دونوں بھائی اتنے دن کہاں غائب ہو گئے تھے، میں تو تم لوگوں کی صورت بھی بھول چکا تھا مگر اب تک پانچ فیصد بھلا سکا ہوں۔ میں نے کہا، حضور والا ہم لوگ گذشتہ ایک ہفتہ سے آپ کو تلاش کر رہے تھے۔

کہنے لگے، کیا ہذیان بک رہے ہو۔ بھلا میں کہاں چلا گیا تھا؟ میں نے کہا، جوش صاحب، قبلہ یہ بتلایئے کہ کیا آپ کو اپنی شخصیت کی معرفت کامل حاصل ہے؟ یعنی کیا آپ خود کو پہچاننے کی طرح پہچانتے ہیں؟ جوش صاحب نے حیرت ناک نگاہوں سے مجھے اوپر سے نیچے تک اس طرح دیکھا جیسے وہ مجھے اب پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ کہنے لگے میاں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں نے کہا حضرت آپ کی شخصیت ان گوشت پوست کے پردوں اور تہذیب و تمدن کی قدروں کے سر بفلک پہاڑوں کے درمیان کہیں پوشیدہ ہے۔ ہم دونوں بھائی ایک ہفتے سے اسی کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ جوش صاحب کے چہرے پر ایک سوالیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کہنے لگے پھر کچھ پتا چلا ہمارا؟ میں نے کہا جی ہاں آپ کا قصر عالیشان تو دکھائی دے گیا ہے مگر ابھی ہم لوگ اس محل میں داخل نہیں ہو سکے مگر ہمیں امید ہے کہ جوش صاحب قبلہ آہستہ آہستہ خود ہم سے ملنے اپنے سنگین محل سے نکل کر ہمارا استقبال کریں گے۔ اس کے بعد ہم نے جو کچھ ان کے تصور الٰہ اور دین کے متعلق معلومات جمع کی تھیں وہ ان کو سنائیں تو بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کہ آج تک کسی نے مجھ کو اس طرح نہیں سمجھا جس طرح آپ لوگوں نے سمجھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ لوگوں کو اپنی کتاب "حرف آخر" بھی مطالعہ کے لیے دوں، جس کو میں نے ناقابل اشاعت کے زمرے میں داخل کر دیا ہے کیونکہ میرے خیال میں ہمارے معاشرے کی ذہنی سطح اتنی بلند نہیں ہوئی ہے کہ اس فکر کو برداشت کر سکے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے مجھے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ کتاب دی جو

ہزاروں اشعار پر مشتمل ہے۔ ہم دونوں بھائی وہ کتاب لے کر گھر آگئے اور دوسرے دن سے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ یہ طویل منظوم ڈراما جوش صاحب نے ۱۹۳۸ء میں لکھنا شروع کیا تھا مگر ابھی تک اس کے بعض حصے تشنۂ تکمیل ہیں۔

حرفِ آخر

اس طویل منظوم ڈرامے کے دو حصے ہیں۔

پہلے حصے میں کائنات اور آدم و حوا کی تخلیق سے متعلق جو قدیم روایات مشہور ہیں، جوش صاحب نے ان کو "حسبِ روایاتِ پیشیں" کے عنوان سے بیان کیا ہے۔ اس کے بعد نہایت تفصیل اور زبان و بیان کی بے پناہ مہارت سے اس تصور کے اجزائے ترکیبی کا منطقی نقص بیان کر کے اس نظریے کو رد کر دیا۔

دوسرے حصے میں اس کائنات کی تخلیق کے متعلق جدید سائنسی نظریہ ارتقاء کو بیان کیا ہے جس کے تحت مادہ مختلف ارتقائی منازل سے گزر کر حیات کی شکل اختیار کرتا ہے جس کی آخری منزل انسان ہے۔ اس کے بعد ارتقاء انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کو تسخیر کائنات کے ذریعے اس کی حقیقی منزل یعنی مقام الوہیت پر فائز ہونے کی تلقین کرتا ہے اور یہی حرف آخر ہے۔

جوش صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ آج ہم فکر انسانی کے جس دور میں ہیں وہ سائنس اور منطق کا دور ہے۔ اب مذہب کا دور ختم ہو چکا۔ مذہب کا دور عقیدہ پرستی کا دور تھا۔ آج تحقیق اور جستجو کا دور ہے۔ مذہب میں خوف اور لالچ انسانی عمل کے محرکات تھے۔ آج علت اور معلول کے قوانین کا ادراک اور حقوق اور ذمہ داریوں کے شعور کا دور ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا دور ہے۔ مذہب کا دور فکری انجماد سے جمود کا دور تھا آج ذہنی اور فکری ارتقا کا دور ہے۔ مذہب صرف اپنے ہم عقیدہ لوگوں کو زندگی کا حق دیتا ہے جبکہ آج تمام نوعِ انسانی کو اس کائنات کے وسائل سے فیضیاب ہونے کے مساوی حقوق کا تصور عام ہو رہا ہے۔ مگر بد قسمتی سے تیسری دنیا کے ممالک میں علم کے فقدان کے باعث ابھی مذہب اور

عقیدہ پرستی کی گرفت عام ذہنوں پر بہت مضبوط ہے اور اس کو قائم رکھنے میں معاشرے کے مراعات یافتہ طبقات کا اثر بہت زیادہ ہے اور یہ لوگ مذہب کے توسط سے لوگوں میں ان کے انسانی حقوق کا شعور بیدار ہونے نہیں دیتے اور مذہب کی بنیاد چونکہ خدا اور ابلیس کے مروجہ شخصی تصور پر قائم ہے، جو خیر اور شر کی طاقتوں کے نمائندے ہیں، اس لیے ان تصورات کی جگہ علت اور معلول کے اَنمٹ ناآشنا قوانین کے تصور کو عام کرنے کی ضرورت ہے۔ مگر چونکہ ابھی تک انسانی ذہن پختگی کی اس منزل تک نہیں پہنچ سکا جہاں اس فکر کو آسانی سے قبول کیا جاسکے تو جوش صاحب نے اس کتاب کے متعلق لکھ دیا کہ اسے ان کی زندگی میں شائع نہ کیا جائے۔ لیکن جوش صاحب کی فکر کا کما حقہٗ احاطہ کرنے کے لیے اس راز سے بھی پردہ اٹھ جائے تو کیا ہرج ہے۔ یہ مکمل نظم تو یہاں درج نہیں ہو سکتی مگر میں اس کے چیدہ چیدہ اہم حصے نقل کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ اس طویل منظوم ڈرامائی تخلیق کے توسط سے جوش صاحب جو خیال پیش کرنا چاہتے ہیں، وہ عام قاری تک پہنچ جائے۔

"تخلیق سے پیشتر"
(طویل نظم حرفِ آخر سے اقتباس)

منظر (۱)۔ سینۂ عدم میں وجود کا پیچ و تاب (حسب روایاتِ پیشیں)

سین (۱)

ایک افسوں بدوش ظلمت میں
ایک گہرے سکوت کا عالم
روئے خنداں نہ دیدہ گریاں
جلوۂ گل نہ رشحۂ شبنم
سازِ دیوانگی نہ سوزِ خرد
نغمۂ سرخوشی نہ نوحۂ غم
نہ محبت کا جامۂ صد چاک
نہ جوانی کے گیسوئے پرخم
سوزِ تخلیق سازِ درپردہ
اور بیرونِ پردہ زیر نہ بم
جیسے بادل کی آڑ میں بجلی
جیسے بربط کے تار میں سرگم
نیم پوشیدہ، گاہ نیم عیاں
باہم آویزشِ وجود و عدم

اک عمیق و رسیدہ معنی میں
جامد و پا بہ گِل عناصر میں
خود سے گلتی ہوئی سی اک زنجیر
سینۂ قطرگی میں رہ رہ کر
بول اٹھنے کے شوقِ بے حد سے
حرکت بے تعطّل موجد
کربِ ناگفتہ حرف میں یزداں
کپکپی ظلمتوں میں یوں گویا
چند جگنو سے دم بدم تاباں
تیرہ اوجِ خلا پہ جنبش میں
پُرفسوں ظلمتوں میں پرافشاں
دھندلی اونچی فضاؤں میں غلطاں
سست کوندے کی طرح لرزش میں
تیرگی اُس چراغ کے مانند
یوں فضاؤں پہ سرگرانی سی
ابروئے ذوقِ آفرینش میں
ایک کھوئے ہوئے سے جادے پر
ایک اندازہ سا نہ ظن نہ یقیں
ایک عالم بغیر لیل و نہار
اک تپاں حرفِ نارسیدہ بہ لب
ایک چشمک سی بے مقام و جہت
ایک تعمیر بے در و دیوار
اک حکایت بغیر گوش و زباں
ایک نادیدہ عقدہ بے ناخن

لفظ بننے کا جذبۂ محکم
اک ابھرتا ہوا سا جذبۂ رم
خود سے کھلتا ہوا سا ایک علم
پیچ و تابِ خروشِ موجۂ یم
خامشی مبتلائے کرب و الم
شش جہت میں تصورِ عالم
فکرِ نا آفریدہ جام میں جم
نور بننے کی کھا رہی ہے قسم
چند پلکیں سی پے بہ پے برہم
عکسِ تسنیم و پرتوِ زمزم
جادوئے آذری و خوابِ صنم
زلفِ حوا و دامنِ آدم
روحِ غفلت پہ ذہن کا پرچم
ہر نفس ہو رہا ہو جو مدغم
حمل سے جیسے وحشتِ مریم
ایک دھندلے ہلال کا سا خم
ایک رکتی ہوئی صدائے قدم
ایک ابہام سا نہ کیف نہ کم
ایک پیماں بغیر "لا" و "نعم"
ایک لرزاں نگینہ بے خاتم
اک تمنا سی مخفی و مبہم
ایک تشکیل بے حدوث و قدم
اک کتابت بغیر لوح و قلم
ایک آوارہ راز بے محرم

اور اس آوارہ راز کے اندر قلبِ خالق کی جنبشِ پیہم

سین (۲)
(عدم سے وجود کی جانب)

ایک دھندلکے کا سماں ہے۔ چاروں طرف سکوت بہہ رہا ہے۔ گاہ گاہ وجہ ذوالجلال سے ایک کرن سی پھوٹتی اور گردو پیش کے سہانے پن میں گم ہو جاتی ہے۔ خدا کے جسم میں رہ رہ کر ایک تشنج کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور وہ اسے بار بار دباتا ہے اور وہ ہر بار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے کہ ایک شدید ہیجان کے عالم میں جھرجھری لے کر خدا اپنا داہنا ہاتھ پوری قوت سے بلند کر کے آواز دیتا ہے۔

خدا کی پہلی آواز

اے میری تخییل! بن جا کائنات ہست و بود
ہاں چمن اے جذبۂ ایجاد تشریف وجود

اے عدم اٹھ گامزن ہو شکلِ موجودات میں
اے مرے اجمال آ جا رنگ تفصیلات میں

ہاں مجسم حسن ہو جا اے مرے دل کی ترنگ
اے نویلی سادگی بن جا نگار آب و رنگ

محمل اسماء میں آ جا لیلیٰ وجہِ جمیل
پردۂ اشکال میں چھپ جا مری روحِ جلیل

محفلِ امکاں میں در آ اک نئے انداز سے
اے مری ذات اپنے دامن کو جھٹک کر ناز سے

اے مرے ہیجان بن جا کارگاہ این و آں
معرضِ ہستی میں آ جا اے زمیں اے آسماں

یہ کہتے ہی خدا کو پھر شدت کے ساتھ جھرجھری آتی ہے۔ وہ اپنے جسم کو جھٹکتا اور اس زور سے جھٹکتا ہے کہ اس کے ہر بن مو سے اک آنچ سی نکلنے لگتی ہے۔ تشنج میں اتنی ہی سرعت کے ساتھ گردش کرتی ہوئی بے شمار چنگاریاں کانپنے لگتی ہیں اور کانپتے کانپتے پورے نظام شمسی کی شکل اختیار کر کے توازن، تطابق، حرکت و حرارت اور رنگ و نور کے ایک تابناک عالم میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ خدا اس منظر کو اس تھکے ہوئے لیکن مسرت انگیز سکون کے ساتھ دیکھتا ہے جو کسی درد کے رفع ہونے کے بعد محسوس کرتا ہے۔ وہ مسکراتا ہے۔ دوبارہ مسکراتا ہے اور

پھر ایک ایسی رسنگاری آمیز تسکین کے ساتھ قہقہہ لگا کر دفعتاً نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے جو کاندھے سے کوئی زبردست وزن گرا دینے کے بعد حاصل ہوا کرتی ہے۔

منظر (۲)

(خلقت کے ایک مدت دراز کے بعد)

خدا پہلی بار عرش کا دریچہ کھول کر غیر آباد کرۂ ارض پر نگاہ ڈالتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے۔

سین (۱)

یہ رباط حسن و خوبی یہ بساط رنگ و بو
یہ سرود لالہ و گل یہ سرود آب جو
یہ شگوفے یہ ستارے یہ بگولے یہ حباب
یہ بیاباں یہ بہاراں یہ سمندر یہ سراب
یہ رباب دور گل یہ نغمۂ باد مراد
یہ خروش قلزم و طوفاں یہ جوش ابر و باد
یہ فلک کی تازہ کاری یہ فضا کی طرفگی
یہ گھٹا یہ دھوپ یہ کہرا یہ مینہ یہ چاندنی
یہ خنک شاداب شاخیں پھول برساتی ہوئی
ندیاں یہ بن کے اندر پیچ و خم کھاتی ہوئی
صبح کی یہ نور دوڑاتی ہوئی قرص رواں
شام کی یہ کروٹیں لیتی ہوئی تاریکیاں
یہ قمر یہ کہکشاں یہ کوہ یہ وادی یہ بن
بن کے اندر یہ خم آب رواں کا بانکپن
یہ صبیح و نرم صبحیں یہ سہانے بوستاں
یہ سلونے جھٹ پٹے یہ سانولی تاریکیاں
سرخ جنبش میں یہ کھلتی ہوئی کلیوں کا رنگ
رنگ کے ہیجان میں یہ پھول بننے کی امنگ
پرفسوں یہ دشت پراسرار یہ پست و بلند
تیرگی میں بے حقیقت روشنی میں ارجمند
یہ شب مہتاب و روز ابر و فصل برشگال
یہ خرام جو یہ موج سبزہ یہ باد شمال
یہ ضیائے بحر و بر یہ جلوۂ کوہ و کمر
کس قدر ضوبار ہے یہ عالم شمس و قمر

یہ کہہ کر خدا ٹھہر جاتا ہے اور پھر کچھ رکتی سی آواز میں کہتا ہے:

کس قدر ضوبار ہے یہ عالم شمس و قمر

اور پھر کچھ سوچ کر دوبارہ دھیمی آواز سے ارشاد فرماتا ہے:

کس قدر ضوبار ہے یہ عالم شمس و قمر

یہ کہتے ہی خدا کی آنکھیں خاکدان کے سینے میں پیوست ہو جاتی ہیں اور وہ طرفۃ العین میں یہ معلوم کر کے کہ سینۂ ارض کے اندر کیا تمنائیں کروٹیں لے رہی ہیں۔ پھر کہنا شروع کرتا ہے۔

خاک کی تمنا

لے رہے ہیں کروٹوں پر کروٹیں لیل و نہار
ہاں میں سمجھا اس کرہ کو ہے کسی کا انتظار
آرزو یہ کس کے نفسوں کی ہے؟ یہ کیا راز ہے
خاک کا ایک ایک ذرہ گوش بر آواز ہے
وہ ثبات کوہساراں ہو کہ رقص آب جو
دہر کی ہر چیز کا دل ہے شہید آرزو
اک کھٹک سی ہو رہی ہے قلب موجودات میں
ایک پرتو سا ہے غلطاں سینۂ ذرات میں
یہ جو ہوتی ہے دھمک رہ رہ کے نبض تاک میں
اپنے ساقی کی یہ حسرت ہے بطون خاک میں
ایک اک تارا ہے نغمے شوق کے گاتا ہوا
اشتیاق دید میں پلکیں سی جھپکاتا ہوا
ایک اک ساعت میں غلطاں ہے فراغ آرزو
وقت کے سینے میں ہے روشن چراغ آرزو
قلب کی حاجت ہے اس بے چین سینے کے لیے
یہ انگوٹھی تلملاتی ہے نگینے کے لیے

خدا کی یہ آواز سنتے ہی ذرات بگولوں کی شکل میں آسمان کی جانب بلند ہونے لگتے ہیں۔ پنکھڑیوں کی نسوں میں ایک گہرا رنگ دوڑنے لگتا ہے۔ دریاؤں کی روانی میں تیزی آ جاتی ہے اور درخت یک بارگی جھومنے لگتے ہیں اور خدا نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔

ارادۂ تخلیق انساں

خدا کرسی پر متمکن ہے۔ جس کے ذہن میں انسان کا ہیولیٰ غلطیدہ ہے۔ سامنے کرۂ ارض کا پرتو فضا میں کانپ رہا ہے اور خدا اس تمنا سے بے چین پرتو کی طرف آنکھیں اٹھا کر بڑی گرم جوشی کے ساتھ ارشاد فرماتا ہے۔

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی

کہ اتنے میں چند رکتے ہوئے قدموں کی چاپ محسوس ہوتی ہے۔ خدا ناخوش گواری کے ساتھ ادھر گردن موڑتا ہے اور دیکھتا ہے کہ چند فرشتے سروں کو جھکائے اور ہاتھوں کو جوڑے ادب اور خوف کے ساتھ بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ جنھیں دیکھ کر خدا کہتا ہے:

کیا ہوا اس احتجاجی شکل سے آئے ہو کیوں

(ایک تسبیح معمر فرشتہ آگے بڑھ کر)

فرشتوں کا اعتراض

خانہ زادوں کے دلوں پر یہ پڑا ہے عکس ابھی

خلقتِ انساں پہ مائل ہے دماغ داوری

بارگاہ نور میں حاصل ہو کیوں ظلمت کو بار

ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار

ان پہ اشکوں کی نمی ہے ان پہ سجدوں کے نشاں

یہ ہماری داڑھیاں ہیں دیکھ یہ پیشانیاں

ماسوا اس کے ضمیر آب و گل میں ہے جنوں

خاک پر تیری بہائے گا شقی انسان خوں

اس کے نیزے ٹوٹ جائیں اور علم میرے گڑیں

یہ اسی دھن میں ہلا دے گا پہاڑوں کی جڑیں

ہر عمل اس کا بنے گا اک زبوں رد عمل

اے خدا لاشوں سے پٹ جائیں گے یہ دشت و جبل

پھول روندے جائیں گے پودے اکھاڑے جائیں گے
سینۂ ہائے بحر و بر مسعود پھاڑے جائیں گے
کاٹ دے گی خون کے رشتوں کو تیغ شعلہ رو
بھائی کی تلوار سے بھائی کا ٹپکے گا لہو
حشر تک بوتا رہے گا کشت جاں میں تخم شر
اور کبھی انجام سے بھی یہ نہ ہو گا بہرہ ور
چپکے تو فقرے کسے گا یہ تری آیات پر
اور ہنسے گا پھر یہ خود تیری مقدس ذات پر
دھوپ سنولا جائے گی اور چاندنی کھو جائے گی
ظلمتوں کے پالنے میں روشنی سو جائے گی
طبع عالی پر گرانی ہو گی بے حد و حساب
فتنۂ خوابیدہ کو رہنے بھی دے مصروف خواب
پھر بھی ہم عرض کرتے ہیں بچشم اشک بار
ہم تری تسبیح کو کیا کم ہیں اے پروردگار
ان پہ اشکوں کی نمی ہے ان پہ سجدوں کے نشاں

یہ سنتے ہی خدا بگڑ کر جواب دیتا ہے۔

معترض فرشتوں کو خدا کا جواب

اسے کہ رہتے ہو سدا اپنی ہی آوازوں میں گم
لیکن اسرار کو پہچان سکتے ہی نہیں
ربط بھی معلوم ہے آغاز میں انجام میں

مشورہ دینے کی خاطر مجھ کو اور آتے ہو تم
ہے جو میرے علم میں تم جان سکتے ہی نہیں
جاؤ اور لگ جاؤ جا کر اپنے اپنے کام میں

یہ سنتے ہی فرشتے شرمندگی اور خوف کے ساتھ الٹے قدموں بھاگتے اور عرش کی سیڑھیوں سے اترتے ہی زمین پر گر جاتے ہیں اور خدا دوبارہ خاطر کو جمع فرما کر فضا میں کانپتے

ہوئے کرۂ ارض کے پرتو کی جانب آنکھیں اٹھا کر کہنا شروع کرتا ہے۔

ہاں میں بخشوں گا اسے انسان سے تابندگی

اور فرشتوں کا خیال آتے ہی زیرِ لب

یہ فرشتے بھی ہیں کتنے کم نگاہ و کم سواد

اور پھر سہ بارہ فضا میں کانپتے ہوئے کرۂ ارض کے پرتو پر نگاہیں جما کر انسان سے بلند ترین امیدیں وابستہ کر کے کہتا ہے۔

ہاں میں بخشوں گا اسے انساں سے تابندگی — کون انساں؟ نازِ مخلوقات و فخرِ زندگی
کون انساں؟ فاتحِ کونین امیرِ آب و گل — سینۂ آفاق کا لرزندہ و بیدار دل
نورِ گیتی، مشعلِ افلاک، شمعِ انجمن — اک مجسم کج کلاہی اک سراپا بانکپن
ناصرِ اوجِ نگاراں ناظمِ ابر و چمن — ناظرِ موجِ بہاراں ناقدِ سرو و سمن
مدعائے آسمان و مقصدِ روئے زمیں — مرکزِ اضدادِ عالم محورِ دنیا و دیں
شارحِ آیاتِ ہستی، شارحِ دینِ حیات — قاضیٔ شہرِ صفات و کاتبِ دیوانِ ذات
مکتبِ نور و حرارت، درس گاہِ خیر و شر — صاحبِ نار و برودت راکبِ شمس و قمر
دور بینِ خشک و تر معیارِ نقدِ مدح و ذم — خورد بینِ آب و گل میزانِ جنسِ کیف و کم
شاہِ گیتی، صاحبِ آفاق، دارائے حیات — ابرِ رحمت، وارثِ فطرت، رئیسِ کائنات
اک زمیں پرور محقق اک فلک پیما حکیم — ایک مقیاسِ تخیل اک رصد گاہِ عظیم
آسماں کا داور و دارا زمیں کا کج کلاہ — بر کا آقا، بحر کا مولا، فضا کا بادشاہ
دہر کی پیدا و پنہاں طاقتوں کا شہریار — نظم کا پیغامبر، آئین کا پروردگار
طرفہ باز، یکّہ موجودات کا اسرار باز — اوج کا نباض، پستی کا طبیب و چارہ ساز
برق پیما ابلقِ شام و سحر کا شہسوار — جنبشوں کا میرِ لشکر گردشوں کا تاجدار
عرصۂ تابش کی ضو رفتار فوجوں کا نشاں — بحرِ ظلمت کا سبک رو کشتیوں کا بادباں
روشنی کا نفس، فطرت کا سخن، حق کا پیام — مہر و مہ کا مقتدا، سرکش عناصر کا امام
عالمِ اسباب کی محرابِ اعظم کا چراغ — پیکرِ ارض و سما کے کاسۂ سر کا دماغ
چشمِ ہستی کی بصارت زندگی کا رازداں — خامشی کا زمزمہ گونگے حقائق کی زباں

خون گل دوڑائے گا جو ان خس و خاشاک میں
نفخ کردوں گا خود اپنی روح جس کی خاک میں

سر جھکا دو اے فرشتو زندگی کے سامنے
خاک پر رکھ دو جبینیں آدمی کے سامنے

غرض خدا اپنے تصورات کو آب و گل کا پیکر عطا کر کے اسے آدم کی شکل میں خلق فرماتا ہے اور تمام کائنات کو اس کے لیے مسخر فرما دیتا ہے اور تمام فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔ چنانچہ تمام فرشتے آدم کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں مگر ابلیس سجدہ کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔

خدا سخت برہمی کے عالم میں ابلیس کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔

خدا: بد گہر، یہ سرکشی، یہ زعم باطل، یہ غرور
کس لیے جھکتا نہیں کمبخت! آدم کے حضور

ابلیس: کام لے ادراک سے یار خدا ادراک سے

خدا: کیا کہا، میں کام لوں! کیا کام لوں ادراک سے؟

ابلیس: یہ کہ ابلیس آگ سے ہے اور آدم خاک سے

خدا: ہاں میں واقف ہوں کہ شیطاں نار ہو آدم طین ہے

ابلیس: خاک کے قدموں پہ گرنا آگ کی توہین ہے

خدا: آگ کی توہین ہے؟ یہ طنطنہ یہ طمطراق

ابلیس: شق ہو میرے سر پہ شق ہو گنبد فیروزہ طاق
مجھ سے کہتا ہے خدا، یہ طنطنہ یہ طمطراق
طنطنہ تو ہے مرا عین مزاج آتشیں

خدا: خاک پر ناداں فرشتے، خاک پہ رکھ دے جبیں

ابلیس: اف یہ سر اور آدم خاکی ـــ نہیں ہرگز نہیں

خدا: کیا کہا؟ ہرگز نہیں۔ کیوں اے سراپا بغض و کیں
دور ہو اے آتش مردود اے روح لعیں
حشر تک برسے گی لعنت تجھ پہ غرب و شرق سے
اے رعنا کے تاج گر جا اس شقی کے فرق سے

یہ برد، یہ اینٹھ، یہ ٹس، یہ اکڑ، یہ آن بان
عرش سے جا فرش پر گر پڑ زمیں کی خاک چھان

ابلیس: انبیا کو کیا زمیں کی سمت بھیجا جائے گا؟
خدا: کھائے گا او باغی و ملعون دھوکا کھائے گا
ابلیس: خیر دیکھا جائے گا معبود دیکھا جائے گا

اس کے بعد خدا آدم کو کرہ ارض پر اپنا خلیفہ مقرر فرماتا ہے اور تمام کائنات کو اس کے لیے مسخر فرما دیتا ہے۔

"خدا کا حکم زمین اور اس میں موجود تمام اشیاء کے لیے"

اے زمیں آباد ہو جا آشنائے راز سے
گونج اٹھو اے آسماں انسان کی آواز سے
اے خموشی بڑھ رکاب نطق آدم تھام لے
اے پہاڑو سر جھکا دو آدمی کے سامنے
اپنی تنگی سے خبردار اے عروس بحر و بر
ہو رہا ہے خاک پر اسرار حق کا پردہ در
ہاں ابل پڑ سینۂ انگور سے موج شراب
شاہد آفاق کے چہرے سے اٹھ جا اے نقاب
اے سمندر ہاں ادب کے ساتھ شور پیچ و تاب
پاک انساں کے قدم لے اے دمکتے آفتاب
ہاں اٹھو اے آفاق، استقبال آدم کے لیے
سرو قد ہو اے عناصر خیر مقدم کے لیے
کھیتیوں کو ترک کر دو زمیوں سے کام لو
ابر و برف و باد! طوفانوں کی باگیں تھام لو
پیش وانی کو ادب سے پیش وانی کو بڑھو
اے کڑکتی بجلیو اے گڑگڑاتے بادلو
اے شگوفو مسکراؤ آبشارو گیت گاؤ
گنگناؤ اے ہواؤ اے پرندو چہچہاؤ
بخشتا ہوں لے تجھے روح عظیم و نفس پاک
ہاں کلاہ فخر کج کر اے جوان اقبال خاک
ہوش میں آ اے غنودہ فرش خاک ہوش میں
کچھ خبر ہے عرش آتا ہے تری آغوش میں

آدم کا نزول

آسمانوں نے علم کھولے زمیں نے سانس لی
ذرے ذرے سے اٹھی اک تازہ موج زندگی
بھاپ بن کر چھائی میدانوں پہ روح بحر و بر
دید کی خاطر پہاڑوں نے اٹھائے اپنے سر

سنسنائی سینۂ فولاد میں تیغ دو دم
پتھروں میں کسمسائے ناتراشیدہ صنم

خفتہ میدانوں میں شہروں کا تخیل جاگ اٹھا
ایک پرتو سا در و دیوار کا پڑنے لگا

گونج اٹھی کہسار کے سینے میں تیشے کی صدا
لیلیٰ تعمیر کا رخسار لو دینے لگا

حکم قدرت کے لیے موج ہوا آنے لگی
باادب با ہوش کی پیہم صدا آنے لگی

ذوق ایجادات و صنعت کا بگل بجنے لگا
آئی طبل عالم خاکی سے دوں دوں کی صدا

اپنے میثاق اطاعت کو سنانے کے لیے
آئیں ساری قوتیں عالم کی صف باندھے ہوئے

سامنے آ آ کے اشیا نے بتائے اپنے نام
ہونکتے بپھرے عناصر نے کیا جھک کر سلام

تند طوفانوں کی اکڑی گردنیں خم ہو گئیں
احتراماً قد آدم بحر کی موجیں اٹھیں

رکھ کے کشتی میں خواص این و آں بہر خراج
نذر کو آیا قوائے کارفرما کا مزاج

جھک گئی ہستی مودب ہو گئے ارض و سما
شاہدان دہر نے وا کر دیے بند قبا

روشنی کو سینۂ ظلمت میں راہیں مل گئیں
خاک کے در کھل گئے کانوں کی باچھیں کھل گئیں

نو عروس دہر نے زلفوں کو برہم کر دیا
چاند مجرے کو جھکا، سورج نے سر خم کر دیا

ادھر تمام کائنات اپنے خزانے لیے حضرت آدم کے استقبال کے لیے موجود تھی مگر ادھر آدم خود اپنے وجود میں کسی شے کی کمی محسوس کر رہا تھا اور یہ تھی اس کے نصف بہتر کی جستجو جو اس کے گرم خون میں آتش سوزاں بن کر دوڑ رہی تھی...... آدم کی اس جسمانی طلب اور نفسیاتی الجھن کا نقشہ کس مہارت سے کھینچا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

آدم

حیراں ہوں خاک پر ہے یہ کیا زندگی کا طور
ہر ساعت ایک فکر ہے ہر سانس ایک غور

دریا، درخت، سبزہ، سکوں، ابر، آبشار
ہر چند دلفریب ہے لیکن یہ قلب زار

سینے میں مثل شعلہ بھڑکتا ہے کس لیے
کیا چیز ڈھونڈتا ہے دھڑکتا ہے کس لیے

کچھ اس کی اصل بھی ہے کہ وسواس ہے مجھے؟
کس چیز کی کمی کا یہ احساس ہے مجھے

ہر لحظہ ایک دھن ہے تو ہر آن ایک کرید
اور کیوں ہے کس بنا پہ ہے کھلتا نہیں یہ بھید

ساکن ہوں اور خیال ہے آوارہ چار سو
کس چیز کی تلاش ہے؟ کس شے کی آرزو

یہ واقعہ غریب ہے یہ مرحلہ عجیب — خود سے ہوں فاصلے پہ کبھی اور کبھی قریب

اور بالخصوص فکر میں جھلکتی ہے جب جبیں — خود کو ٹٹولتا ہوں کہ میں ہوں بھی یا نہیں

رہتی ہے مثل ابر مسلط دماغ پر — سنجیدگی رموز خفی سے عمیق تر

سینے میں کانپتی ہے مرے ایک موج نور — دل سے قریب، فہم سے بالا، نظر سے دور

رہتا ہوں ایک طرفہ تقاضے سے مضمحل — اپنے سے دور دور مناظر سے متصل

رہتا ہوں کیوں اداس سا آنسو پیے ہوئے — کیسی یہ سنسنی ہوں رگوں میں لیے ہوئے

گونجی ہوئی ہیں کس کے قدم کی یہ آہٹیں — کیسی یہ میرے جسم میں ہیں کسمساہٹیں

چھالا سا دل میں وقت سحر پھوٹتا ہے کیوں — راتوں کو نامراد بدن ٹوٹتا ہے کیوں

باد شمال ہو کہ وہ ابر جواں خرام — ناقص ہر ایک چیز ہے ہر شے ہے ناتمام

احساس نا تمامی عالم تو ہے مگر — اب تک ہوں ناتمام کے معنی سے بے خبر

کوندا سا اک لپکتا ہے ہر شاخ تاک پر — پرتو سا ایک کانپتا رہتا ہے خاک پر

دوران خون میں ہے رواں ایک تیز دھار — خود اپنی سانس لینے میں چبھتی ہے بار بار

کچھ اجنبی زبان میں کرتی ہے گفتگو — راتوں کو اک بعید سی موہوم آرزو

چشموں کو کیا کروں لب ساحل کو کیا کروں — اس نامراد کشمکش دل کو کیا کروں

خود اپنے ولولوں کو بھی پہچانتا نہیں — کس راستے کے موڑ پہ ہوں جانتا نہیں

آدم اپنے ماحول کی ہر شے کو حیرانی سے دیکھتا ہے اور بار بار یہ الفاظ دہراتا ہے۔

اس نامراد کشمکش دل کو کیا کروں — ہاں نامراد کشمکش دل کو کیا کروں

خدا اپنے چہیتے کی باطنی خلش کو دور کرنے کی خاطر حوا کی تخلیق کرتا ہے۔

صیاد غم کا ہوتا ہے مرہم — مبارکباد مرگ نو بہ آدم

زمین پر جب آدم و حوا ایک دوسرے کے قریب ہوتے ہیں تو ان کی جذباتی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ پہلے آدم کا حال سنیے۔

یہ کس شے کی نرالی، اجنبی، ناآشنا ضو ہے — یہ کس نور خفی کا نورس و موہوم پرتو ہے

یہ میرے گرد کیسا درمیانی سا اجالا ہے — جو سطح روشنی سے پست ہے ظلمت سے بالا ہے

نہ جانے راستے میں ہیں کہ محو رقص منزل میں — یہ کیسے تلخ و شیریں ولولوں کی دھوم ہے دل میں

یہ کس ناخن کا پرتو پڑ رہا ہے عقدۂ دل پر
یہ لو کیسی ہے جو رہ رہ کے کانپ اٹھتی ہے ساحل پر

یہ کیا ہے روحِ ساحل جاگتی ہے اور ندی سوتی ہے
ندی کے موڑ پر اک داستاں معلوم ہوتی ہے

فضا میں دائرے سے بن رہے ہیں کیا تلاطم ہے
یہ طوفانِ حقیقت ہے کہ طغیانِ توہم ہے

یہ کیسی گھٹتی بڑھتی دل نشیں آواز آتی ہے
کہ جیسے اک گرہ لگتی ہے لگ کر کھل سی جاتی ہے

یہ کس نا آشنا سے میہماں کی آمد آمد ہے؟
یہ کس بے کجے بوجھے کارواں کی آمد آمد ہے

یہ کیا عالم ہے ہر شے بحرِ ظلمت میں ڈبوتی ہے
یہ کس کی سانس چہرے پر مجھے محسوس ہوتی ہے

ہوئی اف یک بیک یہ میری نبضوں میں دھمک کیسی
ارے یہ دفعتاً جنبش سی کیسی یہ چمک کیسی

یہ آہٹ کس کی یوں گونجی مرے بے چین سینے میں
صبا جیسے گلی میں راگنی جیسے سفینے میں

یہاں آیا ہے کوئی یا جنوں نے مجھ کو گھیرا ہے
ارے یہ کس کا شانہ مس ہوا تو کون ہے؟ کیا ہے؟

ادھر آدم کا یہ حال تھا اور ادھر حوا اپنے داخلی جذبات ہیجان میں مبتلا تھی ..... جذبۂ تخلیق چنگاریاں بن کر ہر موئے تن میں لہریں لے رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت جوش صاحب کی زبانی سنئے۔

حوا

بازو یہ نرم نرم یہ گوری کلائیاں
یہ تن بدن میں آنچ کی لہریں رواں دواں

بیداریوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے
کیسی یہ نیند سی ہے احاطہ کیے ہوئے

آنکھوں سے ایک بھاپ سی اٹھتی ہے گرم و سرد
پنڈے کے بھیگے پن میں ہے کیسے مزے کا درد

تڑپا رہا ہے کون دلِ درد مند کو
اینٹھن سی کھائے جاتی ہے ہر جوڑ بند کو

رگ رگ میں خون لیتا ہے تھم تھم کے چٹکیاں
رخ سے لٹوں کے چھوتے ہی اٹھتا ہے اک دھواں

کوئی ہمک رہا ہے یہ اندازِ دل نشیں
سینے میں ہے کہ گود میں مجھ کو خبر نہیں

کانوں سے لو نکلتی ہے اور آگ ہے جبیں
چھاتی ابل رہی ہے نہ ہو جائے شق کہیں

زانو پہ سونے والے ہی سے کیوں نہ پوچھ لوں
یہ بے خودی سی مجھ پہ پھٹی پڑ رہی ہے کیوں

دھومیں مچی ہوئی ہیں وہ دل میں کہ الاماں
اینٹھی سی جا رہی ہیں نگوڑی کلائیاں

اک لو سی پھٹ رہی ہے الجھتی نجوم سے
کیا صبح ہو رہی ہے رگ و پے میں دھوم سے

ہوتی ہے کیوں لچک سی کمر میں یہ بار بار
کیسا ہے اف یہ دھوم مچاتا ہوا ابھار

پیدا ہوئی ہے بات یہ شاید بہت بری
تیزی سے بن رہی ہوں میں اک زندہ پھول بن
ہر رونگٹے کی جاگ اٹھی پیاس الاماں
شیریں و تلخ زہر رگ و پے میں بھر دیا
لگتا ہے تیر بن کے چکنا ہزار کا
رہ رہ کے کوئی چیز مچلتی ہے کیا کروں

پہلو سے زلف مس ہو تو آتی ہے جھرجھری
ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے پھپکا ہوا بدن
احساس اور جسم کا احساس الاماں
کس نے یہ مجھ کو جسم سے آگاہ کر دیا
در آیا ہے بدن میں زمانہ بہار کا
کوزی کے پاس آگ سی جلتی ہے کیا کروں

معبود میری اوس کو پی لے کوئی کرن
سیال ہو رہی ہوں سنبھلتا نہیں بدن

صحراؤں میں گھومتے گھومتے اتفاقاً آدم و حوا ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ اس اتفاقی ملاقات کے نتیجے میں ان کا بے کیف ماحول ایک دم رنگین اور خوبصورت بن جاتا ہے۔ اس نفسیاتی کیفیت کا حال سنیے۔

واقعہ تھا کہ گماں تھا مجھے معلوم نہیں
پرتو صبح کی مانند زمیں کی جانب
ذرے ذرے سے جوانی کی مہک آتی ہے
ایک چشمے کی سی آواز تو آتی تھی ضرور
جس کی رفتار سے تھی کاہکشاں جنبش میں
چاند کا سینہ، ستاروں کا جگر، خاک کا دل
بام گردوں پہ فسانوں نے علم کھولا تھا
آسمانوں سے برستے تھے خوشی کے گوہر
جھٹ پٹے کی شکن آلود فضا کے پیچھے
شام کی جنبش تاباں کی گہرتابی میں

کل یہ کیا طرفہ سماں تھا مجھے معلوم نہیں
کون شب کو نگراں تھا مجھے معلوم نہیں
کس کا لب عطر فشاں تھا مجھے معلوم نہیں
اور وہ چشمہ کہاں تھا مجھے معلوم نہیں
کون وہ سرو رواں تھا مجھے معلوم نہیں
کس کی شوخی سے تپاں تھا مجھے معلوم نہیں
یا حقیقت کا نشاں تھا مجھے معلوم نہیں
یا فلک اشک فشاں تھا مجھے معلوم نہیں
دوست یا دشمن جاں تھا مجھے معلوم نہیں
کون یہ نیم عیاں تھا مجھے معلوم نہیں

آدم و حوا گو داخلی ہیجان کے ہاتھوں آتش بجاں تھے مگر اس بے چینی کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھے کہ اتنے میں ایک سرخ پوش انھیں ترغیب دیتا ہے۔

(ابلیس) سرخ پوش کی ترغیب

اس آب تبسم میں نہ آئے گی روانی
اس حرف سے جھلکے ہیں نہ جھلکیں گے معانی
اس حسن سے ہوگی نہ کبھی شعلہ فشانی
برسے گا نہ اک بوند بھی اس ابر سے پانی

نادان! اگر تو نے مری بات نہ مانی

اس سلسلۂ شرم سے جل جائے گا جس وقت
رگ رگ میں جواں خون ابل جائے گا جس وقت
سانچے میں نئی آگ کے ڈھل جائے گا جس وقت
کانٹا ترے سینے سے نکل جائے گا جس وقت

کھل جائیں گے تخلیق کے اسرار نہانی

ہاں جھوم کر انگارہ جوانی کا دہک جائے
کوندا سا لپکنے لگے بجلی سی چمک جائے
یوں پی کے عشرت کہ ترا جسم چھلک جائے
اور اتنی کہ انگڑائی جو لے جلد مسک جائے

اٹھ رقص میں آ رقص میں بھرپور جوانی

اس شرم سے اس ضبط سے اس بیم و رجا سے
اس جذبۂ ناموس سے اس خوف خدا سے
اس شدت آداب سے اس فرط حیا سے
اس خفت و معزولی انداز و ادا سے

شامیں ہی سلونی ہیں نہ صبحیں ہیں سہانی

سرخ پوش (ابلیس) کی اس ترغیب کے بعد ماحول اور بھی رنگین ہو گیا۔

کروٹیں ذروں نے لیں غنچوں نے آنکھیں کھول دیں
آسماں جھوما نرت کرنے لگی کم سن زمیں
سر پہ پہلی بار چمکا قوس کا رنگین پل
گلشن ہستی میں پہلی بار لچکی شاخ گل
زندگی نے مسکرا کر پہنا پھولوں کا لباس
چہرۂ گیتی پہ پہلی مرتبہ اتری مٹھاس
درس پہلی بار دنیا کو لطافت کا ملا
اولیں نغمہ چھڑا اور اولیں غنچہ کھلا
گل کے پیراہن سے پہلی بار نکلی بوئے گل
تاک کے خوشے سے پہلی بار ٹپکا خون مل
اک لگاوٹ سی ہوئی پیدا، بنی جو بڑھ کے آگ
نے سے پہلی بار نکلی نغمہ سوزاں کی آگ
ابتدائی شدت احساس میں ڈوبا ہوا
دیدۂ ارض و سما سے اولیں آنسو گرا
اور پھر گھر کر تمناؤں کا بادل آ گیا
گھر کے گرجا اور گرج کر اک جہاں پر چھا گیا

پھر تو برسانے لگا ذوقِ جنوں ذوقِ نگاہ
خاک پر الھڑ جوانی کا جمال بے پناہ

عارضے بے خود ہوئے برنائی اٹھلانے لگی
شوخیاں مچلیں جوانی رقص فرمانے لگی

یوں کھنچے ابرو تنے سانچے میں عالم ڈھل گیا
یوں ہلیں پلکیں رگِ ہستی پہ نشتر چل گیا

کانپتی، تپتی دہکتی حسرتیں پیدا ہوئیں
زندگی کے طاق کافوری میں شمعیں جل اٹھیں

عرشیوں نے بربط اٹھایا فرش کی لچکی کمر
رقصائے ماہ و انجم گنگنائے بحر و بر

جوہروں میں دل نشیں بندے جھمکنے سے لگے
سینۂ الماس میں کنگن جھلکنے سے لگے

نرم ریشم کی تمنا دہر پر چھانے لگی
اک خیالِ سرسراہٹ کی صدا آنے لگی

سینۂ دوشیزۂ گیتی کے اندر ناگہاں
کروٹیں لینے لگا ذوقِ حریر و پرنیاں

عارضِ بے آبِ گوہر پر صباحت چھا گئی
روئے زر پر خون یوں دوڑا کہ سرخی آ گئی

سینۂ گوہر میں بندھنے کی تمنا جاگ اٹھی
قلبِ سیم و زر میں اک پازیب سی بجنے لگی

دفعتاً عالم کی پہنائی پہ گویا چھا گئی
پاک بچوں کے تبسم کی سہانی چاندنی

کھل کھلا اٹھے شگوفے چہچہا اٹھے طیور
نغمہ گونجا زیر و بالا، رنگ دوڑا دور دور

جھوم کر گھنگھور ساون کی گھٹا آنے لگی
زمزمے جھومے صبا چہکی، فضا گانے لگی

اس پُرکیف فضا میں آدم، حوا سے مخاطب ہو کر کہتا ہے۔

آدم کا پہلا ترانہ

اے نرگسِ جاناں یہ نظر کس کے لیے ہے
یہ شعلہ، یہ بجلی یہ شرر کس کے لیے ہے

اے قامتِ بالا و بلند اے قدِ موزوں
یہ سرو یہ شاخِ گلِ تر کس کے لیے ہے

اے سنبل و نسریں کے لیے پیکِ ہزیمت
پیغامبرِ فتح و ظفر کس کے لیے ہے

اے سایۂ کاکل میں جھمکتے ہوئے چہرے
یہ شام کے حلقے میں سحر کس کے لیے ہے

اے مہر و مہتاب سے دمکے ہوئے مکھڑے
تجھ پر یہ تبسم کا اثر کس کے لیے ہے

اس پیکرِ شفاف کے گرد اے مہِ تاباں
ڈھلکی ہوئی یہ تہبِ گہر کس کے لیے ہے

اے دخترِ شبنم و پروردۂ نرگس
یہ تاب یہ دزدیدہ نظر کس کے لیے ہے

اے خود سے الجھتی ہوئی سرشار جوانی — ہر سانس میں یوں زیر و زبر کس کے لیے ہے

حوا کا جواب

یہ کچھ نہیں معلوم مگر تجھ سے سنوں گی — یہ بات کہ تو خاک بسر کس کے لیے ہے
ہر سانس میں یہ زیر و زبر تیرے لیے ہے — نادان! یہ ممنوع شجر تیرے لیے ہے

آدم: کس درجہ زندگی تھی پریشاں ترے بغیر
حوا: سچ سچ یہ زندگی تھی پریشاں مرے بغیر؟
آدم: ہاں ہاں یہ زندگی تھی پریشاں ترے بغیر

پھیکا تھا رنگ لالہ و گل دور ہجر میں — گونگے تھے طائران خوش الحاں ترے بغیر
پڑتی تھی آہ نرم سی شے سے بھی اک خراش — حساس اس قدر تھی رگ جاں ترے بغیر
چبھتی تھی پہلوؤں میں ستاروں کی روشنی — ڈستا تھا پرتو مہ تاباں ترے بغیر
ہوتی تھی مس تو آنکھوں میں لگتی تھی باد سرد — کتنا سبک تھا دیدۂ حیراں ترے بغیر

آدم و حوا کے قرب پر حوروں کا ترانہ مبارک باد

مبارک حضرت انساں مبارک — مبارک جلوۂ جاناں مبارک
وفور غم کو عشرت کی بشارت — ہجوم درد کو درماں مبارک
شب تاریک کی خاموشیوں میں — خروش مرغ خوش الحاں مبارک
نگاہ رہرو راہ طلب کو — سواد کوچۂ جاناں مبارک
خم محراب چشم آرزو کو — چراغ چہرۂ خنداں مبارک
فضائے شام غم کی تشنگی کو — نسیم صبح گل افشاں مبارک
سکوت موسم لب تشنگی کو — سرود بربط و باراں مبارک
وفور کلفت پیدائے غم کو — ہجوم عشرت پنہاں مبارک
ہوائے بخیۂ زخم جگر کو — ادائے جنبش مژگاں مبارک
لب امید کو موج تبسم — یہ فیض دیدۂ گریاں مبارک
سبک رفتار موج زندگی کو — مبارک دولت طوفاں مبارک

آدم و حوا کے قرب پر آتشیں پیکر ابلیس نعرہ مسرت لگاتا ہے۔

خود کو گم کردہ راہ کر کے چھوڑا — حوا کو بھی تباہ کر کے چھوڑا
کیا کیا نہ کیے حضرتِ والا نے جتن — آدم نے مگر گناہ کر کے چھوڑا

اس کے بعد ابلیس کے قہقہے فضا میں گونجنے لگے۔

میری فتح اولیں کو نوٹ کر لے آسماں
ہاں جلاجل کو بجائیں کس طرف ہیں آندھیاں

قرب آدم و حوا کے ایک زمانے کے بعد جب انسانی آبادی بڑھنے لگتی ہے تو حوا آدم کی طرف دیکھ کر کہتی ہے۔

آفریں جوش حیات و مرحبا زور نمو — یہ مرے بچے ہیں میری نسل ہے میرا لہو
اپنے بچے زندگی کے یوں ترانے گائیں گے — کون کہہ سکتا تھا ہم اتنے عدد بن جائیں گے
آسمان زندگانی کے مہ و پرویں ہیں یہ — کتنے پیارے کتنے بھولے کس قدر شیریں ہیں یہ
بچپنا ہے کس قدر رفتار میں گفتار میں — جی میں آتا ہے کہ رکھ لوں اس کلیجے میں انھیں
اے میں قرباں پھر رہے ہو کس قدر بے گانہ وار — آؤ آؤ اس طرف تو آؤ ماں تم پر نثار
آؤ آؤ مشکل یاد نو بہاری آؤ آؤ — آؤ بچو آؤ میں ہوں ماں تمھاری آؤ آؤ

آدم

یہ بلانے کی صدائیں کس قدر بے سود ہیں — جب کہ حوا خود یہ تیری ذات میں موجود ہیں
آج کل جو شکل انساں میں دکھاتا ہے بہار — یہ تری ان نرگسی آنکھوں کا ہے رنگ خمار
ان کی شیریں زندگانی · زندگانی ہے تری — یہ تمنا ہے تری یہ نوجوانی ہے تری
یہ جو چہروں پر نظر آتی ہے اک شیریں پھبن — یہ ترے مکھڑے کی رنگیں جوت ہے اے سیم تن
رکھ رہے ہیں یہ جو اٹھلا کر ترے بچے قدم — در حقیقت یہ تری آواز کا ہے زیر و بم
بازوؤں پر یہ جو زلفیں اڑ رہی ہیں تابدار — یہ تری مہکی ہوئی سانسیں ہیں اے جانِ بہار
یہ ادھر جو جا رہی ہیں دختران تیرہ دم — یہ اسی وادی کی کلیاں ہیں جہاں چٹکے تھے ہم
یہ جو میٹھے زمزموں سے گنگناتی ہے زمیں — سنسناہٹ یہ ترے سینے کی ہے اور کچھ نہیں

خاک پر محفل ہوئی ہے یہ جو اک موج شباب — یہ ترے ہونٹوں کا رس ہے تیری آنکھوں کی شراب
یہ جو جنبش سی نظر آتی ہے تجھ کو دور تک — میری بجلیوں کی دمک ہے تیری پلکوں کی جھپک
یہ جو دو آنکھوں میں لہریں دو دلوں میں میل ہے — یہ وہی کھیلا ہوا اپنا پرانا کھیل ہے
زندہ و پائندہ و رخشندہ و تابندہ باد — نسل آدم زندہ باد و نسل حوا زندہ باد

انسانی تہذیب کی ترقی سے خوش ہو کر خدا آدم و حوا کی نسل نوع آدم کی تعریف کرتا ہے۔

مرحبا اے نوع انساں مرحبا صد مرحبا — یہ تجلی ۔ یہ ترنم ۔ یہ تبسم ۔ یہ ضیا
یہ چمن یہ کھیت یہ تالاب یہ نہریں یہ بند — یہ کلس رنگین و زر افشاں منارے یہ بلند
یہ محل یہ طاق یہ گنبد یہ فوارے یہ باغ — یہ اجالے کے دریچے یہ اندھیرے کے چراغ
یہ خروش مطرباں یہ نغمہ چنگ و رباب — یہ ہجوم رنگ و روغن یہ وجود آب و تاب
یہ قبائیں یہ جواہر یہ نوادر یہ بخور — موج آب و موج رنگ و موج عود و موج نور
کون کہہ سکتا تھا وحشت کی بلا مل جائے گی — ضوفگن چہروں کے سانچے میں زمیں ڈھل جائے گی

مگر اپنی دنیاوی زندگی میں آدم و حوا اس قدر منہمک ہو جاتے ہیں کہ اپنے خالق و آقا خدا کو بھول جاتے ہیں۔ چنانچہ حوا آدم سے پوچھتی ہے۔

حوا۔ کون ہیں یہ بزرگوار اوپر؟
آدم۔ ان کو دیکھا تھا کبھی میں نے؟

—

خدا

ان کا ہے جو مادی بھول گئے ان کا جو ہے ملجا بھول گئے
افسوس کہ اپنے خالق کو یہ آدم و حوا بھول گئے

یہاں سے زوال آدم شروع ہوتا ہے۔ خدا کو بھولنے کے معنی یہ ہیں کہ آدم منصب خلافت الٰہی کو بھول جاتا ہے۔ یہ دراصل ابلیس کی فتح تھی جس نے آدم کو اس مقام بلند سے نیچے گرا دیا تھا۔ چنانچہ خدا یہ تصفیہ فرماتا ہے کہ:

زندگی ہے پیچ عرفان حقیقت کے بغیر
یہ ورق تاریک ہے مہر نبوت کے بغیر

اے سحر اس کو چھپا لے اس اندھیری رات سے
اے زمیں رخشندہ ہو جا مشعل آیات سے

ہاں چمک برق ہدایت ہاں برس ابر کرم
جاگ اے روحانیت کھل اے رسالت کے علم

خدا آدم کی راہ نمائی کے لیے لاکھوں پیغامبر بھیجتا ہے۔ ان پیغمبروں کے حالات زندگی اور ان کے پیغامات سے متعلق جوش صاحب کی اس کتاب کے صفحات ابھی خالی ہیں۔ جب آخری پیغمبر بھی دنیا سے پردہ فرما لیتے ہیں تو خدا تمام پیغمبروں کو جمع کر کے فرماتا ہے کہ اب تو کرۂ ارض جنت میں تبدیل ہو چکا ہوگا تو تمام پیغمبر اثبات میں جواب دیتے ہیں۔ خدا اس دنیا کے معائنے کے لیے آسمان اول پر تشریف لاتا ہے اور آسمان میں سوراخ کر کے دنیا کا نظارہ فرماتا ہے۔ یہ مغرب کا وقت ہے اور ایک شہر کی مسجد سے مغرب کی اذان سنائی دیتی ہے۔ خدا خوش ہو کر اطمینان کا سانس لیتا ہے کہ مسجد کے قریب ہی ایک محل پر نظر پڑتی ہے جو روشنیوں کی وجہ سے بقعۂ نور بنا ہوا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں وہاں سے گھنگھروؤں کی جھنکار میں کسی مغنیہ آتش نفس کی شعلہ نوائی امام مسجد کی تلاوت قرآن پر حاوی ہوتی ہوئی کنگورہ فلک سے ٹکراتی ہے جو ایک انتہائی جنسی اشتعال پیدا کرنے والا گانا گا رہی تھی۔ اسی محل کی دیوار کے زیر سایہ ایک گھاس پھونس کی جھونپڑی میں ایک مفلوک الحال غریب بیوہ عورت اپنی بیمار جوان بیٹی کو لیے بیٹھی ہے جو تیز بخار میں مبتلا ہے اور اس کی دوا دارو کے لیے بھی اس غریب عورت کے پاس دام نہیں ہیں۔ دوسری طرف محل میں جشن ناؤ و نوش برپا ہے اور عالم یہ ہے کہ۔ "چمن میں آج ہر گلبانگ نوشا نوش ہے ساقی" کا سماں ہے۔ ادھر وہ بوڑھی بیوہ ماں بیٹی کی بیماری سے مجبور ہو کر محل کے دروازے پر دستک دیتی ہے۔ اندر سے چند پہریدار برآمد ہوتے ہیں اور اس بڑھیا کو دھکے مار کر محل کی سیڑھیوں سے نیچے گرا دیتے ہیں۔ بڑھیا گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ بہت دیر کے بعد جب اسے ہوش آتا ہے تو وہ گرتی پڑتی اپنی کٹیا میں پہنچتی ہے تو کیا دیکھتی ہے کہ اس کی جوان بیٹی تڑپ تڑپ کر مر چکی ہے۔ مسجد سے فجر کی اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ محل سے مطربہ کی تان اذان سے زیادہ بلند ہے مگر ان سب سے زیادہ بلند بیوہ ماں کا گریہ و ماتم ہے جس نے ساکنان عرش کے قلوب کو تڑپا دیا۔ خدا

تمام پیغامبروں کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا ہے اور آسمان اول کا در بند ہو جاتا ہے اور وہ غصہ کے عالم میں عرش پر بیٹھ جاتا ہے کہ اتنے میں فرشتوں کی جانب سے کورس میں کچھ گانے کی آواز سنائی دیتی ہے۔

معترض فرشتوں کی یاد دہانی

الٰہی خلقت آدم کے ہیجانی ارادے ہیں
کروڑوں ہو نکلتے فتنے ہیں غلطاں ہم نہ کہتے تھے

تری تسبیح کو حاضر ہے لشکر خانہ زادوں کا — یہ آدم ہے بڑا باغی ذرا خاکی کھرا کھوٹا
ڈبو دے گا لہو میں دہر کو یہ خاک کا پتلا — بشر بے خیر شر ہے اسے پیدا نہ کر مولا
یہ آل تیغ ہے اولاد پیکاں ہم نہ کہتے تھے

جادو جذبہ و جاہ و جلال و جنگ کی دھن میں — عصا و چتر و مہر و افسر و اورنگ کی دھن میں
زبان و ملک و نسل و قوم و دین و رنگ کی دھن میں — دف و طنبور و طاؤس و عود و چنگ کی دھن میں
بہائے گا لہو گیتی پر انساں ہم نہ کہتے تھے

گریں گی بجلیاں امن و اماں کے آشیانوں پر — حکومت خار کی ہو گی مہکتے گلستانوں پر
صدائے کافری ٹھونگیں لگائے گی اذانوں پر — اٹھے گا رایت سرکار حق صرف آسمانوں پر
زمیں پر ثبت ہو گی مہر شیطاں ہم نہ کہتے تھے

سعادت کو گرایا جائے گا قعر نحوست میں — کتب خانے جلائے جائیں گے شہر جہالت میں
زبان صدق کاٹی جائے گی دار الخلافت میں — سر اخلاص تولا جائے گا صحن عدالت میں
یہ میزان خم شمشیر براں ہم نہ کہتے تھے

مرے گا یہ فقط اپنی ہی عشرت کے ہی جینے پر — یہ ٹانکے گا گہر سب اپنی ہی ٹوپی کے فیتے پر
ترس کھائے گا یہ ظالم نہ مُردے پر نہ جیتے پر — نگاہ قہر اب ہے کس لیے اپنے ہی جیتے پر
بشر ہے خسرو اقلیم عدواں ہم نہ کہتے تھے

بنے گا کوئے خوباں ہی نہ خال مرکز لذت — خرابات مغاں ہی میں نہ گونجے گی خناثیت
یہ سلے بڑھ جائے گی اتنی کہ ہر مستی و عشرت — حرم میں بھی کہ ہے دار الامان عفت و عصمت
جلائی جائے گی قندیل عصیاں ہم نہ کہتے تھے

کبھی طغیان وحشت سے کبھی جوش تمنا سے
کبھی دل کے اشارے سے کبھی اوروں کے ایما سے
کبھی آہنگ امشب سے کبھی گلبانگ فردا سے
کبھی ہیجان مستی سے کبھی دست زلیخا سے
پھٹے گا حضرت نائب کا داماں ہم نہ کہتے تھے

بنے گا شوق عصیاں کوہ آتش بار کا لاوا
نکالا جائے گا اس آدمی کا خلد سے باوا
خلافت کھائے گی اک روز دشت کفر میں کاوا
ہماری بات کو ٹھکرا کے اب کیوں ہے یہ پچھتاوا
بغاوت پر اتر آئے گا انساں ہم نہ کہتے تھے

ڈبوئے جائیں گی اعمال صالح جوئے غفلت میں
نہ رہنے پائے گی اک شمع بھی طاق رسالت میں
ترے کلمات ڈھالے جائیں گے سر تال اور گت میں
ترے آیات گائے جائیں گے محراب قرأت میں
فقط اک ڈھول بن جائے گا قرآں ہم نہ کہتے تھے

خداوندا! یہ انساں اہل طاعت پر ستم ڈھا کر
یہ عصیاں کار اعیان ولایت پر ستم ڈھا کر
بہ صد اقرار اقطاب ہدایت پر ستم ڈھا کر
امامت کو فنا کر کے رسالت پر ستم ڈھا کر
ترا بھی پھاڑ ڈالے گا گریباں ہم نہ کہتے تھے

قوائے این و آں کو فکر کی بھٹی میں پگھلا کر
محیط بے کران ثابت و سیار پر چھا کر
زمین و آسماں کی طاقتوں کو فتح فرما کر
حیات جاوداں کا تاج پیشانی پہ جھمکا کر
یہ کل ہو گا الوہیت کا خواہاں ہم نہ کہتے تھے

اس کے بعد جوش صاحب انسانی معاشرتی خرابیوں کے مختلف پہلوؤں پر تنقید کرتے ہیں۔ اسی سلسلے میں علماء دین کے خلوت کدوں کا ذکر بھی فرماتے ہیں۔ کہ:

چوں بہ خلوت می روند آں کار دیگر می کنند

علما جو عوام میں پاکیزگی اور طہارت کی علامت بن کر ظاہر ہوتے ہیں، اپنی خواب گاہوں میں زنان بازاری کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔ اسی کے ساتھ جوش صاحب ہمارے معاشرے کی مختلف رسوم پر بھی تنقید کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک قصہ یوں بیان کرتے ہیں کہ ایک لڑکا اختر ایک لڑکی سے محبت کرتا ہے۔ لڑکی مذہبی گھرانے کی تربیت یافتہ ہوتی ہے اور باوجود اختر سے محبت کرنے کے جب ماں باپ اس کی شادی ایک دیندار شخص سے کر دیتے ہیں تو

لڑکی اختر سے ملنا جلنا ترک کر دیتی ہے۔ ایک دن موقع پا کر اختر لڑکی سے ملنے کی کوشش کرتا ہے تو لڑکی یہ کہہ کر ملنے سے انکار کر دیتی ہے کہ

شادی کے بعد دل کو محبت کا حق نہیں

(مگر اختر پُرجوش اور بگڑے ہوئے لہجے میں جواب دیتا ہے)

کیا کہا دل: اور ہو واماندۂ رسم و رواج
قلب سے حق محبت چھین لے اور ازدواج
ازدواج انساں کے دور اہلیت کا شعار
ازدواج: ایام وحشت کی بھیانک یادگار
حبس میدان طلب، قحط دیار جستجو
حبسِ روح تمنا، قبر ذوق آرزو
خستگی عشق و اضمحلال شوق تشنہ کام
مقتل جذباتِ نورس مرگ سوز ناتمام
ایک قرب دائمی بیگانۂ رومان فصل
لذت ہجراں سے خالی اک مسلسل کرب وصل
اک سفینہ سست رو آشوب طوفاں کے بغیر
اک فریضہ مضمحل ہیجان عصیاں کے بغیر
الاماں یہ بدمزہ بے کیف شادی کا چلن
اک بندھا پانی ہے اک چکنا ہوا رخت کہن
جس میں یوں لپٹے ہوئے دو جسم رہتے ہیں سدا
بیشتر جو موت سے پہلے نہیں ہوتے رہا
ہڈیاں چبھتی ہیں گو اک دوسرے کے جسم کی
عمر بھر حاصل نہیں ہوتی ہے لیکن مخلصی
کیف تبدیلی سے جو ہونے نہیں دیتا دوچار
قبر یک رنگی و یکسانی میں دیتا ہے فشار

مشعلِ حسن و جوانی کو بجھا دیتا ہے جو
عشوہ و انداز کی تعمیر ڈھا دیتا ہے جو
بام دارائی سے عورت کو گرا دیتا ہے جو
خانۂ شوہر کا فرنیچر بنا دیتا ہے جو
دید کی ارزانیوں سے دل کو بھر دیتا ہے جو
حسن کے اجمال کو تفصیل کر دیتا ہے جو
آج یہ سو فیصدی بچے جو نا ہنجار ہیں
قربت بالجبر کی دراصل پیداوار ہیں

اس طرح معاشرے کے مختلف اداروں پر تنقید کر کے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مذہب کے توسط سے جو خدا کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ نہ قادر مطلق ہے اور نہ عالم کل ہے کیونکہ اس کی خواہش کے علی الرغم انسان شرف انسانیت سے بہرہ ور نہ ہو سکا۔ پھر تصور الٰہ کی مختلف منازل اور مدارج سے بحث کرتے کرتے کہتے ہیں کہ خدا کا تصور انسانی علم اور ذہنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ مختلف منازل سے گزرتا ہوا وحدت کے تصور تک پہنچا۔

اور پھر بھٹی میں یہ سارے خدا ڈالے گئے
اک نئے واحد خدا کی شکل میں ڈھالے گئے
اور مسلط ہو گیا دنیا پہ وحدت کا دروغ
اور ملا افسردۂ اصنام یزداں کو فروغ
جس کو تو اللہ کہتا ہے سن اے مرد خدا
نام ہے وہ تو کروڑوں خالقوں کے عطر کا
ایک دانا نے تراشا ہے اسے بہر بشر
وہم کے لاکھوں کروڑوں آبگینے توڑ کر
اب تو اے شیطاں! یقیں آیا خدا کچھ بھی نہیں
اک پرانے وہم باطل کے سوا کچھ بھی نہیں

کل تھا جس صورت سے ہندو اوری سس خنگ ولات
ہے یونہی تیرا خدا بھی آج رب کائنات
وہ بھی تھا اک کاہ ناداں اور یہ بھی کاہ ہے
پہلے ہورسس تھا الہٰ دہر اب اللہ ہے
ان تمام اسماء میں ہے اوہام کی صورت گری
فرق اتنا ہے وہ کل کی بات تھی یہ آج کی

اس کے بعد جوش صاحب لکھتے ہیں کہ یزداں اور ابلیس چونکہ دونوں تخیل بشری کے آفریدہ ہیں اس لیے اب عقل انسانی دونوں کو تسلیم نہیں کرتی اور اس طرح "قصہ ابلیس و یزداں ختم شد" کہہ کر یہ باب بند کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ ذہن انسانی اپنے محدود حواس کی بنا پر جب بھی کسی شے کا ادراک کرتا ہے تو اس کو مثالی سہاروں کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے انسان خواہ کتنا ہی عقلمندی کا دعویدار کیوں نہ ہو اگر کسی وجود کو ذہن میں مشخص کر کے اس کو کوئی نام دے گا تو وہ حقیقی خالق کائنات نہیں ہو سکتا بلکہ اس کی محدود قوت متخیلہ کا تراشا ہوا بت ہو گا۔ بقول غالب

اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

اور چونکہ لامحدود کا تصور محدود ذہن انسانی کے لیے محال ہے اس لیے ہم اس کو صرف قوانین فطرت اور اصول قدرت ہی کے توسط سے جان سکتے ہیں۔ جو اس کائنات میں حیات کی صورت گری میں محسوس کی جا سکتی ہے اور جو تبدیلی اور ارتقاء کے ذریعہ سے ہر لحظہ ایک نئی شان میں جلوہ گر ہے۔ جس کی بے پناہ طاقت مادے کے روپ میں ظاہر ہو رہی ہے۔ چنانچہ جب یہ مادی ارتقاء اس کرۂ خاکی کو اپنی جولانیوں کے لیے منتخب کرتا ہے تو کس طرح اپنے اظہار کے لیے مختلف روپ اختیار کرتا ہوا حیات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ جوش صاحب نے نہایت تفصیل سے اس ارتقا کو بیان کیا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے۔ ارتقا۔ یہاں سے کتاب کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔

ارتقا

رنگ و بو کا یہ ستارہ جس میں ہے یہ ریل پیل
زندگی کا جس میں کھیلا جا رہا ہے کب سے کھیل

یہ کرہ یہ آب و گل کی کارگاہ ہست و بود
قبل از پیدائش تاریخ ہے جس کا وجود

رقص میں کب سے ہے یہ رقاصۂ جادو ادا
ذہن میں آتا نہیں اندازہ ماہ و سال کا

عمر کیا ہے اس تماشا گاہ ابرو باد کی
غور کرتے وقت رک جاتی ہے سانس اعداد کی

یہ مہ و خورشید یہ سیارگان ہفتمیں
اور انھی کے ساتھ یہ گردندہ و غلطاں زمیں

ایک ہی جگہ میں رقصاں تھے یہ سب آتش جمال
جن کے گرداگرد تھا لرزندہ اک شعلوں کا جال

گرمیٔ انداز سے لیکن یہ بزم اتفاق
پل میں برہم ہو گئی کچھ یوں پھنکا صور فراق

شعلہ رو تارے جدا ہو کر پرافشاں ہو گئے
پھول گلدستے میں جتنے تھے پریشاں ہو گئے

اور پریشاں ہو کے تڑپے پیچ و خم کھانے لگے
گرد مہر ناز پرور ناچنے گانے لگے

مہر کا زور کشش یوں زلف جھٹکانے لگا
کوکبوں کا جذبۂ رم رقص فرمانے لگا

اور ہمارا یہ ستارا بھی بہ شوق آب و گل
بن گیا دوش خلا پر اک وجود مستقل

الاماں والحفیظ اس دور آتش کا سماں
آگ تھی صرف آگ پانی کا نہ تھا نام و نشاں

ارض تھی بحر خلا میں ایک انگاروں کی ناؤ
ایک آتش بار مجمع ایک وحشتناک الاؤ

ایک ہیبتناک بھٹی تھی خلا کے درمیاں
شعلۂ جنباں و آتش پرور و دوزخ فشاں

چہرۂ آتش سے خود اپنا گریباں پھاڑتی
گونجتی، بلتی، لڑھکتی، ہونکتی، چنگھاڑتی

دھوں دھنا دھن گھم گھما دھم دھم شوں شائیں بائیں
سنسناہٹ دھڑدھڑاہٹ گھڑگھڑاہٹ شائیں شائیں

الاماں یہ سخت آوازیں تھیں اور ارض سقیم
سنگ ریزے تھے حقیر اور خاک پارے تھے عظیم

یورش حدت سے حالت تھی چٹانوں کی تباہ
سینۂ گیتی سے اٹھتے تھے بخارات سیاہ

دھات کے پگھلے ہوئے انبار تھے بہتے ہوئے
آگ سے لوہا تھا پانی اور پتھر موم تھے

یہ زمیں تھی نام دوزخ ہر نفس جیتی ہوئی
کانپتی، جلتی، دہکتی، کھولتی، تپتی ہوئی

گونجتی اسٹیم سناتی ہوئی چنگاریاں
کپکپی، جھٹکے، دھماکے، زلزلے، شعلے، دھواں

پتھروں کی برہمی پگھلی ہوئی گندھک کا جوش
آتشیں لاوے کے فوارے چٹانوں کا خروش

کانپتے شعلوں کی لرزش کپکپاتی لو کا رم
سرخ انگاروں کی ہلچل تند آنچوں کا ادھم

کھولتے اجزائے گیتی کی بھیانک سسکیاں
اور اس دود و دخاں سے باہزاراں التہاب
وجد کرتا گرم برچھوں سے زمیں کو پاٹ کر
چیختی ، بھنتی ، ابلتی ، گونجتی ، گلتی رہی
سست گامی کی بدولت ٹھوکریں کھاتی رہی
جب ہوا پیدا مزاج نار میں کچھ اعتدال
اور پھر آہستہ آہستہ اک نئے آہنگ سے
جس سے پھوٹا چشمۂ گرم قلزاتِ خوش آب
خود کو آب تیرہ کی رفتار میں کھونے لگے
رفتہ رفتہ سینۂ گیتی میں دل بجنے لگا
اور پھر اشیم سے ٹھنڈی ہوائیں مس ہوئیں
آب و آتش میں بہم سرگوشیاں ہونے لگیں
اور تدریجاً یونہی گھٹتی رہی بے مہر آگ
باگ مڑتے ہی گھٹائیں بال بکھرانے لگیں
بدلیاں تپتی چٹانوں کو ہوا دینے لگیں
ایک طرح تو بصد ناز و ادا پڑنے لگی
ہو گیا فطرت کا دل فرطِ خوشی سے باغ باغ
ابر لہرانے لگے ، ٹھنڈی ہوا چلنے لگی
گنگناتے پیچ و خم کھاتے ہوئے دھارے چلے
اور موج باد و باراں ہو گئی مشغول کار
جسم کے دھاتوں کو خراشا معدنوں کو چھوڑ کر
سطح پر لا کر جمایا جو بہر صد زشت و خوب
دھوم سے مال غنیمت جمع کرنے کے لیے
معدنی ذرات سے بھرنے لگی جیب زمیں

دور تک اک ہول پرور جنبش دود و دخاں
سرخ کرنوں کو جھکا کر ناز افشاں آفتاب
سینۂ گیتی کے شعلوں کو زباں سے چاٹ کر
یوں ہی لاکھوں سال بیچاری زمیں جلتی رہی
وقت کی لاانتہا وسعت میں چکراتی رہی
مائل نرمی ہوا عفریت آتش کا جلال
پھوٹ نکلے کھولتے سوتے بطون سنگ سے
آ گئی روئے زمیں پر اک انوکھی آب و تاب
پستیوں میں سرخ ذرے دلنشیں ہونے لگے
آب کا گاڑھا پسینہ سازِ گل بننے لگا
سنسناتے پتھروں پر بوندیاں بجنے لگیں
بوندیوں کی گود میں چنگاریاں سونے لگیں
جس کے پھیلاؤ کی جانب موڑ دی قدرت نے باگ
شادیانوں کی صدائیں چرخ سے آنے لگیں
دل کشی سے ندیاں انگڑائیاں لینے لگیں
تیرہ غاروں میں سمندر کی بنا پڑنے لگی
بن گیا گردوں رقیق القلب ، گیتی تر دماغ
پیکر گیتی میں نبض مدعا چلنے لگی
آگ کے سینے پہ پانی کے خنک آرے چلے
اس کو کاٹا ، اس کو چھانٹا ، اس کو رگڑا بار بار
سنگ ریزوں کو تراشا پتھروں کو توڑ کر
سخت چیزوں کا برادہ ، بزم اشیا کا ربوب
بستیوں کی سمت طوفانی وزیرے چل پڑے
سر زمین تخلیق میں آنے لگی خاک سیہ

مدتوں دنیا رہی آشفتہ حال و سینہ چاک
تب کہیں جا کر فراہم ہو سکے اسباب خاک

اور پھر بحر حیات آور نے آ کر جوش میں
تو عروس خاکداں کو لے لیا آغوش میں

تشنہ کامی کو بالآخر جام کوثر مل گیا
بحر کیا پایا، عروس خاک کو بر مل گیا

اور پھر آئیں بلائیں کارواں در کارواں
برف باری زلزلے سیلاب صرصر آندھیاں

برف گرتی تھی بلائے آسمانی کی طرح
اور برس پڑتی تھی بعض اوقات پانی کی طرح

یخ کے تودوں کی بلندی بنی تھی میدانوں میں پہاڑ
یوں گرجتی تھیں گھٹائیں چیخ اٹھتے تھے پہاڑ

ہونکتے چشمے گرا کرتے تھے پیہم دھائیں دھائیں
برق رو جھکڑ چلا کرتے تھے دن بھر سائیں سائیں

ایسی گرتی تھیں چٹانوں پر کڑک کر بجلیاں
سرخ لو بن کر نکل پڑتی تھی پتھر کی زباں

تند خو طوفان آتے تھے اور اتنے متصل
کانپتا رہتا تھا تو مولود کہساروں کا دل

ژالہ باری کے دھماکے تھے چٹانوں پر مہیب
بولتے تھے ہر قدم پر شاہ طوفاں کے نقیب

قربت خورشید ادھر تھی اک بلائے بے اماں
اور ادھر بپھرے عناصر کی جنوں انگیزیاں

ہر نفس اک زلزلہ اک سیل اک طوفان تھا
اک گرج اک گونج اک ہنگامہ اک ہیجان تھا

الغرض دنیا نہ جب خوش تھی نہ اب آرام میں
پہلے بھٹی میں تھی مضطر اب بھنور کے دام میں

کم سنی اور کم سنی میں یہ بلائیں ہولناک
آگ سے کل نیم جاں تھی آج پانی سے ہلاک

ایک تھے دکھیا زمیں کے واسطے قہر و کرم
کل تھے اگنی کے مظالم آج اندر کے ستم

الغرض ناہید اور مریخ دونوں سخت تھے
کل تو اس کا قہر تھا اور آج اس کے عربدے

اپنا طوفانی سفینہ الغرض کھیتی رہی
ارض قرنوں کروٹوں پر کروٹیں لیتی رہی

صبر لیکن مدتوں کے بعد کام آ ہی گیا
تیرہ شب کو روز روشن کا پیام آ ہی گیا

آرزو دل کی بر آئی سینکڑوں قرنوں کے بعد
رک گئیں طوفاں کی نبضیں تھم گئی آواز رعد

آب و آتش کو سمویا وقت کی رفتار نے
سانس لی راحت کی پہلی مرتبہ سنسار نے

عارض مشکیں کی تابش میں تغزل کھو گیا
دیو جنبش نے کمر کھولی تلاطم سو گیا

ہو گئے طوفاں گزیدہ بحر و بر شاداں بحال
یوں عناصر میں ہوا پیدا نمایاں اعتدال

مژدہ ہستی لیے موج صبا آنے لگی
قلزموں نے ارغنوں چھیڑا زمیں گانے لگی

اور پھر اس دلفریب و دلنشیں انداز سے
خاک سے پودوں نے سر اپنے نکالے ناز سے

اور پھر سبزے کی جنبش سے زمیں لہرا گئی
اور پھر کچھ تھم کے اٹھی ایک موج سرخوشی
خاک نے انگڑائی لے کر اپنے جوڑے کو چھوا
زندگی کی طرفہ جنبش سے ملی روح جمود
کونپلیں بن بن کے پھوٹے خاکداں کے ولولے
گاہ کی نبضیں بھی زیر کہکشاں چلنے لگیں
دہر کے تاریک گوشے تک منور ہو گئے
زندگی کیا دولت بیدار ادراک و حواس
زندگی موج شعور و جوے دانش زندگی
خسرو گردون گرداں شاہ گیتی زندگی
شعلہ پرور شعلہ پیکر شعلہ افشاں زندگی
منتشر تاریخ دنیا کی مولف زندگی
زندگی سالار بحر و بر اسیر برق و باد
میر عالم فاتح پیدا و پنہاں زندگی
الغرض اب زندگی کا کارواں چلنے لگا
ابتدا بحر میں چلتا رہا بڑھتا رہا
بحر سے نکلا تو بحر بے کراں بن کر چلا
جتنا قدرت نے شکست و ریخت کا منتر پڑھا
ہر نفس ، ہر آن بام اوج پر چڑھتی گئی
اور بالآخر ہر طرف تھی زندگی ہی زندگی
کتنے قرنوں میں بڑھا یہ کاروان زندگی
عقل پر اوہام کے ہاتھوں نہ اتنا جور کر
سوچ تو کس منزل طوفاں سے آئی ہے حیات
کتنی لاتعداد زنجیروں کو ہے توڑے ہوئے

اسی ستارے کی مسیں بھیگی جوانی آ گئی
قلزموں میں زندگی کی اولیں جنبش ہوئی
آئی سطح بحر سے میلاد خوانی کی صدا
اولیں مضراب سے لرزاں ہوا تار وجود
مچھلیوں کی شکل میں ابھرے ارادے بحر کے
پانیوں پہ سانس یعنی کشتیاں چلنے لگیں
زندگی کی سانس سے جھونکے معطر ہو گئے
زندگی آواز اشارہ گیت آگاہی قیاس
سیل احساسات و طوفاں گاہ جنبش زندگی
زندگی ، تابندگی ، رقصندگی ، رخشندگی
تند طوفانی عناصر کی روانی زندگی
دین کے رنگیں صحائف کی مصنف زندگی
دہر کا دل خاک کی معراج فطرت کی مراد
کردگار انبیاء اخلاق یزداں زندگی
اور نئی شکلوں نئے اجسام میں ڈھلنے لگا
اور پھر آہستہ آہستہ زمیں پر آ گیا
پاؤں رکھتے ہی زمیں پر آسماں بن کر چلا
زندگی کا فاتحانہ عزم اتنا ہی بڑھا
جس قدر قدرت سے وہ لڑتی گئی بڑھتی گئی
مچھلیاں حشرات طائر چار پائے آدمی
سانس اکھڑ جاتی ہے اس تفسیر سے تاریخ کی
غور کر ابلیس میری کاوشوں پر غور کر
کتنی موتوں کو کچل کر مسکرائی ہے حیات
اور کلائی کتنے طوفانوں کی ہے موڑے ہوئے

کتنی تاریکی کے اندر پائی ہے راہ نجات
کتنے میداں تھے جہاں گر گر کے تھمی ہے حیات

کتنی اندھی طاقتوں سے کس قدر دکھ پائے ہیں
کس قدر سفاک قدرت کے طمانچے کھائے ہیں

جتدائی منزلوں کی بے پر و بالی کو دیکھ
قہر افگن مادے کی ہمت عالی کو دیکھ

قدرت جبار کا بھی خشک ہوتا ہے لہو
مادے کے فاتحانہ ولولوں کی روبرو

روح کے دھوکے میں عاقل کو نہ آنا چاہیے
مادے کا ذہن میں پرچم اڑانا چاہیے

آخری تین اشعار کے متعلق نعمت اللہ خاں نے کہا کہ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تین اشعار اس پوری نظم میں پیش کردہ تصور سے مختلف نظریہ پیش کر رہے ہیں۔ یہاں روح اور مادے کو دو الگ الگ وجود تصور کر کے روح کا انکار اور مادے کا اقرار کیا جا رہا ہے جبکہ اس تمام نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ مادہ تو صرف ایک توانائی مطلق کا صفاتی لباس ہے جس کے ذریعے سے وہ ہر آن نئے نئے روپ اختیار کرتی اور ہر لحہ نئی شان میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔ مادہ تو ہر آن اپنی شکل تبدیل کرتا رہتا ہے جبکہ توانائی ہر منزل پر اپنے وجود کا اثبات کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ارتقا کی ہر منزل پر مادی لباس بدل جاتا ہے مگر توانائی مطلق ناقابل تغیر ہے۔ مادی اشکال کی تبدیلی سے ظاہری صفات بدل جاتی ہیں جیسے پتھر کی صفات پانی کی صفات سے مختلف ہیں۔ پانی کی صفات سے ہوا کی صفات مختلف ہیں۔ پودوں کی صفات سے حیوانوں کی صفات مختلف ہیں وغیرہ۔ مگر ان اشکال اور ان کی صفات کی تبدیلی سے توانائی میں جو ہر وجود میں موجود ہے کوئی بنیادی تبدیلی واقع نہیں ہوتی اور جس کو جوش صاحب نے اوپر کے اشعار میں حیات کہا ہے وہ دراصل وہی توانائی ہی تو ہے جس کو روح بھی کہتے ہیں۔

سوچ تو کس منزل طوفاں سے آئی ہے حیات
کتنی موتوں کو کچل کر مسکرائی ہے حیات

اور یہاں موتوں کو کچلنے سے مراد مادی پیکر کی تبدیلی ہی تو ہے پھر مادے کو حقیقت اور روح کو دھوکا کیسے کہا جا سکتا ہے۔

میں نے کہا یہ بہت اچھا نکتہ تم نے نکالا ہے۔ اس پر خود جوش صاحب سے گفتگو

کرتے ہیں۔ چنانچہ جب دوسرے دن ہم جوشؔ صاحب کے گھر گئے تو ان کی توجہ اس جانب مبذول کروائی تو کہنے لگے تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں اس پر ضرور نظر ثانی کروں گا اور سائنس کی جدید تحقیقات کی روشنی میں اس میں ترمیم کروں گا۔ میں نے عرض کیا کہ طبیعیات کی جدید تحقیقات نے مادے اور روح کے فرق کو ختم کر کے ایک توانائی مطلق کا تصور پیش کیا ہے اور "ارتقا" کوئی موجود بالذات وجود نہیں ہے بلکہ پسندیدہ اور تعمیری تغیر کے لیے انسانی نقطۂ نظر سے عطا کردہ ایک قدر ہے۔ ہر تغیر کو ارتقا نہیں کہہ سکتے حالانکہ ہر تغیر توانائی مطلق کے اظہار کا آئینہ دار ہے اور وہ تمام تغیرات جن کا آپ نے اس قدر تفصیل سے اس نظم میں ذکر کیا ہے دراصل ایک توانائی مطلق کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتے ہیں جبکہ ہر تغیر مادے کی بے ثباتی کا شاہد ہے۔ جوشؔ صاحب نے کہا۔ تم بالکل درست کہتے ہو۔ یہ نظم دراصل اس زمانے کی لکھی ہوئی ہے جبکہ سائنسی تحقیقات توانائی کی ماہیت کی دریافت میں اس مقام تک نہیں پہنچی تھیں جس مقام پر وہ آج ہیں۔ میں ضرور ان اشعار پر نظر ثانی کروں گا۔ مگر نہ معلوم انھوں نے پھر اس میں کوئی تبدیلی کی یا نہیں کیونکہ پھر میری نظر اس کتاب پر نہیں پڑی اور اب تو مجھے امید نہیں کہ وہ کبھی منظر عام پر آ بھی سکے گی۔

مگر یہ طویل منظوم ڈرامہ جس آخری نظم پر ختم ہوتا ہے وہ اس قابل ہے کہ آج بھی ہر انسان اس میں دیے گئے پیغام کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لے۔ چنانچہ اسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "ارتقا کا اعلان" یہ آج انسان کی ترقی کی آخری منزل تو ہو سکتی ہے لیکن کل جب انسان اس منزل پر پہنچ جائے گا اور پھر کہے گا کہ "ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب" تو اس دور کا غالبؔ یا جوشؔ اس کی رہنمائی کس منزل کی طرف کرے گا اسے ہم مستقبل کے حوالے کر کے آج کے جوشؔ کے ارتقا کا اعلان سنتے ہیں۔

ارتقا کا اعلان

بہادرو وہ خم ہوئیں بلندیاں بڑھے چلو
پئے سلام جھک چلا وہ آسماں بڑھے چلو
فلک کے اٹھ کھڑے ہوئے وہ پاسباں بڑھے چلو
یہ ماہ ہے وہ مہر ہے یہ کہکشاں بڑھے چلو
لیے ہوئے زمیں کو کشاں کشاں بڑھے چلو

تمہارے زیر اقتدار مہر و ماہ ہے
تمہاری ذات اصل میں الوہیت پناہ ہے
تمہارا دل رسول ہے تمہارا ذہن الٰہ ہے
بس اک نفس کی دیر ہے بس اک قدم کی راہ ہے
ستارہ بار و مہ چکاں و خور فشاں بڑھے چلو

ابھی یہاں نہ حور ہے نہ خلد بے عدیل ہے
نہ طائروں کے چہچہے میں بانگ جبرئیل ہے
نہ سیم و زر کے قصر ہیں نہ موتیوں کی جھیل ہے
نہ اوج آب و رنگ ہے نہ موج سلسبیل ہے
ہنوز دہر کا لقب ہے خاکداں بڑھے چلو

تمہاری جستجو میں ہیں رواں جہاں پناہیاں
فلک کی شہریاریاں زمیں کی کج کلاہیاں
تم اور بساط بے دلی پہ دل شکن جماہیاں
ہر اک قدم پہ ہیں تو ہوں تباہیاں سیاہیاں
تباہیوں سیاہیوں کے درمیاں بڑھے چلو

ابھی تو دست آدمی میں تیر ہے کمان ہے
زمیں ابھی لڑائیوں شرارتوں کی کان ہے

ابھی تو طفلک حیات نو برس کی جان ہے
مزاج چھوئی موئی ہے دماغ دھان پان ہے
نہیں ہوئی ہے زندگی ابھی جواں بڑھے چلو

ابھی نشاں نہیں ملا ہے منزل نجات کا
ابھی تو دن کے ولولے میں وسوسہ ہے رات کا
ابھی لیا نہیں ہے دل نے جائزہ حیات کا
ابھی پتا چلا نہیں ہے سر کائنات کا
ابھی نظر نہیں ہوئی ہے رازداں بڑھے چلو

وہ عرش ہے یہ فرش ہے وہ دام یہ خیال ہے
نہ وہ کشادہ دام ہے نہ یہ شگفتہ جال ہے
نہ وہ برا شگون ہے نہ یہ خراب فال ہے
تمہاری راہ روک لے کسی کی یہ مجال ہے؟
زمیں ہی سنگ راہ ہے نہ آسماں بڑھے چلو

زمیں کے طول و عرض پر ہیں غم کی قہرمانیاں
چھڑی ہوئی ہیں دہر میں وباؤں کی کہانیاں
علی الدوام کھل رہی ہیں زیست کی کمانیاں
ہنوز زندگی پہ ہے اجل کی حکمرانیاں
حیات ابھی نہیں ہوئی ہے جاوداں بڑھے چلو

ابھی تو خاک کی کلی چٹک کے مسکرائی ہے
زمیں پہ لیلیٰ خودی ابھی تو گنگنائی ہے
ابھی تو فرش خاک پر حیات رسمائی ہے
ابھی تو اس زمین پر خدا ہی کی خدائی ہے
ابھی تو تم پہ عبدیت کا ہے گماں بڑھے چلو

گلوں میں اور خار میں خزاں میں اور بہار میں
فضائے لالہ رنگ میں ہوائے مشک بار میں
خروشِ برق و رعد میں سرودِ آبشار میں
ازل کے دن سے آج تک بشر کے انتظار میں
کھڑی ہیں کائنات کی جوانیاں بڑھے چلو

ابھی تو قصرِ زندگی کی نیو ہے حباب پر
نہ سطحِ خاک پر نہ مہر موجِ آب پر
نہ حلقہ پائے وقت میں نہ قبضہ ہے شباب پر
نہ پاؤں ماہتاب پر نہ ہاتھ آفتاب پر
ابھی تو آسمان پر ہے کہکشاں بڑھے چلو

آج انسان نے پاؤں ماہتاب پر تو رکھ دیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہاتھ کب آفتاب رکھتا ہے۔

قریب ختم رات ہے رواں دواں سیاہیاں
سفینہ ہائے رنگ و بو کے کھل رہے ہیں بادباں
فلک دھلا دھلا سا ہے زمین ہے دھواں دھواں
افق کی نرم سانولی سیاہیوں کے درمیاں
مچل رہی ہیں زر نگار سرخیاں بڑھے چلو
.... بڑھے چلو

اور اس طرح انسانیت کی اس کے شاندار اور اس کی عظمت کے شایانِ شان مستقبل کی طرف رہنمائی کر کے یہ طویل منظوم ڈرامہ جس کو جوش صاحب نے "حرفِ آخر" کا نام دیا ختم ہو جاتا ہے۔ میں نے اس جانب بھی جوش صاحب کی توجہ مبذول کروائی تھی کہ انسانی ارتقا کے سفر میں کوئی فکر "حرفِ آخر" نہیں ہو سکتی۔ آج کے ذہن کا حرفِ آخر کل کی فکر کا حرفِ آغاز ہو سکتا ہے۔ اس لیے کسی خیال یا نظریے کے متعلق یہ کہنا کہ یہ حرفِ آخر ہے خود نظریہ ارتقا کی نفی کرنا ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ یہ تو تم بالکل درست کہہ رہے ہو کہ

کوئی انسانی فکر حرفِ آخر نہیں ہو سکتی مگر ہر زمانہ کی نسبت سے جدید ترین تحقیقات کی روشنی میں نمودار ہونے والی فکر کو اس دور کی حد تک حرفِ آخر سمجھا گیا۔ میں نے عرض کیا کہ اسے بھی ہم جدید فکر تو کہہ سکتے ہیں مگر حرفِ آخر کا حکم نہیں لگا سکتے۔ میں نے کہا کہ اب آپ تصورِ الٰہی کو لے لیجیے ہر دور میں انسانی ذہن کی رسائی کی حد تک خارجی مظاہرِ قدرت اپنے اپنے زمانوں میں انسان کے الٰہ رہ چکے ہیں۔ سورج، چاند، دریا، سمندر، طوفان، درخت، پتھر وغیرہ۔ اور ہر دور میں ان بتوں کو آخری حقیقت ثابتہ کے طور پر پوجا گیا مگر ہر بت دراصل علم کے خزانے کا ایک قفل ثابت ہوا جو انسانی تجربات تحقیقات اور اپنے دور کے جدید ترین علوم کی کنجیوں سے کھلتا رہا اور اس بت کے ٹوٹنے یعنی اس قفل کے کھلنے کے بعد جو علم کے خزانے دریافت ہوئے اور جن کی وجہ سے ذہنِ انسانی نئے نئے حقائق سے آشنا ہوتا گیا تو قدیم نظریات بھی بدلتے گئے اور انسانی علم ترقی کے مدارج طے کرتا رہا اور یوں ہر دور کی فکر کا حرفِ آخر نئے دور کی فکر کا حرفِ آغاز بنتا چلا گیا۔

غالب نے ایک شعر میں اس مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے کہ حسنِ مطلق یا توانائی مطلق اپنے ظہور کے لیے صفات کا جامہ زیب تن کرتی ہے تو جگہ جگہ بندہائے قبا بھی ٹانک کر حسنِ معنی کو پوشیدہ کر دیتی ہے مگر جب علمِ انسانی ہر بندِ قبا کھولتا ہے تو اس میں پوشیدہ نئے نئے علوم کی بوقلمونی سے اس کی نگاہ خیرہ ہو جاتی ہے۔ شعر یہ ہے:

اسد بندِ قبائے یار ہے فردوس کا غنچہ
اگر وا ہو تو دکھلا دوں کہ اک عالم گلستاں ہے

اس شعر پر جوش صاحب ایک دم چونک کر کہنے لگے کہ غالب کے اس شعر کو آپ نے جس مقام پر استعمال کیا ہے اس کی داد نہ دینا بڑی ستم ظریفی ہوگی۔ اس وقت تو غالب کی روح بھی وجد کر رہی ہوگی۔ واہ واہ سبحان اللہ۔

میں نے کہا کہ بندِ قبا کھولنے کی اصطلاح اس معنی میں آپ نے بھی تو کئی جگہ استعمال فرمائی ہے۔ مثلاً موجد و مفکر میں آپ نے کہا ہے کہ

انجم و ذرات کے بندِ قبا کھولے گئے
سائے تک ناپے گئے اور عکس تک تولے گئے

ایک اور جگہ اس سے بھی زیادہ کھل کر آپ نے کہا ہے:

جھک گئی ہستی مودب ہو گئے ارض و سما

شاہدان دہر نے وا کر دیئے بند قبا

تحقیق اور تفتیش کے ذریعے سے حقائق کائنات پر پڑے ہوئے حجابات کو اٹھانا دراصل بند قبا کھولنا ہی تو ہے۔ جیسے جیسے راز ہائے سربستہ کا انکشاف ہوتا جا رہا ہے، آخری حقیقت کے طور پر تسلیم شدہ نظریہ بھی بدلتا جا رہا ہے۔ اسی لیے جب تک یہ سلسلہ جاری رہے گا کوئی فکر حرف آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکے گی۔ اب آپ نے آخری حقیقت کے طور پر یہ اعلان فرما دیا کہ:

روح کے دھوکے میں عاقل کو نہ آنا چاہیے

مادے کا ذہن میں پرچم اڑانا چاہیے

لیکن آج آپ کی سطح مشاہدہ بدلی اور آپ نے سائنس کی جدید تحقیقات کا مطالعہ فرمایا تو پھر یہ اعلان بھی کر دیا:

چلتا نہیں کچھ زور تماشائی کا　　حافظ ہے بس اللہ ہی بینائی کا

جب سطح مشاہدے کی بدلی تو کھلا　　ہر مادہ مرکب ہے توانائی کا

تو آج کی سائنسی فکر نے مادے اور روح کی اس دوئی کو ختم کر دیا بلکہ روح کے قدیم تصور کو بھی بدل کر انرجی یا توانائی کا تصور پیش کیا ہے مگر ہم اس تصور کو بھی حرف آخر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ بقول غالب:

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود

ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اور کون کہہ سکتا ہے کہ انسان کبھی اس قابل ہو بھی سکے گا کہ وہ اپنی فکر کے نتائج کو حرف آخر کہہ سکے۔ جوش صاحب جو بہت غور سے میری باتیں سن رہے تھے اور میری تائید کر کے میری ہمت بڑھا رہے تھے، آخر میں فرمانے لگے۔ "خورشید علی خاں! یہ جو کچھ آپ نے فرمایا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک ایک لفظ سچ ہے لیکن آپ شاید روح اور مادے ہی میں الجھ کر رہ گئے۔ حالانکہ اس پوری نظم میں میں نے جو اصول پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ مذاہب جو خود کو

"حرف آخر" کے طور پر پیش کر کے فکر انسانی کے ارتقا پر تحدید عائد کرتے ہیں وہ حرف آخر نہیں بلکہ "ارتقا" "حرف آخر" ہے۔ غالباً آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہوں گے۔ اب اس سے زیادہ میں کچھ نہ کہوں گا۔

"ایں سخن را فاش تر گفتن خطاست"

اتنے میں قریب کی مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز سنائی دی تو کہنے لگے۔ موذن مرحبا بروقت بولا۔ تری آواز مکے اور مدینے۔ لو میاں وہ شعلۂ رو سیاہ غروب ہو چکا ہے۔ اب وقت ہو چکا ہے کہ بحث کی سنجیدگی کو غرق مے ناب کر دیں۔ اتنے میں اور احباب بھی آ گئے اور ہم دونوں بھائی اجازت لے کر اپنے گھر آ گئے۔

۱۹۷۱ء کے واقعات

پرویز علی خان کی کامیابی کی پارٹی

یہ واقعہ ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء کا ہے کہ میرے بیٹے پرویز علی خاں نے سرگودھا ایر فورس کالج سے آخری امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ ہم نے اس خوشی میں تمام خاندان والوں کی دعوت کی تو سب نے اصرار کیا کہ اس تقریب میں جوش صاحب کو مہمان خصوصی کے طور پر مدعو کیا جائے۔ چنانچہ میں اور نعمت، جوش صاحب کے گھر گئے اور جیسے ہی ہم نے ان سے اپنی پارٹی میں شرکت کی درخواست کی وہ فوراً تیار ہو کر ہمارے ساتھ ہو لیے۔

سب احباب نے پرویز علی خاں کے ساتھ ساتھ جوش صاحب کو بھی پھول پہنائے۔ گل پوشی کے بعد جوش صاحب نے پرویز علی خاں سے مخاطب ہو کر ایک مختصر تقریر فرمائی۔ پہلے تو انھوں نے پرویز کو امتیازی کامیابی پر مبارک باد دی پھر فرمایا کہ "آپ نے اپنے بزرگوں کی پیروی میں فوج کی ملازمت اپنے لیے پسند فرمائی۔ اس میں شک نہیں کہ ہم پٹھان جب ہندوستان میں آئے تھے تو ہم نے بازوئے شمشیر زن کے ذریعے سے یہاں اپنا مقام پیدا کیا تھا مگر اس دور کے طریقہ جنگ اور آج کے طریقے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہمارے بزرگ میدان جنگ میں صرف اس دشمن سے لڑتے تھے جو ان کے مقابلے میں انہی کی طرح ہتھیاروں سے لیس ہوا کرتا تھا مگر آج مخالف ملک کی شہری آبادیوں پر فضائیہ کے ذریعے سے بم گرائے جاتے ہیں اور معصوم بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور پرامن انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا جاتا ہے۔ یہ عمل کسی طرح بھی شیوۂ مردانگی نہیں ...... میرے بیٹے! ابھی ہمارے سامنے جنگ کے بہت سے میدان ہیں۔ سب سے بڑی جنگ تو ہم کو جہالت کے خلاف لڑنا ہے۔ پھر بے روزگاری، بیماری، بھوک افلاس، معاشی معاشرتی اونچ نیچ اور استحصال کے خلاف کثیرالجہات

جنگ لڑتا ہے۔ نوع انسان کو ہر قسم کی ذہنی غلامی سے نکال کر اس کو مقام الوہیت عطا کرتا ہے اور اس راہ میں حائل ہونے والی ہر طاقت سے جنگ کرتا ہے مگر اس کے لیے پہلے آپ کو خود ذہنی اور جسمانی طور پر تیار ہونا ضروری ہے اس لیے خوب گھبرا گھبرا کر علم حاصل کرو۔ یہ بات بھی خوب یاد رکھو کہ کسی ملک کا تحفظ صرف اس کی جغرافیائی سرحدوں ہی کی حفاظت میں نہیں ہوتا حالانکہ یہ بھی بہت ضروری ہے مگر اس سے زیادہ ضروری بات اس مملکت میں رہنے والوں کی فکری علمی اور عقلی سرحدوں کی نگرانی ہے۔ آج کا دشمن اپنے بے پناہ پروپیگنڈے کے ذریعے سے آپ کی فکری صلاحیتوں پر حملہ کرتا ہے اور اس کے ذریعے سے آپ میں داخلی انتشار پیدا کر کے آپ کے اتحاد کی طاقت کو پارہ پارہ کر دیتا ہے اور آپ کو داخلی طور پر کمزور کر کے آپ کی قوت مدافعت کو ختم کر دیتا ہے اور اس طرح اپنے مقاصد حاصل کرتا ہے۔ ہم دشمن کے اس وار کا مقابلہ اپنی ذہنی اور فکری صلاحیتوں کو طاقتور بنا کر ہی کر سکتے ہیں۔ یہ جو قدرت نے آپ کو اپنی شخصیت کی تعمیر کا موقع عطا فرمایا ہے اس کا ایک ایک لمحہ کار آمد بناؤ اور زندگی کے میدان میں ایک مکمل باصلاحیت سپاہی بن کر اس اکاڈمی سے باہر آؤ۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں"۔ جوش صاحب کی تقریر ختم ہوئی تو سب نے کھانا کھایا اور جب ناؤ نوش سے فارغ ہو گئے تو جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ جوش صاحب مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے کہ باریک مال پیش کروں یا موٹا مال؟ پھر خود ہی فرمایا، اچھا آج آپ لوگوں کو اپنی ہجرت کا کرب سناتا ہوں جس کو میں نے "ہچکیوں کا قتفہ" کہا ہے۔

سب نے ایک ساتھ کہا۔ ارشاد ارشاد۔ ضرور سنایئے۔

جوش صاحب نے مجھ سے کہا، موٹے مال کی بیاض تو دیجیے۔ میں نے بیاض پیش کی۔ وہ نظم آپ بھی سنیے۔

ہچکیوں کا قتفہ

اب نہ دریا ہیں نہ گلزار چنا جور گرم
کوئی مونس ہے نہ غم خوار چنا جور گرم

اب نہ گھنگھروں کے سمن زار چنا جور گرم
اب نہ پازیب کی جھنکار چنا جور گرم

اب نہ وہ مصر کا بازار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

تنگ انگنائی میں ساون کی جھڑی روتی ہے
شب کو بجتی نہیں رہ رہ کے گھڑی روتی ہے
آب رو تربت ماضی میں پڑی روتی ہے
سامنے حرمت اجداد کھڑی روتی ہے

اب نہ وہ در نہ وہ دربار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

لکھنؤ کے وہ سلیقے نہ اودھ کے آداب
نہ عنب ہی کے وہ دریا نہ طرب کے گرداب
اب نہ جمنا کا وہ بچپن نہ وہ گنگا کا شباب
اب نہ وہ چنگ و دف و طبلہ و طاؤس و رباب

اب نہ وہ کاکل و رخسار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

نطق طفلاں میں نہیں زمزمہ چنگ و رباب
روئے دختر بھی ہے افسردہ و زرد و بے آب
چشم فرزند میں بھی درد کے لاکھوں گرداب
در پہ ہے شحنۂ ساقی بھی لیے فرد حساب

اور بیگم بھی ہیں بیمار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

لاغری سے ہے خیالات کا کرتا ڈھیلا
سر ہے برسات میں بیٹھا ہوا کچا ٹیلا
زہر حالات سے غیرت کا بدن ہے نیلا
خیر سے روئے مقدس بھی ہے سیلا سیلا

تن بھی گرتی ہوئی دیوار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

پاؤں میں گردش پیہم سے ہیں لاکھوں چھالے
دھوپ وہ جس سے بیاباں میں ہرن ہوں کالے
گرم سڑکوں پہ ہیں کرنوں کے کروڑوں بھالے
کیا مجھے گھور رہا ہے ابے تانگے والے

بول ہاں تو بھی مرے یار چنا جور گرم

کوئی نقاد زباں ہے نہ ادا سنج سخن
باد کی رو میں دیا برق کی زد پر خرمن
للہ الحمد کہ اک لاشہ ہوں بے گور و کفن
مژدہ اے دل کہ مری عظمت دیرینۂ فن

پھر رہی ہے سر بازار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم

اب تو ہر سانس ہے اک معرکہ بدر و حنین
شور طوفان عداوت ہے میان قطبین
مجھ پہ حملے کے لیے فوج عدو ہے بے چین
یوں کراچی میں ہوں جس نہج سے مقتل میں حسین

سب شہادت کے ہیں آثار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

پاؤں میں رشتۂ پرخار اجی کیا کہنا
لب افسردہ پہ اشعار اجی کیا کہنا
دوشِ تخییل پہ کہسار اجی کیا کہنا
سامنے ہے رسن و دار اجی کیا کہنا

سر پہ چلتی ہوئی تلوار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

راگ طوفان نے چھیڑا ہے ہاہا ہاہا
واہ کیا طرفہ تھپیڑا ہے ہاہا ہاہا
کیا دریچے پہ دریڑا ہے ہاہا ہاہا
غرق ہونے ہی پہ بیڑا ہاہا ہاہا

موت کہتی ہے چلو اس پار چنا جور گرم
زندگی اب ہے طرح دار چنا جور گرم
چنا جور گرم بابو میں لایا مجیدار چنا جور گرم

اس کے بعد سب نے فرمائش کی کہ "گل بدنی" سنائیے۔ چنانچہ جوش صاحب نے اپنی مشہور نظم گل بدنی سنانی شروع کی۔

گل بدنی

کیا شعلہ طراز وہ اللہ حسن ہے
کیا لرزشِ تابندگیٔ سیم تنی ہے
رشکِ مہ کنعاں ہے غزالِ ختنی ہے
افشاں ہے کہ آوارگیٔ دُر عدنی ہے

تلووں میں بپا غلغلۂ سینہ زنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

ہر موجۂ انفاس میں دجلے کی روانی
ہر لرزشِ مژگاں میں نئی خواب فشانی
ہر لوچ میں بھیگی ہوئی شاخوں کی کہانی
ہر تان میں پربت کا برستا ہوا پانی

ہر بول میں اک چشمۂ شیریں سخنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

پلّو ہے یہ سینے پہ کہ اک موجِ حبابی
ماتھا کہ خنک صبح کی تنویرِ شبابی
پیکر ہے کہ انسان کے سانچے میں گلابی
آنکھیں ہیں کہ بہکے ہوئے دو مست شرابی

قامت کا خم و پیچ کہ سروِ چمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

زلفیں ہیں شبِ مالوہ، رخ صبحِ بہاراں
شوخی ہے کہ بھونچال، ترارے ہیں کہ طوفاں
عشوے ہیں کہ شمشیر، تبسم ہے کہ پیکاں
مہندی کی سجاوٹ کہ ہتھیلی پہ گلستاں

مکھڑے کی دمک ہے کہ عقیقِ یمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

آواز میں ہے سلطنتِ زمزمہ خوانی
انداز میں ہے جنبشِ برّاں و سنانی
ہر ایک بنِ مو سے ابلتی ہے جوانی
اٹھتی ہے مسامات سے اک بھاپ سی دھانی

اک چادر خوشبو ہے کہ آنگن میں تنی ہے
کیا گل بدنی ۔ گل بدنی ۔ گل بدنی ہے

گردن میں چمن ہار کلائی میں ہے کنگن
کورا ہے جو پنڈا تو جنوں خیز ہے ابٹن
جولاں ہے جوانی کے دھندلکے میں لڑکپن
ابھری ہوئی چولی ہے چھلکتا ہوا جوبن
گل رنگ شلوکا ہے قبا نارونی ہے
کیا گل بدنی ۔ گل بدنی ۔ گل بدنی ہے

ہونٹوں پہ ہے مسکان کہ ہے رات کی رانی
نقش قدم ناز ہے یا تاج کیانی
کشتی کا تلاطم ہے کہ نوکار جوانی
ساحل کا نخستاں ہے کہ پوشاک ہے دھانی
برکھا کی خنک چھاؤں ہے یا زلف گھنی ہے
کیا گل بدنی ۔ گل بدنی ۔ گل بدنی ہے

بل کھاتی لٹوں میں ہے یہ پیشانی رخشاں
یا سایۂ ظلمت میں ہے اک چشمۂ حیواں
ٹیکا ہے کہ ساگر میں جواں چاند ہے غلطاں
ہاتھوں پہ یہ مکھڑا ہے کہ ہے رحل پہ قرآں
تل ہے کہ دمکتی ہوئی ہیرے کی کنی ہے
کیا گل بدنی ۔ گل بدنی ۔ گل بدنی ہے

کس لمحے سے چونکی ہے دھندلکے کو جگانے
الجھی ہوئی زلفوں میں دھواں دھار فسانے
بن دھوئے خد و خال میں نیندوں کے خزانے
انگڑائی کی جھنکار میں ندی کے ترانے

رخسار میں چھپتی ہوئی اعضا شکنی ہے
کیا گل بدنی ۔ گل بدنی ۔ گل بدنی ہے

ناہیں ہیں کہ اک فوج کھڑی لوٹ رہی ہے
توڑا ہے کہ چھاتی کو زمیں کوٹ رہی ہے
بیندی ہے کہ پربت پہ کرن پھوٹ رہی ہے
انگڑائی کا خم ہے کہ دھنک ٹوٹ رہی ہے

مکھڑا ہے یہ قامت پہ کہ نیزے پہ انی ہے
کیا گل بدنی ۔ گل بدنی ۔ گل بدنی ہے

پہلو میں خموشی ہے شبستاں میں تکلم
جلوت میں تواضع ہے تو خلوت میں تحکم
مجرے میں ہے تکرار تو مجرے میں ترنم
مسند پہ خنک موج ہے بستر پہ تلاطم

آغوش میں تلوار ہے گھونگٹ میں ہنی ہے
کیا گل بدنی ۔ گل بدنی ۔ گل بدنی ہے

پہنچا ہے سر بام حرم دیر کا طوفاں
رقصندہ ہے پھر وہ صنم فتنۂ دوراں
عزنی میں پکار آؤ کہ پھر کفر ہے جولاں
موباف کے لچھے میں لپیٹے ہوئے ایماں

اب آئے جسے حوصلہ بت شکنی ہے
کیا گل بدنی ۔ گل بدنی ۔ گل بدنی ہے

اس سن میں بھی پڑتی ہیں چھلاوؤں پہ نگاہیں
اب بھی ہیں وہی شوق کی اگلی سی کراہیں
اب بھی یہ دعا ہے کہ ملیں پھول سی باہیں
مرجائیں ہم اے جوش بتوں کو جو نہ چاہیں

گھٹی میں پڑی عاشقی و برہمنی ہے
کیا گل بدنی، گل بدنی، گل بدنی ہے

اس کے بعد جوش صاحب نے کچھ رباعیات سنائیں پھر مجھ سے کہا کہ اب ہمارے استقبال کا وقت ہو گیا ہے ہمیں گھر پہنچاؤ۔ جوش صاحب کے رخصت ہونے کے بعد سب لوگوں نے نعمت اللہ خاں سے فرمائش کی کہ وہ اپنے پسندیدہ شعرا کا کلام سنائیں۔ نعمت کو جوش، فیض، حبیب جالب اور ساحر لدھیانوی کا بہت سا کلام یاد تھا اور ان کی ایک خاص خوبی یہ تھی کہ وہ شعر کی روح میں اتر کر کلام پڑھتے تھے اور شعر کی تمام جذباتی کیفیت کو سامعین میں منتقل کر دیتے تھے۔ انھوں نے حبیب جالب کی نظم۔ ایسے دستور کو، صبح بے نور کو میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا" اسں طرح پر تاثیر انداز میں سنائی کہ سب لوگ سحرزدہ ہو کر .... میں نہیں جانتا، میں نہیں مانتا" کورس کے انداز میں کہنے لگے۔ غرض یہ محفل نعمت کی وجہ سے بہت دلچسپ رہی اور جوش صاحب کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ ہائے افسوس کہ نعمت کے ساتھ یہ محفل آخری تھی۔

نعمت اللہ خاں جناح ہسپتال میں:

اس کے کچھ دنوں بعد ان کو دل کا دورہ پڑا اور وہ جناح ہسپتال میں داخل کر دیے گئے۔ جوش صاحب کو جب معلوم ہوا تو میرے ساتھ جناح ہسپتال گئے اور بہت دیر تک نعمت کے پاس بیٹھے رہے۔ اتنے میں کچھ لڑکیاں جن کا تعلق کراچی یونیورسٹی کے شعبہ عمرانیات سے تھا، ایک سوالنامہ لے کر نعمت کے کمرے میں آگئیں۔ وہ دراصل یہ معلوم کرنا چاہتی تھیں کہ جن لوگوں کو دل کی بیماری لاحق ہو جاتی ہے، ان کی گھریلو زندگی کیسی ہوتی ہے۔ ان کے کتنے بچے ہیں۔ ان کی آمدنی کیا ہے۔ وہ کس محکمہ میں کام کرتے ہیں یا ان کے کاروبار کی نوعیت کیا ہے۔ اگر شادی شدہ ہیں تو بیوی سے ان کے تعلقات کیسے ہیں؟ بہت سے سوالوں کے جوابات ہاں یا نہیں میں تھے۔ جب وہ لڑکیاں نعمت سے سوالنامہ پر کروا چکیں تو جوش صاحب نے کہا کہ کیا تم مجھ سے کوئی سوال نہیں پوچھو گی۔ میں تو پیدائشی دل کا مریض ہوں۔ میں نے ان لڑکیوں سے جوش صاحب کا تعارف کروایا تو ان میں سے ایک لڑکی جس کا نام

فرزانہ تھا اور جو دوسری لڑکیوں کی نسبت زیادہ پر کشش شخصیت رکھتی تھی جوش صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگی کہ جوش صاحب اگر آپ اہل دل نہ ہوتے اور آپ کے دل میں ہر گل سے زخمی ہونے کی صلاحیت نہ ہوتی تو آپ اتنے عظیم شاعر کس طرح ہوتے اور یہ بھی تو آپ کی رباعی ہے۔

پہلو میں مرے دیدۂ پر نم ہے کہ دل
معبود یہ مقیاس تپ غم ہے کہ دل
ہو ذرہ بھی کج تو بال پڑ جاتا ہے
یہ شیشۂ ناموس دو عالم ہے کہ دل

جوش صاحب انتہائی پر مسرت حیرت سے اس ذہین طالبہ کا منہ تکنے لگے اور کہا کہ اتنی مشکل رباعی تمھیں کس طرح یاد رہی۔ میں نے تو آج تک اردو کے کسی استاد کے منہ سے یہ رباعی نہیں سنی۔ لڑکی نے کہا جوش صاحب! آپ میرے بہت پسندیدہ شاعر ہیں اور میں نے آپ کا کلام ہمیشہ سبقاً پڑھا ہے۔ یہ میری انتہائی خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے ملاقات ہو گئی۔ پھر اس نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب نے چند رباعیات سنائیں جو ان لڑکیوں نے لکھ لیں۔ ان میں چند حسب ذیل ہیں۔

جس وقت یہ فیض فکر و عقل جولاں
انسان بنے گا تاجدار دوراں
مجھ کو نہ ملا تو اسے نگار آفاق
بچ کر مری اولاد سے جائے گا کہاں

اس دھن میں کہ دل عقل کے شیدا ہو جائیں
آفاق کے اسرار ہویدا ہو جائیں
مدت سے گرا رہا ہوں تخم افکار
شاید کہ نئے درخت پیدا ہو جائیں

قدرت سے کرے گی عقد نسل نوخیز
ہو گا مرے فرزند کا دل زمزمہ ریز
شمس و قمر و نجوم و عرش و کرسی
کل میری بہو آئے گی لے کر یہ جہیز

غرض کافی دیر تک جوش صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد لڑکیوں نے اپنی اپنی کاپیوں پر جوش صاحب کے آٹوگراف لیے۔ جوش صاحب نے فرزانہ کی کاپی پر یہ شعر لکھ کر

دستخط کیے۔

متاعِ کفر ملے یا سعادتِ ایماں
جلاؤ مشعلِ تحقیق ہر چہ بادا باد

تقریباً دو ڈھائی گھنٹے بیٹھ کر جب ہم لوگ چلنے لگے تو جوش صاحب نے نعمت سے کہا بھائی تم جلدی تندرست ہو کر آ جاؤ ہماری محفلیں تمہارے بغیر سونی ہو گئی ہیں۔ اتنے میں ڈاکٹر صاحب آ گئے۔ جوش صاحب نے ان سے کہا کہ جناب آپ ہمارے دوست کو گھر جانے کی اجازت کب دے رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا یہ کل اپنے گھر جا سکتے ہیں بشرطیکہ گھر جا کر یہ ان ہدایات پر عمل کریں جو ان کو یہاں دی جائیں گی۔ ہم لوگ ہسپتال سے رخصت ہو کر برنس روڈ آئے وہاں لسی کی ایک دوکان ہے جس کا نام دلبہار لسی ہے۔ جوش صاحب کو یہاں کی لسی بہت پسند ہے۔ چنانچہ ہم دونوں نے وہاں لسی پی اور گھر آ گئے۔

۲۶ فروری ۱۹۷۱ کو جمعہ کے دن چونکہ مجھے ڈیوٹی پر جانا پڑا تھا۔ اس لیے میں دن میں جوش صاحب کے گھر نہ جا سکا تو شام کو ان کا ٹیلی فون آیا کہ اے میاں آج سارا دن تمہارا انتظار کرتا رہا تم کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے کہا جوش صاحب آج ایک جہاز آنے والا تھا اس لیے میری ڈیوٹی لگ گئی تھی۔ جوش صاحب نے کہا کل ہفتے کے دن اگر فرصت ہو تو شام کو آ جاؤ۔ ٹی وی اسٹیشن چلنا ہے۔ چنانچہ دوسرے دن بروز ہفتہ ۲۷ فروری میں سہ پہر میں جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ان کو لے کر ٹی وی اسٹیشن چلا گیا۔ وہاں جوش صاحب نے اپنی ایک طویل نظم "موجد و فکر" سنائی جس کو فلما لیا گیا۔ یہ نظم ۲ مارچ کو ٹیلی کاسٹ کرنے کے لیے فلمائی گئی۔ یہ نظم "الہام و افکار" میں موجود ہے لیکن یہ مسدس اس قابل ہے کہ اس کو یہاں نقل کیا جائے۔ اس نظم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ ایجادات انسانی تہذیب اور تمدن کی بنیادی ضرورتیں پوری کرتی ہیں اور انسانوں کو ہر قسم کی سہولتیں فراہم کرتی ہیں مگر موجد کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں مگر مفکر جو تہذیب انسانی کو شرافت، نیکی اور اخلاقی قدریں عطا کر کے محبت اخوت اور اتحاد کا درس دیتا ہے اور

معاشرہ انسانی کو امن و امان خوشحالی اور پر مسرت زندگی عطا کرتا ہے۔ تاریخ انسانی کی ناقابل فراموش شخصیت بن جاتا ہے۔

موجد و مفکر

"موجد"

مسکرا کر جب ہوئی طلوع تمدن کی سحر جنگلوں سے شہر کی جانب مڑی فکر بشر
رسائی آرزوئے بام چونکا ذوق در کلفت خاک تہ سے اگنے لگے شمس و قمر

خوشۂ حسن زمیں یوں ناز سے پکنے لگا
داب کر دانتوں میں انگلی آسماں تکنے لگا

ہر[1] اشارے کو صدا بن کر نکھرنا آ گیا پھر صدا کو لفظ میں ڈھل کر سنورنا آ گیا
لفظ کو آہنگ نو پا کر ابھرنا آ گیا خاک صامت کو بالآخر بات کرنا آ گیا

لب ہلے تو کشتیاں چلنے لگیں اعجاز کی
فکر انساں کو سواری مل گئی آواز کی

شاہ[2] راہ عام ترشی مانگ نکلی شہر کی روشنی کی موج نے اس مانگ میں افشاں چنی
تاب افشاں جدول منقش میں ڈھل کر بہی مشعلیں یوں جگمگائیں نبض شب چلنے لگی

ساز شب سے نغمہ ہائے صبح دم پیدا ہوئے
بستیاں مڑنے لگیں گلیوں میں خم پیدا ہوئے

آرزوئے[3] خانۂ آرائی کی شمعیں جل اٹھیں کسمسا کر صنعت نوخیز نے آنکھیں ملیں
فلک تعمیر نے ہوئی قبائے ماہ و طیں سر پہ رکھ کر گنبدوں کے قمقمے ناچی زمیں

سنگ ریزے ناز سے ہلکے منارے بن گئے
کروٹیں ذروں نے کچھ یوں لیں کہ تارے بن گئے

---

[1] انسان نے رہنے کے لیے مکان تعمیر کیا۔

[2] زبان اور بولیاں ایجاد ہوئیں۔

[3] راستے اور گلیاں بنیں اور ان میں روشنی آئی۔

منتشر افراد کو مل جل کے رہنا آ گیا
آدمی کو این و آں کی تیغ سہنا آ گیا
مجلۂ احساس میں پھولوں کا گندھنا آ گیا
وقت کے دھارے کو بالترتیب بہنا آ گیا

ناز سے زلفِ لطافت کی گرہ کھلنے لگی
پھول کے کانٹے پہ روحِ گلستاں تلنے لگی

سر جھکایا جہل نے پھر علم کے دربار میں
دائرے بننے لگے جنبش ہوئی پرکار میں
آ گئی روحِ نبوت سرحدِ گفتار میں
سبزۂ آیات لہکا گلشنِ انوار میں

اور جب اس سبزے میں دریا کی روانی آ گئی
نوعِ انساں کی مسیں بھیگیں جوانی آ گئی

پھر بڑھی دنیا کو سر کرنے حیاتِ نوجواں
بادہ بار و مشک ریز و مہر بیز و مہ چکاں
پرفشاں، جنباں، جہاں، لرزاں، رواں، غلطاں، دواں
نغمہ خواں، شاداں، خراماں، وقت داں، جولاں، تپاں

پتھروں کو پیستی شیشوں کو پگھلاتی ہوئی
کارخانوں کے دھوئیں میں پیچ و خم کھاتی ہوئی

خشک و تر کو جانچتی ارض و سما کو بھانپتی
صبح کو مکھڑا دکھاتی شام کو منہ ڈھانپتی
لہلہاتی ۔ چہچہاتی ۔ لپلپاتی ۔ کانپتی
دوڑتی ۔ بڑھتی ۔ جھپٹتی ۔ دندناتی ۔ ہانپتی

بربطِ تکرارِ تکلیفات پہ گاتی ہوئی
موت کو نیچا دکھا کر ناز فرماتی ہوئی

ناز سے جزوِ مکاں بن کر زماں گانے لگا
چمنیوں میں کارخانوں کا دھواں گانے لگا
زمزمے چھیڑے زمیں نے آسماں گانے لگا
طائروں کا ذکر کیا خود آسماں گانے لگا

حوصلے نوعِ بشر کے ناز فرمانے لگے
ہاتھ باندھے آب و آتش کے خواص آنے لگے

ساعتوں[1] کو کوک بھرتے ہی روانی مل گئی
ہر دقیقے کو منظم پرفشانی مل گئی
تنگ لمحوں کو گجر کی نغمہ خوانی مل گئی
عمر کے سونے کو لوہے کی کمانی مل گئی

---

[1] گھڑی کی ایجاد ہوتی ہے۔

سوئیوں کی رو میں لمحوں کو چھلکنا آ گیا
وقت کو محرابِ آہن میں لٹکنا آ گیا

[1] دیدہ و رخسار اور گوش و زباں کے درمیاں — فاصلوں کی چھٹ گئیں نبضیں بایں بعدِ مکاں
ایک دریائے ہم آغوشی ہوا گویا رواں — آگیا کھنچ کر بالآخر ایک مرکز پر جہاں
اور یوں آواز گرمِ قطعِ منزل ہو گئی
عکس کو بھی قوتِ پرواز حاصل ہو گئی

[2] ایک کروٹ لی پھر ایسی عالمِ ایجاد نے — برف لگی سرد کاندھے پر شرارے لاد نے
ٹوپیاں بدلیں بصد اخلاص برق و باد نے — موم کی گردن میں باہیں ڈال دیں فولاد نے
جنگ جو اضداد میں عہد مدارا ہو گیا
درمیانِ جام و سنداں بھائی چارا ہو گیا

خشکی کے تختے ہائے شور تک اوڑھے گئے — سطحِ بینائی پہ تاروں کے گھر رولے گئے
انجم و ذرات کے بندِ قبا کھولے گئے — سائے تک ناپے گئے اور عکس تک تولے گئے
عرش تک فرشِ مبیں کی ہمتِ عالی گئی
شعلہ و شبنم میں بل دے کر گرہ ڈالی گئی

[3] ذوق نکھرا کہکشانی بام و در بننے لگے — سنگ ریزے آئینے، قطرے گہر بننے لگے
برق پارے مرغ ہائے نامہ بر بننے لگے — آہنی اعصاب ڈھل کر بال و پر بننے لگے
زندگی اوجِ ثریا کی طرف جانے لگی
قلبِ انجم کے دھڑکنے کی صدا آنے لگی

کہکشاں جھجکی، نظر چھونے لگی افلاک کو — فکر بڑھانے لگی اجرامِ حیرت ناک کو
اور پھر گیتی کی جانب موڑ کر ادراک کو — آدمی گننے لگا ضرباتِ نبضِ خاک کو

---

[1] ٹیلی وژن اور ٹیلی فون کی ایجاد۔

[2] رفریجریٹر کی ایجاد۔

[3] ریڈیو اور طیارے کی ایجاد۔

ذہن کی میزان میں تابانیاں تلنے لگیں
چادرِ ارض و سما کی سلوٹیں کھلنے لگیں

پھر زمیں کی سمت موڑی یوں کدالوں نے عناں[1] — ارض کے طبقات کو آنے لگیں انگڑائیاں
ظرف ہائے خاک سے جھانکے بتانِ باستاں — ہڈیوں نے اپنے جسموں کی سنائی داستاں

تنگ غاروں میں ہوا آنے لگی، بو پھٹ گئی
خفتگانِ خاک کے سر سے دلائی ہٹ گئی

مردہ غاروں سے سلاطینِ کہن پیدا ہوئے — نیم جاں ریشوں سے ماضی کے چمن پیدا ہوئے
بت کدوں نے آنکھ کھولی، برہمن پیدا ہوئے — خار و خس کی کوکھ سے گل پیرہن پیدا ہوئے

مردہ پروانوں نے آہِ سرد بھر کر بات کی
کشتہ شمعوں نے سنائیں داستانیں رات کی

گونج اٹھی الفاظ سے گونگے پہاڑوں کی زباں — بول اٹھیں[2] سنگِ خارا کی مرتب دھاریاں
نغمۂ تاریخ سے بجنے لگیں خاموشیاں — رت جگوں کے جشن کا نکلا چٹانوں سے دھواں

نصب ہر ذرے پہ اک پھولوں کا ڈیرا ہو گیا
شامِ زیرِ ارض میں گویا سویرا ہو گیا

خاک میں جو ٹل چکے تھے سامنے آنے لگے — مطربانِ خیمہ ہائے باستاں گانے لگے
گل رخانِ دورِ پیشیں بال بکھرانے لگے — خستہ ماہ و سال اک اک پور چٹخانے لگے

چادرِ ذوقِ تجسس میں رفو کرنے لگے
دور ہائے سنگ و آہن گفتگو کرنے لگے

دیدۂ بیدار کے مانند کانیں کھل گئیں — گردنِ تاریخ کی سب ریسمانیں کھل گئیں
سنگ دور کے آبگینوں کی دکانیں کھل گئیں — عصر ہائے صبر بر لب کی زبانیں کھل گئیں

بڑھ گئے کچھ اور پردے آگہی کے ساز میں
سن بتایا خاک نے اپنا تحمل آواز میں

۱۔ آثارِ قدیمہ کی کھدائی۔
۲۔ چٹانوں کی پرتیں صدیوں کی تاریخ ہیں۔

سینۂ آہن میں چمکا غنچۂ سیف و قلم   کسمسائے بستر ذرات پہ دیر و حرم
رسمسایا نیستاں میں زمزموں کا زیر و بم   کروٹیں لینے لگے پتھر میں بے ترشے صنم

زر میں کنگن کی تمنا چٹکیاں لینے لگی
رات کی لٹ خیمۂ ابیض کو صدا دینے لگی

دامن فولاد تشریف کتاں بننے لگا   زہر کا افشردہ، آب جاوداں بننے لگا
شیشہ یوں پگھلا حریر و پرنیاں بننے لگا   سنگ یوں ترشا کہ رخسار بتاں بننے لگا

بوتلیں جھمکیں نقاب اٹھی عذار حور سے
بنت چنگ و رنگ جھانکی غرفۂ انگور سے

چھڑ لیے مضراب تھرائی، فضا پر راگنی   ناز کی پھوٹی کرن انداز کی چٹکی کلی
چھائی عشووں کی گھٹا چھٹکی ادا کی چاندنی   دل رباؤں نے ملی آنکھیں دلوں سے لو اٹھی

لرزش مژگاں جنوں کی کشتیاں کھینے لگی
چبھ گئے نشتر رگ ہستی لہو دینے لگی

شرم سے مژگان خوباں کو جھپکنا آ گیا   راگنی کی آنچ پر آہوں کو پکنا آ گیا
نیند اڑی تو موج باراں کو جھپکنا آ گیا   ولولوں پر رس کی بوندوں کو ٹپکنا آ گیا

خستہ نظروں کی زبانیں حسن کو چکھنے لگیں
قوس مستی پر تمنائیں قدم رکھنے لگیں

جاگ اٹھا گردنوں کے طرۂ خم میں بانکپن   پھٹ پڑی شاداب مکھڑوں پر قیامت کی پھبن
بن گیا ہر ماہ پیکر اک مہکتا پھول بن   موتیے کی طرح چٹکے نازنینوں کے بدن

بند ٹوٹے غرفہ ہائے سیم و زر کھلنے لگے
انکھڑیاں اٹھیں تو بت خانوں کے در کھلنے لگے

نرگس بیمار کو طرز تکلم آ گیا   وہ تکلم جس سے ہونٹوں پر تبسم آ گیا
وہ تبسم جو لیے موج ترنم آ گیا   وہ ترنم جس سے دنیا میں تلاطم آ گیا

وہ تلاطم خون میں جس سے روانی آ گئی
وہ روانی باڑھ پر جس سے جوانی آ گئی

۱؎ جمالیاتی شعور کی بیداری۔

نوعِ انساں میں بتدریج آدمیت آ گئی
وضع میں شائستگی دل میں شرافت آ گئی
بات میں دل جوئی آنکھوں میں مروت آ گئی
روح فرسا اجنبیت میں اخوت آ گئی
شعلہ ہائے غم گساری کو بھڑکنا آ گیا
دل کو اوروں کی مصیبت پر دھڑکنا آ گیا

موجدوں نے جیب میں بھر کر قوائے کائنات
پرتوِ ایجاد سے دمکا دیا روئے حیات
ایک اک قطرے سے کھینچے برق کے صد ہا نکات
ایک اک ذرے سے کھینچے سحر کے لاکھوں صفات
ایک اک گوشے سے چمناور جہاں پیدا کیے
کائی کے ریشوں سے کتنے گلستاں پیدا کیے

واہ کیا احسان ہے اقطابِ ایجادات کا
ایک دریا بہہ رہا ہے ظرفِ مصنوعات کا
جگمگا اٹھا ہے دن کی طرح مکھڑا رات کا
جسمِ آہن میں رواں ہے خون احساسات کا
یوں انھوں نے جزوِ خاک اپنا پسینا کر دیا
دھات کے آلات کو دانا و بینا کر دیا

جو ہُوا ایجاد کرنے میں ہوا تھا کام یاب
عظمتیں غلطاں ہیں اس کے گرد بے حد و حساب
گھومتے پہیے کی ہر گردش بفیضِ اضطراب
جیب میں ڈالے ہوئے ہے سو طوافوں کا ثواب
ہاں دھرا اک تمکنت ہے زلزلوں کے درمیاں
ایک نفسِ مطمئن ہے ولولوں کے درمیاں

موجدانِ ذی حشم ہیں محسنانِ آدمی
ان کی بے تابی پہ قائم ہے سکونِ زندگی
ان کے روئے جستجو پر جھلکیاں ہیں غیب کی
ان کے ماتھے ہیں نہیں اٹھتے جو سجدوں سے کبھی
ان میں سے ہر فرد اویسِ قرنی و حلاج ہے
سر کا زانو تک پہنچ جانا یہاں معراج ہے

ان کے آگے موسموں کی سختیاں ہیں شرم سار
کھیلتے رہتے ہیں یہ وحشی عناصر کا شکار
ہاں انھیں کے جذبہ ایثار سے باصد وقار
ہم ہیں آب و خاک کے آقا ہوا کے شہریار
رعب ہے اپنا مسلط کشورِ اضداد پر
کاٹھیاں رکھی ہوئی ہیں پشتِ برق و باد پر

ان کے حسب آرزو مظروف بن جاتا ہے ظرف[1]   قطرہ بنتا ہے عجوبہ ذرہ بنتا ہے شگرف
آگ بن جاتی ہے پانی برق بن جاتی ہے برف   ان کے دم سے دوڑتا ہے رشتۂ آہن میں حرف

بل نکل جاتے ہیں ان سے چرخ کج رفتار کے
یہ ثوابت کے گرو ہیں دیوتا سیار کے

کوئی ان میں خود نوازی کے لیے کوشاں نہیں   صرف اک خدمت کی دھن ہے دوسرا ارماں نہیں
ہانک کھائیں کچھ عبادت سے یہ وہ انساں نہیں   یہ خدا یا آدمی سے اجر کے خواہاں نہیں

خوف دوزخ کا نہ جنت کا انھیں ارمان ہے
خدمت ان کا دین ہے ذوق وفا ایمان ہے

یہ تو ہوئی موجدوں کی بات اب مفکروں کے متعلق سنیے:

"مفکر"

دل کو لیکن سخت استعجاب ہے اے ہم نشیں   اتنے احسانات پر بھی یہ محبان مبیں
بن نہ پائے زیر سقف آسماں صدر زمیں   اور تو اور آدمی کے حافظے تک میں نہیں

نام ان کا دہر کے مسند نشینوں میں نہیں
یہ سفینوں میں تو ہیں موجود سینوں میں نہیں

یہ بظاہر ہے بڑی احساں فراموشی کہ ہم   محو کر دیں ذہن سے ارباب خدمت کے کرم
زلف نفسیات کے سلجھائے لیکن کون خم   یاد رہتے ہیں بشر کو صرف وہ اہل ہم

موڑ کر ذہن بشر کو بوستانوں کی طرف
جو اڑاتے ہیں زمیں کو آسمانوں کی طرف

طبع انسانی کو دے سکتا نہیں جو روشنی   نوع انسانی کا وہ آقا نہیں بنتا کبھی
آدمی کو جو غذا دیتا نہیں ادراک کی   امتوں کا مقتدا بنتا نہیں وہ آدمی

قبلہ گاہ اس شخص کو انساں بنا سکتا نہیں
ذہن انسانی کو جو آگے بڑھا سکتا نہیں

---

[1] ٹیلی گراف کی ایجاد۔

بے شک ایجادات و مصنوعات کی تابندگی — خاک پر برسا چکی ہے بے نہایت روشنی
روشنی بھی وہ کہ جس سے وجد میں ہے زندگی — معنوی خدمت کی لیکن بات ہے کچھ اور ہی

گھر کو جو چمکائے وہ شمع شبستاں اور ہے
دل کو جو رخشندہ کر دے وہ چراغاں اور ہے

یوں فضائے زیست پر ہے ذہن کامل کا جلال — مصر کے بازار میں جس طرح یوسف کا جمال
عقل اگر گل ہو تو شمع کشتہ ہے ماضی و حال — لاش ہے انسان اگر جلتی نہیں شمع خیال

دارو و درماں سے مردوں کو جلانا اور ہے
زندہ انسانوں کو قبروں سے اٹھانا اور ہے

افسر و اورنگ و لعل و گوہر و چتر و قصور — بارگاہ و خیمہ و خرگاہ و طاؤس و بخور
جامۂ منقش و فرش مرمر و جام بلور — ہیچ ہیں یہ سب کے سب بیمار ہے جب تک شعور

بوستان آب و گل کی آبیاری اور ہے
جس سے لہکے فکر وہ باد بہاری اور ہے

ثابت و سیار کا قبضے میں لانا اور ہے — علت و معلول پر نظریں جمانا اور ہے
نخل تن کو سرو کا ہم قد بنانا اور ہے — قامت فکر و تخیل کا بڑھانا اور ہے

گیتی و گردوں کی پہنائی پہ چھا جانا ہے اور
اس گھنے جنگل میں خود اپنے کو پا جانا ہے اور

کاہ کی رگ میں جو دوڑاتا ہے خون کہکشاں — کھولتا ہے خار کے دل میں جو باب گلستاں
شہ رگوں میں گونجتی رہتی ہے جس کی داستاں — نعرہ بنتا ہے اسی کا نام زیر آسماں

تاقیامت حافظے میں جگمگاتا ہے وہی
برش تیغ اجل پر مسکراتا ہے وہی

جو عمل کے طاق میں رکھتا ہے شمع اعتدال — ڈالتا ہے خنجر براں پہ جو عکس ہلال
بخشتا ہے عارض احساس کو جو خد و خال — جس کے دم سے سانس لینا سیکھ جاتا ہے خیال

ناچتی ہے لیلیٰ آفاق جس کے ساز پر
مسئلے چکتے ہیں جس کے شعلۂ آواز پر

نصب کرتا ہے دلوں میں جو حقائق کے خیام   بے زباں انسانیت کو جو سکھاتا ہے کلام

بخشتا ہے جسمِ حکمت کو جو اعصابی نظام   اک قوی برہان بن جاتا ہے جس کا صرف نام

جوڑ دیتا ہے جو ٹوٹی ہڈیاں تخییل کی

جس کی سانس آواز ہوتی ہے پرِ جبریل کی

جس سے تنہائی میں روحِ ایزدی کرتی ہے بات   ٹوٹتے ہیں جس کی ضربِ نطق سے لات و منات

جس کا ناخن کھولتا ہے عقدۂ ذات و صفات   جس سے بنتا ہے تصور ایک جسمِ ذی حیات

جس کے نکتے گے مد بھری آنکھوں میں لے تولے ہوئے

رقص کرتی ہے ذہن میں گھونگھٹ کے پٹ کھولے ہوئے

ڈھالتا ہے جو نئے سانچوں میں آئینِ جہاں   جو عمل کے قالب میں نفخ کرتا ہے رواں

بخشتا ہے جو تأمل کے بدن کو استخواں   توتلے افکار ہو جاتے ہیں جس سے نغمہ خواں

جو عطا کرتا ہے گل دستے خس و خاشاک کو

جو سکھاتا ہے خرامِ ناز طفلِ خاک کو

کھولتی ہے بابِ گردوں جس کے لفظوں کی مہک   جس کے حرفِ رشد کی انگڑائی بنتی ہے دھنک

سیکڑوں ذی ہوش انسانوں کو وقتِ مرگ تک   ہر نفس آتی ہے اپنی سانس سے جس کی مہک

انشراحِ صدر کی مہندی لگا کر پاؤں میں

بیٹھتی ہے زندگی جس کی نظر کی چھاؤں میں

جس کے ہونٹوں پر نچھاور سرخیٔ درِ عدن   جس کے لفظوں میں گندھے ہوتے ہیں لاکھوں بانکپن

جس کی موجِ گفتگو میں سانس لیتے ہیں چمن   جس کے لہجے سے دلوں میں پھوٹ جاتی ہے کرن

روشنی بھرتا ہے جو اخلاق کے قانون میں

جس کے فقرے دوڑتے ہیں آدمی کے خون میں

اعتدال و ضبط کا قائم جو کرتا ہے وقار   حلقۂ دشتِ خزاں میں جو بساتا ہے بہار

بخشتا ہے چہرۂ سیرت کو جو نقش و نگار   معنوی آبائے انساں میں وہ ہوتا ہے شمار

بارشیں قرنوں کی اس کا قصر ڈھا سکتی نہیں

آندھیاں اس کے چراغوں کو بجھا سکتی نہیں



راغب صاحب، جوش صاحب، مرزا عالمگیر قدر، بابا ذہین شاہ تاجی، منو عباس صاحب، اور چند احباب

مسدس ختم ہوا اور ہم ٹی وی اسٹیشن سے فارغ ہوئے تو میں نے جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچایا۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کہ اگر فرصت ہو تو کل ذرا جلدی آ جائیے۔ ہمارے ایک دوست ہیں تھاریانی ان کے گھر جانا ہے۔ مرزا عالمگیر قدر بھی آئیں گے۔ میں نے وعدہ کر لیا اور گھر آ گیا۔

مرزا عالمگیر قدر:

دوسرے دن یعنی ۲۸ فروری ۱۹۷۱ء کو اتوار تھا میں ۱۰ بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب تیار بیٹھے تھے۔ جوش صاحب کے ساتھ مرزا عالمگیر قدر بھی تھے۔ جو ان کے بچپن کے دوست تھے۔ جوش صاحب نے میرا تعارف کروایا تو اٹھ کر بہت محبت سے گلے لگایا اور کہنے لگے کہ جوش تمہاری اتنی تعریف کرتے ہیں تو ضرور تم میں کچھ خوبیاں بھی ہوں گی۔ مگر ہم تو تجربے کے بعد ہی کوئی رائے قائم کریں گے۔ میں نے عرض کیا خدا کرے میں آپ کے معیار پر بھی پورا اتروں۔ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں مرزا صاحب کا تعارف اس طرح کرایا ہے "خاندان تیمور کی یادگار، لکھنؤ کے باشندۂ باوقار، کچھ اوپر چالیس برس سے ضیق النفس میں گرفتار پھر بھی آواز بلا کی پاٹ دار، زود اشتعال و شرارہ بار، میرے لڑکپن کے یار، موسیقی و مزامیر کے ماہر اسرار، کھانا پکانے میں یکتائے روزگار، فن سخنوں کے شہریار اور معلومات عامہ کے پروردگار۔ سانولے رنگ بڑی بڑی آنکھوں کے پوست استخواں اور کاغذی بدن کے آدمی" یہ نواب واجد علی شاہ کے بیٹے نواب مرزا برجیس قدر کے پوتے تھے۔ جوش صاحب نے ان کے متعلق یہ بالکل صحیح رائے ظاہر کی ہے کہ "اس کرۂ ارض پر معلومات عامہ کا اس قدر بڑا کباڑی اور کوئی موجود نہیں ہے"۔ غرض میں، جوش صاحب اور مرزا عالمگیر قدر ہم تینوں تھاریانی صاحب کے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ راستے میں جوش صاحب نے کہا تھاریانی بہت اچھے آرکیٹیکٹ ہیں۔ پکے مسلمان ہیں اور مجھے مسلمان بنانے کی کوشش میں رہتے ہیں۔ ان کا مکان گرومندر کے نزدیک تھا۔ ہم لوگ جب وہاں پہنچے تو وہ ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم لوگ تھوڑی دیر تک ان کے گھر رہے پھر ان کے ایک دوست کے گھر چلے گئے جہاں ہم سب کی دعوت تھی۔ کھانے کے بعد جوش صاحب نے بہت دیر تک اپنا

کلام سنایا جو ٹیپ کر لیا گیا۔ غرض وہاں تمام دن گزار کر شام کو گھر لوٹے۔ مرزا صاحب وہیں سے کسی کے ساتھ اپنے گھر چلے گئے اور میں جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچا کر اپنے گھر آ گیا۔

ایرانی دوشیزہ سے ملاقات:

اس واقعہ کے چند دنوں کے بعد جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ ہندوستان سے ان کے بھائی رئیس احمد خاں آئے ہوئے ہیں اور مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں ۲۶ مارچ بروز جمعہ ۱۹۷۱ء سہ پہر ان کے گھر گیا۔ دونوں بھائی تخت پر بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ رئیس احمد خاں صاحب ڈیل ڈول سے اچھے خاصے پہلوان معلوم ہوتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ کشتی اور ورزش کا شوق رہا ہے۔ بیوی کے انتقال کے بعد پھر شادی نہیں کی مگر ایک لڑکا ہر وقت خدمت میں رہتا ہے۔ جوش صاحب کہنے لگے آج شام کہیں باہر چلو ڈرنک اور کھانا باہر ہی کھائیں گے۔ میں نے کہا چلیے گرینڈ ہوٹل ملیر چلتے ہیں۔ وہاں کا منیجر میرا دوست ہے۔ وہیں سوئمنگ پول پر شام گزاریں گے۔ چنانچہ میں نے گرینڈ ہوٹل کے منیجر مسٹر روسی کو ٹیلی فون کیا تو کہنے لگا۔ شوق سے آئیے۔ میں انتظار کروں گا۔ چنانچہ ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ اس نے سوئمنگ پول پر میز اور کرسیاں ڈلوا دیں اور جوش صاحب کے لیے ڈرنک کا بھی انتظام کر دیا۔ رئیس احمد خاں صاحب نے پول میں تیرنا شروع کر دیا۔ اس ہوٹل میں عام طور پر باہر سے آنے والے مسافر ٹھہرتے ہیں جو چند دن کے لیے کراچی کی سیر کو آتے ہیں۔ اس وقت پول میں ایک ایرانی خاتون بھی تیر رہی تھیں۔ عمر تقریباً ۲۵۔ ۳۰ کے درمیان۔ بھرا بھرا جسم۔ نہایت سرخ و سفید رنگ۔ پرکشش خدوخال۔ تھوڑی دیر میں وہ پول سے نکل کر تولیے سے جسم کو خشک کرتی ہوئی جوش صاحب کے قریب کرسی پر بیٹھ کر اردو میں کہنے لگیں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہی ہوں تو آپ حضرت جوش ملیح آبادی ہیں۔ جوش صاحب نے نہایت مسرت آمیز حیرت سے کہا۔ جی ہاں آپ نے بالکل درست پہچانا۔ میں جوش ہی ہوں۔ اس نے کہا میرے والد کا تعلق بھی لکھنؤ سے تھا مگر میری والدہ ایرانی تھیں۔ میرے والد ایران میں آ کر آباد ہو گئے تھے اب ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں کچھ دنوں کے لیے کراچی گھومنے پھرنے

کے لیے آئی ہوئی ہوں۔ میرے والد کے پاس آپ کا کلام اور تصویریں بھی تھیں وہ آپ کو بہت پسند کرتے تھے۔ ان کو آپ کا کلام بہت یاد تھا۔ رئیس احمد خاں نے جو ایک حسینہ کو اپنے بھائی کے پاس بیٹھے دیکھا تو فوراً پول سے نکل کر ایک کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ جوش صاحب نے ان سے کہا کہ جا کر کپڑے بدل آئیں۔ خان صاحب کو یہ مشورہ ناگوار گزرا مگر بڑی مشکل سے جا کر لباس تبدیل کر آئے اور کرسی لے کر اس خاتون کے قریب بیٹھ گئے۔ اتنے میں سورج غروب ہو گیا اور جوش صاحب پیمانہ بکف طلوع ہو گئے۔ وہ خاتون جس نے اپنا نام زہرہ بتایا تھا وہ بھی شریک مے نوشی ہو گئیں ..... اور جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کرنے لگیں ..... اس وقت جوش صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے۔ انھوں نے پہلے تو قطعہ خانقاہ سنائی۔ اس کے بعد جب زہرہ نے جوش صاحب کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے پیار کر لیا تو رئیس احمد خاں کا جذبۂ رقابت چھلک پڑا کہنے لگے بھائی صاحب چلیے بھاوج کھانے پر انتظار کر رہی ہوں گی۔ میں نے کہا خان صاحب، فکر نہ کیجیے کھانے کا بھی یہیں بندوبست ہو جائے گا مگر رئیس خاں صاحب آتش زیر پا ہو رہے تھے اور جوش صاحب جو جنت در آغوش، جمال پری رخ میں محو تھے، کہنے لگے میاں ہم پٹھانوں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ہمارا ایک بھائی دوسرے بھائی کا مادر زاد دشمن ہوتا ہے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے گلاس منھ کو لگایا، بھائی کے جذبات کی تلخی کو عرق مے ناب کر کے اس ترک شیرازی کے ہاتھ کا بوسہ لیا اور یہ رباعی پڑھی۔

دیکھے تھے بہاروں نے کب ایسے انداز — رنگوں کا تناسب اور بہ اعجاز
دیکھا جو اسے تو دفعتاً گونج اٹھی — گل زار میں جل شانہ کی آواز

افوہ یہ کافر ہے بہت سخت حسیں — پاپی خدوخال ہیں کہ ماہ و پرویں
یہ آن یہ عربدے یہ انوٹ یہ لٹک — اے بار خدا قابل برداشت نہیں

گرینڈ ہوٹل کے سوئمنگ پول کے کنارے آج کی شام نہایت حسین اور رنگین تھی۔ مے ہو، وے، کنج باغ ہو ساقی ہو ماہ وش اور پھر جوش جیسا شاعر اور پہلو میں زہرہ جبیں۔ جوش صاحب کی طبیعت میں بلا کی روانی تھی اور وہ مسلسل اپنا کلام سنا رہے تھے۔ تقریباً

ساڑھے آٹھ بجے ہوٹل کے بیرے نے کھانا لاکر میز پر رکھا۔ پہلے سوپ دیا گیا پھر بہت لذیذ سیخ کباب لائے گئے پھر مرغ کے تکے اور اس کے بعد تلی ہوئی مچھلی۔ یہ تمام مینو جوش صاحب کو بہت پسند آیا۔ جوش صاحب نے بہ اصرار زہرہ کو بھی اپنے ساتھ کھانے میں شریک کر لیا۔ غرض ساڑھے نو بجے کھانے سے فارغ ہوئے زہرہ نے جوش صاحب کو الوداعی بوسہ دیا اور ہم لوگ اپنے گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔ راستہ میں جوش صاحب جس قدر آج کی شام کی تعریف کر رہے تھے رئیس احمد خاں کی تعریف سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ میرا دل رکھنے کے لیے کر رہے ہیں۔ بقول غالب:

رفوے زخم کرتے ہیں بہ نوک نیش عقرب ہا

غرض تقریباً ساڑھے دس بجے دونوں بھائیوں کو جوش صاحب کے گھر پہنچا کر میں اپنے گھر آ گیا۔

maablib.org

۱۹۷۲ء کے واقعات

اس واقعہ کے بعد میں اپنی نوکری کے سلسلے میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ بہت دنوں تک جوش صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔ اسی مدت میں اپنے محکمے کی طرف سے مجھے ایک ہفتے کے لیے ڈھاکے بھیج دیا گیا۔ وہاں سے واپسی پر بھی جوش صاحب کے گھر نہ جا سکا۔ آخر ۲۲ جنوری ۱۹۷۲ء کو صبح ۹ بجے میں نے جوش صاحب کو ٹیلی فون کیا۔ میری آواز سن کر کہنے لگے ارے بھائی خورشید علی خاں تم پھر کیوں یاد آ گئے۔ میں تو ایک مدت سے تم کو بھلانے کی کوشش کر رہا ہوں مگر میں جتنی کوشش کرتا ہوں، تم اتنے ہی یاد آتے ہو۔ اگر آج کوئی کام نہ ہو تو دس بجے تک میرے گھر آ جاؤ۔ ذہین شاہ صاحب کے وہاں جائیں گے۔ چنانچہ میں دس بجے اپنے ساتھ کچھ پان لے کر جوش صاحب کے گھر گیا۔ پان دیکھ کر بہت خوش ہوئے کہنے لگے یہ آپ نے بہت اچھا کیا جو پان لے آئے۔ میں تو آج کل پالک کے پتے کھا رہا ہوں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مشرقی پاکستان سے تنازع کی وجہ سے مغربی پاکستان میں پان کی درآمد بہت محدود ہو گئی تھی اور تھوڑے بہت پان کہیں سے آ بھی جاتے تھے تو ان کی قیمت اتنی زیادہ تھی کہ عام آدمی کے لیے خریدنا بہت مشکل تھا۔ میں جب ان کے گھر پہنچا تو جوش صاحب تیار بیٹھے تھے۔ فوراً میرے ساتھ ہو لیے اور ہم دونوں بابا ذہین شاہ صاحب کے گھر ان کے پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس کے مکان میں پہنچے وہاں رئیس امروہوی ان کے برادران سید محمد تقی اور جون ایلیا کے علاوہ راغب صاحب مرادآبادی اور چند دوسرے شعرا پہلے سے موجود تھے۔ جوش صاحب کے پہنچنے کے بعد محفل شعر آراستہ ہوئی۔ سب شعرا نے اپنا اپنا کلام

سنایا جوش صاحب نے ایک طویل نظم سنائی۔ اس وقت مجھے اس کا عنوان یاد نہیں مگر اس میں جوش صاحب نے زندگی کے کئی موڑ دکھائے تھے۔ پھر اپنی عقل پرستی کا اظہار کیا تھا ایسے میں ایک حسینہ ان پر عاشق ہوجاتی ہے۔ پھر خدا کے ساتھ مکالمہ ہے۔ شاعر خدا سے شکایت کرتا ہے کہ اس نے انسان کو مجبور پیدا کیا ہے۔ انسانیت مشیت الٰہی کے اشاروں پر چلنے کے لیے مجبور ہے مگر پھر کہتے ہیں کہ میں بھی ابن آدم ہوں۔ باشعور ہوں اور میں خدا کی مشیت پر غالب آسکتا ہوں۔ اس کے بعد بابا صاحب نے اپنا کلام سنایا اور جوش صاحب کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ شراب کے ذریعہ خارج سے اخذ مستی کرتے ہیں حالانکہ اپنے اندر مے خانہ لیے پھرتے ہیں اور اپنی باطنی شراب کو استعمال نہیں کرتے۔ مستی تو خود آپ کے اندر موجود ہے، جو ابدی بھی ہے اور خارجی ذرائع کی محتاج بھی نہیں۔ جوش صاحب نے کہا بابا صاحب آپ درست فرماتے ہیں۔ خود میرا شعر ہے:

اپنے سینوں میں جو اگتے ہیں سرور
اک جوش مسلسل ہے انھیں دن ہو کہ رات

سلامت علی خاں:

۱۲ مارچ منگل کی شام کو میں جوش صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا۔ نعمت بھی اب تن درست ہو کر اپنے دفتر جانے لگے تھے اور جوش صاحب کا اصرار تھا کہ میں نعمت کو بھی اپنے ساتھ ان کے گھر لاؤں لہٰذا اب کے نعمت بھی میرے ساتھ تھے۔ جوش صاحب کے ساتھ ان کے ڈھاکے کے دوست سلامت علی خاں مع اپنی بیگم سلیمہ سلامت علی کے بیٹھے ہوئے تھے۔ ام الشعرا بیگم جوش بھی جوش صاحب کے قریب تخت پر تشریف فرما تھیں۔ نعمت سے مل کر جوش صاحب بہت خوش ہوئے۔ جوش صاحب نے سلامت علی خاں کا تعارف نعمت سے کرایا اور کہا کہ یہ ڈھاکے میں جوٹ کے بہت بڑے تاجر اور برآمد کنندگان میں سے تھے۔ وہاں ان کا بہت بڑا بنگلہ اور کئی کاریں تھیں مگر اب وہاں کے حالات کی وجہ سے کراچی آگئے ہیں۔ یہاں کچھ لوگ کاروباری رقابت کی وجہ سے ان کو پریشان کر رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں اگر آپ ان کو پولیس کا تحفظ فراہم کریں گے تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔ نعمت نے

دوسرے دن خان صاحب کو اپنے دفتر بلوایا ان سے معاملے کی نوعیت معلوم کی اور ایسا انتظام کر دیا کہ خان صاحب ہر قسم کی تکلیف سے محفوظ ہو گئے۔ اس کے بعد سے جوش صاحب نعمت کے اور بھی گرویدہ ہو گئے۔

خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اس دن جب ہم دونوں بھائی جوشش صاحب کے گھر پہنچے تو جوش صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے۔ چونکہ ابھی سورج کے غروب اور جوش صاحب کے طلوع ہونے میں کوئی ایک گھنٹے سے زیادہ وقت باقی تھا تو نعمت نے فرمائش کی کہ جوش صاحب اگر بار خاطر نہ ہو تو "ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب" سنائیے۔ یہ نظم مجھے بے حد پسند ہے۔ اسی کے ساتھ مجھے آپ کی وہ نظم بھی بہت پسند ہے۔

سلام اے تاجدار جرمنی اے ہٹلر اعظم   فدائے قوم شیدائے وطن اے نیر اعظم

جوشش صاحب نے فرمایا کہ یہ ہٹلر اعظم والی نظم میری نہیں ہے۔ یہ کسی صاحب نے میرے نام سے چھپوا دی تھی مگر یہ میں نے نہیں کہی۔ ہاں البتہ ایسٹ انڈیا کمپنی والی نظم میری ہے۔ اس نظم کو انگریزی حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ اور میرے گھر کی تلاشی بھی لی تھی۔ جس پر میں نے "تلاشی" کے عنوان سے ایک اور نظم کہی تھی۔ نعمت نے کہا جوش صاحب براہ کرم دونوں نظمیں سنائیے، میں ان کو لکھنا چاہتا ہوں۔ جوش صاحب نے فرمایا میں آپ کو سنا دیتا ہوں، آپ ان کو "یادوں کی برات" سے نقل کر لیجیے۔

"ایسٹ انڈیا کمپنی کے فرزندوں سے خطاب"

۱

کس زباں سے کہہ رہے ہو آج اے سوداگرو
دہر میں انسانیت کے نام کو اونچا کرو
جس کو سب کہتے ہیں ہٹلر، بھیڑیا ہے بھیڑیا
بھیڑیے کو مار دو گولی پئے امن و بقا
باغ انسانی میں چلنے ہی پہ ہے باد خزاں
آدمیت لے رہی ہے ہچکیوں پہ ہچکیاں

ہاتھ ہے ہٹلر کا رخشِ خود سری کی باگ پر
تیغ کا پانی چھڑک دو جرمنی کی آگ پر

۲

سخت حیراں ہوں کہ محفل میں تمہاری اور یہ ذکر
نوعِ انسانی کے مستقبل کی اب کرتے ہو فکر
جب یہاں آئے تھے تم، سوداگری کے واسطے
نوعِ انسانی کے مستقبل سے کیا واقف نہ تھے
ہندیوں کے جسم میں کیا روحِ آزادی نہ تھی
سچ بتاؤ کیا وہ انسانوں کی آبادی نہ تھی

۳

اپنے ظلمِ بے نہایت کا فسانہ یاد ہے؟
کمپنی کا بھی وہ دورِ مجرمانہ یاد ہے؟
لوٹتے پھرتے تھے جب تم کارواں در کارواں
سر برہنہ پھر رہی تھی دولتِ ہندوستاں
دستکاروں کے انگوٹھے کاٹتے پھرتے تھے تم
سرد لاشوں سے گڑھوں کو پاٹتے پھرتے تھے تم
صنعتِ ہندوستاں پر موت تھی چھائی ہوئی
موت بھی کیسی، تمہارے ہاتھ کی لائی ہوئی

۴

اللہ اللہ کس قدر انصاف کے طالب ہو آج
میر جعفر کی قسم کیا دشمنِ حق تھا سراج
وہ اودھ کی بیگموں کا بھی ستانا یاد ہے؟
یاد ہے جھانسی کی رانی کا زمانا یاد ہے؟

ہجرتِ سلطانِ دہلی کا سماں بھی یاد ہے؟
شیر دل ٹیپو کی خونیں داستاں بھی یاد ہے؟
تیسرے فاقے میں اک گرتے ہوئے کو تھامنے
کس کے سر لائے تھے تم شاہ ظفر کے سامنے
یاد تو ہو گی وہ مٹیا برج کی بھی داستاں؟
اب بھی جس کی خاک سے رہ رہ کے اٹھتا ہے دھواں
تم نے قیصر باغ کو دیکھا تو ہو گا بار ہا؟
آج بھی آتی ہے جس سے ہائے اختر کی صدا
سچ کہو کیا حافظے میں ہے وہ ظلم بے پناہ
آج تک رنگون میں اک قبر ہے جس کی گواہ
ذہن میں ہو گا یہ تازہ ہندیوں کا داغ بھی
یاد تو ہو گا تمہیں جلیان والا باغ بھی؟
پوچھ لو اس سے تمہارا نام کیوں تابندہ ہے
ڈائر گرگ دہن آلود، اب بھی زندہ ہے
وہ بھگت سنگھ اب بھی جس کے غم میں دل ناشاد ہے
اس کی گردن میں جو ڈالا تھا وہ پھندا یاد ہے
ہند کے رہبر رہا کرتے تھے کس ہنجار سے
پوچھ لو یہ قید خانوں کے در و دیوار سے
اب بھی ہے محفوظ جس میں طنطنہ سرکار کا
آج بھی گونجی ہوئی ہے جن میں کوڑوں کی صدا

۵

آج کشتی خلق کی امواج میں کھیتے ہو کیوں؟
سخت حیراں ہوں کہ اب تم درسِ حق دیتے ہو کیوں

اہلِ قوت دامِ حق میں تو کبھی آتے نہیں
آدمیت کو کبھی خاطر میں لاتے نہیں

۶

لیکن آج اخلاق کی تلقین فرماتے ہو تم
ہو نہ ہو اپنے میں اب قوت نہیں پاتے ہو تم
اہلِ حق روشن نظر ہیں اہلِ باطن کور ہیں
یہ تو ہیں اقوال ان قوموں کے جو کم زور ہیں
آج شاید منزلِ قوت میں تم رہتے نہیں؟
جس کی لاٹھی اس کی بھینس اب کس لیے کہتے نہیں؟
کیا کہا؟ انصاف ہے انساں کا فرضِ اولیں
کیا قتال و ظلم کا اب تم میں کس باقی نہیں؟

۷

دیر سے بیٹھے ہو، نخلِ راستی کی چھاؤں میں
کیا خدا ناکردہ کچھ موچ آ گئی ہے پاؤں میں
گونج تاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپِ تازی کیا شفا خانے میں ہے
آج کل تو ہر نظر میں رحم کا انداز ہے
کچھ طبیعت کیا نصیبِ دشمناں ناساز ہے؟
سانس کیا اکھڑی کہ حق کے نام پر مرنے لگے
نوعِ انساں کی ہوا خواہی کا دم بھرنے لگے
ظلم بھولے، راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے

۸

مجرموں کے واسطے زیبا نہیں یہ شور و شین
کل یزید و شمر تھے اور آج بنتے ہو حسین
خیر اے سوداگرو اب ہے تو بس اس بات میں
وقت کے فرمان کے آگے جھکا دو گردنیں
اک کہانی وقت لکھے گا نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی
وقت کا فرمان اپنا رخ بدل سکتا نہیں
موت مل سکتی ہے یہ فرمان مل سکتا نہیں

اس کے بعد نعمت کی فرمائش پر جوش صاحب نے اپنی نظم تلاشی بھی سنائی۔

"تلاشی"

جس سے امیدوں میں بجلی آگ ارمانوں میں ہے
اے حکومت کیا وہ شے اس مہر کے خانوں میں ہے؟
بند پانی میں سفینے کھے رہی ہے کس لیے
تو مرے گھر کی تلاشی لے رہی ہے کس لیے؟
گھر میں درویشوں کے کیا رکھا ہوا ہے بدنہاد
آ مرے دل کی تلاشی لے کہ بر آئے مراد
جس کے اندر دہشتیں پرہول طوفانوں کی ہیں
جس میں غلطاں آندھیاں اندھے بیابانوں کی ہیں
جس کے اندر ناگ ہیں اے دشمن ہندوستاں
شیر جس میں ہونکتے ہیں کوندتی ہیں بجلیاں
چھوٹتی ہیں جس سے نبضیں افسر و اورنگ کی
جس میں ہے گونجی ہوئی آواز طبل جنگ کی

جس کے اندر آگ ہے دنیا پہ چھا جائے وہ آگ
نار دوزخ کو پسند جس سے آ جائے وہ آگ
موت جس میں دیکھتی ہے منہ اُس آئینے کو دیکھ
میرے گھر کو دیکھتی کیا ہے مرے سینے کو دیکھ

اس کے بعد جوش صاحب نے تفصیل سے تلاشی کا واقعہ بھی سنایا کہ ایک ہندو انسپکٹر نے کس طرح شرافت کا ثبوت دیا کہ تلاشی لینے کے بجائے پہلے تو اس نے جوش صاحب سے ان کے مکان کے اندر آنے کی معافی مانگی پھر تکمیل ضابطہ کے لیے کاغذی کارروائی کر کے رخصت ہو گیا مگر اس دوران ایک مسلمان ہیڈ کانسٹیبل نے جوش صاحب کی ٹائم پیس اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔ جب جوش صاحب نے یہ داستان ختم کی تو سورج غروب ہو چکا تھا۔ انھوں نے سلامت علی خاں کی طرف اس طرح دیکھا کہ اب کس کا انتظار ہے۔ پیگ بناؤ۔ چنانچہ اب کے ساقی کے فرائض خان صاحب نے ادا کیے اور یہ دور جاری تھا کہ میں اور نعمت محفل رنداں میں بار خاطر بننے کے بجائے جوش صاحب سے اجازت لے کر اپنے گھر آ گئے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کہ کل صبح دس بجے آ سکو تو ضرور آ جاؤ، میر رسول بخش صاحب تالپور سے ملنے چلیں گے۔

میر رسول بخش تالپور:

دوسرے دن ۱۵ مارچ ۱۹۷۲ء بروز بدھ میں ٹھیک دس بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ہم دونوں اسمبلی بلڈنگ چلے گئے۔

وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ میر صاحب اوپر اسمبلی ہال میں دربار عام میں مصروف ہیں۔ میں نے اوپر جا کر دیکھا کہ ہال میں لوگوں کا ہجوم ہے اور میر صاحب کو سائلوں نے گھیر رکھا ہے۔ ہر شخص کے ہاتھ میں ایک درخواست ہے اور میر صاحب ہر درخواست پر کوئی مناسب حکم لکھ دیتے ہیں۔ میں نے نیچے آ کر جوش صاحب سے آنکھوں دیکھا حال بیان کیا۔ انھوں نے ایک پرچے پر لکھا، میر صاحب! آپ دربار عام میں ہیں اور میں نیچے موٹر میں بیٹھا ہوا ہوں۔ ملاقات کیسے ہو"۔ ......جوش

میں نے اوپر جا کر جیسے ہی پرچہ میر صاحب کو دیا انھوں نے پڑھ کر کہا۔ "یہ میری عزت افزائی ہے۔ جوش صاحب کو لے آئیے اور میرے چیمبر میں بٹھائیے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں" اور اسی کے ساتھ انھوں نے اپنا ایک آدمی میرے ساتھ کر دیا کہ جوش صاحب کو لفٹ کے ذریعہ سے اوپر لے آئے۔ چنانچہ ہم لوگ جوش صاحب کو لے کر میر صاحب کے چیمبر میں آئے اور وہاں ان کو صوفے پر بٹھا کر وہ شخص یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ میر صاحب کو اطلاع کرنے جا رہا ہے۔

میر صاحب فوراً تشریف لائے نہایت محبت اور احترام سے جوش صاحب سے ملے۔ پھر کہا۔ حضور اگر اجازت دیں تو کچھ لوگوں کی درخواستیں نمٹا آؤں۔ یہ لوگ بہت دور دیہاتوں سے آئے ہیں۔ جوش صاحب نے کہہ تو دیا ضرور ضرور۔ مگر اس تصور سے کہ اب نہ معلوم کتنی دیر مزید انتظار کرنا پڑے گا۔ ان کے چہرے پر اضطرابی کیفیت نمودار ہونے لگی۔ اس وقت وہاں ڈاکٹر مختار صاحب تین خواتین اور کچھ لوگ بھی بیٹھے تھے مگر جوش صاحب کسی کی طرف متوجہ نہیں ہوئے اور جب انتظار کرتے ہوئے پندرہ بیس منٹ گزر گئے تو مجھ سے کہا۔ اب بھاگ چلو۔ میں نے کہا میر صاحب برا مانیں گے۔ تھوڑی دیر اور انتظار کیے لیتے ہیں۔ پانچ منٹ کے بعد جوش صاحب نے اپنی کاپی میں سے ایک پرچہ پھاڑا اور یہ شعر لکھ کر مجھے دیا کہ جا کر میر صاحب کو دے آؤں۔ شعر یہ تھا۔

تم تو جوان ہوتے ہی کچھ اور ہو گئے　　بدلی نگاہ، طور سے، بے طور ہو گئے

میں نے یہ پرچا میر صاحب کو نہیں دیا بلکہ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور میر صاحب کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ جیسے ہی میر صاحب کی نظر مجھ پر پڑی فوراً سمجھ گئے کہ جوش صاحب بے چین ہو رہے ہوں گے لہٰذا سب کام چھوڑ کر کھڑے ہو گئے اور جوش صاحب کے پاس آ کر بہت محبت اور انکسار سے معافی چاہی کہ جوش صاحب کو انتظار کی زحمت برداشت کرنا پڑی۔ پھر جوش صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر کہا "فرمائیے سرکار میرے لیے کیا حکم ہے"۔ جوش صاحب نے کہا میں تو آپ کے دیدار کے لیے حاضر ہوا تھا۔ میر صاحب کہنے لگے "کل پریذیڈنٹ بھٹو صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا مگر لوگوں نے جو ان کی کوٹھی پر مظاہرہ کیا تو اس سے ان کا موڈ سخت خراب ہو گیا۔ نہ معلوم لوگ کیا چاہتے ہیں اگر حالات پرسکون ہوں تو ترقی کے بہت کام ہو سکتے ہیں مگر لوگ کسی طرح ہم لوگوں کو اطمینان کا سانس لینے نہیں دیتے۔

جوشش صاحب یہ مسلمان قوم بھی عجیب ہے لوگوں کی باتوں میں آکر اپنے محسنوں کی دشمن بن جاتی ہے۔ بھٹو صاحب جیسا لیڈر بہت کم پیدا ہو گا۔ اگر اس مسکین کو کام کرنے کا موقع دیا گیا تو آپ دیکھنا پاکستان بہت جلد دنیا کی صف اول کی قوموں میں شامل ہو جائے گا۔ جوش صاحب نے کہا، ہاں صاحب ہماری قوم کی ہسٹری یہ ہے کہ یہ ہسٹری شیٹروں کی قوم ہے۔

اتنے میں میر صاحب کا سیکرٹری کچھ درخواستیں لے کر آ گیا اور ہم دونوں میر صاحب سے اجازت لے کر باہر آ گئے۔ چلتے وقت میر صاحب نے جوشش صاحب سے کہا کہ وہ تین چار دن کے بعد خود ان کے مکان پر حاضری دیں گے۔ جوش صاحب نے کہا پہلے سے ٹیلی فون کر دیجیے گا تاکہ میں آپ کے استقبال کے لیے تیار رہوں۔ بہرحال ہم لوگ وہاں سے رخصت ہو کر برنس روڈ آئے جہاں لسی پی۔ پھر ایک بنک پر گئے جہاں سے جوشش صاحب نے کچھ رقم نکلوائی۔ اس کے بعد میں جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچا کر اپنے گھر آ گیا۔

جوش صاحب اور پابندی وقت:

اکیسویں مارچ ۱۹۷۲ء کو صبح جوش صاحب نے ٹیلی فون کیا کہ آج دو بجے سے پہلے میرے گھر آ جاؤ، یہاں سے ٹی وی اسٹیشن چلیں گے۔ آج وہاں ایک مشاعرہ ہے۔ چنانچہ میں پونے دو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ ٹھیک دو بجے ٹی وی اسٹیشن کی گاڑی آ گئی۔ میں نے اپنی گاڑی جوش صاحب کے گھر پر چھوڑ دی اور ان کے ساتھ چلا گیا۔ جب ہم ٹی وی اسٹیشن پہنچے تو ہم کو سیدھے اسٹوڈیو میں لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ مگر وہاں ابھی اسٹیج تیار کیا جا رہا تھا اور بیٹھنے کے لیے کوئی کرسی تک نہ تھی۔ وہاں کے منتظمین نے جوش صاحب کو ایک ملحقہ کمرے میں بٹھا دیا۔ میں بھی ایک کرسی پر ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ جوش صاحب کہنے لگے دیکھیے صاحب یہ لوگ کس قدر غیر ذمہ دار ہیں، مجھے اسقدر جلدی بلوا لیا اور یہاں ابھی تک اسٹیج بھی تیار نہیں ہے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو باتوں میں لگاؤں مگر جب دو بج کر بیس منٹ ہو گئے تو جوش صاحب بے چین ہونے لگے۔ مجھ سے کہا کہ بھاگ چلو۔ اب مجھ سے نہ بیٹھا جائے گا۔ میں نے کہا تھوڑی دیر اور صبر فرمائیے مگر وہ برہم ہونے لگے اور میرے روکنے کے باوجود باہر نکل گئے۔ راستے میں وہی صاحب جو ہمیں جوشش صاحب کے گھر سے لائے

تھے مل گئے۔ انھوں نے جوش صاحب کو روکنا چاہا مگر جوش صاحب بہت جوش میں تھے، سیدھے باہر سڑک پر پہنچ گئے اور مجھ سے کہا کہ کوئی ٹیکسی روک لو۔ میں نے ان صاحب سے کہا، آپ فوراً افتخار عارف صاحب کو بلا لائیں۔ چنانچہ وہ صاحب بھاگے ہوئے گئے اور افتخار عارف اور صہبا اختر کو بلا لائے۔ یہ دونوں حضرات بھی ہانپتے کانپتے پہنچے، اتنے میں جوش صاحب ایک ٹیکسی میں بیٹھ چکے تھے۔ ان لوگوں نے جوش صاحب کے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر معافی مانگی۔ جوش صاحب کہنے لگے جناب میری زندگی سکنڈ کی سوئی کے حساب سے معینہ وقت کے مطابق چلتی ہے۔ غضب خدا کا دو بجے کا وقت دیا اور اب ڈھائی بج رہے ہیں اور ابھی آپ کا اسٹیج بھی تیار نہیں ہے۔ اب مجھ سے کچھ نہ پڑھا جائے گا۔ کہنے لگے نہ معلوم لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں اور وقت کی پابندی کیوں نہیں کرتے۔ غرض یہ صرف افتخار عارف اور صہبا اختر صاحبان کی کوشش تھی کہ جوش صاحب ٹیکسی سے اتر کر واپس اسٹوڈیو میں آگئے۔ اتنے میں اور شعرا بھی آگئے۔ سرور بارہ بنکوی نے آکر جوش صاحب کو باتوں میں بہلانا شروع کر دیا۔ پھر رئیس امروہوی، جمیل الدین عالی، دلاور فگار، جون ایلیا، محشر بدایونی، شاعر لکھنوی، رضی اختر شوق، سحر انصاری، محمود شام، شبنم رومانی، محسن بھوپالی بھی آگئے۔ جناب سرشار صدیقی نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ یہ مشاعرہ تین بجے سے پہلے شروع نہ ہو سکا۔ اور جب ہم گھر واپس آئے تو رات کے نو بج چکے تھے اور جوش صاحب کی عبادت میں خلل پڑ چکا تھا مگر میں ان کو گھر پہنچا کر اپنے گھر آگیا۔

محسن صاحب اعظم گڑھی:

اس واقعے کے تیسرے دن، جمعہ تھا جوش صاحب نے کہا کہ صبح نو بجے آ جاؤ تو محسن صاحب اعظم گڑھی کے گھر جائیں گے۔ چنانچہ میں، جمعہ کے دن نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب تیار بیٹھے تھے، فوراً گاڑی میں بیٹھ گئے۔ جوش صاحب کو ان کا مکان ٹھیک سے معلوم نہ تھا۔ قائداعظم کے مزار کے پیچھے عقب جیکب لائن میں ایک چھوٹی سی مسجد کے زیر سایہ ان کا کوارٹر تھا۔ وہاں پہنچ کر ایک جگہ میں نے گاڑی کھڑی کی، جوش صاحب تو گاڑی میں بیٹھے رہے اور میں مکان ڈھونڈنے لگا۔ کافی تلاش کے بعد ان کا کوارٹر ملا۔ مکان کے

صحن کا احاطہ کانٹوں کی باڑھ سے گھرا ہوا تھا۔ آنگن میں دو چارپائیوں پر قدیم وضع اور اس سے زیادہ قدیم خیالات کے چند بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان ہی میں سے ایک ضعیف بزرگ دبلے پتلے ابھری ہڈی کے لانبا قد، دبی ہوئی رنگت، خشخشی داڑھی۔ سامنے کے چند دانتوں کے علاوہ باقی تمام دانت ندارد۔ لانبا چہرہ، شیعہ عقیدے کے راسخ الاعتقاد مسلمان۔ مجھے دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ یہ تھے جناب محسن صاحب اعظم گڑھی۔ میں نے کہا جوش صاحب بھی آئے ہیں اور وہ سڑک پر گاڑی میں بیٹھے ہیں۔ یہ سنتے ہی وہاں بیٹھے ہوئے تمام صاحبان میرے ہمراہ جوش صاحب کے استقبال کے لیے روانہ ہوگئے اور جوش صاحب کو اپنے ساتھ لے کر اپنے گھر آئے۔ گھر کے آنگن میں فرش بچھا کر اس پر قالین ڈال دیا گیا۔ پھر شام تک محفل شعر و سخن گرم رہی۔ اس دن جوش صاحب نے زیادہ تر مرثیے سنائے۔ غرض غروب سے پہلے ہم لوگ وہاں سے روانہ ہوئے۔ جوش صاحب نے کہا چلو عرفان کے گھر چلتے ہیں۔ ان کا گھر جمشید کوارٹرس میں تھا۔ یہ صاحب جوش صاحب کی بھانجی جو لاہور میں رہتی ہیں، ان کے صاحبزادے تھے۔ ان کے والد سید مشتاق علی ہاشمی لاہور میں پوسٹ آفس میں کسی بڑے عہدے پر ہیں۔ ان کی تین بہنیں نکہت، درخسانہ اور فرزانہ بہت ذہین اور قابل ہیں۔ اپنی اپنی جماعتوں میں امتیازی نمبروں سے کامیاب ہو کر ہمیشہ حکومت کی طرف سے تعلیمی وظیفہ حاصل کرتی ہیں۔ جوش صاحب ان سب بچوں سے بہت محبت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ رہ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ عرفان میاں کراچی میں نوکری کرتے ہیں اور جمشید روڈ کے سرکاری کوارٹر میں رہتے ہیں۔ جب جوش صاحب نے کہا کہ شام کی ڈرنک عرفان میاں کے گھر میں کریں گے تو میں ان کے مکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں جوش صاحب نے پوچھا، وہ مرزا کا کیا شعر ہے "لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں" میں نے دوسرا مصرع پڑھا "ہرچند ہاتھ اس میں ہمارے قلم ہوئے"۔ جوش صاحب کہنے لگے مرزا سے چوک ہو گئی۔ ثانی مصرع اس طرح ہونا چاہیے تھا۔ "گو اس خطا میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے"۔ "ہرچند ہاتھ اس میں ہمارے قلم ہوئے"۔ یہاں "اس میں" کا اشارہ ذم کی طرف ذہن کو لے جاتا ہے۔ میں نے کہا یہ آپ لوگ اہل لکھنؤ اس قدر حساس کیوں واقع ہوئے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات میں آپ کا ذہن ذم کا پہلو نکال لیتا ہے۔ کہنے لگے ان اشاروں کی نزاکتوں سے اہل دلی نابلد ہیں۔ اتنے میں

عرفان میاں کا گھر آ گیا اور ہم لوگ ان کے مہمان ہو گئے۔ جوش صاحب نے گرومندر کی شراب کی دوکان سے وہسکی کی ایک بوتل خرید لی تھی۔ سوڈا اور گزک کا انتظام عرفان میاں نے کر دیا۔

جوش صاحب جب طرح ہو چکے تو پھر انھوں نے وہی موضوع چھیڑ دیا کہنے لگے مرزا نے اکثر جگہ ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہ کیا شعر ہے۔

تاراج کاوش غم ہجراں ہوا اسد   سینہ کہ تھا خزانہ گہر ہائے راز کا

یہاں بھی مرزا سے لغزش ہو گئی۔ میں نے عرض کی۔ کہاں۔ کہنے لگے سینہ میں "ہ" کا جھٹکا محسوس ہونا چاہیے جبکہ یہاں "ہ" کے بجائے الف پڑھنا پڑتا ہے۔ سینا کہ تھا خزانہ گہر ہائے راز کا۔ جو غلط ہے۔ آخر میں "الف" نہیں "ہ" ہے۔ اس کے بعد دیر تک جوش صاحب مختلف شعرا کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیتے رہے۔ کسی کے ہاں تعقید تھی تو کہیں ذم تھا۔ کہیں روزمرہ کی غلطی تھی تو کہیں فکر کا نقص تھا۔ مجھے اس بات کا افسوس ہوا کہ میرے پاس اس وقت ٹیپ ریکارڈر نہیں تھا ورنہ وہ ساری باتیں اس قابل تھیں کہ ان کو ریکارڈ کر لیا جاتا۔ جوش صاحب اس رات عرفان میاں ہی کے گھر رہے اور میں کوئی نو بجے ان سے رخصت ہو کر گھر آ گیا۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کل نو بجے تک آ جائیے گا۔ میر صاحب کے گھر چلیں گے۔

اردو سندھی تنازعہ:

دوسرے دن صبح وقت مقررہ پر عرفان میاں کے گھر سے جوش صاحب کو لے کر میں میر رسول بخش تالپور کی سرکاری قیام گاہ پہنچا جو پہلے وزیر اعلیٰ کا مکان تھا اور اب گورنر ہاؤس ہے۔ میر صاحب بہت اخلاق سے ملے۔ ہم لوگوں کو کوکو کولا پلایا۔ پھر وہ اور جوش صاحب ملحق کمرے میں چلے گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد مجھے بھی اندر بلوا لیا۔ میری عدم موجودگی میں ان دونوں میں کیا باتیں ہوئیں مجھے اس کا تو علم نہیں ہے مگر میری موجودگی میں جوش صاحب میر صاحب سے کہہ رہے تھے کہ آج کل جو اردو اور سندھی کا تنازعہ چل رہا ہے اس سے ان کو ہندوستان میں اردو ہندی جھگڑے کی یاد تازہ ہو رہی ہے۔ جوش صاحب کہہ رہے تھے کہ اردو ہی صرف وہ زبان ہے جو انگریزی کی جگہ لے سکتی ہے اور اس زبان میں مغربی علوم کا خزانہ بھی

موجود ہے۔ مقامی لحاظ سے آپ علاقائی زبانوں میں تعلیم ضرور دیجیے بلکہ یہ ضروری بھی ہے مگر پہلے علاقائی زبانوں میں وہ علم بھی تو منتقل کیجیے جو ذہنوں کو روشن کر سکے اور قوم کے نونہالوں کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کی صف میں کھڑا ہونے کے لائق بنا سکے۔ یہ بات یاد رکھیے کہ سامراج جب کسی قوم کے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے اس کو کمزور کرنا چاہتا ہے تو پہلے اس قوم میں زبان کے اختلاف کو ہوا دے کر عصبیت کے جذبات کی پرورش کرتا ہے۔ یہ جو آج کل دیواروں پر اردو اور سندھی کے حق میں اختلافی نعرے لکھے جا رہے ہیں یہ مجھے کسی طوفان کی آمد کی خبر دے رہے ہیں۔ بھٹو صاحب آج اسلامی سوشلزم کی بات کر رہے ہیں اور اسلامی ممالک کا بلاک بنا کر چین کے ساتھ تعلقات استوار کر کے پاکستان کو جوہری توانائی رکھنے والا ملک بنانا چاہتے ہیں، یہ سب باتیں استعمار ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرے گا۔ سندھ میں مہاجر ایک طاقتور عنصر ہے اور شہروں میں تو آپ اس کی اہمیت کو نظرانداز کر ہی نہیں سکتے۔ ابھی تک تو مہاجروں میں اپنے علیحدہ تشخص کا احساس پیدا نہیں ہوا ہے مگر مجھے ڈر ہے کہ اگر یہ اردو اور سندھی کے تنازعہ نے خدانخواستہ شدت اختیار کر لی تو یہاں بھی اختلافات کی تباہ کن دراڑ پڑ جائے گی۔ میرے خیال میں مدت کے بعد پاکستان کو ایک اچھا لیڈر ملا ہے جس کو بین الاقوامی تناظر میں اپنے ملک کے حالات کا صحیح عرفان حاصل ہے۔ اس وقت بھٹو صاحب اور ان کے ہمدرد ساتھیوں کے تدبر اور فراست کا امتحان ہے۔ انھیں کوئی ایسی تحریک جو کسی قسم کے اختلافات کا باعث بن سکتی ہو جڑ پکڑنے نہیں دینی چاہیے۔ میر صاحب! خواہ دنیا کچھ کہے کہ یہ پاکستان اسلام کی سربلندی اور اسلامی مملکت کے قیام کی خاطر وجود میں آیا ہے مگر میری بات اچھی طرح سے یاد رکھیے کہ یہ مسلم ریاست تو ہو سکتی ہے یعنی یہاں مسلمان تو حکومت چلا سکتے ہیں مگر دنیا کی استعماری طاقتیں اس کو اسلامی مملکت کبھی بننے نہیں دیں گی یعنی یہاں قرآن کے اسلامی قوانین کا عمل کبھی نہیں ہونے دیا جائے گا۔ یہ مملکت تو صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ اس کے ذریعہ سے سرمایہ دارانہ ممالک روس میں ریشہ دوانیاں کر سکیں اور تیل کے چشموں کی طرف اس کی پیش قدمی کو روکا جا سکے۔ میر صاحب نہایت انہماک سے جوش صاحب کی تقریر سن رہے تھے۔ آخر میں چونک کر کہنے لگے جوش صاحب آپ نے میری آنکھیں کھول دیں۔ میں بھٹو صاحب سے کہوں گا کہ وہ آپ کو اپنا مشیر تعلیم مقرر

کر لیں۔ جوش صاحب نے کہا میر صاحب اس نے آج تک کسی حاکم کی مصاحبی نہیں کی۔
بھلا میں کہاں اور یہ وبال کہاں۔ ہمیں تو مرزا نے یہ ہدایت کی ہے کہ:

یک بخت اوج نذر سبک باری اسد سر پر وبالِ سایۂ بالِ ہما نہ مانگ

یہ جو میں نے آج آپ سے اتنی باتیں کی ہیں یقین کیجیے میں بھٹو صاحب کی دل سے قدر کرتا ہوں اور آپ تو میرے بھائیوں کی طرح ہیں۔ میں اپنے دل کی بات آپ سے نہیں کہوں گا تو اور کس سے کہوں گا۔ میرے لیے سندھی بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی اردو بلکہ پاکستان کے تمام صوبوں کی زبانیں میرے اپنے ملک کی زبانیں ہیں۔ یہ ایک گلدستے میں سجے ہوئے مختلف رنگ کے پھولوں کے مانند ہیں جن کے اختلاف رنگ و بو کے باعث گلدستے کا حسن قائم ہے مگر ان سب کو ایک ہی گلدان میں رہنا چاہیے۔ ان کی وجہ سے گلدانوں کا بٹوارا نہیں ہونا چاہیے۔ مرزا نے ایک جگہ کہا ہے کہ:

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

کسی ملک کی علاقائی ثقافتیں ہوں یا زبانیں یہ رنگوں کی بوقلمونی اثبات بہار کی علامت ہیں مگر ان میں بہار آفرینی کی کیفیت صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کوئی ایک قدر مشترک ان کو ایک مرکز کے ساتھ وابستہ رکھ سکے اور زبان کی حد تک یہ بندھن صرف اردو زبان ہی بن سکتی ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں انگریزی زبان تمام ہندوستان کی قدر مشترک بنا دی گئی تھی کیونکہ وہ حکمرانوں کی ضرورت تھی مگر پاکستان کی حد تک یہاں کی علاقائی زبانوں کا مزاج صرف اردو زبان کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ ان سب کا رسم الخط مشترک ہے۔ ان کا خمیر ایک ہے ان میں بہت سے الفاظ مشترک ہیں۔ آج حکومت کو چاہیے کہ وہ ایسی تنظیمیں قائم کرے جو ملک میں لسانی تعصب کو پیدا نہ ہونے دیں بلکہ میں تو ملک کے بہتر مستقبل کی خاطر یہاں تک کہوں گا کہ اس قسم کے تعصب کو تعزیری جرم قرار دیا جائے۔ اسی صورت میں پاکستان مستقبل کے خطرات سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ آپ نے دیکھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی بنیاد بھی لسانی اختلاف ہی سے شروع ہوئی تھی۔ جوش صاحب کی ہر بات پر میر صاحب بار بار کہہ رہے تھے۔ سرکار آپ نے بجا فرمایا۔

جوش صاحب کی نہایت ہی بصیرت افروز باتیں جاری تھیں کہ بہت سے لوگ

میر صاحب سے ملنے کے لیے آ گئے اور ہم دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اب وہاں سے رخصت ہو جائیں چنانچہ جب جوش صاحب نے چلنے کے لیے اجازت چاہی تو میر صاحب ہم کو گاڑی تک پہنچانے آئے اور بہت تپاک سے رخصت کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میر رسول بخش تالپور سندھی تہذیب اور محبت کی مکمل مثال ہیں۔ میر صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ برنس روڈ آئے وہاں لسی پی اور ایک بجے جوش صاحب کو ان کے مکان پر پہنچا کر میں اپنے گھر آ گیا۔ چلتے وقت جوش صاحب نے اصرار کیا کہ آج شام کو بھی آ جاؤ۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ گھر آ کر میں نے دوپہر کا کھانا کھایا، تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد شام پانچ بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ اس وقت وہاں راغب صاحب مراد آبادی اور میاں فراست رضوی بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے وہ سب باتیں تفصیل سے بتائیں جو آج جوش صاحب نے میر صاحب سے کی تھیں۔ اس پر راغب نے ایک سوال نامہ مرتب کر کے اس پر جوش صاحب کے جوابات لکھ کر ان کے دستخط لے لیے۔

راغب صاحب نے سوال کیا کہ اگر علاقائی زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ دے کر اردو کو صرف رابطے کی زبان کی حیثیت سے باقی رکھا جائے تو اس سلسلے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ جوش صاحب نے کہا ایسا نظریہ تنگ نظری کی بدترین مثال ہو گا۔

راغب صاحب نے پھر دریافت کیا کہ جب اردو کسی صوبے میں پڑھائی ہی نہیں جائے گی تو اس کو رابطے کی زبان کا درجہ دینے سے کیا حاصل ہو گا؟ جوش صاحب کا جواب تھا کہ ظاہر ہے کہ جب پڑھائی نہیں جائے گی تو رابطے کا کام کیا دے گی۔

راغب صاحب نے پوچھا کہ اگر مادری زبان میں تعلیم دی جائے تو وہ انگریزی یا اردو کے مقابلے میں زیادہ مفید ہو گی یا نہیں۔ جوش صاحب نے کہا کہ کسی بھی زبان کے ساتھ تعصب نہیں ہونا چاہیے۔ علم خواہ کسی زبان میں ہو، حاصل کرنا چاہیے اور یہ تو بڑی واضح بات ہے کہ اگر تعلیم مادری زبان میں دی جائے گی تو ذہن آگے بڑھے گا اور بہتر نتائج مرتب ہوں گے بشرطیکہ اس زبان میں علم کا ذخیرہ اور ابلاغ علم کی صلاحیت موجود ہو۔ اتنے میں سورج غروب ہو گیا۔ مے خانہ سجایا گیا۔ چنگیری میں چنبیلی کے پھول بھر کر میز پر رکھ دیے گئے۔ بلی مارکہ اگر بتیاں جلا دی گئیں۔ جوش صاحب کی وہ تمام چیزیں جس میں ایک بلی اشارہ چشم سے

وقت گزراں کا اعلان کرتی رہتی ہے سامنے میز پر رکھ دی گئی اور جوش صاحب نے "بیاد فلاں بنت فلاں" کہہ کر گلاس منہ کو لگایا اور ایک گھونٹ پی کر گلاس میز پر رکھ دیا۔ راغب صاحب نے کلام سنانے کی فرمائش کی تو جوش صاحب نے فرمایا کہ صاحبو ایک نظم سنیے اور قافیوں کی داد دیجیے۔ نظم کا عنوان ہے "آ گئی جوانی"۔

"آ گئی جوانی"

کسی کی شمع کم عمری کی اکساہٹ کے دن آئے
ترنگیں کوک اٹھیں سینے میں جنجاہٹ کے دن آئے
جوانی کی انگیٹھی سنسنائی کوئلے چٹخے
لوسے آنچ نکلی تن کی ابلاہٹ کے دن آئے
روپہلی سطح پر مکھڑے کی دوڑیں چھپی کرنیں
کٹیلی رس بھری آنکھوں کی کجلاہٹ کے دن آئے
دلائی میں چھپایا گونجتے سینے کے فتنوں کو
جھکائی شوخیوں نے آنکھ شرماہٹ کے دن آئے
کھلنڈرے پن کے مکھڑے پر رس آیا نوجوانی کا
لب و رخسار کی خشکی میں چکناہٹ کے دن آئے
مرے ٹھنڈے عرق آلودہ لمحوں کو مبارک ہو
کہ اس کے شرتی پنڈے کی گرماہٹ کے دن آئے
رگ و پے سے دھواں اٹھا دھوئیں سے لو نکل آئی
نگاہ ناز سے لوہے کی پگھلاہٹ کے دن آئے
نظر پڑنے لگی رنگ نقوش لالہ و گل پر
خدا کا شکر ہے گڑیوں سے اکتاہٹ کے دن آئے

رہا کرتی تھیں محو خواب جو محراب ابرو میں
تو اترے اب ان پلکوں کی جھپکاہٹ کے دن آئے
زہے قسمت کہ اس کی اندفاعی کدوکاوش سے
ہمارے بے شکن بستر کی گنجلاہٹ کے دن آئے
الٰہی خیر اس طوفان میں جیب و گریباں کی
کہ اب انگڑائی سے چولی کی مسکاہٹ کے دن آئے
گلک پیدا ہوئی موج نفس کی آمد و شد میں
گجر بجنے لگا سینے میں گدراہٹ کے دن آئے
خدا کا شکر اب اے جوش راتوں کے اندھیروں میں
سرہانے کسی کے پاؤں کی آہٹ کے دن آئے

سب نے قوالی کی دل کھول کر داد دی۔ چوتھے پیگ کے دوران میں کھانا آ گیا۔ کھانے سے فارغ ہو کر جوش صاحب نے خوب کلیاں کیں۔ راغب صاحب نے کہا جوش صاحب آج کل آپ کی کلیات بہت مشہور ہو رہی ہیں۔ آخر میں جوش صاحب نے ایک کپ دودھ ایک چمچ اسپ غول کی بھوسی ملا کر پی لیا اور سونے کے لیے اپنی خواب گاہ میں چلے گئے اور محفل برخاست ہو گئی۔

اس واقعے کے تقریباً ایک ہفتے تک میں اپنے کاموں میں مشغول رہا کہ جوش صاحب سے ملاقات نہ ہو سکی۔

بابا صاحب اور منصور حلاج:

جمعہ ۳۱ ویں مارچ ۱۹۷۲، صبح آٹھ بجے جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا۔ کہنے لگے ارے یہ اتنے دن کہاں غوطہ لگایا۔ ارے بھائی کہاں غائب ہو گئے ہو؟ میں نے کہا کچھ کام تھے اس لیے حاضر نہ ہو سکا۔ فرمایا اب کب آؤ گے۔ عرض کیا آپ جب حکم دیں۔ فرمایا میں آج ذہین شاہ کے وہاں جا رہا ہوں اگر نو بجے تک آ سکو تو تم بھی میرے ہمراہ چلو۔ چنانچہ میں ایک گھنٹے میں تیار ہو کر ٹھیک نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب تیار کھڑے تھے۔

ہم دونوں پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ ایس میں بابا صاحب کے مکان کے لیے روانہ ہوگئے۔ راستے میں میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ کو بابا صاحب سے واقعی اتنی محبت ہے کہ آپ بار بار ان سے ملتے رہتے ہیں۔ جوش صاحب سچ سچ بتائیے کہ آپ بابا صاحب کی ذہانت و ذکاوت سے متاثر ہیں یا ان کے حلقۂ ارادت کے حسن و جمال سے؟ جوش صاحب نے میری طرف نہایت معنی خیز نظروں سے دیکھا پھر فرمایا۔ میاں اب تم بھی دل کے نہاں خانوں میں پہنچ کر چور پکڑنے لگے ہو۔ میں نے کہا یہ بات تو ظاہر ہے کہ بابا صاحب کے عقائد اور ان کا مبلغ علم آپ کے نظریات سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ پھر قدر مشترک یا تو شاعری ہے یا ان کی محفلوں میں موسیقی و نغمہ سے لطف اندوز ہونے کی خواہش یا پھر جمال پری رخاں کی عقیدت مندی نے آپ کے اندر کے شاعرانہ جذبہ حسن پرستی کو اپنی جانب متوجہ کیا ہے۔
جوش صاحب کہنے لگے کہ یہ تمام باتیں یعنی بابا صاحب کی ذہانت و ذکاوت، ان کی شاعری، ان کے حلقۂ ارادت کا حسن و جمال و نغمہ و حال ان سب نے مجھے متاثر کیا ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے علاوہ بابا صاحب کی محبت ان کا خلوص، ان کی طلسماتی شخصیت کا سحر ان کی مہمان نوازی اور ہر ایک شخص کی تکلیف دور کرنے کی خصوصیت ان تمام باتوں نے مجھے بابا صاحب کا گرویدہ بنایا ہے اور میں زیادہ دن بابا صاحب سے ملے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اتنے میں بابا صاحب کا آستانہ آگیا۔ ہم لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ بڑے ہال میں وہ اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب کو دیکھتے ہی محبت سے اٹھ کر گلے ملے اور اپنے قریب بٹھا لیا۔ معلوم ہوتا ہے ہمارے آنے سے پہلے بابا صاحب منصور حلاج کے متعلق کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔
ہمارے بیٹھتے ہی انھوں نے فرمایا لوگوں نے منصور حلاج کو بہت غلط سمجھا ہے۔ کوئی شخص اس کے علم کی گہرائی تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کی ذہانت و ذکاوت اس کا شعور ذات بے پناہ بلند تھا۔ منصور نے اپنی روح کو اس کائنات کی روح اعظم کے ساتھ ہم آہنگ محسوس کیا تھا۔ اس نے کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ اسے اپنی انا کی عظمت کا ادراک ہو گیا تھا۔
وہ سمجھتا تھا کہ وہ روح جو مجھ میں ہے وہی اس تمام کائنات کی قوت حیات ہے۔ جب وہ انالحق کہتا تھا تو اس کا مطلب اسی روح کی حقانیت کا ادعا تھا۔ وہ اپنے وجود کے حق ہونے کا دعویدار تھا۔ اس کے خیال میں اس کائنات میں وجود صرف واجب الوجود کے لیے ہی یقینی

ہے باقی تمام ظاہری صورتیں دھوکا ہیں اور چونکہ میری روح بھی اسی واجب الوجود کا حصہ ہے اس لیے میں بھی حق ہوں۔ بابا صاحب نے ایک کتاب دکھا کر فرمایا کہ یہ ایک فرانسیسی مصنف کی کتاب ہے۔ اس نے بہت محنت سے منصور حلاج کی کتاب کا فرانسیسی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور وہ خود بھی اس کتاب پر کام کر رہے ہیں۔

بابا صاحب نے کہا کہ مسلمان صوفیا میں وحدت الوجود کا تصور بھی یہی ہے۔ لاموجود الا اللہ۔ محمد ابن عربی نے بہت تفصیل سے اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کی تعلیمات کا خلاصہ یہ ہے کہ "حق" صورت عینیت میں عدم میں ہے لیکن عالم خلق میں وہ اشکال میں ظاہر ہے۔ اس طرح مخلوقیت کے مرتبہ میں وجود یعنی ہستی حق لے کر پیدا ہوئی کیونکہ حقائق خلق، صورت محض ہیں مگر یہ تمام صورتیں دراصل حق ہی کی ہیں لہذا تمام مخلوق حق ہے۔ یہاں حق دراصل وجود یا ذات کے معنی میں استعمال ہوا ہے صورت کے معنی میں نہیں۔ شیخ اکبر نے فتوحات مکیہ میں وجود اور صورت کی قرابت کو ثابت کیا ہے۔ میں نے کہا بابا صاحب ہم لوگ بحیثیت قوم بڑے مردہ پرست واقع ہوئے ہیں۔ اب ہم شیخ اکبر اور منصور حلاج کے فلسفے کو لیے بیٹھے ہیں اور جو یہ آپ کے سامنے دور جدید کا منصور وا بن ہندی حضرت جوش کی شکل میں بیٹھا ہوا ہے آپ اس کی طرف توجہ نہیں فرماتے۔ میرے دخل در معقولات سے بابا صاحب یہ سمجھے کہ ان کی بات چونکہ بہت گہرے اور مشکل مسائل سے متعلق تھی اس لیے میری سمجھ سے بالاتر ہے اور میں موضوع بدلنا چاہتا ہوں۔ اس لیے وہ ایک دم خاموش ہو گئے۔ مگر جوش صاحب نے کہنا شروع کیا کہ اردو اور فارسی کے زیادہ تر شعرا نے وحدت الوجود کے فلسفہ کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ خاص طور سے غالب نے اس پر بہت اچھے شعر کہے ہیں جیسے:

دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بابا صاحب۔ تفکر و استغراق کے عالم میں ایک مقام وہ بھی آتا ہے جہاں متفکر خارجی کائنات کی لطیف ترین شے سے بھی زیادہ لطیف ہو جاتا ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

گاہ دل اتنی لطافت میں ڈبوتا ہے مجھے چاندنی کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

مگر ایک منزل اس سے آگے اور بھی ہے جہاں متفکر، فکر اور خارجی کائنات میں کوئی غیریت

باقی ہی نہیں رہتی۔ جیسے غالب نے کہا ہے کہ:

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

میری ایک رباعی ہے:

لعل و خزف و سوسن و خاشاک و گیاہ — نجم و گہر و ذرہ و خار و خس و ماہ

جب پردۂ اشکال اٹھایا تو کھلا — میرے ہی یہ سب نام ہیں اللہ اللہ

بابا صاحب یہ رباعی سن کر جھومنے لگے۔ فرمایا تیسرے مصرع میں لفظ کھلا اور چوتھے میں اللہ اللہ کا جواب نہیں ہے۔ جوش صاحب آپ واقعی محبوب الٰہی ہیں۔ جوش صاحب نے کہا یہاں محبوب کی اضافت مخلِ فصاحت ہے۔

بابا صاحب نے مسکرا کر کہا مگر ممد حیات ہے۔

جوش صاحب .... وہ کیسے؟ بابا صاحب نے کہا تاکہ آپ کو وار سے محفوظ رکھا جائے۔ بات بہت گہرائی تک پہنچ گئی تھی۔ دو عظیم صوفی ایک دوسرے کے مقابل تھے۔ بابا صاحب نے کہا جوش صاحب جس کو آپ تفکر کہتے ہیں یہ انسان کو بڑے دھوکے میں ڈال دیتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے انسانی فکر کو قرآنی علم کے تابع کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد بابا صاحب نے علم کی ماہیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اپنے خاص نقطۂ نظر سے فرمایا کہ علم دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک مادی اشیاء کا علم جو انسان اپنی عقل کے توسط سے حاصل کر سکتا ہے لیکن اس کی عقل روح کی ماہیت سمجھنے سے قاصر ہے۔ روح کی حقیقت سمجھنے کے لیے دوسری طرح کے علم کی ضرورت ہے جسے الہام یا وحی کہتے ہیں۔ یہ علم نبیوں اور پیغمبروں کو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے اور ہم جو کچھ روح کے متعلق جان سکتے ہیں وہ وہی ہے جو نبیؐ نے ہم کو بتایا ہے۔ روح دراصل امر الٰہی میں سے ہے اور یہ امر یعنی کن کا حکم ہر وقت جاری رہتا ہے۔ میں نے عرض کیا بابا صاحب یہ بتائیے کہ کیا روح موجود بالذات کوئی الگ شے ہے جو مادے سے ماوراء اپنا وجود رکھتی ہے یا یہ صرف ایک توانائی ہے جو ہمارے ادراک میں مادی مظاہر کے توسط سے آتی ہے۔ اسی توانائی کو علم طبیعیات کی رو سے انرجی کہا جاتا ہے اور جس کو ہم عقل کہتے ہیں وہ بھی دراصل انرجی ہی ہے جو ہمارے دماغی خلیات کے توسط سے ظاہر ہوتی ہے ...... اور جس کو ہم الہام کہتے ہیں یہ بھی ہمارے دماغ ہی کا

ایک پیچیدہ عمل ہے جس کے توسط سے خود ہمارا اپنا مبلغ علم ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک قدیم غلط نظریہ یہ بھی ہے کہ ہمارا دل عضو فکری ہے حالانکہ علم افعال اعضا (Physiology) کی رو سے اب یہ بات بلا خوف تردید کہی جاتی ہے کہ عضو فکری صرف دماغ ہے اور دل محض ایک پمپ ہے جس کے ذریعے سے خون جسم کے تمام اعضا میں پہنچایا جاتا ہے۔ جوش صاحب میرے سوال کی معقولیت مگر موقع اور محل کی نسبت سے اس کی نامعقولیت کو سمجھ رہے تھے۔ زیرلب مسکراہٹ کے ساتھ بولے ارے میاں یہ تمھارا سوالِ جواب آمیز زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ اس وقت آپ اپنی سائنسی فکر کو لگام دیں اور بابا صاحب سے منصور حلاج کے متعلق سنیں۔ مگر بابا صاحب نے فرمایا۔ نہیں نہیں ان کو کہنے دو یہ آج کل کے سائنسی فکر رکھنے والے لوگ نہ تو روح کی ماہیت کو سمجھ سکتے ہیں اور نہ وحی کی عظمت کو۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے روحانی طاقت کو حاصل کرنا پڑتا ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ مگر اس تمام بحث کے دوران بابا صاحب کے چہرے پر ان کی فطری محبت، شرافت اور وقار میں کسی قسم کا تغیر واقع نہیں ہوا۔ وہ سنجیدگی سے یہ سمجھ رہے تھے کہ چونکہ میرا علم ناقص ہے اس لیے ان کا فرض ہے کہ وہ میری صحیح راہنمائی فرمائیں۔ مگر جوش صاحب اس گفتگو کا رخ بدلنا چاہتے تھے کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔

فضل احمد کریم فضلی...... بیت الغزل:

بابا صاحب نے فون اٹھایا۔ دوسری طرف فضل احمد کریم فضلی صاحب کا ٹیلی فون تھا انھوں نے کہا بابا صاحب اور جو حضرات ان کے پاس بیٹھے ہیں وہ سب ان کے گھر پہنچ جائیں۔ بابا صاحب نے کہا کہ جوش صاحب اور ان کے دوست خورشید علی خاں بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ چنانچہ ہم تینوں فضلی صاحب کے مکان "بیت الغزل" پہنچ گئے۔

فضلی صاحب کچھ مدت سے بیمار ہیں مگر آج تندرست دکھائی دے رہے تھے۔ فضلی صاحب اپنے پلنگ پر گاؤ تکیے سے لگے نیم دراز تھے اور انھوں نے لیٹے لیٹے ہی ہمارا استقبال کیا۔ کہنے لگے ضعف بہت بڑھ گیا ہے کھڑا ہوتا ہوں تو چکر آنے لگتے ہیں۔ ہم لوگ بیٹھے ہی تھے کہ ماہرالقادری صاحب اور ان کے ساتھ ایک اور صاحب آ گئے۔ ماہر صاحب کو

بہت دن بعد دیکھا تھا۔ داڑھی پر خضاب لگانے لگے تھے۔ آنکھوں میں سرمہ بھی کچھ زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ خیریت پوچھی اور خاص طور پر حیدرآباد دکن میں میری بہن اور ان کے شوہر پروفیسر اور سابق ایم۔ پی۔ اے اختر حسن صاحب کے متعلق پوچھنے لگے کہ اب کیسے ہیں۔ میں نے کہا بہت دنوں سے کوئی خط نہیں آیا مگر سب لوگ خیریت سے ہیں۔ اس کے بعد سب نے فضل صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ فضل صاحب بہت دیر تک کلام سناتے رہے۔ ایک شعر پر جو یہ تھا:

اثر دل پہ کرتی تو یاروں کی باتیں　　مگر ان کا انداز تھا ناصحانہ

ماہر صاحب نے کہا:　مگر ان کا انداز تھا تاجرانہ

بابا صاحب نے کہا:　کبھی جوشیانہ کبھی ماہرانہ

یہ ہنسی مذاق ہو رہا تھا کہ ایک خاتون سبز چائے لے کر آ گئیں اور ہر ایک سے پوچھ کر کہ وہ کتنے چمچے شکر استعمال کریں گے۔ ہر ایک کی پیالی میں کسی میں ایک کسی میں دو چمچے شکر ڈال کر چائے دیتی رہیں۔ جب ماہر صاحب کی باری آئی تو انھوں نے ایک لطیفہ سنانا شروع کر دیا کہ ایک محفل میں ایک خاتون نے ان سے پوچھا کہ وہ کتنے چمچے شکر چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا آپ ڈالتی جائیں تو خاتون نے جب آٹھ چمچے شکر پیالی میں ڈال کر ہاتھ روک لیا تو وہ کہنے لگے کہ میں نے شرم کے مارے مزید شکر مانگنا مناسب نہ سمجھا اور چائے پھیکی ہی پی گیا۔ اس وقت تک ماہر صاحب کی پیالی میں چار چمچے شکر پڑ چکی تھی۔ میں نے کہا ماہر صاحب آپ تو حیدرآباد میں رہ کر کھڑا چمچا پینے کے عادی ہیں مگر اب اس عمر میں شکر کا زیادہ استعمال نقصان دہ ہے اس لیے اب آپ پھیکی چائے پی لیجیے۔ ماہر صاحب کہنے لگے اچھا بھائی، آپ کہتے ہیں تو پھیکی ہی چائے پیے لیتا ہوں۔ اس کے بعد پھر شاعری شروع ہو گئی۔ جوش صاحب نے ایک نظم سنائی۔ ماہر صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ بابا صاحب نے بھی کلام سنایا۔ ایک شعر پر سب نے بہت داد دی۔ مجھے اور جوش صاحب کو بھی بہت پسند آیا۔

فسردہ سکانہ حرم میں دل رسیدۂ دیر　　یہاں خدا کے تصور میں بت گری سی ہے

یہ شعر سب کو اتنا پسند آیا کہ کئی کئی دفعہ پڑھوایا گیا۔

اس کے بعد بابا صاحب نے ایک اور عارفانہ غزل سنائی جس کے دو شعر سب نے پسند کیے۔

نقشِ قدم جہاں گزرے	ترے آپ کا
وہ بدنصیب ہے سجدہ جسے گراں گزرے
وہ اہلِ عشق نہ اہلِ یقیں نہ اہلِ ادب
ترے حضور جسے غیر کا گماں گزرے

ماہر صاحب نے گرہ لگائی:

خدا کرے کہ وہ ساعت بھی جلد آ جائے
جناب جوش پہ جب بولنے سے گراں گزرے

سب نے تو آمین کہا مگر جوش صاحب نے فوراً کہا۔ انشاء اللہ آپ کی دعا کبھی قبول نہیں ہو گی۔ کیونکہ:

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم	اے بے خبر ز لذت شرب مدام ما

غرض ایک بجے تک یہ دلچسپ محفل شعر و سخن جاری رہی۔ پھر سب اپنے اپنے گھر رخصت ہو گئے۔ میں نے بابا صاحب کو ان کے گھر پہنچایا۔ جوش صاحب کو ان کے گھر۔ اور پھر جلد ملنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر آ گیا۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کہ اگر کل فرصت ہو تو صبح نو بجے تک آ جاؤ میر صاحب کے گھر چلیں گے مجھے ان سے ضروری کام ہے۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

سرکاری وظیفہ کی درخواست:

دوسرے دن صبح نو بجے میں جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہ تیار بیٹھے تھے فوراً میرے ساتھ ہو لیے۔ ہم لوگ میر رسول بخش تالپور کی سرکاری قیام گاہ پہنچے۔ دس بج رہے تھے معلوم ہوا کہ مشیر اعلیٰ ابھی تک آرام فرما رہے ہیں مگر ان کے سیکرٹری نے مجھے اور جوش صاحب کو اندر ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھا دیا۔ جوش صاحب نے ایک پرچے پر اپنا نام لکھ کر سیکرٹری کو دیا تاکہ وہ میر صاحب کو جوش صاحب کے آنے کی اطلاع دے سکے۔ تھوڑی ہی دیر میں میر صاحب شب خوابی کے لباس میں چلے آئے اور جوش صاحب سے معذرت چاہی کہ انھیں انتظار کرنا پڑا۔ اتنے میں چائے اور بسکٹ وغیرہ بھی آ گئے۔ اس سے پہلے کہ جوش صاحب کوئی بات شروع کرتے میر صاحب نے کہنا شروع کر دیا۔ "صاحب ایسی قوم سے واسطہ پڑا ہے کہ جو ملک میں بدنظمی اور انتشار پیدا کرتی رہتی ہے اور کسی طرح امن و امان کا قیام گوارا نہیں کرتی۔ اب دیکھیے کل ہی کس بے پر چند شرپسند لوگوں نے اسکول

سی لڑکیوں کی بے عزتی کی اور انھیں پریشان کیا۔ صدر بھٹو صاحب سخت ناراض ہے۔۔۔ اس کو بھی کوئی سکون سے کام نہیں کرنے دیتا۔ جوش صاحب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر بھٹو صاحب کو کام کرنے دیا گیا تو وہ اس ملک کی تقدیر بدل دے گا۔ جوش صاحب نے کہا کہ میر صاحب اس وقت بھٹو صاحب کو بہت ٹھنڈے دل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد میر صاحب نے کہا۔ سرکار اس وقت کیسے زحمت فرمائی۔ میرے لائق کوئی حکم ہو تو فرمائیں۔ جوش صاحب نے کہا میر صاحب آپ کو تو معلوم ہے کہ روشن علی بھیم جی۔ ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی سے مجھے دو ہزار روپے ماہانہ دیا کرتے تھے مگر اب حکومت نے اس کمپنی کو قومی ملکیت میں لے کر بھیم جی کو الگ کر دیا ہے۔ اس لیے انھوں نے میری ماہانہ رقم بند کر دی ہے۔ میر رسول بخش صاحب نے کہا جوش صاحب آپ بالکل فکر نہ ہوں۔ میں آج ہی بھٹو صاحب سے بات کروں گا اور آپ کا ماہانہ وظیفہ بہت جلد جاری ہو جائے گا۔ یہ حکومت کسی کی جاگیر تو نہیں ہے اگر ہم اس حکومت سے لے سکتے ہیں تو آپ کو بھی ضرور ملے گا۔ میں بھٹو صاحب سے اس معاملے کو طے کرا کے آپ کو خود مطلع کروں گا اور یہ کام انشاء اللہ ایک دو دن میں ہی ہو جائے گا۔ میر صاحب نے جوش صاحب کو اس طرح مطمئن کیا کہ وہ خوش ہو کر وہاں سے رخصت ہوئے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے کہا کہ چلو آغا حسن عابدی صاحب کے گھر چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ کلفٹن روڈ پر واقع آغا صاحب کے گھر چلے گئے۔

آغا حسن عابدی صاحب:

جب ہم ان کے گھر پہنچے تو اس وقت ۱۱ بج رہے تھے معلوم ہوا کہ آغا صاحب ابھی تک سو رہے ہیں۔ مگر جب ان کو جوش صاحب کے آنے کی خبر دی گئی تو وہ تیار ہو کر تقریباً ایک گھنٹے میں باہر آئے مگر اس مدت میں آغا صاحب کے ملازمین نے ہم کو بہت لذیذ چائے پلائی اور کھانے کی بہت سی چیزیں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔ آغا صاحب کا مکان بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ ڈرائنگ روم کا سفید قالین اور اسی سے مناسبت رکھنے والے خوبصورت ریشمیں پردے بہت جاذب نظر تھے۔ وہاں کی ہر چیز کی سجاوٹ سے مکین کے اعلیٰ ذوق حسن کا پتا چلتا ہے۔ آغا صاحب نے آتے ہی ہمارے انتظار کی زحمت برداشت کرنے پر

معافی مانگی پھر جوش صاحب کے آنے کا سبب دریافت کیا تو جوش صاحب کہنے لگے کہ ان کو کسٹم کی طرف سے کلیرنگ فارورڈنگ (Clearing Forwarding) کا لائسنس ملا ہے جس پر ان کے ایک عزیز عابد علی صاحب کام کر رہے ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ آغا صاحب اپنے بینک (یونائیٹڈ بینک) کا کلیرنگ کا تمام کام ان کی ایجنسی کو دیں تاکہ جوش صاحب کی آمدنی کی کوئی سبیل ہو سکے۔ آغا صاحب نے کہا کہ ان کے پاس کام زیادہ نہیں ہے مگر اس ضمن میں ان سے جو کچھ ہو سکے گا وہ ضرور کریں گے۔ اس کے بعد آغا صاحب سے کچھ فلسفیانہ قسم کی باتیں ہونے لگیں۔ آغا صاحب کی شخصیت جس قدر دلکش ہے ان کی قابلیت اور انداز گفتگو بھی بہت متاثر کرنے والا ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ کائنات ہر آن تغیر پذیر ہے۔ یہ کوئی تکمیل شدہ شے یعنی (Finished Product) نہیں ہے بلکہ اس میں لامحدود امکانات پوشیدہ ہیں۔ ہم خود اس کل کا ایک جزو ہیں جیسے قطرہ دریا کا جزو بھی ہے اور اس کے صفات بھی رکھتا ہے۔ ہماری صلاحیتیں بھی ترقی کر کے اس کائنات سے اخذ فیض کر سکتی ہیں۔ انسان کو کبھی اپنی موجودہ حالت پر قناعت کر کے بیٹھنا نہیں چاہیے بلکہ اس کو ہمیشہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں لگے رہنا چاہیے۔ میں نے کہا آغا صاحب اقبال نے بھی اسی تصور کو پیش کیا ہے۔ ایک جگہ وہ کہتا ہے:

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں   ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

اور غالب نے کہا ہے کہ:

جا داد بادہ نوشی رنداں ہے شش جہت   غافل گماں کرے ہے کہ گیتی خراب ہے

آغا صاحب! جی ہاں یہی بات ہے۔ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ چونکہ یہ کائنات (Finished Product) نہیں ہے اور اپنے اندر لامحدود امکانات رکھتی ہے۔ اس لیے یہ کام انسان کا ہے کہ وہ اس ہر آن تغیر پذیر کائنات کو اپنی مرضی کے مطابق (Shape) دے۔ دنیا میں صرف وہی انسان یا اقوام بام عروج پر متمکن ہونے کی حقدار ہیں جو اس تغیراتی بہاؤ کا رخ اپنی مرضی کے مطابق موڑنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ میں نے کہا آغا صاحب آپ کو یہ باتیں کہنے کا حق ہے کیونکہ یہی آپ کا عملی فلسفہ حیات بھی ہے۔ اتنے میں ملازم نے آ کر کہا کہ آغا صاحب کے لیے اسلام آباد سے ٹی فون ہے اور بھٹو صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔ آغا صاحب تو

اٹھ کر چلے گئے اور میں اور جوش صاحب آپس میں باتیں کرنے لگے کہ آغا صاحب نہ صرف فلسفیانہ فکر رکھتے ہیں بلکہ اس کے مطابق عمل بھی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد آغا صاحب تشریف لائے اور کہنے لگے کہ بھٹو صاحب نے اسلام آباد بلوایا ہے۔ وہ بینکوں کو قومی ملکیت میں لینا چاہتے ہیں۔ میں جا کر ان سے کچھ مہلت لینے کی کوشش کروں گا۔ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ ہم نے آغا صاحب سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی تو انھوں نے کہا آپ کل گیارہ بجے تک اگر دفتر تشریف لے آئیں تو میں آپ کے سامنے متعلقہ افسر کو بلوا کر کہہ دوں گا کہ آئندہ سے بینک کا تمام کلیئرنگ فارورڈنگ کا کام وہ آپ کی ایجنسی کو دیا کریں۔ غرض کہ دو بجے ہم لوگ آغا صاحب کے گھر سے رخصت ہو کر اپنے اپنے گھر آ گئے۔

دوسرے دن میں اور جوش صاحب آغا صاحب کے دفتر یونائیٹڈ بینک کے صدر دفتر پہنچے۔ آغا صاحب کسی میٹنگ میں مشغول تھے مگر جیسے ہی ان کو جوش صاحب کے آنے کی اطلاع ملی فوراً ہم لوگوں کو اپنے دفتر میں بلوا لیا۔ جوش صاحب کے کام کے سلسلے میں انھوں نے متعلقہ افسر کو بلوا کر ہدایات دے دیں کہ آئندہ کلیئرنگ فارورڈنگ کا کام جس قدر ممکن ہو جوش صاحب کی ایجنسی کو دیا جائے ...... چونکہ جوش صاحب نے محسوس کر لیا تھا کہ آغا صاحب بہت مصروف ہیں۔ ان کو بھٹو صاحب نے اسلام آباد بلوایا تھا اس لیے آغا صاحب اپنے مشیروں سے مشورہ کر رہے تھے کہ اگر بھٹو صاحب سے بینکوں کے قومیانے کا مسئلہ اٹھے تو ان کو کیا لائحہ عمل اختیار کرنا چاہیے ..... اس لیے ہم لوگ جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گئے اور چونکہ نعمت اللہ خاں کا دفتر یعنی پولیس ہیڈ آفس یونائیٹڈ بینک سے بہت قریب تھا اس لیے جوش صاحب نے ان سے ملنے کی خواہش کی تو ہم لوگ ان کے آفس چلے گئے۔ وہاں جیسے ہی جوش صاحب کی آمد کا علم دوسرے پولیس افسروں کو ہوا، بہت سے افسر نعمت کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ نعمت نے سب کی تواضع چائے اور بسکٹ سے کی۔ کچھ لوگوں نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی مگر جوش صاحب نے اس مقام کو شاعری کے لیے مناسب نہیں سمجھا۔ وہ صرف نعمت کی خیریت دریافت کرنے کے لیے گئے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم لوگ رخصت ہوئے اور میر رسول بخش تالپور کی قیام گاہ پہنچے۔ وہاں معلوم ہوا کہ میر صاحب صدر بھٹو سے ملاقات کے لیے گئے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب نے ایک پرچہ پر اپنے

آنے کی اطلاع میر صاحب کو دی اور گھر آ گئے۔

دوسرے دن شام کو میں، راغب صاحب اور چند دوسرے احباب جوش صاحب کے مکان پر جمع تھے۔ جوش صاحب نے کہا کہ میں کل یعنی چھٹی اپریل کو صبح کی گاڑی سے پنڈی جا رہا ہوں آج دن میں میر صاحب کا ٹیلی فون آیا تھا انھوں نے کہا کہ مجھے بھٹو صاحب نے اسلام آباد بلوایا ہے۔ میر صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کس لیے بلوایا ہے وہ تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو گا۔ اس کے بعد سب نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب نے پہلے کچھ رباعیات سنائیں۔

وہ گرد ہے سب اٹے ہوئے ہیں معبود
سب ایک سبق رٹے ہوئے ہیں معبود
ہاں دیکھ کہ اس گنبد زنگاری میں
کتنے احمق ڈٹے ہوئے ہیں معبود

خون دل سے چمن کو مہکاتا ہے
خود کو پئے آب و رنگ سنولاتا ہے
سروں سیجوں میں پھول بٹ جاتے ہیں
مالی ہے کہ دیکھتا ہی رہ جاتا ہے

اس کے بعد یہ نظم سنائی:

دشمن سے بھی جب تک کہ محبت نہیں ہوتی
تکمیل عروج بشریت نہیں ہوتی
اس درجہ ہے آگاہی رفتار تغیر
دنیا کی کسی بات پہ حیرت نہیں ہوتی
رگ رگ میں بھڑکتے ہی دم فکر جو شعلے
دوزخ کے شراروں میں وہ حدت نہیں ہوتی
اندر سے جو ابھرے وہ حقیقت میں خوشی ہے
باہر سے جو آئے وہ مسرت نہیں ہوتی
افلاس کو مل جائے اگر خاطر مجموع
پھر دولت آفاق کی حاجت نہیں ہوتی
آتی ہے وہ شب بھی کبھی آغوش بتاں میں
اللہ کی بندے کو ضرورت نہیں ہوتی

اس کے بعد جوش صاحب جب طرح ہو گئے تو میں نے جوش صاحب کا کلام سنانا شروع کر دیا۔ بہت سی رباعیات اور نظمیں سنا چکا تو جوش صاحب نے کہا ارے میاں تمھیں تو میرا کلام مجھ سے زیادہ یاد ہے۔ اس پر راغب صاحب نے فوراً یہ رباعی فی البدیہہ ارشاد فرمائی۔

عظمت پہ اس انسان کی کیوں رشک نہ آئے　　اس حافظے اس شان پہ کیوں رشک نہ آئے

حافظ ہیں کلام جوش کے اسے راغب　　خورشید علی خان پہ کیوں رشک نہ آئے

غرض رات پونے نو بجے تک شعر و شاعری کی محفل گرم رہی۔ جوش صاحب چوتھا پیگ ختم کر کے کھانا تناول فرما چکے تو دریافت فرمایا۔ صاحبو! اب کیا وقت ہوا ہے تو میں نے عرض کیا۔ نو میں بیس باقی ہیں" جوش صاحب فوراً بولے۔ "پھر بھی اتنے خبیث باقی ہیں"۔ اس کے بعد ظاہر ہے کون شخص وہاں بیٹھ کر خبیث کہلانے کی بے غیرتی برداشت کر سکتا تھا۔ جوش صاحب کو ان کے نواسوں کے حوالے کر کے ہم سب رخصت ہونے لگے۔ چلتے چلتے جوش صاحب نے مجھ سے کہا۔ "کل ہمیں گاڑی میں بٹھانا نہ بھولیے گا" میں نے وعدہ کر لیا اور گھر آ گیا۔

جوش صاحب کی اسلام آباد روانگی اور ملازمت کی کوشش:

دوسرے دن چھٹی اپریل ۱۹۷۲ء کو میں جوش صاحب کو تیز گام پر سوار کرا کے گھر آ گیا اور جوش صاحب پنڈی روانہ ہو گئے۔

جوش صاحب اسلام آباد کس مقصد سے گئے تھے؟ انھوں نے تو سرسری طور پر یہ بتایا تھا کہ بھٹو صاحب نے ان کو وہاں بلوایا ہے مگر یکم مارچ ۱۹۸۲ء کے روزنامہ جنگ میں مولانا کوثر نیازی کا ایک مضمون بہ عنوان "حضرت جوش ملیح آبادی ...... چند یادیں" مشاہدات و تاثرات" کے کالم میں چھپا ہے۔ یہ مضمون مولانا نے جوش صاحب کی دوسری برسی کے موقع پر تحریر فرمایا ہے۔ اس سے جوش صاحب کے اس سفر کے مقصد پر روشنی پڑتی ہے۔ اس لیے مولانا کا مضمون یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"۱۲ اپریل ۷۲ء کی بات ہے میں وزارت اطلاعات کے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ پرائیویٹ سیکرٹری نے ایک پرچہ لا کر دیا۔ اس پر حضرت جوش ملیح آبادی نے اپنے ہاتھ سے یہ تین رباعیاں لکھ بھیجی تھیں۔

ہاں قطب خرابات مغاں آیا ہے　　سلطان بتاں و حوریاں آیا ہے

کوثر! متواج ہو کہ ساحل پہ ترے　　سر حلقۂ رندانِ جہاں آیا ہے

ایک پھول مجھے بخش! گلستاں لے لے
اک قطرہ پلا بحر پرافشاں لے لے
دے دے قدحِ آتشِ سیال مجھے
اور اس کے صلے میں آبِ حیواں لے لے

اے پیرِ مغاں و بندہ پرور! مددے
برگشتہ ہے پھر مجھ سے مقدر مددے
بھر دے مرے سبو کو بھر دے
اے حوصلۂ ساقیِ کوثر! مددے

تالپور برادران (جناب میر علی احمد تالپور اور میر رسول بخش تالپور مرحوم) جن سے حضرت جوش کے پرانے مراسم تھے۔ ازراہِ ادب پروری مجھ سے پہلے ہی ذکر کر چکے تھے کہ جوش صاحب مجھ سے ملنے کے لیے اسلام آباد آنا چاہتے ہیں۔ مگر اس وقت کسی پیشگی اطلاع یا فون کے بغیر ان کی تشریف آوری میرے لیے بالکل غیر متوقع تھی۔ میں کابینہ کے اجلاس میں پیش کرنے کے لیے ایک اہم مسودہ کی تیاری میں مصروف تھا۔ کوئی اور ملاقاتی ہوتا تو میں اسے شاید ہی مل پاتا لیکن جوش صاحب کے مقام و مرتبہ کی وجہ سے میں نے کاغذات ایک طرف رکھ دیے اور خود انتظار گاہ میں جا کر انھیں اپنے ہمراہ لے آیا۔ جوش صاحب کچھ ہی عرصہ پہلے بھارت کو چھوڑ کر پاکستان آئے تھے[1] اور غمِ دوراں[2] کے ہاتھوں مجبور ہو کر کسی معقول ملازمت کی تلاش میں تھے۔ میں نے عرض کیا۔ فوری طور پر تو میں کچھ نہ کر سکوں گا لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کے حسبِ حیثیت کوئی صورت پیدا ہو جائے"۔ اس ملاقات میں جوش صاحب نے اپنا تازہ کلام بھی سنایا۔ میرے ساتھ چائے بھی پی۔ ان کی باتوں میں دل شکستگی پائی جاتی تھی اور اشعار میں ناقدریِ عالم کا گلہ۔ مجھے بار بار یہ شعر یاد آ رہا ہے۔

یوں پھریں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے
اے کمال! افسوس ہے تجھ پر کمال افسوس ہے

مہینہ بھر اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ جوش صاحب کے لیے کیا کیا جائے۔ ادب اور ادیب۔ دائرہ کار کے اعتبار سے وزارت تعلیم سے متعلق تھے۔ وزیر تعلیم سے بات کی مگر وہ

۱۔ یہاں مولانا کو غلط فہمی ہوئی ہے جوش ۱۹۵۵ء میں کراچی آ گئے تھے۔
۲۔ مولانا کا یہ تجزیہ بھی غلط فہمی پر مبنی تھا جوش صاحب دراصل غمِ جاناں کے ہاتھوں مجبور ہو کر لاہور کے قریب رہنا چاہتے تھے۔

بد قسمتی سے جوش صاحب کے ادبی مقام ہی سے نابلد محض تھے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وزیر اعظم سے خصوصی اجازت لے کر میں اپنی وزارت ہی میں "افسر بکار خاص" قسم کی کوئی آسامی پیدا کروں اور اس پر جوش صاحب کو فائز کر دوں کہ ٹھیک ایک ماہ کے بعد (۱۲ مئی ۱۹۷۲ء) کو حضرت جوش نے ایک خط کے ذریعے یاد دہانی کرائی۔ انھوں نے لکھا۔

"بندہ نواز! آپ نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔ ہر چند آپ خانقاہی ہیں اور میں خراباتی لیکن آپ کی غیر معمولی شرافت مردم شناسی نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ دستِ سبو نے ظرف وضو کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔ حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند!

علوی صاحب سے میرے قیام لاہور کی علت، میرا پتا اور میرا فون نمبر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مجھ کو جلد سے جلد اپنے جوار شاداب میں بلا لیجیے۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

آپ کی زلف محبت کا صید خورسند

جوش

ممتاز علوی صاحب جن کا ذکر حضرت جوش نے اپنے خط میں کیا ہے۔ اس زمانے میں وزارت اطلاعات کے سیکرٹری تھے۔ بڑے قابل افسر اور بڑے شریف النفس انسان۔ ابھی چند روز پیشتر اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ وہ بھی جوش صاحب کے مداحوں میں شامل تھے۔ میں نے انھیں بلایا اور ان کے مشورے سے وزارت اطلاعات ہی کے زیر اہتمام جوش صاحب کی تعیناتی طے پائی۔ وزیر اعظم سے بھی میں نے بطور خاص فون پر اجازت لے لی اور جوش صاحب اسلام آباد منتقل ہو گئے۔

"سرکاری قیام گاہ، ایک پرائیویٹ سیکرٹری، ٹیلی فون، موٹر اور جوائنٹ سیکرٹری کے برابر مشاہرہ۔ یہ تھیں ان کو ملنے والی مراعات۔ خیال تھا کہ ان کی گزر بسر اچھی طرح ہو جائے گی مگر ان کی شاہ خرچیوں نے انھیں ہمیشہ مقروض ہی رکھا"۔ آگے چل کر مولانا

ایک اور واقعہ کا ذکر فرماتے ہیں ۔ ایک مرتبہ جوش صاحب رات کو دفتر میں تشریف لائے اور مجھے یہ دردناک تحریر بھجوائی ۔ " بندہ پرور! پاکستان آ کر میں جس قدر ذلیل و خوار ہوا ہوں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں ۔ ہندوستان میں میرا یہ عالم تھا کہ فون کیے بغیر پنڈت جواہر لال کے وہاں پہنچ جاتا اور وہاں جا کر اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ ابھی تک خواب گاہ میں ہیں تو ان کی خواب گاہ میں پہنچ جایا کرتا تھا اور پاکستان میں اس قدر ہلکا ہو چکا ہوں کہ کئی مرتبہ آپ کی خدمت میں فون کرنے کے باوجود آپ سے ملاقات تو درکنار بات تک نہیں ہو سکتی ہے ۔ بندہ نواز! میں ناشکرا نہیں ہوں مجھ کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ صرف آپ کی ذات مبارک ہے جس کے کرم کی بنا پر میں آج یہاں اطمینان سے بیٹھا ہوا ہوں ۔ میرا دل آپ کا شکرگزار بھی ہے اور آپ کی شرافت کا پرستار بھی ۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے دل کے ٹکڑے اڑے جا رہے ہیں کہ آپ مجھ سے غافل ہو چلے ہیں اور نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ حسرت موہانی کا یہ شعر مجھ پر صادق آ رہا ہے کہ :

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاری دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

پی خودداری کو ٹھکرا کر اس وقت حاضر ہوا ہوں اور دریافت کر رہا ہوں کہ :

عزم دیدار تو دارد جان برلب آمدہ
باز گردد ۔ یا برآید ۔ چیست فرمان شما

آپ کی قدردانی کا پرستار

جوش مرحوم "

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں ۔

" میں نے پرچہ پڑھا تو تڑپ اٹھا اجلاس کو تھوڑی دیر ملتوی کر کے خود باہر گیا ۔ انھیں تعظیم و احترام سے اندر لایا ۔ نہ مل سکنے کی معافی چاہی ۔ چائے پیش کی ۔ ان کے معاملات نمٹائے ۔ افسر صاحبان اس دوران فائلیں بغل میں دبائے پرائیویٹ سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھے رہے ۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد جوش صاحب رخصت ہوتے تب کہیں جا کر دوبارہ اجلاس شروع ہوا " ۔

خیر یہ سب تو بہت بعد کی باتیں ہیں اور چونکہ مولانا کوثر نیازی نے اپنے مضمون میں تحریر فرمادی تھیں اس لیے میں نے یہاں نقل کر دیں۔ ہم ذکر کر رہے تھے جوش صاحب کے اس سفر کے مقاصد کا جو انھوں نے کراچی سے چھٹی اپریل کو بذریعہ تیز گام اسلام آباد کے لیے کیا تھا مگر چونکہ جوشش صاحب کو ابھی تک یہ یقین نہیں تھا کہ کامیابی کے امکانات کتنے فی صد ہیں اس لیے انھوں نے کراچی کے احباب کو کچھ نہیں بتایا۔ جوش صاحب کو پنڈی گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے اور ان کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ تو میں نے سوچا کہ خود پنڈی جا کر ان کی خیریت معلوم کی جائے۔

ہاشمی صاحب کا خاندان:

ایک دن جوشش صاحب کا ٹیلی فون آیا انھوں نے فرمایا کہ وہ خیریت سے ہیں اور مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ منگل کے دن ۲۵ ویں اپریل کو عرفان میاں کے والد، والدہ اور تین بہنیں تیز گام کے ذریعے سے کراچی پہنچ رہی ہیں۔ میں کینٹ اسٹیشن سے اس خاندان کو لے کر عرفان میاں کے گھر پہنچا دوں۔ چنانچہ مقررہ تاریخ اور وقت پر میں کینٹ اسٹیشن گیا۔ وہاں عرفان میاں بھی موجود تھے۔ گاڑی وقت پر آئی ان کے والد ہاشمی صاحب ان کی والدہ اور تینوں بہنیں ریحانہ، رخسانہ اور فرزانہ ان سب کو لے کر عرفان میاں کے گھر پہنچا کر جب میں چلنے لگا تو ہاشمی صاحب نے میرا شکریہ ادا کر کے کہا کہ وہ لوگ یہاں کراچی کی سیر کرنے کے لیے آئے ہیں اور جوش صاحب نے کہا ہے کہ خورشید علی خاں ہم لوگوں کو یہاں کی سیر کرائیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن میں شام کو ان سب کو لے کر کلفٹن گیا وہاں پہلے مچھلی گھر کی سیر کی پھر پلے لینڈ میں جھولوں پر بیٹھے۔ اس کے بعد ساحل سمندر پر جا کر چاٹ وغیرہ کھائی۔ واپسی میں بندو خاں کے ہوٹل میں کباب تکہ کھا کر گھر واپس آئے۔ دوسرے دن ان کو لے کر ہل پارک گیا۔ وہاں بلوموں ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ ان بچیوں میں رخسانہ شاعرہ بھی ہیں اور اردو ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ بی۔ اے کر رہی ہیں اور اختیاری مضامین میں نفسیات میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا اور مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کر کے خوشی ہوئی۔ سب سے چھوٹی بہن فرزانہ یہ بھی بہت سمجھدار ہیں اور بہت اچھا گاتی

ہیں۔ آواز بہت سریلی اور دلکش ہے۔ انھوں نے جوش صاحب کی چند غزلیں گا کر سنائیں۔ بہت لطف آیا۔ وہاں سے ہم لوگ ملیر گئے جہاں ان کے ایک عزیز رہتے ہیں۔ رات گئے واپس آئے۔ بندو خاں کے ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا۔ پھر ان کو گھر پہنچا کر میں اپنے گھر آگیا۔ دوسرے دن کا پروگرام ہاکس بے اور منگھو پیر کی سیر کا تھا چنانچہ میں صبح ۵ بجے ایک ہوٹل سے نہاری اور نان لے کر ان کے گھر گیا وہ سب لوگ تیار بیٹھے تھے۔ ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے ہاکس بے روانہ ہوئے اور صبح سویرے سمندر کے کنارے پہنچ گئے وہاں ایک ہٹ کے چوکیدار کو کچھ پیسے دے کر ہٹ کھلوائی۔ پھر سب لوگ سمندر میں پانی سے کھیلنے لگے صبح کے وقت سمندر پر سکون تھا۔

آٹھ بجے کے قریب ناشتہ کیا پھر یہ بچیاں اونٹ کی سواری کرنے لگیں۔ بارہ ایک بجے وہاں سے نکل کر منگھو پیر گئے وہاں مگرمچھ دیکھے پھر گرم پانی کے چشموں میں منہ ہاتھ دھویا ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ تقریباً چار بجے ان لوگوں کو گھر پہنچا کر اپنے گھر آگیا۔

بھنبھور کی سیر:

چلتے وقت ہاشمی صاحب نے کہا کہ اگر کل آپ کو فرصت ہو تو ہمیں بھنبھور کے آثار قدیمہ دکھا دیجیے۔ یہ طے ہوا کہ دوسرے دن صبح پانچ بجے بھنبھور کے لیے روانہ ہوں گے۔

چنانچہ دوسرے دن میں صبح سویرے ان کے گھر پہنچ گیا اور ہم سب لوگ آثار قدیمہ دیکھنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ گھگھر ریلوے پھاٹک سے آگے بڑھے تو صبح کی سرخی افق پر نمودار ہورہی تھی۔ سندھ کے صحرا میں باد نسیم محو خرام ناز تھی۔ رخسانہ نے کہا خورشید صاحب آپ کو بابا (جوش صاحب) کی طلوع فکر کا وہ بند یاد ہے جس میں یہی منظر کس قدر دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ سنیے

سرخی بڑھی فضاؤں پہ تابندگی کے ساتھ
تابندگی جہاں کی رخشندگی کے ساتھ
رخشندگی شمیم کی بالندگی کے ساتھ
بالندگی رباب و دف زندگی کے ساتھ

اور زندگی تصور مطلق لیے ہوئے
انفاس میں خروش انا الحق لیے ہوئے

دھوپ لیے زمیں کی طرف سرخوشی چلی　　احساس کی ترنگ، ہوئے بے حسی چلی
غفلت کی سمت از سر نو آگہی چلی　　سونے کا تھال سر پہ لیے زندگی چلی
سارنگیاں چھڑیں چمن روزگار میں
حق سرہ کی گونج اٹھی لالہ زار میں

اور ذرا یہ بند ملاحظہ فرمایئے۔

نازل ہوئے دلوں پہ بلوریں تصورات　　پائی قیام ذہن نے زربفت کی قنات
چوک لیے ہوئے حرکت کی چلی برات　　کولے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات
خورشید کے ورود سے گل زار جاگ اٹھا
یوسف جو آئے مصر کا بازار جاگ اٹھا

میں نے کہا جوش صاحب نے تو حیات انسانی کے تاریک افق پر حضرت علی کے ورود کا منظر پیش کیا ہے مگر اس وقت اس صحرا میں طلوع صبح کے منظر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بابا نے اسی منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ رخسانہ کہنے لگیں ویسے خورشید صاحب آپ کا کیا خیال ہے یہاں بابا کھل کر اپنے شیعہ ہونے کا اعلان نہیں کر رہے ہیں؟ میں نے کہا تو آپ کے بابا نے عقائد کو چھپایا کب ہے؟ طلوع فکر تو کہی ہی حضرت علی کی شان میں ہے۔ آپ نے اگر طلوع فکر پڑھی ہے تو اس کا انتساب بھی ضرور پڑھا ہو گا۔ جس میں جوش صاحب نے اپنی اس بے مثال ادبی تخلیق کو اس وقت کراچی کے کمشنر سید ابو طالب نقوی (جو اے ٹی نقوی کے نام سے مشہور ہیں) کے شیریں ترین نام سے منسوب کیا ہے اور جن کے متعلق انھوں نے شاعرانہ انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "جن کا تصور میرا نغمہ بہار اور جن کا تبسم میری صبح کوہسار ہے اور جن کی رگوں میں اسی عدیم النظیر مفکر اعظم کا خون پاک گردش کر رہا ہے جو میری اس نظم کا موضوع ہے"...... اب اس انتساب میں کتنی باتیں غور طلب ہیں۔ میں اگر عرض کروں گا تو شکایت ہو گی۔ مگر اب اس موضوع کو یہیں ختم کیجیے کیونکہ ہماری گفتگو کا رخ اس منظر سے مطابقت نہیں رکھتا...... اتنے میں دھابے جی آ گیا اور ہم لوگوں نے وہاں ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ اور اس کے بعد بھنبھور پہنچ گئے۔ وہاں کا میوزیم دیکھا۔ قدیم مسجد کے کھنڈر دیکھے اور ایک کنواں بھی دیکھا جس میں گذشتہ پانچ ہزار سال کی

تہذیبوں کے آثار زمین کی مختلف پرتوں میں نظر آتے ہیں۔ میں نے رخسانہ سے کہا یہ بتایئے ہم لوگ ابھی کس تہذیبی سطح پر ہیں۔ پھر میں نے کیفی اعظمی کا ایک شعر پڑھا۔

بیلچے لاؤ کھولو زمیں کی تہیں   میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

سب اس بات پر متفق تھے کہ ہماری تہذیب ابھی کاشتکاری کے دور سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ میں نے کہا آپ کے خیال میں اس کے اسباب کیا ہیں۔ کہنے لگیں اس کے اسباب کثیر الجہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو تعلیم کی کمی، معاشرہ پر جاگیردار طبقہ کی مضبوط گرفت پھر جاگیرداروں اور بیرونی استعماری طاقتوں کا گٹھ جوڑ جس سے ہر گروہ اپنے اپنے مفاد کا تحفظ کرتا ہے۔ غرض دس بجے تک ہم لوگ آثار قدیمہ کی سیر سے فارغ ہو کر واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں بھی اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ ان سب بہنوں میں رخسانہ ماشاء اللہ غیر معمولی ذہین لڑکی ہے۔ گیارہ بجے ان کو گھر پہنچا کر میں پی آئی اے کے دفتر گیا اور ۳۰ ویں تاریخ کے لیے پنڈی کا ٹکٹ لے کر گھر واپس آ گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جوش صاحب کو پنڈی گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے اور ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں تھی کہ وہاں وہ کیا کر رہے ہیں اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔ ٹکٹ لے کر گھر پہنچا ہی تھا کہ عرفان میاں کا ٹیلی فون آیا کہ جوش صاحب پنڈی سے آ گئے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور جوش صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ میں تو کل کی فلائٹ سے پنڈی آپ سے ملنے جا رہا تھا۔ کہنے لگے اب اپنی سیٹ دوسری مئی کے لیے بدلوا لیں۔ میں بھی دوسری کو واپس جا رہا ہوں۔ اب دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔ پھر کہنے لگے آج شام کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا آپ جو حکم دیں۔ کہنے لگے سمندر کی سیر کو نہ چلیں؟ میں نے کہا ضرور۔

maablib.org

سمندر کی سیر:

اسی شام عرفان میاں، ان کی بہنیں اور جوش صاحب ہم سب کیماڑی پہنچے۔ وہاں ہمارے کسٹم کے ایک ساتھی کنوَر تحسین یونس علی خاں صاحب نے ایک کرائے کی کشتی کا بندوبست کر دیا اور ہم لوگ سمندر کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ سمندر پرسکون تھا۔

شام کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ فرزانہ نے جوش صاحب کی کئی غزلیں گائیں۔ جوش صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ رخسانہ بھی شاعرہ ہیں مگر اپنا کلام سناتی ہوئی شرماتی ہیں مگر جوش صاحب کے اصرار پر انھوں نے بھی چند رباعیات سنائیں۔ سورج غروب ہوا تو جوش صاحب نے اپنا شغل شروع کیا۔ ان کو افسوس تھا کہ ہم میں سے کوئی ان کا ہم مشرب نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں چودھویں کا چاند انتہائی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔

چاندنی رات میں سمندر کی سیر کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب مجھے آپ کی ایک نظم یاد آ رہی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں مگر مقطع میں جناب خضر کے بجائے آپ ہی کا تخلص استعمال کر لوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا۔ رخسانہ کہنے لگیں۔ مقطع میں شاعر ہی کا نام آنا چاہیے۔ یہ خضر صاحب کہاں سے ٹپک پڑے خیر آپ نظم سنائیے۔ جوش صاحب نے کہا اس نظم کا عنوان تو بتاؤ۔ میں نے کہا اس کا عنوان ہے "راہ طرب" اور یہ آپ کے مجموعہ "حرف و حکایت" میں ہے۔ فرمایا ارے بڑا پرانا مال لائے ہو۔ یہ ۱۹۳۰ء کی کہی ہوئی ہے۔ خیر تم سناؤ۔ میں نے کہا مال پرانا سہی مگر اس وقت بالکل تازہ ہے۔ سنیے۔

راہ طرب

اللہ رے آج جشن خرابات کا فروغ
چھائی ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی
چھلکی صراحیوں میں ہے روح رباب و چنگ
نکھری ہوئی ہے نشے سے نمناک چاندنی
نغمے ہیں اپنے چشمۂ پنہاں سے ہم کنار
جبریل سے بھی ہو نہ سکے جس کا ایک حرف
گردش میں ہیں سروں پہ اٹھائے گلابیاں

لرزش میں تار ساز ہے گردش میں دور جام
رقصندہ آب نہر ہے تابندہ سقف و بام
اُفق جوانیوں پہ ہے نور مے تمام
ڈوبی ہوئی ہے کیف میں باد سبک خرام
روحیں ہیں اپنے مرکز اصلی سے ہم کلام
وہ آ رہے ہیں عالم ارواح سے پیام
ترکان راہ پارہ و خوبان لالہ فام

اب یہ بند ذرا توجہ سے ملاحظہ فرمائیے جس میں تخلص کا تصرف کیا گیا ہے۔

آیا یہ کون راہ طرب پوچھتا ہوا
آنے دو اس بزرگ کو آنے دو روبرو

چہرہ تو کہہ رہا ہے کہ ہے رہبر انام
لازم ہے ہر جوان کو پیری کا احترام

یہ ریش یہ عمامہ یہ حق آشنا نظر
راہ طرب کی فکر میں نظریں ہیں سوئے جام

ہاں اس طرف قریب، ذرا اور کچھ قریب
اچھا..... جناب جوش ہیں، وعلیکم السلام

سب نے اس تصرف کی بے انتہا داد دی۔ خود جوش صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے کہ تم تو مجھ پر چوٹ کر گئے مگر تمھاری حسن ظرافت کی داد دیے بغیر چارہ نہیں۔ بھئی خوب، بہت خوب۔ غرض یہ شام اس قدر حسین اور دلچسپ تھی کہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ تقریباً دس بجے ہم لوگ ساحل پر واپس آئے۔ راستے میں بندو خاں کی ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا اور گھر واپس آ گئے۔ اس رات جوش صاحب نے عرفان میاں ہی کے مکان پر قیام کیا۔ چلتے وقت مجھ سے کہنے لگے کہ کل صبح سویرے سات بجے تک آجائیے، بہت کام ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن ۳۰ ویں اپریل کو میں صبح ساڑھے سات بجے جوش صاحب سے ملنے عرفان میاں کے مکان پہنچ گیا۔ سب لوگ ناشتہ کر رہے تھے میں نے بھی ان کے ساتھ چائے پی اور تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں، جوش صاحب، ہاشمی صاحب اور ان کی تینوں بچیاں ریحانہ، خسانہ اور فرزانہ بابا ذہین شاہ صاحب کے مکان کے لیے روانہ ہوئے مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بابا صاحب سویرے سے کہیں تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے ہم لوگ پی آئی اے کے دفتر گئے۔ میں نے اپنی سیٹ تیسویں کے بجائے دوسری مئی کے لیے بدلوائی۔ اس تبدیلی کے لیے ستر روپے زیادہ دینے پڑے۔ جوش صاحب نے اصرار کیا کہ یہ دام وہ ادا کریں گے کیونکہ یہ تبدیلی ان کی وجہ سے کروائی جا رہی تھی مگر میں نے انھیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ غرض ٹکٹ بدلوا کر ہم لوگ گورنر ہاؤس پہنچے۔

گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور:

میر رسول بخش تالپور ایک دن قبل ہی گورنر سندھ مقرر ہوئے تھے۔ گورنر ہاؤس میں مبارک باد دینے والوں کا مجمع تھا۔ لوگ پھولوں کے ہار میر صاحب کو پہنا رہے تھے۔ ان کے سیکرٹری نے ہم لوگوں کو ایک علٰحدہ کمرے میں بٹھا دیا اور کوکو کولا کی بوتلوں سے ہماری تواضع کی۔ اس کمرے میں ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی جس کے پس منظر میں پیپلز پارٹی کا پرچم تھا جس پر دو تلواریں تھیں اور اوپر ہلال اور بیچ میں بھٹو صاحب کی تصویر تھی۔ جس کے چہرے

رنگینی کے آثار نمایاں تھے۔ جوش صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور کہا کہ اس تصویر کو دیکھو اور بتاؤ کہ کیا تاثر پیدا ہوتا ہے اور پھر خود ہی کہنے لگے، بہت برا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ چہرے پر سخت رعونت ہے اور اس امر کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے، جو غلط ہے۔ ابھی ہم اس تصویر کے تاثرات پر غور کر ہی رہے تھے کہ میر صاحب کمرے میں تشریف لے آئے، بہت محبت اور تپاک سے گلے ملے اور ہر ایک کی خیریت پوچھی۔ اس کے بعد جوش صاحب کو الگ کمرے میں لے گئے۔ وہاں ان سے تقریباً آدھا گھنٹہ علیحدگی میں بات کی۔ پھر وہ دونوں باہر آئے پھر میر صاحب ہم لوگوں کو گاڑی تک پہنچانے آئے، چلتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ ابھی مولانا کوثر نیازی سے مل لیجیے وہ اس وقت اپنے دفتر ہی میں ہوں گے۔ چنانچہ ہم لوگ میر صاحب سے رخصت ہو کر قدیم سیکرٹریٹ میں مولانا کے دفتر پہنچے۔ مولانا مرکزی وزیر نشر و اشاعت تھے۔

مولانا کوثر نیازی سے ملاقات:

جیسے ہی ان کو جوش صاحب کی آمد کی اطلاع ہوئی فوراً باہر آ کر ہمارا استقبال کیا اور اپنے دفتر میں لے گئے۔ چائے منگوائی اور خود اپنے ہاتھ سے بنا کر ہم لوگوں کو پیش کی۔ جوش صاحب نے ہم سب کا تعارف مولانا سے کروایا۔ فرزانہ کے متعلق جب جوش صاحب نے یہ کہا کہ اس کا گلا بہت اچھا ہے اور خاص طور پر غزل کا جذباتی تاثر ابھارنے میں اس کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے تو مولانا کوثر نیازی نے فرزانہ سے فرمائش کی کہ کوئی غزل سنائیے۔ فرزانہ نے نہایت دلکش انداز میں جوش صاحب کی غزل سنائی۔

بر بطِ نہ اٹھا کیف غنا بھول چکا ہوں
ہر جنبش کو اے زہرہ نوا بھول چکا ہوں
اب حسن کو تکلیف نہ دے ناز و ادا کی
میں عشق کو اے جان وفا بھول چکا ہوں
در پر ترے آ کر نہ صدا دوں گا کہ اب میں
رسم طلب و طرز دعا بھول چکا ہوں

رہتا ہے جہاں عشق ردائے ہوئے وصوفی
اس راہ کو اے ماہ لقا بھول چکا ہوں
شعلوں میں حسینوں کے دکھاتا تھا جو گلزار
مدت ہوئی وہ رنگ حنا بھول چکا ہوں
اک نقش ہے تیرا کہ مٹائے نہیں مٹتا
ہر چند کہ سب کچھ بخدا بھول چکا ہوں

یہ غزل کافی طویل ہے مگر فرزانہ نے اختصار سے کام لیا اور صرف چند ہی اشعار سنائے مگر اس کے گلے کا سوز طرز ادا کی دلکشی نے وہ سماں باندھا کہ مولانا نے دل کھول کر داد دی اور یہ دریافت فرمایا کہ ان بچیوں کی "رہائش" کہاں ہے۔ یا تو جوش صاحب اپنی غزل سن کر جھوم رہے تھے یا رہائش کا لفظ سن کر ایسے اچھلے کہ جیسے ان کے جسم تصور میں کوئی کانٹا چبھ گیا ہو۔ فرمایا، مولانا "رہائش" بدنسلا لفظ ہے۔ رہنا ہندی کا لفظ ہے اس میں ی ش لگا کر فارسی کا مصدر رہائش نہیں بنایا جا سکتا اگر اس ترکیب کو ہم جائز قرار دے دیں تو پھر چلنے سے چلائش، کھانے سے کھلائش کو بھی درست تسلیم کرنا پڑے گا۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا جوش صاحب، اب آپ اسلام آباد تشریف لا رہے ہیں ہم لوگ آپ سے اردو سیکھ لیں گے۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد دوران گفتگو مولانا نے پوچھا۔ جوش صاحب، آپ کی تنخواہ کی "ادائیگی" کراچی میں ہوگی یا اسلام آباد میں۔ جوش صاحب پھر الجھ گئے۔ فرمایا یہ ادائیگی کا لفظ بھی پہلے لفظ کی طرح غلط ترکیب سے بنا ہے۔ "ادا" فارسی لفظ اور "ئیگی" ہندی۔ فارسی اور ہندی کی آمیزش سے لفظ نہیں بنانا چاہیے۔ مولانا نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے"۔ چلتے وقت مولانا نے دریافت فرمایا جوش صاحب آپ اسلام آباد کب تشریف لا رہے ہیں تو جوش صاحب نے فرمایا کہ دوسری مئی کو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ غرض مولانا کے پاس تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ میں نے سب لوگوں کو عرفان میاں کے مکان پر پہنچایا۔ جوش صاحب بھی وہیں رہ گئے اور میں اپنے گھر آ گیا۔

نظریہ جبر و قدر:

دوسرے دن میری ماموں زاد بہن اختر خانم جنھوں نے سیاسیات میں کراچی یونیورسٹی سے ام اے کیا اور اب پی ایچ ڈی کر رہی ہیں، میرے گھر آئیں اور جوش صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ ہم دونوں عرفان میاں کے گھر پہنچے، جہاں جوش صاحب مقیم تھے۔ جب میں نے اختر کا تعارف جوش صاحب سے کروایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ عرفان میاں کی بہنیں بھی آ گئیں۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران جبر و قدر کا مسئلہ زیر بحث آ گیا۔ اختر خانم نے کہا کہ ایک باشعور انسان جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا بے شک آپ جو چاہے کر سکتی ہیں مگر خود چاہنا آپ کے بس میں نہیں۔ انسان کا ہر عمل کسی نہ کسی میبج کا رد عمل ہوتا ہے اور یہ میبج کسی خارجی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور آپ کا رد عمل آپ کی شخصیت کے قوام کا نتیجہ۔ آپ کی شخصیت کا تانا بانا جن اجزا سے بُنا جاتا ہے ان میں میراث، تربیت، صحت، علم، تجربہ، جغرافیہ، تاریخ، عقائد ان تمام عوامل سے آپ کی نفسیات کا ہیولا ترتیب پاتا ہے۔ انہی سے آپ کی جذباتی کیفیت مرتب ہوتی ہے۔ یہ سب اجزا مل کر آپ کے رویئے کا تعین کرتے ہیں۔ پھر آزاد مرضی کہاں باقی رہی۔ ہم بالکل نباتات اور حیوانات کی طرح جبر کے تابع ہیں۔ کوئی ہماری گدی پکڑ کر ہم سے کام لیتا ہے۔ آدمی خارجی اور داخلی جبر کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ میں نے کہا تو پھر اس کے یہ معنی ہوئے کہ اگر ہم انسانی کردار میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہیں تو ہم کو اس جبر کا پتا چلانا پڑے گا جو ہمارے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جوش صاحب نے کہا۔ بے شک۔ میں نے کہا کہ داخلی جبر تو وہ ہے جو ہر ذی حیات کی تعمیر میں مضمر ہے۔ جن کو ہم بقائے ذات اور بقائے نسل کے جبلی تقاضے کہتے ہیں۔ یہ تو ہمارے وجود کی ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اور دراصل انہی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وہ خارجی ماحول سے متعارف ہوتا ہے۔ بقائے ذات کی تکمیل کے لیے وہ اپنے جغرافیائی ماحول کا جائزہ لیتا ہے اور بقائے نسل کی خاطر وہ دوسرے ہم جنس سے آشنائی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح نسل انسانی ایک جغرافیائی ماحول میں ایک سماج تشکیل دیتی ہے پھر معاشرتی ضرورتوں کے تحت اور آپس کے تعلقات اور باہمی رشتوں سے اقدار، رسم و رواج، تہذیب، ثقافت اور حکومت جنم لیتے ہیں اور اس طرح وہ خارجی

جبر معرضِ وجود میں آتا ہے جس کے تابع اس معاشرے میں انسانوں کے کردار تشکیل پاتے ہیں۔ انسانی کردار کی تشکیل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں ایک طرف اس کی وراثت جس کے ذریعہ سے اس کی عضویاتی ساخت تشکیل پاتی ہے۔ دوسری طرف اس عضویہ کی تربیت و پرداخت اس کا قدرتی اور معاشرتی ماحول کرتا ہے۔ قدرتی ماحول میں تو اس کا جغرافیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کوئی انسان رہتا ہے وہ جگہ کرہ ارض کے کس حصے میں واقع ہے۔ کیا وہ برفانی علاقہ ہے یا پہاڑی علاقہ۔ میدانی ہے یا سمندری۔ زرخیز زمین ہے یا بنجر۔ درجہ حرارت کی نوعیت کیا ہے وہاں کس قسم کی پیداوار ہوتی ہے وغیرہ۔ یہ جغرافیائی ماحول انسانوں کی ضرورتوں کا تعین بھی کرتا ہے اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسائل بھی مہیا کرتا ہے۔ اسی جغرافیائی ماحول میں انسانی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ معاشرہ انسانی اعمال پر اپنے اثرات اپنے معاشرتی اداروں کے توسط سے مرتب کرتا ہے جن میں اس کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، تمدنی، اخلاقی اقدار اور تنظیمیں شامل ہیں۔ یہ تمام عوامل انسانی رویے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرح انسانی کردار متعینہ سانچوں میں ڈھل کر نکلتا ہے اور پھر انسان اسی کردار کے جبر کے تابع ہر خارجی اور داخلی مہیج پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اب اگر ہم اپنے رویوں میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے سماجی اداروں میں تبدیلی لانا پڑے گی۔ اپنی تمام تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا تجزیہ کر کے ان میں ردوبدل کرنا پڑے گا۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اچھا معاشرہ اچھا آدمی پیدا کرتا ہے اور برا معاشرہ برا آدمی پیدا کرتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا یہ بات بالکل درست ہے مگر یہ بھی ایک نفسیاتی جبر ہے کہ معاشرہ اتنی آسانی سے نہیں بدلا جاسکتا کیونکہ انسانوں کے ذہن کی کمائی بہت آہستہ آہستہ کھلتی ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

ہر گام پہ ہے فکر کو قرنوں کی ضرورت
اور عمر کی تقدیر میں ہے برق خرامی

اور ہمارے معاشرے میں تو ابھی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، چودھریوں، وڈیروں، سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کا بہت زیادہ اثر ہے اور ہماری ہیئت حاکمہ بھی انہی اثرات کے تابع ہے۔ اس لیے تبدیلی بہت آہستہ آہستہ آرہی ہے۔

جوش صاحب نے کہا کہ ان تمام باتوں سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انسانی

اعمال خارجی اور داخلی جبر کے تابع ہوتے ہیں اور آزاد مرضی یا (Free Will) نام کی کوئی چیز اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اختر خانم نے کہا جوش صاحب جس کو ہم (Free Will) کہتے ہیں وہ دراصل ہمارا نفسیاتی احساس ہے جو ہماری شخصیت کی خصوصیت ہے۔ ہمارا شعور ذات اپنے ماحول سے اخذ مسرت کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنا ماحول اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے اور اگر موزوں حالات میسر آ جائیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل سے اس کو یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے اپنی زندگی بسر کی ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ خود مسرت اور غم کے احساسات بھی تو انسان کی عضویاتی اور نفسیاتی تشکیل کا نتیجہ ہیں۔ ہم دراصل ایک مشین کی طرح ہیں جس کا کنٹرول کسی اور طاقت کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہمارے ذریعہ سے اپنے مقاصد حاصل کر رہی ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب اس طاقت کا کوئی نام ہے۔ جوش صاحب نے کہا، ہم صرف اتنا محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک توانائی ہے۔ آپ اس کا کوئی نام رکھ لیں لیکن نام کے ساتھ ہی بہت سی غلط فہمیوں کا امکان ہے۔ جب کوئی شخص اس قوت حاکمہ کو مشخص کر کے کوئی نام دیتا ہے تو پھر وہ لامحدود توانائی مطلق اس کے فکری حدود کے حبس خانے میں محدود ہو جاتی ہے اور چونکہ ہر انسان کی فکری، علمی اور تخیلی صلاحیت اس کے علم، تجربے اور احساسات کی نسبت سے محدود ہوتی ہے اس لیے وہ اس ناقابل تصور ہستی کا جو بھی تصور قائم کرے گا وہ اس کے ذہن کا تراشیدہ صنم ہو گا۔ بقول اقبال

تراشیدم صنم بر صورت خویش   بہ شکل خود خدا را نقش بستم

مرا از خود بروں رفتن محال است   بہ ہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اس لیے اس توانائی مطلق کو مشخص کیے بغیر اگر آپ کوئی نام دے سکیں تو آپ کی مرضی۔ لیکن آپ جب بھی مشخص کر کے کوئی نام دیں گے تو وہ انسانی صفات ہی کا چربہ ہو گا اور اس طرح خدا کے بھیس میں خود انسان ہی نوع انسان کی تقدیر کا ناخدا بن جائے گا۔ آج تمام سائنسی علوم انسانی فکر کو انہی اصنام خیالی کی گرفت سے نکال کر توانائی مطلق کے ناقابل تغیر قوانین علت و معلول کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ابھی جس داخلی اور خارجی جبر کی طرف اشارے کیے ہیں اگر ان کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ تعین کیے بغیر چارہ ہی نہیں

رہتا کہ اس تمام انفس و آفاق کو ایک توانائی مطلق کا جبر کامل اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے جو اپنے استغنیٰ ناآشنا قوانین کے ذریعہ سے ہر ذرۂ وجود پر مسلط ہے۔

سزا و جزا کا تصور:

میں نے کہا جوش صاحب اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس کائنات میں صرف اور صرف خالق کائنات کا ارادہ ہی موثر ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی اعمال میں بھی اسی کے ارادے کی جلوہ گری ہے تو پھر ہمارے اعمال کی سزا و جزا کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ اس سوال کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل علت اور معلول کے قوانین کے تحت اپنا ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اگر یہ نتیجہ ہمارے لیے مفید ہو تو وہ اس عمل کی جزا ہوگی اور اگر نقصان رساں ہو تو وہ سزا ہے۔ اگر ہم اپنے عمل کے نتیجے سے واقف ہوں اور نقصان دہ اعمال سے اجتناب کریں تو ان کے ضرر رساں نتائج سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ہمارے اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے اثرات ہمارے جسم پر مرتب ہوتے ہیں جیسے کھانا، پینا، سونا جاگنا، ورزش کرنا وغیرہ دوسرے وہ جن کو ہم معاشرتی اعمال کہتے ہیں جن میں ایک انسان دوسرے انسان یا انسانوں کے تعلق سے کوئی عمل کرتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں نتائج تو علت اور معلول کے قوانین کے مطابق ہی مرتب ہوں گے مگر ہمارے معاشرے میں سزا و جزا کے دو نظام ملتے ہیں۔ ایک مذہب کے توسط سے دیا ہوا تصور جس کا تعلق حیات بعد الموت سے بیان کیا جاتا ہے دوسرا کسی مملکت کے تعزیری قوانین کے تحت سزا کا تصور۔

جہاں تک مذہب کا سزا و جزا کا تصور ہے اور جس کو مرنے کے بعد کی زندگی سے وابستہ کیا جاتا ہے جس کو مذہب کی زبان میں جنت اور دوزخ سے تعبیر کیا گیا ہے، میرے نزدیک یہ متشابہات میں سے ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حساب کے دن ہمارے ان اعمال کی گواہی جن کا تعلق ہمارے جسموں سے ہے ہمارے اعضا خود دیں گے۔ ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، کان غرض جسم کا ہر عضو ان اعمال کی گواہی دے گا جو اس کے تعلق سے سرزد ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارا کھانا پینا۔ یعنی ہماری ہر قسم کی غذا اور ہر قسم کا مشروب ہمارے جسم پر اپنے کیمیاوی اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے

تمام اعمال یعنی اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، دوڑنا، ورزش کرنا یا نہ کرنا، سونا جاگنا، مختلف لوگوں سے ملنا، ہنسنا بولنا، ہمارے غم اور مسرت کے احساسات، ہماری نفسیاتی الجھنیں، جذباتی کشمکش، ہمارے ہیجان غرض ہماری داخلی اور خارجی ہر کیفیت ہمارا معاشرتی اور قدرتی ماحول ہمارے کام کرنے کے اوقات اور طریق کار ہمارے جسم کے مختلف اعضا پر اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور ہمارے اعضا ان اثرات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور ان میں ان اعمال کی نسبت سے اچھی یا بری تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ عمل علت اور معلول کے قوانین کے تحت خود بہ خود جاری رہتا ہے۔ کہیں کہیں ہمیں اس تبدیلی کا علم ہوتا ہے مگر زیادہ تر یہ تغیر غیر محسوس طور پر واقع ہوتا رہتا ہے اور بالآخر ایک وقت وہ آتا ہے جب ہمارا کوئی عضو اس مسلسل خراب اثر کے باعث بیمار پڑ جاتا ہے اور اس میں تکلیف شروع ہو جاتی ہے تو انسان پریشان ہو کر خدا کو پکارتا ہے اور اس سے شکایت کرتا ہے کہ اے خدا تو نے مجھے کس عذاب میں گرفتار کر دیا تو قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ تو خود تمہارے اعمال تھے جو اب محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ تکلیف ہی دراصل اس عضو کی، ان اعمال کی شہادت ہے جو ہم کرتے آئے ہیں۔ اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ مذہب جس کو یوم حساب سے تعبیر کرتا ہے وہ دراصل ہمارے اعمال کے پیکر محسوس میں ظاہر ہونے کا وقت ہے جو واقع تو ضرور ہوتا ہے مگر اس کی مدت کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ مختلف اعمال کے نتائج کی مدت مختلف ہوتی ہے۔ یہ تو رہی مذہبی نقطۂ نظر سے ہمارے اعمال کی سزا و جزا کی توضیح۔

اب دوسرا پہلو سزا کا وہ ہے جو ہمارے ملکی قوانین تعزیرات کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس مصنوعی تصور سزا کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ یہ سزا انتقامی ہے اصلاحی نہیں۔ اس سلسلے میں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یہ تمام کائنات جس میں خود انسان اور انسانی معاشرہ شامل ہے، ناقابل تغیر علت اور معلول کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں یہاں ہر معلول علت پیدا ماں ہے۔ اسی طرح ہر جرم کسی نہ کسی علت کے تابع ہوتا ہے بالکل جس طرح ہر مرض جسم کی کسی نہ کسی خرابی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے اور جس طرح معالج مرض کو مریض سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ مریض ہی کو ختم

کرنے کی۔ تو اسی طرح جرم بھی معاشرتی مرض ہے جس کے اسباب بھی معاشرے کی خرابی ہی میں تلاش کرنے چاہیں۔ مجرم بھی مریض کی طرح معاشرتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں جرم اور مجرم میں فرق کرنا چاہیے اور جرم سے نفرت کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور مجرم کو اس معاشرتی مرض سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری تعزیرات اصلاحی ہوں نہ کہ انتقامی۔ مگر بدقسمتی سے ہماری تعزیرات انتقامی ہے۔ یہ قدیم دور کی ان روایات کی آئینہ دار ہے جب کسی معاشرے میں وسائل کی کمی اور طاقت کے عدم توازن کے باعث معاشرہ مترفین اور محرومین میں تقسیم ہو گیا اور طاقتور مترفین اپنی جان، مال، عزت اور آبرو کے تحفظ کے لیے ان کے حقوق میں دست اندازی کرنے والوں کو انتقام کے ذریعہ سے خوف زدہ کر کے اپنے مفادات کی حفاظت کرنے لگے۔
معاشرتی سزا کا تصور دراصل قہرآشنا مطلق العنان شہنشاہوں، مذہبی پیشواؤں، نوابوں، جاگیرداروں، مغلوب الغضب قبائلی سرداروں سریع الاشتعال آمروں کی جبلی آفریدہ آتش غضب کا انتقامی اظہار ہے کیونکہ یہ مراعات یافتہ طبقہ کبھی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کہ معاشرے میں حقوق کی عدم مساوات کو ختم کر کے محروموں اور ناداروں کو جو آبادی کی اکثریت پر مشتمل ہوتے ہیں، پر مسرت زندگی بسر کرنے کے وہ تمام حقوق دے دیے جائیں جن کی اس دور کی تہذیب متقاضی ہوتی ہے اور جن سے مراعات یافتہ طبقہ خود مستفید ہوتا رہتا ہے۔ اسی عدم مساوات اور محرومیوں کی بنا پر پورے معاشرے میں ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کے حقوق میں مداخلت کرنے لگتا ہے اور یہ مداخلت جب جان، مال، عزت اور آبرو کے حقوق میں ہو تو جرائم جنم لیتے ہیں اور اگر اس معاشرے میں حکومتی عملہ جو جرائم کی روک تھام کے لیے متعین کیا جاتا ہے مگر جو خود بھی محرومین کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے، مجرموں کو تحفظ فراہم کر کے ان کے ذریعہ سے خود بھی فوائد حاصل کرنے لگے تو جرائم متعدی وبا کی طرح تمام معاشرے کو اپنے خونی پنجہ میں جکڑ لیتے ہیں اور اس معاشرے میں ایک ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو طرح طرح کے جرائم کی تخلیق کا سبب بنتی رہتی ہے اور چونکہ ہمارے تعزیری قانون کی بنیاد انتقامی ہے اس لیے برسر اقتدار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ جرم کرنے والوں کو سزا دے کر وہ جرم کا تدارک کر دے گا حالانکہ حقیقت یہ ہے

بدقسمتی سے جوش صاحب کے ادبی مقام ہی سے نابلد محض تھے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے اس سے پہلے ان کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ میں سوچ ہی رہا تھا کہ وزیرِ اعظم سے خصوصی اجازت لے کر میں اپنی وزارت ہی میں "افسر بکار خاص" قسم کی کوئی آسامی پیدا کروں اور اس پر جوش صاحب کو فائز کر دوں کہ ٹھیک ایک ماہ کے بعد (۱۲ مئی ۱۹۷۲ء) کو حضرت جوش نے ایک خط کے ذریعے یاد دہانی کرائی۔ انھوں نے لکھا۔

"بندہ نواز! آپ نے میرے دل کو موہ لیا ہے۔ ہرچند آپ خانقاہی ہیں اور میں خراباتی لیکن آپ کی غیر معمولی شرافت مردم شناسی نے ایک ایسی فضا پیدا کر دی ہے کہ دستِ سبو نے ظرفِ وضو کے گلے میں باہیں ڈال دی ہیں۔ حوریاں رقص کناں ساغر شکرانہ زدند!

علوی صاحب سے میرے قیام لاہور کی علت، میرا پتا اور میرا فون نمبر معلوم کیا جاسکتا ہے۔ مجھ کو جلد سے جلد اپنے جوار شاداب میں بلالیجیے۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

آپ کی زلفِ محبت کا صید خورسند

جوش

ممتاز علوی صاحب جن کا ذکر حضرت جوش نے اپنے خط میں کیا ہے۔ اس زمانے میں وزارت اطلاعات کے سیکرٹری تھے۔ بڑے قابل افسر اور بڑے شریف النفس انسان۔ ابھی چند روز پیشتر اسلام آباد میں ان کا انتقال ہوا ہے۔ وہ بھی جوش صاحب کے مداحوں میں شامل تھے۔ میں نے انھیں بلایا اور ان کے مشورے سے وزارت اطلاعات ہی کے زیرِ اہتمام جوش صاحب کی تعیناتی طے پائی۔ وزیرِ اعظم سے بھی میں نے بطورِ خاص فون پر اجازت لے لی اور جوش صاحب اسلام آباد منتقل ہوگئے۔

سرکاری قیام گاہ، ایک پرائیویٹ سیکرٹری، ٹیلی فون، موٹر اور جوائنٹ سیکرٹری کے برابر مشاہرہ۔ یہ تھیں ان کو ملنے والی مراعات۔ خیال تھا کہ ان کی گزر بسر اچھی طرح ہو جائے گی مگر ان کی شاہ خرچیوں نے انھیں ہمیشہ مقروض ہی رکھا۔" آگے چل کر مولانا

ایک اور واقعہ کا ذکر فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ جوش صاحب رات کو دفتر میں تشریف لائے اور مجھے یہ دردناک تحریر بھجوائی۔ "بندہ پرور! پاکستان آ کر میں جس قدر ذلیل و خوار ہوا ہوں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ ہندوستان میں میرا یہ عالم تھا کہ فون کیے بغیر پنڈت جواہر لال کے وہاں پہنچ جاتا اور وہاں جا کر اگر یہ معلوم ہوتا کہ وہ ابھی تک خواب گاہ میں ہیں تو ان کی خواب گاہ میں پہنچ جایا کرتا تھا اور پاکستان میں اس قدر ہلکا ہو چکا ہوں کہ کئی مرتبہ آپ کی خدمت میں فون کرنے کے باوجود آپ سے ملاقات تو درکنار بات تک نہیں ہو سکتی ہے۔ بندہ نواز! میں ناشکرا نہیں ہوں مجھ کو اس بات کا احساس ہے کہ یہ صرف آپ کی ذات مبارک ہے جس کے کرم کی بنا پر میں آج یہاں اطمینان سے بیٹھا ہوا ہوں۔ میرا دل آپ کا شکرگزار بھی ہے اور آپ کی شرافت کا پرستار بھی۔ لیکن یہ دیکھ کر میرے دل کے ٹکڑے اڑے جا رہے ہیں کہ آپ مجھ سے غافل ہو چلے ہیں اور نوبت یہاں تک آ چکی ہے کہ حسرت موہانی کا یہ شعر مجھ پر صادق آ رہا ہے کہ:

ایک ہی بار ہوئیں وجہ گرفتاری دل
التفات ان کی نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا

اپنی خودداری کو ٹھکرا کر اس وقت حاضر ہوا ہوں اور دریافت کر رہا ہوں کہ:

عزم دیدار تو دارد جان برلب آمدہ
باز گردد۔ یا برآید۔ چیست فرمان شما

آپ کی قدردانی کا پرستار
جوش مرحوم"

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں۔

"میں نے پرچہ پڑھا تو تڑپ اٹھا اجلاس کو تھوڑی دیر ملتوی کر کے خود باہر گیا۔ انھیں تعظیم و احترام سے اندر لایا۔ نہ مل سکنے کی معافی چاہی۔ چائے پیش کی۔ ان کے معاملات نپٹائے۔ افسر صاحبان اس دوران فائلیں بغل میں دبائے پرائیویٹ سیکرٹری کے کمرے میں بیٹھے رہے۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد جوش صاحب رخصت ہوئے تب کہیں جا کر دوبارہ اجلاس شروع ہوا"۔

خیر یہ سب تو بہت بعد کی باتیں ہیں اور چونکہ مولانا کوثر نیازی نے اپنے مضمون میں تحریر فرمادی تھیں اس لیے میں نے یہاں نقل کر دیں۔ ہم ذکر کر رہے تھے جوش صاحب کے اس سفر کے مقاصد کا جو انھوں نے کراچی سے چھٹی اپریل کو بذریعہ تیز گام اسلام آباد کے لیے کیا تھا مگر چونکہ جوش صاحب کو ابھی تک یہ یقین نہیں تھا کہ کامیابی کے امکانات کتنے فی صد ہیں اس لیے انھوں نے کراچی کے احباب کو کچھ نہیں بتایا۔ جوش صاحب کو پنڈی گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے اور ان کی کوئی خیر خبر معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ تو میں نے سوچا کہ خود پنڈی جا کر ان کی خیریت معلوم کی جائے۔

ہاشمی صاحب کا خاندان:

ایک دن جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا انھوں نے فرمایا کہ وہ خیریت سے ہیں اور مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ منگل کے دن ۲۵ ویں اپریل کو عرفان میاں کے والد، والدہ اور تین بہنیں تیز گام کے ذریعے سے کراچی پہنچ رہی ہیں۔ میں کینٹ اسٹیشن سے اس خاندان کو لے کر عرفان میاں کے گھر پہنچا دوں۔ چنانچہ مقررہ تاریخ اور وقت پر میں کینٹ اسٹیشن گیا۔ وہاں عرفان میاں بھی موجود تھے۔ گاڑی وقت پر آئی ان کے والد ہاشمی صاحب ان کی والدہ اور تینوں بہنیں ریحانہ، رخسانہ اور فرزانہ ان سب کو لے کر عرفان میاں کے گھر پہنچا کر جب میں چلنے لگا تو ہاشمی صاحب نے میرا شکریہ ادا کر کے کہا کہ وہ لوگ یہاں کراچی کی سیر کرنے کے لیے آئے ہیں اور جوش صاحب نے کہا ہے کہ خورشید علی خاں ہم لوگوں کو یہاں کی سیر کرائیں گے۔ چنانچہ دوسرے دن میں شام کو ان سب کو لے کر کلفٹن گیا وہاں پہلے مچھلی گھر کی سیر کی پھر پلے لینڈ میں جھولوں پر بیٹھے۔ اس کے بعد ساحل سمندر پر جا کر چاٹ وغیرہ کھائی۔ واپسی میں بندو خاں کے ہوٹل میں کباب تکہ کھا کر گھر واپس آئے۔ دوسرے دن ان کو لے کر ہل پارک گیا۔ وہاں بلوسون ہوٹل میں بیٹھ کر چائے پی۔ ان بچیوں میں رخسانہ شاعرہ بھی ہیں اور اردو ادب کا بہت اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں۔ بی۔ اے کر رہی ہیں اور اختیاری مضامین میں نفسیات میں دلچسپی رکھتی ہیں۔ انھوں نے اپنا کلام بھی سنایا اور مختلف موضوعات پر ان سے گفتگو کر کے خوشی ہوئی۔ سب سے چھوٹی بہن فرزانہ یہ بھی بہت سمجھدار ہیں اور بہت اچھا گاتی

ہیں۔ آواز بہت سریلی اور دلکش ہے۔ انھوں نے جوش صاحب کی چند غزلیں گا کر سنائیں بہت لطف آیا۔ وہاں سے ہم لوگ ملیر گئے جہاں ان کے ایک عزیز رہتے ہیں۔ رات گئے واپس آئے۔ بندو خاں کے ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا۔ پھر ان کو گھر پہنچا کر میں اپنے گھر آ گیا۔ دوسرے دن کا پروگرام ہاکس بے اور منگھو پیر کی سیر کا تھا چنانچہ میں صبح ۵ بجے ایک ہوٹل سے نہاری اور نان لے کر ان کے گھر گیا وہ سب لوگ تیار بیٹھے تھے۔ ہم لوگ ساڑھے پانچ بجے ہاکس بے روانہ ہوئے اور صبح سویرے سمندر کے کنارے پہنچ گئے وہاں ایک ہٹ کے چوکیدار کو کچھ پیسے دے کر ہٹ کھلوائی۔ پھر سب لوگ سمندر میں پانی سے کھیلنے لگے صبح کے وقت سمندر پرسکون تھا۔

آٹھ بجے کے قریب ناشتہ کیا پھر یہ بچیاں اونٹ کی سواری کرنے لگیں۔ بارہ ایک بجے وہاں سے نکل کر منگھو پیر گئے وہاں مگرمچھ دیکھے پھر گرم پانی کے چشموں میں منہ ہاتھ دھویا ایک ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ تقریباً چار بجے ان لوگوں کو گھر پہنچا کر اپنے گھر آ گیا۔

بھنبھور کی سیر:

چلتے وقت ہاشمی صاحب نے کہا کہ اگر کل آپ کو فرصت ہو تو ہمیں بھنبھور کے آثار قدیمہ دکھا دیجیے۔ یہ طے ہوا کہ دوسرے دن صبح پانچ بجے بھنبھور کے لیے روانہ ہوں گے۔

چنانچہ دوسرے دن میں صبح سویرے ان کے گھر پہنچ گیا اور ہم سب لوگ آثار قدیمہ دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ گھگھر ریلوے پھاٹک سے آگے بڑھے تو صبح کی سرخی افق پر نمودار ہو رہی تھی۔ سندھ کے صحرا میں باد نسیم محو خرام ناز تھی۔ رخسانہ نے کہا خورشید صاحب آپ کو بابا (جوش صاحب) کی طلوع فکر کا وہ بند یاد ہے جس میں یہی منظر کس قدر دلکش پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ سنیے

سرخی بڑھی فضاؤں پہ تابندگی کے ساتھ   تابندگی جہاں کی رخشندگی کے ساتھ
رخشندگی شمیم کی بالندگی کے ساتھ   بالندگی رباب و دف زندگی کے ساتھ

اور زندگی تصور مطلق لیے ہوئے
انفاس میں خروش انا الحق لیے ہوئے

دھوئیں لیے زمیں کی طرف سرخوشی چلی
احساس کی ترنگ، سوئے بے حسی چلی
غفلت کی سمت از سر نو آگہی چلی
سونے کا تھال سر پہ لیے زندگی چلی
سارنگیاں چھڑیں چمن روزگار میں
حق سرہ کی گونج اٹھی لالہ زار میں

اور ذرا یہ بند ملاحظہ فرمایئے۔

نازل ہوئے دلوں پہ بلوریں تصورات
پائی قیام ذہن نے زربفت کی قنات
چونک لیے ہوئے حرکت کی چلی برات
کولے پہ ہاتھ رکھ کے تھرکنے لگی حیات
خورشید کے ورود سے گل زار جاگ اٹھا
یوسف جو آئے مصر کا بازار جاگ اٹھا

میں نے کہا جوش صاحب نے تو حیات انسانی کے تاریک افق پر حضرت علی کے ورود کا منظر پیش کیا ہے مگر اس وقت اس صحرا میں طلوع صبح کے منظر کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بابا نے اسی منظر کی تصویر کشی کی ہے۔ رخسانہ کہنے لگیں ویسے خورشید صاحب آپ کا کیا خیال ہے یہاں بابا کھل کر اپنے شیعہ ہونے کا اعلان نہیں کر رہے ہیں؟ میں نے کہا تو آپ کے بابا نے عقائد کو چھپایا کب ہے؟ طلوع فکر تو کہی ہی حضرت علی کی شان میں ہے۔ آپ نے اگر طلوع فکر پڑھی ہے تو اس کا انتساب بھی ضرور پڑھا ہو گا۔ جس میں جوش صاحب نے اپنی اس بے مثال ادبی تخلیق کو اس وقت کراچی کے کمشنر سید ابو طالب نقوی (جو اے ٹی نقوی کے نام سے مشہور ہیں) کے شیریں ترین نام سے منسوب کیا ہے اور جن کے متعلق انھوں نے شاعرانہ انداز بیان اختیار کرتے ہوئے کہا ہے کہ "جن کا تصور میرا ابر بہار اور جن کا تبسم میری صبح کوہسار ہے اور جن کی رگوں میں اسی عدیم النظیر مفکر اعظم کا خون پاک گردش کر رہا ہے جو میری اس نظم کا موضوع ہے" ..... اب اس انتساب میں کتنی باتیں غور طلب ہیں۔ میں اگر عرض کروں گا تو شکایت ہو گی۔ مگر اب اس موضوع کو یہیں ختم کیجیے کیونکہ ہماری گفتگو کا رخ اس منظر سے مطابقت نہیں رکھتا ..... اتنے میں دھابے جی آ گیا اور ہم لوگوں نے وہاں ایک ہوٹل میں ناشتہ کیا۔ اور اس کے بعد بھنبھور پہنچ گئے۔ وہاں کا میوزیم دیکھا۔ قدیم مسجد کے کھنڈر دیکھے اور ایک کنواں بھی دیکھا جس میں گذشتہ پانچ ہزار سال کی

تہذیبوں کے آثار زمین کی مختلف پرتوں میں نظر آتے ہیں۔ میں نے رخسانہ سے کہا یہ بتایئے ہم لوگ ابھی کس تہذیبی سطح پر ہیں۔ پھر میں نے کیفی اعظمی کا ایک شعر پڑھا۔

بیلچے لاؤ کھولو زمیں کی تہیں　　　میں کہاں دفن ہوں کچھ پتا تو چلے

سب اس بات پر متفق تھے کہ ہماری تہذیب ابھی کاشتکاری کے دور سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ میں نے کہا آپ کے خیال میں اس کے اسباب کیا ہیں۔ کہنے لگیں اس کے اسباب کثیر الجہات ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو تعلیم کی کمی، معاشرہ پر جاگیردار طبقہ کی مضبوط گرفت پھر جاگیرداروں اور بیرونی استعماری طاقتوں کا گٹھ جوڑ جس سے ہر گروہ اپنے اپنے مفاد کا تحفظ کرتا ہے۔ غرض دس بجے تک ہم لوگ آثار قدیمہ کی سیر سے فارغ ہو کر واپس روانہ ہوئے راستے میں بھی اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ ان سب بہنوں میں رخسانہ ماشاءاللہ غیر معمولی ذہین لڑکی ہے۔ گیارہ بجے ان کو گھر پہنچا کر میں پی آئی اے کے دفتر گیا اور ۲۰ دسمبر تاریخ کے لیے پنڈی کا ٹکٹ لے کر گھر واپس آ گیا۔ بات دراصل یہ تھی کہ جوش صاحب کو پنڈی گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے اور ان کے متعلق کوئی اطلاع نہیں تھی کہ وہاں وہ کیا کر رہے ہیں اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ میں بھی وہاں پہنچ جاؤں۔ ٹکٹ لے کر گھر پہنچا ہی تھا کہ عرفان میاں کا ٹیلی فون آیا کہ جوش صاحب پنڈی سے آ گئے ہیں اور مجھے بلا رہے ہیں۔ میں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور جوش صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ میں تو کل کی فلائٹ سے پنڈی آپ سے ملنے جا رہا تھا۔ کہنے لگے اب اپنی سیٹ دوسری منی کے لیے بدلوالیں۔ میں بھی دوسری کو واپس جا رہا ہوں۔ اب دونوں ساتھ ہی چلیں گے۔ پھر کہنے لگے آج شام کا کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا آپ جو حکم دیں۔ کہنے لگے سمندر کی سیر کو نہ چلیں؟ میں نے کہا ضرور۔

سمندر کی سیر:

اسی شام عرفان میاں، ان کی بہنیں اور جوش صاحب ہم سب کیماڑی پہنچے وہاں ہمارے کسٹم کے ایک ساتھی کنور تحسین یونس علی خاں صاحب نے ایک کرائے کی کشتی کا بندوبست کر دیا اور ہم لوگ سمندر کی سیر کو روانہ ہو گئے۔ سمندر پرسکون تھا

شام کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ فرزانہ نے جوش صاحب کی کئی غزلیں گائیں۔ جوش صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ رخسانہ بھی شاعرہ ہیں مگر اپنا کلام سناتی ہوئی شرماتی ہیں مگر جوش صاحب کے اصرار پر انھوں نے بھی چند رباعیات سنائیں۔ سورج غروب ہوا تو جوش صاحب نے اپنا شغل شروع کیا۔ ان کو افسوس تھا کہ ہم میں سے کوئی ان کا ہم مشرب نہیں ہے۔ تھوڑی ہی دیر میں چودھویں کا چاند انتہائی آب و تاب کے ساتھ طلوع ہوا۔

چاندنی رات میں سمندر کی سیر کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب مجھے آپ کی ایک نظم یاد آ رہی ہے اگر اجازت ہو تو عرض کروں مگر مقطع میں جناب خضر کے بجائے آپ ہی کا تخلص استعمال کر لوں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہوگا۔ رخسانہ کہنے لگیں۔ مقطع میں شاعر ہی کا نام آنا چاہیے۔ یہ خضر صاحب کہاں سے ٹپک پڑے خیر آپ نظم سنایئے۔ جوش صاحب نے کہا اس نظم کا عنوان تو بتاؤ۔ میں نے کہا اس کا عنوان ہے "راہ طرب" اور یہ آپ کے مجموعہ "حرف و حکایت" میں ہے۔ فرمایا ارے بڑا پرانا مال ہے۔ یہ ۱۹۳۰ء کی کہی ہوئی ہے۔ خیر تم سناؤ۔ میں نے کہا مال پرانا سہی مگر اس وقت بالکل تازہ ہے۔ سنیے۔

راہ طرب

اللہ رے آج جشن خرابات کا فروغ
لرزش میں تار ساز ہے گردش میں دور جام

چھائی ہوئی ہے عرش سے تا فرش چاندنی
رقصندہ آب نہر ہے تابندہ سقف و بام

جھلکی صراحیوں میں ہے روح رباب و چنگ
اٹھتی جوانیوں پہ ہے نور مہ تمام

نکھری ہوئی ہے نشے سے نمناک چاندنی
ڈوبی ہوئی ہے کیف میں باد سبک خرام

نغمے ہیں اپنے چشمۂ پنہاں سے ہم کنار
روحیں ہیں اپنے مرکز اصلی سے ہم کلام

جبریل سے بھی اٹھ نہ سکے جس کا ایک حرف
وہ آ رہے ہیں عالم ارواح سے پیام

گردش میں ہیں سروں پہ اٹھائے گلابیاں
ترکان ماہ پارہ و خوبان لالہ فام

اب یہ بند ذرا توجہ سے ملاحظہ فرمایئے جس میں تخلص کا تصرف کیا گیا ہے۔

آیا یہ کون راہ طرب پوچھتا ہوا
چہرہ تو کہہ رہا ہے کہ ہے رہبر انام

آنے دو اس بزرگ کو آنے دو روبرو
لازم ہے ہر جوان کو پیری کا احترام

یہ ریش یہ عمامہ یہ حق آشنا نظر
راہ طرب کی فکر میں نظریں ہیں سوئے جام
ہاں اس طرف قریب، ذرا اور کچھ قریب
اچھا۔۔۔۔ جناب جوش ہیں وعلیکم السلام

سب نے اس تصرف کی بے انتہا داد دی۔ خود جوش صاحب بہت ہنسے اور کہنے لگے بس تو تم مجھ پر چوٹ کر گئے مگر تمہاری حس ظرافت کی داد دیے بغیر چارہ نہیں۔ بھئی خوب، بہت خوب۔ غرض یہ شام اس قدر حسین اور دلچسپ تھی کہ ہمیشہ یاد رہے گی۔ تقریباً دس بجے ہم لوگ ساحل پر واپس آئے۔ راستے میں بندو خاں کی ہوٹل میں رات کا کھانا کھایا اور گھر واپس آگئے۔ اس رات جوش صاحب نے عرفان میاں ہی کے مکان پر قیام کیا۔ چلتے وقت مجھ سے کہنے لگے کہ کل صبح سویرے سات بجے تک آجائیے، بہت کام ہیں۔

چنانچہ دوسرے دن ۳۰ویں اپریل کو میں صبح ساڑھے سات بجے جوش صاحب سے ملنے عرفان میاں کے مکان پہنچ گیا۔ سب لوگ ناشتہ کر رہے تھے میں نے بھی ان کے ساتھ چائے پی اور تقریباً ساڑھے آٹھ بجے میں، جوش صاحب، ہاشمی صاحب اور ان کی تینوں بچیاں ریحانہ، رخسانہ اور فرزانہ بابا ذہین شاہ صاحب کے مکان کے لیے روانہ ہوئے مگر وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ بابا صاحب سویرے سے کہیں تشریف لے گئے ہیں۔ وہاں سے ہم لوگ پی آئی اے کے دفتر گئے۔ میں نے اپنی سیٹ تیسویں کے بجائے دوسری مئی کے لیے بدلوائی۔ اس تبدیلی کے لیے ستر روپے زیادہ دینے پڑے۔ جوش صاحب نے اصرار کیا کہ یہ دام وہ ادا کریں گے کیونکہ یہ تبدیلی ان کی وجہ سے کروانی پڑی تھی مگر میں نے انھیں ایسا نہیں کرنے دیا۔ غرض ٹکٹ بدلوا کر ہم لوگ گورنر ہاؤس پہنچے۔

گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور:

میر رسول بخش تالپور ایک دن قبل ہی گورنر سندھ مقرر ہوئے تھے۔ گورنر ہاؤس میں مبارک باد دینے والوں کا مجمع تھا۔ لوگ پھولوں کے ہار میر صاحب کو پہنا رہے تھے۔ ان کے سیکریٹری نے ہم لوگوں کو ایک علاحدہ کمرے میں بٹھا دیا اور کوکو کولا کی بوتلوں سے ہماری تواضع کی۔ اس کمرے میں ایک بڑی سی تصویر آویزاں تھی جس کے پس منظر میں پیپلز پارٹی کا پرچم تھا جس پر دو تلواریں تھیں اور اوپر ہلال اور بیچ میں بھٹو صاحب کی تصویر تھی۔ جس کے چہرے

کرختگی کے آثار نمایاں تھے۔ جوش صاحب نے مجھے اپنے قریب بلایا اور کہا کہ اس تصویر کو دیکھو اور بتاؤ کہ کیا تاثر پیدا ہوتا ہے اور پھر خود ہی کہنے لگے۔ بہت برا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ چہرے پر سخت رعونت ہے اور اس امر کا بھی اظہار ہوتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ جو غلط ہے۔ ابھی ہم اس تصویر کے تاثرات پر غور کر ہی رہے تھے کہ میر صاحب کمرے میں تشریف لے آئے۔ بہت محبت اور تپاک سے گلے ملے اور ہر ایک کی خیریت پوچھی۔ اس کے بعد جوش صاحب کو الگ کمرے میں لے گئے۔ وہاں ان سے تقریباً آدھا گھنٹہ علیحدگی میں بات کی۔ پھر وہ دونوں باہر آئے پھر میر صاحب ہم لوگوں کو گاڑی تک پہنچانے آئے۔ چلتے ہوئے کہنے لگے کہ آپ ابھی مولانا کوثر نیازی سے مل لیجیے وہ اس وقت اپنے دفتر ہی میں ہوں گے۔ چنانچہ ہم لوگ میر صاحب سے رخصت ہو کر قدیم سیکرٹریٹ میں مولانا کے دفتر پہنچے۔ مولانا مرکزی وزیر نشر و اشاعت تھے۔

مولانا کوثر نیازی سے ملاقات:

جیسے ہی ان کو جوش صاحب کی آمد کی اطلاع ہوئی فوراً باہر آ کر ہمارا استقبال کیا اور اپنے دفتر میں لے گئے۔ چائے منگوائی اور خود اپنے ہاتھ سے بنا کر ہم لوگوں کو پیش کی۔ جوش صاحب نے ہم سب کا تعارف مولانا سے کروایا۔ فرزانہ کے متعلق جب جوش صاحب نے یہ کہا کہ اس کا گلا بہت اچھا ہے اور خاص طور پر غزل کا جذباتی تاثر ابھارنے میں اس کو غیر معمولی ملکہ حاصل ہے تو مولانا کوثر نیازی نے فرزانہ سے فرمائش کی کہ کوئی غزل سنائے۔ فرزانہ نے نہایت دلکش انداز میں جوش صاحب کی غزل سنائی۔

بربط نہ اٹھا کیف غنا بھول چکا ہوں
ہر جنبش گوا سے زہرہ نوا بھول چکا ہوں
اب حسن کو تکلیف نہ دے ناز و ادا کی
میں عشق کو اے جان وفا بھول چکا ہوں
در پر ترے آکر نہ صدا دوں گا کہ اب میں
رسم طلب و طرز دعا بھول چکا ہوں

رہتا ہے جہاں عشق رہائے ہوئے دھونی
اس راہ کو اے ماہ لقا بھول چکا ہوں
گلوں میں حسینوں کے دکھاتا تھا جو گل زار
مدت ہوئی وہ رنگ حنا بھول چکا ہوں
اک نقش ہے تیرا کہ مٹائے نہیں مٹتا
ہر چند کہ سب کچھ بخدا بھول چکا ہوں

یہ غزل کافی طویل ہے مگر فرزانہ نے اختصار سے کام لیا اور صرف چند ہی اشعار سنائے مگر اس کے گلے کا سوز طرز ادا کی دلکشی نے وہ سماں باندھا کہ مولانا نے دل کھول کر داد دی اور یہ دریافت فرمایا کہ ان بچیوں کی "رہائش" کہاں ہے۔ یا تو جوش صاحب اپنی غزل سن کر جھوم رہے تھے یا رہائش کا لفظ سن کر ایسے اچھلے کہ جیسے ان کے جسم تصور میں کوئی کانٹا چبھ گیا ہو۔ فرمایا، مولانا "رہائش" بدنسلا لفظ ہے۔ رہنا ہندی کا لفظ ہے اس میں ی ش لگا کر فارسی کا مصدر رہائش نہیں بنایا جا سکتا اگر اس ترکیب کو ہم جائز قرار دے دیں تو پھر چلنے سے چلائش، کھانے سے کھلائش کو بھی درست تسلیم کرنا پڑے گا۔

مولانا نے مسکراتے ہوئے فرمایا جوش صاحب، اب آپ اسلام آباد تشریف لا رہے ہیں ہم لوگ آپ سے اردو سیکھ لیں گے۔ اس کے تھوڑی دیر کے بعد دوران گفتگو مولانا نے پوچھا۔ جوش صاحب، آپ کی تنخواہ کی "ادائیگی" کراچی میں ہوگی یا اسلام آباد میں۔ جوش صاحب پھر الجھ گئے۔ فرمایا یہ ادائیگی کا لفظ بھی پہلے لفظ کی طرح غلط ترکیب سے بنا ہے۔ "ادا" فارسی لفظ اور "ئیگی" ہندی۔ فارسی اور ہندی کی آمیزش سے لفظ نہیں بنانا چاہیے۔ مولانا نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا "اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم کرے"۔ چلتے وقت مولانا نے دریافت فرمایا جوش صاحب آپ اسلام آباد کب تشریف لا رہے ہیں تو جوش صاحب نے فرمایا کہ دوسری مئی کو میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ غرض مولانا کے پاس تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ میں نے سب لوگوں کو عرفان میاں کے مکان پر پہنچایا۔ جوش صاحب بھی وہیں رہ گئے اور میں اپنے گھر آ گیا۔

نظریہ جبر و قدر:

دوسرے دن میری ماموں زاد بہن اختر خانم جنھوں نے سیاسیات میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور اب پی ایچ ڈی کر رہی ہیں، میرے گھر آئیں اور جوش صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ ہم دونوں عرفان میاں کے گھر پہنچے، جہاں جوش صاحب مقیم تھے۔ جب میں نے اختر کا تعارف جوش صاحب سے کروایا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ عرفان میاں کی منی بھی آگئیں۔ مختلف موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ گفتگو کے دوران جبر و قدر کا مسئلہ زیر بحث آگیا۔ اختر خانم نے کہا کہ ایک باشعور انسان جو چاہے وہ کر سکتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا بے شک آپ جو چاہے کر سکتی ہیں مگر خود چاہنا آپ کے بس میں نہیں۔ انسان کا ہر عمل کسی نہ کسی مہیج کا رد عمل ہوتا ہے اور یہ مہیج کسی خارجی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے اور آپ کا رد عمل آپ کی شخصیت کے قوام کا نتیجہ۔ آپ کی شخصیت کا تانا بانا جن اجزا سے بنا جاتا ہے ان میں میراث، تربیت، صحت، علم، تجربہ، جغرافیہ، تاریخ، معتقدات ان تمام عوامل سے آپ کی نفسیات کا ہیولا ترتیب پاتا ہے۔ انہی سے آپ کی جذباتی کیفیت مرتب ہوتی ہے۔ یہ سب اجزا مل کر آپ کے رویے کا تعین کرتے ہیں۔ پھر آزاد مرضی کہاں باقی رہی۔ ہم بالکل جمادات اور حیوانات کی طرح جبر کے تابع ہیں۔ کوئی ہماری گدی پکڑ کر ہم سے کام لیتا ہے۔ کوئی خارجی اور داخلی جبر کے زیر اثر کام کرتا ہے۔ میں نے کہا تو پھر اس کے یہ معنی ہوئے کہ اگر ہم انسانی کردار میں کوئی تبدیلی پیدا کرنا چاہیں تو ہم کو اس جبر کا پتا چلانا پڑے گا جو ہمارے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ جوش صاحب نے کہا، بے شک۔ میں نے کہا کہ داخلی جبر تو وہ ہے جو ہر ذی حیات کی تعمیر میں مضمر ہے۔ جن کو ہم بقائے ذات اور بقائے نسل کے جبلی تقاضے کہتے ہیں۔ یہ تو ہمارے وجود کی ایسی ضرورت ہے جس سے کوئی شخص مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اور دراصل انہی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے وہ خارجی ماحول سے متعارف ہوتا ہے۔ بقائے ذات کی تکمیل کے لیے وہ اپنے جغرافیائی ماحول کا جائزہ لیتا ہے اور بقائے نسل کی خاطر وہ دوسرے ہم جنس سے آشنائی پیدا کرتا ہے۔ اس طرح نسل انسانی ایک جغرافیائی ماحول میں ایک سماج تشکیل دیتی ہے پھر معاشرتی ضرورتوں کے تحت اور آپس کے تعلقات اور باہمی رشتوں سے اقدار، رسم و رواج، تہذیب، ثقافت اور حکومت جنم لیتے ہیں اور اس طرح وہ خارجی

جبر معرض وجود میں آتا ہے جس کے تابع اس معاشرے میں انسانوں کے کردار تشکیل پاتے ہیں۔ انسانی کردار کی تشکیل ایک پیچیدہ مسئلہ ہے جس میں ایک طرف اس کی وراثت جس کے ذریعے اس کی عضویاتی ساخت تشکیل پاتی ہے۔ دوسری طرف اس عضویے کی تربیت و پرداخت اس کا قدرتی اور معاشرتی ماحول کرتا ہے۔ قدرتی ماحول میں تو اس کا جغرافیہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کوئی انسان رہتا ہے وہ جگہ کرہ ارض کے کس حصے میں واقع ہے۔ کیا وہ برفانی علاقہ ہے یا پہاڑی علاقہ۔ میدانی ہے یا سمندری۔ زرخیز زمین ہے یا بنجر۔ درجہ حرارت کی نوعیت کیا ہے وہاں کس قسم کی پیداوار ہوتی ہے وغیرہ۔ یہ جغرافیائی ماحول انسانوں کی ضرورتوں کا تعین بھی کرتا ہے اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے وسائل بھی مہیا کرتا ہے۔ اس جغرافیائی ماحول میں انسانی معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ یہ معاشرہ انسانی اعمال پر اپنے اثرات اپنے معاشرتی اداروں کے توسط سے مرتب کرتا ہے جن میں اس کی سیاسی، معاشی، معاشرتی، ثقافتی، تمدنی، اخلاقی اقدار اور تنظیمیں شامل ہیں۔ یہ تمام عوامل انسانی رویے کی تشکیل کرتے ہیں۔ اس طرح انسانی کردار متعینہ سانچوں میں ڈھل کر نکلتا ہے اور پھر انسان اسی کردار کے جبر کے تابع ہر خارجی اور داخلی مہیج پر اپنا ردعمل ظاہر کرتا ہے۔ اب اگر ہم اپنے رویوں میں کوئی تبدیلی لانا چاہتے ہیں تو ہم کو اپنے سماجی اداروں میں تبدیلی لانا پڑے گی۔ اپنی تمام تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا تجزیہ کر کے ان میں رد و بدل کرنا پڑے گا۔ اس لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اچھا معاشرہ اچھا آدمی پیدا کرتا ہے اور برا معاشرہ برا آدمی پیدا کرتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا یہ بات بالکل درست ہے مگر یہ بھی ایک نفسیاتی جبر ہے کہ معاشرہ اتنی آسانی سے نہیں بدلا جاسکتا کیونکہ انسانوں کے ذہن کی کایا بہت آہستہ آہستہ کھلتی ہے۔ میرا ایک شعر ہے۔

ہر گام پہ ہے فکر کو قرنوں کی ضرورت

اور عمر کی تقدیر میں ہے برق خرامی

اور ہمارے معاشرے میں تو ابھی جاگیرداروں، سرمایہ داروں، چودھریوں، وڈیروں، سرداروں اور مذہبی پیشواؤں کا بہت زیادہ اثر ہے اور ہماری ہیئت حاکمہ بھی انہی اثرات کے تابع ہے۔ اس لیے تبدیلی بہت آہستہ آہستہ آرہی ہے۔

جوش صاحب نے کہا کہ ان تمام باتوں سے میرے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ انسانی

اعمال خارجی اور داخلی جبر کے تابع ہوتے ہیں اور آزاد مرضی یا (Free Will) نام کی کوئی چیز اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اختر خانم نے کہا جوش صاحب جس کو ہم (Free Will) کہتے ہیں وہ دراصل ہمارا نفسیاتی احساس ہے جو ہماری شخصیت کی خصوصیت ہے۔ ہمارا شعور ذات اپنے ماحول سے اخذ مسرت کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ اس کے لیے وہ اپنا ماحول اپنی مرضی کے مطابق مرتب کرنے کی سعی میں لگا رہتا ہے اور اگر موزوں حالات میسر آ جائیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے تو اس کو مسرت حاصل ہوتی ہے۔ اس عمل سے اس کو یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی مرضی سے اپنی زندگی بسر کی ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ خود مسرت اور غم کے احساسات بھی تو انسان کی عضویاتی اور نفسیاتی تشکیل کا نتیجہ ہیں۔ ہم دراصل ایک مشین کی طرح ہیں جس کا کنٹرول کسی اور طاقت کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہمارے ذریعہ سے اپنے مقاصد حاصل کر رہی ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب اس طاقت کا کوئی نام ہے۔ جوش صاحب نے کہا، ہم صرف اتنا محسوس کر سکتے ہیں کہ ایک توانائی ہے۔ آپ اس کا کوئی نام رکھ لیں لیکن نام کے ساتھ ہی بہت سی غلط فہمیوں کا امکان ہے۔ جب کوئی شخص اس قوت حاکمہ کو مشخص کر کے کوئی نام دیتا ہے تو پھر وہ لامحدود توانائی مطلق اس کے فکری حدود کے حبس خانے میں محدود ہو جاتی ہے اور چونکہ ہر انسان کی فکری، علمی اور تخیلی صلاحیت اس کے علم، تجربے اور احساسات کی نسبت سے محدود ہوتی ہے اس لیے وہ اس ناقابل تصور ہستی کا جو بھی تصور قائم کرے گا وہ اس کے ذہن کا تراشیدہ صنم ہو گا۔ بقول اقبال

تراشیدم صنم بر صورت خویش ــــ بہ شکل خود خدا را نقش بستم

مرا از خود بروں رفتن محال است ــــ بہ ہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اس لیے اس توانائی مطلق کو مشخص کیے بغیر اگر آپ کوئی نام دے سکیں تو آپ کی مرضی۔ لیکن آپ جب بھی مشخص کر کے کوئی نام دیں گے تو وہ انسانی صفات ہی کا چربہ ہو گا اور اس طرح خدا کے بھیس میں خود انسان ہی نوع انسان کی تقدیر کا ناخدا بن جائے گا۔ آج تمام سائنسی علوم انسانی فکر کو انہی اصنام خیالی کی گرفت سے نکال کر توانائی مطلق کے ناقابل تغیر قوانین علت و معلول کی طرف رہنمائی کر رہے ہیں۔ چنانچہ آپ نے ابھی جس داخلی اور خارجی جبر کی طرف اشارے کیے ہیں اگر ان کا بنظر غائر جائزہ لیا جائے تو یہ یقین کیے بغیر چارہ ہی نہیں

رہتا کہ اس تمام انفس و آفاق کو ایک توانائی مطلق کا جبر کامل اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے جو اپنے اسٹنیٰ ناآشنا قوانین کے ذریعہ سے ہر ذرۂ وجود پر مسلط ہے۔

سزا و جزا کا تصور:

میں نے کہا جوش صاحب اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ اس کائنات میں صرف اور صرف خالق کائنات کا ارادہ ہی موثر ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی اعمال میں بھی اسی کے ارادے کی جلوہ گری ہے تو پھر ہمارے اعمال کی سزا و جزا کا کیا جواز رہ جاتا ہے۔ جوش صاحب نے کہا کہ اس سوال کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ انسان کا ہر عمل علت اور معلول کے قوانین کے تحت اپنا ایک نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ اگر یہ نتیجہ ہمارے لیے مفید ہو تو وہ اس عمل کی جزا ہو گی اور اگر نقصان رساں ہو تو وہ سزا ہے۔ اگر ہم اپنے عمل کے نتیجے سے واقف ہوں اور نقصان دہ اعمال سے اجتناب کریں تو ان کے ضرر رساں نتائج سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ ہمارے اعمال دو قسم کے ہوتے ہیں ایک وہ جن کے اثرات ہمارے جسم پر مرتب ہوتے ہیں جیسے کھانا، پینا، سونا جاگنا، ورزش کرنا وغیرہ دوسرے وہ جن کو ہم معاشرتی اعمال کہتے ہیں جن میں ایک انسان دوسرے انسان یا انسانوں کے تعلق سے کوئی عمل کرتا ہے۔ ہر دو صورتوں میں نتائج تو علت اور معلول کے قوانین کے مطابق ہی مرتب ہوں گے مگر ہمارے معاشرے میں سزا و جزا کے دو نظام ملتے ہیں۔ ایک مذہب کے توسط سے دیا ہوا تصور جس کا تعلق حیات بعد الموت سے بیان کیا جاتا ہے دوسرا کسی مملکت کے تعزیری قوانین کے تحت سزا کا تصور۔

جہاں تک مذہب کا سزا و جزا کا تصور ہے اور جس کو مرنے کے بعد کی زندگی سے وابستہ کیا جاتا ہے جس کو مذہب کی زبان میں جنت اور دوزخ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ میرے نزدیک یہ متشابہات میں سے ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حساب کے دن ہمارے ان اعمال کی گواہی جن کا تعلق ہمارے جسموں سے ہے ہمارے اعضا خود دیں گے۔ ہاتھ، پیر، آنکھ، ناک، کان غرض جسم کا ہر عضو ان اعمال کی گواہی دے گا جو اس کے تعلق سے سرزد ہوتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ ہمارا کھانا پینا۔ یعنی ہماری ہر قسم کی غذا اور ہر قسم مشروب ہمارے جسم پر اپنے کیمیاوی اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اس کے علاوہ ہمارے

تمام اعمال یعنی اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، دوڑنا، ورزش کرنا یا نہ کرنا، سونا جاگنا، مختلف لوگوں سے ہنسنا بولنا، ہمارے غم اور مسرت کے احساسات، ہماری نفسیاتی الجھنیں، جذباتی کشمکش، ہمارے ہیجان غرض ہماری داخلی اور خارجی ہر کیفیت ہمارا معاشرتی اور قدرتی ماحول ہمارے کرنے کے اوقات اور طریق کار ہمارے جسم کے مختلف اعضا پر اپنے اثرات مرتب کرتے رہتے ہیں اور ہمارے اعضا ان اثرات سے متاثر ہوتے رہتے ہیں اور ان میں ان اعمال کی نسبت سے اچھی یا بری تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں۔ اور یہ عمل علت اور معلول کے قوانین کے تحت خود بہ خود جاری رہتا ہے۔ کہیں کہیں ہمیں اس تبدیلی کا علم ہوتا ہے مگر زیادہ تر یہ تغیر غیر محسوس طور پر واقع ہوتا رہتا ہے اور بالآخر ایک وقت وہ آتا ہے جب ہمارا کوئی عضو اس مسلسل خراب اثر کے باعث بیمار پڑ جاتا ہے اور اس میں تکلیف شروع ہو جاتی ہے تو انسان پریشان ہو کر خدا کو پکارتا ہے اور اس سے شکایت کرتا ہے کہ اے خدا تو نے مجھے کس عذاب میں گرفتار کر دیا تو قرآن کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ یہ تو خود تمہارے اعمال کے جواب محسوس شکل میں تمہارے سامنے آ رہے ہیں۔ یہ تکلیف ہی دراصل اس عضو کی ان اعمال کی شہادت ہے جو ہم کرتے آئے ہیں۔ اب یہاں ایک بات اور سمجھ لیجیے کہ مذہب جس کو یوم حساب سے تعبیر کرتا ہے وہ دراصل ہمارے اعمال کے پیکر محسوس میں ظاہر ہونے کا وقت ہے جو واقع تو ضرور ہوتا ہے مگر اس کی مدت کا تعین کرنا مشکل ہوتا ہے کیونکہ مختلف اعمال کے نتائج کی مدت مختلف ہوتی ہے۔ یہ تو رہی مذہبی نقطۂ نظر سے ہمارے اعمال کی سزا و جزا کی توضیح۔

اب دوسرا پہلو سزا کا وہ ہے جو ہمارے ملکی قوانین تعزیرات کے ذریعے سے نافذ کیا جاتا ہے۔ میرے خیال میں اس مصنوعی تصور سزا کا کوئی جواز نہیں ہے کیونکہ یہ سزا انتقامی ہے اصلاحی نہیں۔ اس سلسلے میں جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ یہ تمام کائنات جس میں خود انسان اور انسانی معاشرہ شامل ہے، ناقابل تغیر علت اور معلول کے قوانین کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں یہاں ہر معلول علت بداماں ہے۔ اسی طرح ہر جرم کسی نہ کسی علت کے تابع ہوتا ہے بالکل جس طرح ہر مرض جسم کی کسی نہ کسی خرابی کے نتیجہ میں ظاہر ہوتا ہے اور جس طرح معالج مرض کو مریض سے دور کرنے کی کوشش کرتا ہے نہ کہ مریض ہی کو ختم

کرنے کی۔ تو اسی طرح جرم بھی معاشرتی مرض ہے جس کے اسباب بھی معاشرے کی خرابی ہی میں تلاش کرنے چاہییں۔ مجرم بھی مریض کی طرح معاشرتی بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہمیں جرم اور مجرم میں فرق کرنا چاہیے اور جرم سے نفرت کر کے اس کو ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور مجرم کو اس معاشرتی مرض سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہماری تعزیرات اصلاحی ہوں نہ کہ انتقامی۔ مگر بد قسمتی سے ہماری تعزیرات انتقامی ہے۔ یہ قدیم دور کی ان روایات کی آئینہ دار ہے جب کسی معاشرے میں وسائل کی کمی اور طاقت کے عدم توازن کے باعث معاشرہ مترفین اور محرومین میں تقسیم ہو گیا اور طاقتور مترفین اپنی جان، مال، عزت اور آبرو کے تحفظ کے لیے ان کے حقوق میں دست اندازی کرنے والوں کو انتقام کے ذریعہ سے خوف زدہ کر کے اپنے مفادات کی حفاظت کرنے لگے۔ معاشرتی سزا کا تصور دراصل قہر آشنا مطلق العنان شہنشاہوں، مذہبی پیشواؤں، نوابوں، جاگیرداروں، مغلوب الغضب قبائیلی سرداروں سریع الاشتعال آمروں کی جبل آفریدہ آتش غضب کا انتقامی اظہار ہے کیونکہ یہ مراعات یافتہ طبقہ کبھی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہو سکتا کہ معاشرے میں حقوق کی عدم مساوات کو ختم کر کے محروموں اور ناداروں کو جو آبادی کی اکثریت پر مشتمل ہوتے ہیں، پر مسرت زندگی بسر کرنے کے وہ تمام حقوق دے دیے جائیں جن کی اس دور کی تہذیب متقاضی ہوتی ہے اور جن سے مراعات یافتہ طبقہ خود مستفید ہوتا رہتا ہے۔ اسی عدم مساوات اور محرومیوں کی بنا پر پورے معاشرے میں ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کے حقوق میں مداخلت کرنے لگتا ہے اور یہ مداخلت جب جان، مال، عزت اور آبرو کے حقوق میں ہو تو جرائم جنم لیتے ہیں اور اگر اس معاشرے میں حکومتی عملہ جو جرائم کی روک تھام کے لیے متعین کیا جاتا ہے مگر جو خود بھی محرومین کے طبقے سے تعلق رکھتا ہے، مجرموں کو تحفظ فراہم کر کے ان کے ذریعہ سے خود بھی فوائد حاصل کرنے لگے تو جرائم متعدی وبا کی طرح تمام معاشرے کو اپنے خونی پنجہ میں جکڑ لیتے ہیں اور اس معاشرے میں ایک ایسی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے جو طرح طرح کے جرائم کی تخلیق کا سبب بنتی رہتی ہے اور چونکہ ہمارے تعزیری قانون کی بنیاد انتقامی ہے اس لیے برسر اقتدار طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ جرم کرنے والوں کو سزا دے کر وہ جرم کا تدارک کر دے گا حالانکہ حقیقت یہ ہے

اپنے معمول کا مطالعہ کرتا ہے۔ میں نے کہا میں اس بات کو خوب سمجھتا ہوں کہ آپ دونوں مجھے بیچ میں رکھ کر دراصل ایک دوسرے سے مخاطب ہیں مگر بشری کمزوری کے تحت اتنی تعریف پر خوش ہونا بھی ایک فطری امر ہے۔

نگاہ ناز جسے آشنائے راز کرے وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ہاشمی صاحب گرم گرم کبابوں کی قاب لے آئے۔ میں نے چکھے تو واقعی بہت لذیذ تھے۔ میں نے جوش صاحب سے کبابوں کی تعریف کی تو وہ بھی ہمارے ساتھ شریک ہوگئے۔ کباب کے بعد بالائی آگئی وہ بھی اس قدر لذیذ تھی کہ ضرورت سے زیادہ کھا گئے۔ غرض کھانے سے فارغ ہوئے تو جوش صاحب نے کلیاں کر کے منہ صاف کیا اور کہا کہ ہم تو اب انتقال فرماتے ہیں۔ ایک گھنٹے بعد اگر زندہ اٹھے تو آپ لوگوں سے ملاقات ہوگی۔ مجھ سے کہا دلبر بھاگ مت جانا۔ میں نے کہا آپ آرام فرمائیں میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ چنانچہ جوش صاحب تو لیٹ گئے اور ہم لوگ باتیں کرتے رہے۔ موضوع گفتگو زیادہ تر انسانی نفسیات کے مسائل ہی رہے۔ ان باتوں میں چار بج گئے۔ جوش صاحب بیدار ہوگئے، غسل ثانی فرمایا۔ پھر چائے پینے تک پانچ بج گئے۔ سمن اور ان کی بہن اجازت لے کر رخصت ہو گئیں۔ چلتے وقت جوش صاحب نے کہا کل ضرور آجانا، ہم لوگ چھانگا مانگا جائیں گے۔ دونوں نے آنے کا وعدہ کر لیا۔ اتنے میں شوکت حسین رضوی صاحب آگئے۔ اور مجھے اور جوش صاحب کو لے کر اپنے گھر چلے گئے۔

شوکت حسین رضوی کے گھر دعوت:

ان کا مکان النور اسٹوڈیو کے ایک حصہ میں واقع ہے۔ شوکت صاحب نے ہم کو اپنا اسٹوڈیو دکھایا۔ اس وقت کوئی شوٹنگ نہیں ہو رہی تھی۔ اسٹوڈیو بہت بڑے علاقے میں پھیلا ہوا ہے اور ہر قسم کے ساز و سامان سے آراستہ ہے۔ شوکت صاحب کی موجودہ بیگم یاسمین صاحبہ بھی وہیں تشریف لے آئیں اور بہت عقیدت اور محبت سے جوش صاحب سے ملیں۔ اسٹوڈیو کی سیر کے بعد ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے۔

شوکت صاحب نے بلیک لیبل کی بوتل کھولی۔ ایک گلاس میرے سامنے بھی رکھ دیا۔

جوش صاحب نے کہا No. He is not a gentleman رضوی صاحب نے میرے لیے کوکوکولا منگوایا۔ ادھر سورج غروب ہوا اور جوش صاحب و رضوی صاحب طلوع ہو گئے۔ گزک میں نمکین کاجو، نمکین پستے اور بادام تھے۔ نمکین کاجو جوش صاحب کو بہت پسند ہیں۔ دوسرے تیسرے پیگ کے بعد یاسمین صاحبہ نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ پھر دیر تک جوش صاحب کلام سناتے رہے۔ شغل مے نوشی ختم ہوا تو کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔ بہت لذیذ اور پر تکلف کھانا تھا۔ یہ شام بہت دلچسپ رہی۔ کوئی دس بجے رضوی صاحب نے جوش صاحب کو ہاشمی صاحب کے گھر اور مجھے اختر میاں کے گھر پہنچایا۔ اور اس طرح آج کا دن ختم ہوا۔

چھانگا مانگا کی سیر:

دوسرے دن صبح ہی صبح میرے پاس رخسانہ کا ٹیلی فون آیا کہ سب لوگ چھانگا مانگا جانے کے لیے تیار ہیں اور بابا آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔ آپ جلد آ جائیے اور ناشتہ ہمارے ساتھ ہی کیجیے۔ چنانچہ میں آدھے گھنٹے میں ہاشمی صاحب کے مکان پر پہنچ گیا۔ سب لوگ ناشتے کی میز پر تھے۔ میں بھی ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم لوگ گاڑیوں میں بیٹھ ہی رہے تھے کہ حسن اور ان کی بہن بھی آ گئیں۔ ان کو دیکھ کر جوش صاحب کھلکھلا کر ہنس دیے۔ مسرت ان کے ہر رگ و ریشے سے ابل رہی تھی۔ میں نے کہا اب چلیے تاکہ:

بدمست گھٹاؤں کی طرح دشت میں جھومیں
چھلکائیں مئے ہوش ربا جام کو چومیں
کیا دہر دو عالم کو کریں غرق سبو میں
ہستی سے گزر جائیں مچلتے ہوئے دھوم میں

کیونکہ:

اس رت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات

میں نے کہا میر صاحب بھی موسم بہار میں جنوں جولانیوں کے لیے صحرا ہی کا رخ کرتے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ:

پھر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر — نادان فصل گل میں کوئی بھی گھر رہے ہے

اتفاق سے ان دنوں چند روز سے لاہور پر بڑے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے اور جس روز ہم لوگ چھانگا مانگا کے لیے روانہ ہوئے تو ہلکی ہلکی پھوار بھی پڑ رہی تھی۔ غرض تمام راستے شعر و شاعری کرتے ہم لوگ چھانگا مانگا کے ریسٹ ہاؤس پہنچے۔ وہاں تھوڑی دیر آرام کیا پھر بیرے نے بہت اچھی چائے پلائی۔ جہاں موسم اس قدر حسین ہو اور ماحول اتنا رنگین تو کوئی شخص کمرے میں کیسے بند ہو سکتا ہے۔ چھانگا مانگا کے جنگلوں میں ایک چھوٹی سی ریل گاڑی چلتی ہے چنانچہ ہم سب لوگ ریل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے کہا جوش صاحب آپ کو تو ویسے بھی ریل کا سفر بہت پسند ہے چلیے آج سارا دن اسی ریل میں گھومتے ہیں۔ بعض بعض جگہ تو گھنے درختوں کے بیچ سے ریل گزرتی رہی۔ ایک نہر اس جنگل کے بیچ سے گزرتی ہے جس میں کئی قسم کے آبی پرندے بھی ہیں۔ غرض دو تین گھنٹے کی سیر کے بعد جب ریل رک گئی اور اس کا عملہ دوپہر کے وقفے میں کھانا کھانے چلا گیا تو ہم لوگ ریسٹ ہاؤس آ گئے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر تھوڑی دیر آرام کیا۔ شام کو ریسٹ ہاؤس کے سامنے میز کرسیاں ڈال دی گئیں۔ چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر پھر سیر کو نکل گئے اور غروب سے تھوڑی دیر قبل ریسٹ ہاؤس آ گئے۔ اس دفعہ جوش صاحب نے ریسٹ ہاؤس کے ملازم سے کہہ کر نہر کے کنارے میز کرسیاں ڈلوا دیں اور وہیں سامان مے نوشی بھی منگوا لیا۔ اتنے میں سورج غروب ہو گیا اور جوش صاحب طلوع ہو گئے۔ جوش صاحب نے اپنی کتاب "یادوں کی برات" میں اپنی دو سابقہ محبوباؤں کے ساتھ ایک شام کا ذکر کیا ہے۔ آج بھی بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ایکشن ری پلے (Action Replay) ہو رہا ہے یعنی وہ منظر دہرایا جا رہا ہے۔ بہتر ہے کہ اس منظر کو جوش صاحب ہی کی زبان سے سنیے۔

"اب شام ہو گئی۔ ریسٹ ہاؤس کے بوائے کے تھیلے میں گلاس، سوڈے اور بوتل رکھوا کر ہم نہر کے ایک ایسے کنارے پر جا کر بیٹھ گئے جدھر کوئی آتا جاتا نہیں۔ ہائے وہ رنگین شام، وہ سامنے دو گل فام، وہ چھلکتا جام، وہ آنکھوں آنکھوں میں کلام، وہ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، وہ آسمان پر ابر کے ہلکے ہلکے ٹکڑے، وہ افق پر ڈوبتے سورج کا سونا، وہ چار مدھ بھری انکھڑیوں میں جادو ٹونا۔ جب جوش صاحب نے اس حلقۂ پری جمال میں دو پیگ ختم کر کے تیسرا پیگ بنا کر

سامنے رکھ لیا تو سمن نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کر دی۔ جوش صاحب نے اپنی ایک غزل سنائی۔

تو جو چاہے تو خزف کو در غلطاں کر دے
پور چٹخائے تو گونگوں کو غزل خواں کر دے

چلبلے پن پہ اتر آئے جو شوخی تیری
کوہ کو کاہ کے مانند پرافشاں کر دے

رسمسا کر کبھی انگڑائی جو لے وقت سحر
جلوۂ خواب کو اورنگ سلیماں کر دے

تو اٹھا کر کبھی تنبورہ برستی رت میں
بول کھنکائے تو قطبین کو رقصاں کر دے

انکھڑیوں سے جو اترے کبھی آیات جمال
مرد زندیق کو پیغمبر دوراں کر دے

تو کسی مرتد و کافر کو بھی اے زہرہ جبیں
بڑھ کے سینے سے لگائے تو مسلماں کر دے

مسکرا کر جو کلیجے میں چبھو دے مکھڑا
قیس کو جلوۂ لیلیٰ سے گریزاں کر دے

اپنے دانتوں میں دبا لے جو دوپٹے کا سرا
حکمت جوش کو انگشت بہ دنداں کر دے

جوش صاحب غزل ختم کر چکے تو سب کی فرمائش پر فرزانہ نے یہی غزل گا کر سنائی۔ قدرت نے اس بچی کے گلے میں موسیقی اور راگنی کی مٹھاس اس قدر کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کہ ہر شخص غزل سن کر جھومنے لگا۔ میں بار بار سمن کے چہرے کی بدلتی ہوئی رنگت کو نوٹ کر رہا تھا۔ جوش جیسا عظیم شاعر یوں اگر کسی لڑکی کے سامنے اس کے حسن کی دلکشی کا اعتراف کرے تو اس وقت اس کے چہرے کے تاثرات قابل دید ہوتے ہیں۔ حسن کی کامرانی کا احساس نسوانی شرم و حیا کا غازہ بن کر رخ رنگیں کی دلکشی میں صبح بہاراں کا جلال و جمال پیدا کر دیتا ہے۔ اس وقت بقول مخدوم محی الدین۔ خدا بھی مسکرا دیتا تھا جب ہم پیار کرتے تھے۔ جوش صاحب نے سمن بیگم کے چہرے پر التفات کا یہ رنگ دیکھا تو دل کا نذرانہ قبول کرنے پر مبارکباد پیش کی۔ جوش صاحب پر اس وقت دوگونہ سرور کی کیفیت طاری تھی۔ التفات حسن و شباب اور سرمستی بادۂ ناب اس عالم کیف میں جوش صاحب نے ترانۂ مبارک بادگی نوازنی شروع کی۔

آسودگی عشوہ ترکانہ مبارک
اے شمع، جگر سوزی پروانہ مبارک

تیرے کف گل رنگ کو اے تازہ جوانی
میرا یہ چھلکتا ہوا پیمانہ مبارک

اک مرد ادا سنج حقائق کے لبوں پر
افسون تمنا کا یہ افسانہ مبارک

ہاتھوں میں درخشاں ہیں مرے خون کے دیپک
اے حسن یہ آرائش کاشانہ مبارک

اس کاسۂ سر میں کہ تامل کا وطن ہے
یہ فکر کا انداز غریبانہ مبارک

لٹاؤ گہر ہائے معانی کی طرف سے
امڈے ہوئے اشکوں کا یہ نذرانہ مبارک

در پہ ترے لائے ہیں مجھے لوگ یہ کہتے
یہ عقل میں ڈوبا ہوا دیوانہ مبارک

رقصاں ہے خرابات میں خود محتسب شہر
ساقی۔ یہ ظفرمندی مے خانہ مبارک

ایمان ہوا مملکت نجد میں شامل
یہ فتح مبیں جلوہ جانانہ مبارک

چوکھٹ پہ مہ و مہر ہیں قدموں پہ سر جوش
یہ دبدبہ یہ شوکت شاہانہ مبارک

میں نے کہا جوش صاحب خدا آپ کو یہ جلوہ جانانہ مبارک کرے اور ہمیشہ حسینوں کی رفاقت سے نوجوان رکھے۔ شاعر بھی بڑا خوش قسمت انسان ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل کی بات بھری محفل میں جس کو سنانا چاہتا ہے، سنا سکتا ہے اور کوئی اس کی زبان نہیں پکڑ سکتا نہ اس پر کوئی اعتراض کر سکتا ہے۔ بقول میر تقی میر:

عجب ہوتے ہیں شاعر بھی میں اس فرقے کا عاشق ہوں
کہ بے دھڑکے بھری محفل میں یہ اسرار کہتے ہیں

اور خود آپ کا بھی تو یہ شعر ہے:

قرباں ترے کہ اک نگہ التفات نے
دل کی جھجک کو جرأت رندانہ کر دیا

میں نے کہا جوش صاحب یہ غزل سنایئے۔ جوش صاحب نے کہا اسی غزل کا تو وہ مقطع ہے کہ

آواز دو کہ جنس دو عالم کو جوش نے
قربان یک تبسم جانانہ کر دیا

میں نے پھر یہ غزل سنانے کی فرمائش کی تو جوش صاحب نے وہ غزل بھی سنائی۔

ارض و سما کو ساغر و پیمانہ کر دیا
رندوں نے کائنات کو میخانہ کر دیا

اے حسن داد دے کہ تمنائے عشق نے
تیری حیا کو عشوۂ ترکانہ کر دیا

قرباں ترے کہ اک نگہ التفات نے
دل کی جھجک کو جرأت رندانہ کر دیا

صد شکر درس حکمت ناحق شناس کو
ہم نے رہین نعرۂ مستانہ کر دیا

دنیا نے ہر فسانہ حقیقت بنا دیا
ہم نے حقیقتوں کو بھی افسانہ کر دیا

آواز دو کہ جنس دو عالم کو جوش نے
قربان یک تبسم جانانہ کر دیا

اب اندھیرا زیادہ ہو گیا تھا۔ جوش صاحب کا چوتھا جرعہ ختم ہوئے دیر ہو گئی تھی۔ ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر ریسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ وہاں کھانا کھایا پہلے تو یہ رائے ہوئی کہ وہ رات وہیں گزاری جائے مگر حسن اور اس کی بہن نے کہا کہ ان کے والدین پریشان ہو جائیں گے۔ اس لیے سب وہاں سے رخصت ہو کر اپنے اپنے گھر سدھارے۔

دوسرے دن شوکت حسین صاحب نے آ کر کہا کہ ۱۹ مئی منگل کی شب ان کے ایک دوست حفیظ اللہ حسن صاحب کے وہاں جوش صاحب کی شام کی دعوت ہے۔ مجھے اور ہاشمی صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ چونکہ فلم انڈسٹری کی بہت سی معروف شخصیتیں بھی مدعو ہیں اس لیے یہ ذمہ داری حفیظ صاحب نے شوکت صاحب کو سونپی ہے کہ وہ جوش صاحب کو مطلع بھی کریں اور ان کو اپنے ساتھ لے کر بھی آئیں۔ جوش صاحب۔ کسی اور، کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر یہ بات شوکت صاحب سے نہ کہہ سکے۔ ان کے چلے جانے کے بعد مجھ سے کہا۔ حفیظ صاحب نے چونکہ خود آ کر ان کو دعوت نہیں دی ہے۔ اس لیے وہ اس دعوت کو ٹال جانا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا جوش صاحب اگر آپ کو اعتراض تھا تو آپ شوکت صاحب سے کہہ دیتے۔ اب تو شوکت صاحب دوسرے مہمانوں کو بھی اطلاع کر دیں گے اور حفیظ صاحب کو بھی مطلع کر دیں گے کہ آپ نے دعوت قبول کر لی ہے۔ جوش صاحب کہنے لگے میری جوتی سے۔ اگر کہہ دیں گے تو کہہ دیں۔ ارے ہم کوئے جاناں چھوڑ کر تو خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے، شوکت صاحب یا حفیظ صاحب کی کیا حیثیت ہے۔ ابھی ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اُدھر حفیظ اللہ صاحب بول رہے تھے اور جوش صاحب سے بات کرنا چاہتے تھے۔ حفیظ صاحب نے پہلے تو اپنا تعارف کروایا تو وہ جوش صاحب کے قدیم دوستوں میں سے نکلے۔ پھر انھوں نے معذرت چاہی کہ چونکہ ان کو جوش صاحب کی قیام گاہ کا پتا معلوم نہیں ہے اس لیے وہ ٹیلی فون کر رہے ہیں اور انھوں نے شوکت رضوی سے درخواست کی تھی کہ وہ آپ تک ان کی دعوت پہنچا دیں۔ جوش صاحب نے کہا کہ شوکت صاحب نے ان کا پیغام پہنچا دیا ہے مگر وہ بھی تو اپنا دیدار کروا دیں۔ یہ کہہ کر ٹیلی فون

ہاشمی صاحب کو دے دیا۔ انھوں نے حفیظ صاحب کو اپنے گھر کا پتا سمجھا دیا۔

شام تقریباً پانچ بجے حفیظ صاحب جوش صاحب سے ملنے آ گئے۔ اس وقت سمن اور ان کی بہن اور ہاشمی صاحب کی لڑکیاں سب جوش صاحب کو گھیرے ہوئے تھیں۔ جوش صاحب نے میرا تعارف بھی حفیظ صاحب سے کروایا۔ حفیظ صاحب نے کہا جوش صاحب آپ تمام خواتین و حضرات کل شام میرے غریب خانے پر تشریف لائیے۔ میں نے موسیقی کا بھی اہتمام کیا ہے۔ فریدہ خانم بھی آئیں گے اور اگر اقبال بانو بھی لاہور میں ہوئیں تو وہ بھی آئیں گی میں نے میڈم نور جہاں کو بھی مدعو کرنا چاہا تھا مگر چونکہ اس محفل کے مہتمم شوکت حسین صاحب رضوی ہیں، اس لیے وہ ان کی موجودگی پسند نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ بہت سے فلمی ستارے ہمارے گھر کے آنگن میں آپ کے دیدار کے لیے اتر آئیں گے۔ جوش صاحب نے سمن کی طرف اس طرح دیکھا جیسے پوچھ رہے ہوں کہ کہیے کیا حکم ہے سرکار۔ دعوت قبول کروں یا رد کر دوں مگر سب بچیوں نے یک زبان ہو کر کہا کہ ہم بھی ضرور چلیں گے۔ چنانچہ دعوت منظور کر لی گئی اور حفیظ صاحب تھوڑی دیر بیٹھ کر رخصت ہو گئے۔

حفیظ اللہ حسن صاحب کے گھر جوش صاحب کی دعوت:

دوسرے دن ۱۶ مئی ۱۹۷۲ء، منگل کی شام پانچ بجے شوکت صاحب تشریف لے آئے اور جوش صاحب اور میں ان کے ہمراہ حفیظ اللہ حسن صاحب کی کوٹھی پہنچے جو گلبرگ میں واقع ہے۔ کوٹھی کی شان و شوکت دیکھ کر مکین کی دولت مندی کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ کوٹھی کو بجلی کے قمقموں سے اس طرح سجایا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شادی کی تقریب کا اہتمام ہے۔ میں نے یہ حسن آرائش دیکھ کر کہا۔

گلشن میں بندوبست برنگِ دگر ہے آج — قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

جوش صاحب نے شوکت صاحب سے دریافت کیا کہ "کیا یہاں آج کوئی شادی ہے"۔ شوکت صاحب نے کہا آپ کے استقبال کا اہتمام ہے۔ کئی بڑے بڑے لان تھے۔ ایک لان کے بیچ میں نہایت شاندار اسٹیج تیار کیا گیا تھا۔ بڑے بڑے تخت بچھے تھے۔ ان پر نہایت قیمتی ایرانی قالین، پیچھے گاؤ تکیے۔ تخت کے تین طرف خوبصورت پھولوں اور بجلی کے قمقموں سے

منڈوا بنایا گیا تھا۔ حفیظ اللہ حسن صاحب استقبال کے لیے صدر دروازے پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ جیسے ہی ہماری گاڑی گیٹ میں داخل ہوئی۔ صاحب خانہ نے بڑھ کر دروازہ کھولا جوش صاحب کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے گاڑی سے نیچے اتارا اور لے جا کر صدر نشین پر رونق افروز کر دیا۔ مجھے بھی ان کے ساتھ ہی تخت پر بٹھا دیا گیا۔ ہمارے گاڑی سے اترنے کے بعد شوکت صاحب، ہاشمی صاحب اور ان کی بچیوں کو لینے چلے گئے اور تھوڑی دیر میں وہ لوگ بھی آ گئے۔ جوش صاحب کے ایک ملنے والے جو غالباً لاہور ہی میں رہتے تھے، خورشید صاحب فرید آبادی بھی کسی طرح اس محفل میں شریک ہو گئے اور جوش صاحب کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ بہت سے مہمان تو پہلے ہی آ چکے تھے، تھوڑی دیر میں باقی لوگ بھی آ گئے۔ فریدہ خانم پہلے سے موجود تھیں۔ اداکار محمد علی اور ان کی بیگم زیبا۔ اسلم پرویز اور ان کے علاوہ بہت سے فلمی ہیرو ہیروئنیں موجود تھیں۔ جیسے ہی سورج غروب ہوا، شراب کا دور شروع ہو گیا۔ بہت اعلیٰ قسم کی شراب اس قدر وافر مقدار میں موجود تھی کہ اگر بادہ کش خم کے خم لنڈھا جائیں تو بھی کم نہ پڑے۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت تعجب ہوا کہ بہت سے ایسے حضرات و خواتین جن کے متعلق شبہ بھی نہیں ہو سکتا تھا، ان کے ہاتھوں میں بھی جام تھا۔ بقول جوش صاحب "چمن میں آج ہر گلبانگ نوشا نوش ہے ساقی"۔

ادھر گردش میں جام آیا ادھر لرزش میں تار ساز آیا اور مغنیہ آتش نفس فریدہ خانم کے لب گلنار پر نغمہ دلنواز آیا۔ لالہ کی رنگ برنگی نشستوں پر حسینان گل اندام چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے تو ہین بہاراں کا عزم لیے ہوئے تھیں۔ نکھرا ہوا شباب اور اس پر ہوائے شام کی گل باریاں۔ پیشانیوں پر کاکلوں کی فسوں کاریاں۔ دل بسمل پر حکمرانیاں۔ بظاہر سادگی میں بھی پرکاریاں۔ اس شام چمن کے ہر ذرہ پر نزول رحمت پروردگار تھا۔

فریدہ خانم نے نغمہ چھیڑا، فیض صاحب کی غزل تھی:

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا

رنگ بدلے کسی صورت شب تنہائی کا

مگر اس بزم میں تو ہر جانب چاند اور سورج ہی جلوہ افروز تھے۔ اس کے باوجود فریدہ خانم اپنی آواز کا جادو جگا رہی تھیں۔ فریدہ خانم کے بعد اور کچھ لوگوں نے گانا سنایا۔

جب تمام محفل نشہ و مے سے سرشار ہو گئی تو دعوت کام و دہن کا اعلان ہوا۔ جوش صاحب کے لیے ہر چیز وہیں تخت پر مہیا کر دی گئی۔ میں بھی ان کے ساتھ وہیں شریک طعام ہو گیا۔ فرید آبادی صاحب کچھ اس قدر بدمست ہوئے کہ ان کو تن بدن کا ہوش ہی نہ رہا۔ کھانا بہت لذیذ اور وافر مقدار میں تھا۔ کئی قسم کے تو کباب ہی تھے۔ جوش صاحب کو کباب بہت پسند آئے۔ پھر طرح طرح کے میٹھے تھے۔ ناؤ نوشش سے فارغ ہوئے تو سب نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب اس وقت انفاس گل رخاں کی مشک بیز فضاؤں میں اور بادہ عنبر چکاں کی مستی میں اس عالم میں تھے کہ:

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں　　　که ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

(یوں تو گدائے میکدہ ہوں لیکن یہ دیکھو کہ مستی کے عالم میں فلک پر ناز اور ستاروں پر حکمرانی کر رہا ہوں)

جوش صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ سونا مال پیش کروں یا باریک مال۔ شوکت صاحب جو قریب ہی بیٹھے تھے، کہنے لگے جوش صاحب، آپ کا ایک بہت پرانا مال ہے جس کا عنوان ہے "آج کی رات" وہ سنایئے۔ جوش صاحب نے اپنی ایک بیاض کی طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا کہ وہ بیاض دیجیے۔ جوش صاحب نے بیاض کھولی، پھر نظم سنانی شروع کی:

آج کی رات

دیدنی ہے مری محفل کا سماں آج کی رات
موج صہبا میں ہے رقص دو جہاں آج کی رات

لُٹ گیا ہے کوئی اس طرح گل افشانی پر
ذرے ذرے پہ ہے جنت کا گماں آج کی رات

فاصلہ دیتا ہے بکھرے ہوئے پھولوں کی بہار
ہر شکن فرش کی ہے کاہکشاں آج کی رات

ایک موہوم سا نقطہ ہے جہاں ارض و سما
ایسا اک دائرہ ہے رطل گراں آج کی رات

اثر مے سے ہے پگھلا ہوا سونا گویا
عرق آلودہ رخ سیم براں آج کی رات

پرتو بادہ روشن سے ہے بے گرد و غبار
افق عربدۂ زہرہ وشاں آج کی رات

قابل ظلم نہیں فطرت خوباں اس وقت
قادر جور نہیں طبع بتاں آج کی رات

شمع ہے قائل پروانۂ آشفتہ مزاج
حسن ہے مائل صاحب نظراں آج کی رات

جوئے کہسار کے مانند گزر عالم سے
یہ ہے فرمان جہان گزراں آج کی رات

اف ری ساحل پہ غزل ہائے رواں کی ہلچل
اک تلاطم ہے سر آب رواں آج کی رات

غلغلہ ساز کا ہے دیر مغاں سے لے کر
تا بہ خلوت گہہ حوران جناں آج کی رات

جیسے بھیگی ہوئی زلفوں کی مہک عود آمیز
نفس شام ہے یوں مشک فشاں آج کی رات

خاوران در ساقی کے سروں پر کج ہے
کلہ خواجگی کون و مکاں آج کی رات

حلقہ باندھے ہوئے میخوار ہیں سرگرم طواف
جوش ہے قبلہ رندان جہاں آج کی رات

لوگ ہر شعر پر داد دے رہے تھے لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ سوائے چند کے باقی سب لوگ خصوصاً خواتین کی اکثریت صرف تکلفاً واہ وا کر رہی تھی۔ جوش صاحب اس معاملے میں بے انتہا حساس واقع ہوئے ہیں۔ مجھ سے کہنے لگے کلام ضائع ہو گیا۔ مجا نہیں آئی (مزہ نہیں آیا)۔ اس کے بعد خواتین کی طرف سے فرمائش ہوئی کہ گل بدنی سنائیے۔ چنانچہ جوش صاحب نے جب گل بدنی شروع کی تو ہر گل بدن مجسم داد بن گئی اور ہر ٹیپ کے بند پر تمام محفل نے جوش صاحب کے ساتھ کورس میں کہنا شروع کر دیا۔

"کیا گل بدنی گل بدنی گل بدنی ہے"

گل بدنی اختتام کو پہنچی تو "فتنہ خانقاہ" کی فرمائش ہوئی۔ وہاں بزم نگاراں میں ہر فتنہ، فتنہ خانقاہ سے کم نہ تھا۔ جوش صاحب تو حسینہ خانقاہ کی تصویر لفظوں میں تراش رہے تھے۔ مگر اہل محفل ان کی ہر لفظی تصویر کو اپنی نگاہوں کے سامنے پیکر محسوس میں دیکھ رہے تھے۔
جوش صاحب کہہ رہے تھے۔

آنکھوں میں آگ عشوہ آہن گداز کی
لہریں ہر ایک سانس میں سیلاب ناز کی

پلٹیں ہوا کے دوش پہ زلف دراز کی
آئینے میں دمک رخ آئینہ ساز کی

آغوش مہر و ماہ کی گویا پلی ہوئی
سانچے میں آدمی کے گلابی ڈھلی ہوئی

ساون کا ابر کاکل شکیں کے دام میں
موجیں شراب سرخ کی آنکھوں کے جام میں

رنگ طلوع صبح رخ لالہ فام میں
چلتا ہوا شباب کا جادو خرام میں

انساں تو کیا یہ بات پری کو ملی نہ تھی
ایسی تو چال کبک دری کو ملی نہ تھی

ڈوبی ہوئی تھی جنبش مژگاں شباب میں
یا دل دھڑک رہا تھا محبت کا خواب میں
چہرے پہ تھا عرق کہ نمی تھی گلاب میں
یا اوس موتیے پہ شب ماہتاب میں
آنکھوں میں کہہ رہی تھیں یہ موجیں خمار کی
یوں بھیگتی ہیں چاندنی راتیں بہار کی

اور جب جوش صاحب نے یہ بند پڑھا کہ:

ہر چہرہ تیغ اٹھا ترے ساتھ جائیں گے
اے حسن تیری راہ میں دھونی رمائیں گے
اب اس جگہ سے اپنا مصلیٰ اٹھائیں گے
قربان گاہ کفر پہ ایماں چڑھائیں گے
کھاتے رہے فریب بہت خانقاہ میں
اب سجدہ ریز ہوں گے تیری بارگاہ میں

تو وہاں موجود تمام حضرات نے جوش صاحب کے ساتھ ہم آواز ہو کر کہا ہم بھی ترے ساتھ جائیں گے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جوش صاحب اپنے اشعار کے ذریعہ وہاں موجود ہر شخص کے دل کی آواز بن گئے تھے ..... ایک نظم ختم ہوتی تو دوسری کی فرمائش شروع ہو جاتی تھی۔ غرض رات دو بجے تک محفل ماہ رخاں اور بزم گل بدناں میں جوش صاحب اپنے کلام کا جادو جگاتے رہے ..... بالآخر جب یہ محفل برخاست ہوئی تو بہت سی لڑکیوں نے جوش صاحب کو آکر گھیر لیا اور آٹوگراف لینے لگیں۔ ان سے بڑی مشکل سے فارغ ہونے تو حنیف اللہ صاحب نے جوش صاحب کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی میں بٹھا کر رخصت کیا۔ ہم لوگ تقریباً چار بجے اپنے اپنے گھر پہنچے۔

لاہور سے پنڈی واپسی:

دوسرے دن کلام خاں صاحب کا ٹیلی فون پنڈی سے آیا کہ مولانا کوثر نیازی جوش صاحب کو یاد کر رہے ہیں اس لیے وہ پنڈی آ جائیں۔ چنانچہ لاہور کی دلچسپ محفلیں ختم ہوئیں اور جوش صاحب اور میں ۱۸ مئی کو واپس پنڈی پہنچے۔ پنڈی میں جوش صاحب تو

ہوٹل فلیش مین چلے گئے اور میں ان سے رخصت ہو کر اپنے بیٹے سے ملنے رسالپور چلا گیا جو پاکستان ایر فورسس رسالپور اکیڈیمی میں زیر تربیت تھا۔ وہاں مجھے تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا۔ ۲۲ ویں مئی کو میں پنڈی واپس آیا اور کلام خاں صاحب کے گھر گیا۔ شام ہو چکی تھی۔ جوش صاحب بھی وہیں موجود تھے۔ مجھے دیکھتے ہی خوشی سے اٹھ کر گلے لگا لیا۔ کہنے لگے ارے تم اتنے دن تک ایسے غائب ہو گئے کہ میں سمجھا کہ مجھے چکر دے کر کراچی واپس چلے گئے ہو۔ تم نے ٹیلی فون پر اپنے آنے کی اطلاع بھی نہ دی۔ میں اور کلام خاں بس کے اڈے پر تم کو لینے آجاتے۔ میں نے کہا کہ وہاں موقع ہی نہیں ملا کہ آپ کو فون کر سکتا۔ پھر بیٹھ کر باتیں ہونے لگیں۔ رات کو جوش صاحب نے بھی کلام خاں ہی کے گھر قیام کیا۔

دوسرے دن میں نے جوش صاحب سے کہا کہ میں کراچی جانا چاہتا ہوں۔ نعمت اللہ خاں کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ پہلے تو جوش صاحب کسی طرح راضی نہ ہوتے تھے کہ میں جوش صاحب کو چھوڑ کر کراچی چلا جاؤں مگر جب میں نے نعمت کا ذکر کیا تو بادل ناخواستہ راضی ہو گئے۔ پھر ہم لوگ پی آئی اے کے دفتر گئے اور ۲۴ مئی کی شام کی سیٹ بک کروا کر اسلام آباد گئے۔ جہاں دو تین مکان دیکھے پھر گھر آگئے۔

دوسرے دن صبح وزارت اطلاعات کے دفتر گئے۔ علوی صاحب سے مل کر اظہار احمد خاں سیکشن آفیسر منسٹری آف ورکس کے دفتر میں ان سے ملے اور جو مکان دیکھے تھے ان کی تفصیل سے ان کو آگاہ کیا۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ بہت جلد جوش صاحب کے لیے مکان کا بندوبست کر دیا جائے گا۔

۲۴ مئی آج پنڈی کا موسم بہت خوشگوار ہے۔ صبح ہی سے گھرے بادل چھائے ہوئے ہیں اور وقفے وقفے سے بارش ہو رہی ہے۔ شام کی فلائٹ سے میری سیٹ بک تھی۔ شام پانچ بجے سے موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ جوش صاحب نے خوش ہو کر کہا تم میرا دل توڑ کر کراچی جا رہے ہو آج تمھارا جہاز کراچی جائے گا ہی نہیں۔ میں نے کہا خود میرا دل جانے کو نہیں چاہ رہا ہے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔ اب یہاں بہت دن ہو گئے۔ وہاں بھائی بیمار ہے۔ غرض اسی بارش میں کلام خاں اور جوش صاحب مجھے ایرپورٹ پہنچانے آئے۔ بارش کے باعث جہاز تاخیر سے روانہ ہوا اور میں تقریباً ۹ بجے رات کو اپنے گھر کراچی پہنچ گیا۔

کراچی آنے کے بعد میں اپنے کام میں مشغول ہو گیا مگر جوشں صاحب سے دوسرے تیسرے دن ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ وہ ہوٹل فلیش مین سے کلام خاں صاحب کے گھر منتقل ہو گئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے ارے یہاں ہمارے کام میں تو لوہے لگ گئے ہیں نہ تو مکان کا انتظام ہو رہا ہے اور نہ کسی دفتر کا۔ دن بھر بے کار پڑے رہتے ہیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ نے کوئی حلقۂ احباب بھی بنایا ہے یا نہیں۔ کہنے لگے شام کو کچھ احباب جمع ہو جاتے ہیں مگر کراچی والوں کی بات کہاں۔ آنکھیں چاروں طرف ڈھونڈتی ہیں وہ میرا راغب نظر نہیں آتا نہ ذہین شاہ نہ عالیہ امام۔ ارے کہاں ہے میرا پرنس جہانگیر قدر۔ یہاں سلامت علی خاں ہے نہ خورشید علی خاں نہ منور عباس ارے کس کس کے نام گنواؤں۔ شام ہوتے ہی جی چاہتا ہے کہ تم سب میرے اطراف جمع ہو جاؤ۔ میں نے کہا کیا لاہور میں بھی کراچی کے احباب یاد آتے ہیں۔ کہنے لگے ارے کس مقام کا نام لے لیا خورشید علی خاں تم نے۔

لاہور کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں　　　اک تیر میرے سینے پہ مارا کہ ہائے ہائے

میں نے پوچھا اب آپ کوئٹے جاناں کب تشریف لے جا رہے ہیں۔ کہنے لگے یہاں کے حالات قابو میں آ جائیں تو پھر لاہور چلا جاؤں گا۔ اس کے کچھ دن بعد معلوم ہوا کہ جوش صاحب لاہور میں ہیں۔

پھر دوسری جون کو ان کا ٹیلی فون آیا کہ تیسری کو وہ تیز گام سے کراچی تشریف لا رہے ہیں۔ میں، راغب صاحب اور فراست رضوی کینٹ اسٹیشن وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ گاڑی کچھ تاخیر سے پہنچی۔ مگر جوشں صاحب ہم لوگوں کو اسٹیشن پر دیکھ کر بہت خوشں ہوئے۔ ہر ایک کو گلے لگایا پھر ہم سب ان کے گھر فیڈرل بی ایریا گئے جہاں جوش صاحب نے قیام کیا۔ ہم لوگ چلنے لگے تو جوشں صاحب نے کہا شام کو وقت پر آ جانا اور سلامت علی خاں کو بھی لے آنا۔

مجھ سے پوچھنے لگے تمہارے بھائی کی طبیعت اب کیسی رہتی ہے۔ میں نے کہا اب بہتر ہے۔ فرمایا اگر وہ آ سکیں تو شام کو ان کو بھی لے آؤ۔

چنانچہ شام پانچ بجے میں اور نعمت، جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ سلامت علی خاں کو بھی جوش صاحب کے آنے کی اطلاع کر دی گئی تھی۔ چنانچہ وہ بھی آ گئے۔ راغب صاحب اور

فراست رضوی بھی آ گئے۔ جب تمام احباب جمع ہو گئے تو جوش صاحب نے اسلام آباد کے قصے سنانے شروع کر دیے۔ تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا اور جوش صاحب اور سلامت علی خاں پیمانہ بکف طلوع ہو گئے۔ پھر فرمائش پر پہلے جوش صاحب نے کچھ رباعیات سنائیں اس کے بعد کچھ تازہ کلام سنایا۔ چوتھے پیگ کے بعد جوش صاحب کو کھانا کھلا کر ایک کپ دودھ میں اسپ غول کی بھوسی ملا کر پلا دی اور جب وہ لیٹ گئے تو ہم سب احباب دوسری شام وعدہ کر کے اپنے اپنے گھر لوٹ آئے۔

حکیم نصیر الدین صاحب:

ساتویں جون بدھ کے دن صبح نو بجے میں جوش صاحب کے گھر پہنچا تو وہ تیار بیٹھے تھے کہنے لگے چلو حکیم نصیر الدین صاحب سے ملنے ان کے مطب نظامی دوا خانے چلتے ہیں چنانچہ جب ہم وہاں پہنچے تو حکیم صاحب نے بہت محبت سے ہمارا استقبال کیا۔ ان کے صاحبزادے ناصر میاں بھی حکیم ہیں وہ بھی آ کر جوش صاحب کے ساتھ بیٹھ گئے۔ بہت دیر تک اسلام آباد اور لاہور کے متعلق گفتگو ہوتی رہی۔ حکیم صاحب واقعی اگلی شرافت کے نمونے ہیں جوش صاحب کو بہت قیمتی معجون کے تحفے بھی دیے۔ جوش صاحب نے کہا کہ ان کے گھٹنوں میں درد رہتا ہے جس سے چلنے میں تکلیف ہوتی ہے۔ حکیم صاحب نے مالش کے لیے تیل دیا۔ معجون اور تیل لے کر ہم لوگ حکیم صاحب کے مطب سے رخصت ہوئے تو جوش صاحب نے کہا چلو میر رسول بخش صاحب سے ملتے ہیں وہ آج کل گورنر ہاؤس میں منتقل ہو گئے ہیں۔

میر رسول بخش تالپور گورنر سندھ:

میں جوش صاحب کو گورنر ہاؤس لے گیا وہاں ہم دونوں کو گیٹ پر روک لیا گیا اور انتظار گاہ میں بٹھا دیا گیا۔ جب ٹیلی فون پر گورنر صاحب کے پی اے مسٹر اللہ یار نے اجازت دی جب ہم لوگ گورنر ہاؤس میں داخل ہو سکے۔ گورنر ہاؤس کے وسیع و عریض وارانڈے میں بہت سی کرسیاں پڑی ہوئی تھیں جن پر بہت سے حاجت مند ہاتھوں میں

عرضیاں لیے ہوئے بیٹھے تھے۔ یہ لوگ باری باری سے گورنر صاحب کے قریب کرسی پر بیٹھتے اور اپنی عرضی پیش کرتے اور زبانی اپنی شکایت بیان کرتے۔ میر صاحب ہر شخص کا حال نہایت ہمدردی اور سکون سے سنتے اور پھر ان کی درخواست پر احکامات جاری کر کے اپنے مددگاروں کو اس کے متعلق ہدایات دیتے جا رہے تھے۔ ہم دونوں کو ان کے پی اے نے خاص مہمانوں کے کمرے میں بٹھا دیا تھا۔ جب وہاں بیٹھے بیٹھے دیر ہو گئی تو جوش صاحب حسب عادت بے چین ہونے لگے۔ آخر کار ایک پرچے پر حسب ذیل عبارت انگریزی میں لکھ کر مجھے دے دیا کہ جا کر میر صاحب کو دے آؤں۔ جوش صاحب نے لکھا تھا۔

My dear younger brother of yesterday and my Lord of today, how long should I wait ?

Josh Malihabadi

یہ پرچہ لے کر میں میر صاحب کے قریب کھڑا ہو گیا تو میر صاحب کے ملٹری سیکرٹری نے مجھ سے وہ پرچہ لے کر پڑھا اور جوش صاحب سے جا کر کہا کہ گورنر صاحب تھوڑی دیر میں آپ سے ملنے تشریف لائیں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ جوش صاحب کا پرچہ گورنر صاحب کو دے دیجیے۔ اس کو آپ نے کیوں رکھ لیا؟ تب انھوں نے وہ چٹھی میر صاحب کو دی۔ میر صاحب پرچہ دیکھتے ہی اپنے پی اے کو کچھ ہدایات دے کر وہاں سے اٹھ گئے اور جوش صاحب کے پاس آ کر ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے، سرکار معاف فرمائیے میں ذرا مشغول تھا۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو حکم کیجیے۔ جوش صاحب نے کہا اسلام آباد سے آنے کے بعد آپ سے ملنے کے لیے حاضر ہو گیا مگر مجھے اندر آنے میں بڑی زحمت اٹھانا پڑی۔ میر صاحب نے جوش صاحب کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا اور اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہہ کر ایک پاس بنوا دیا تاکہ وہ جب چاہیں بلا روک ٹوک گورنر ہاؤس تشریف لا سکیں۔ میر صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ برنس روڈ آئے۔ وہاں ایک ایک گلاس لسی کا پیا اور گھر آ گئے۔ اس کے بعد نویں جون جمعہ کے دن میں اور جوش صاحب صبح دس بجے آغا حسن عابدی صاحب کے گھر کلفٹن پہنچے۔ معلوم ہوا کہ آغا صاحب ابھی تک سو رہے ہیں۔ ہم لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں آغا صاحب تشریف لائے۔ جوش صاحب سے انتظار کی زحمت

برداشت کرنے کی معافی چاہی۔ جوش صاحب نے پوچھا کہ بھٹو صاحب نے ان کو جس مقصد کے لیے اسلام آباد بلوایا تھا اس کا کیا ہوا؟ آغا صاحب نے کہا کہ ان کے مشورے سے بینکوں کو قومیانے کا مسئلہ کم از کم ایک سال کے لیے ٹل گیا۔ آغا صاحب کو چونکہ کسی ضروری میٹنگ میں شریک ہونا تھا اس لیے وہ جوش صاحب سے اجازت لے کر رخصت ہو گئے۔ ہم وہاں سے اٹھ کر جمیل نشتر صاحب سے ملنے ان کے دفتر نیشنل بینک گئے مگر وہ میٹنگ میں مصروف تھے تو ملاقات نہ ہو سکی مگر جوش صاحب نے ان کو اپنی آمد سے ایک پرچی کے ذریعہ سے مطلع کر دیا اور وہاں سے نکل کر بولٹن مارکیٹ پر عبدالخالق صاحب سگریٹ والے کی دوکان پر پہنچے۔ وہاں عبدالخالق صاحب سے ملاقات ہوئی۔ عبدالخالق صاحب بڑے علم دوست اور عالم نواز انسانوں میں سے تھے۔ جوش صاحب کو بہت چاہتے تھے۔ مجھ سے ان کی واقفیت بہت پہلے کی تھی۔ وہ میرے بہنوئی محمود علی خاں صاحب کے جو پولیس کے محکمہ میں سپرنٹنڈنٹ تھے، دوست تھے۔ محمود بھائی کے گھر میں عبدالخالق صاحب سے میں کئی مرتبہ مل چکا تھا۔ سخن فہم بھی ہیں اور غالب کے طرف دار بھی۔ اکثر ان سے غالب کے اشعار پر گفتگو کرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ اہل علم کے بڑے قدردان تھے۔ اکثر ان کے گھر پر پُرتکلف دعوتوں میں پاکستان کے بڑے بڑے ادیب شاعر اور مفکر حضرات اور خواتین سے ملاقات ہوئی۔ اس وقت جوش صاحب نے چند رباعیات سنائیں اور پھر ہم لوگ تقریباً دو بجے گھر آ گئے۔

اس کے دوسرے دن میں اور جوش صاحب آغا حسن عابدی صاحب سے ملنے کے لیے یونائیٹڈ بینک کے صدر دفتر گئے۔ جب اوپر جانے کے لیے لفٹ پر پہنچے تو لفٹ اوپر گئی ہوئی تھی۔ ہم دونوں نیچے انتظار کرنے لگے تھوڑی دیر میں جب لفٹ نیچے آئی تو اس میں سے بہت لوگ نکل کر باہر آئے۔ جوش صاحب نے یہ دیکھ کر کہا ''اف کس قدر مادۂ فاسدہ جمع ہو گیا تھا اس لفٹ میں''۔ خیر ہم لوگ اوپر عابدی صاحب کے دفتر میں گئے۔ جیسے ہی عابدی صاحب کو جوش صاحب کے آنے کی اطلاع ملی باہر آ کر ان کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ اندر لے گئے۔ وہاں چائے سے خاطر تواضع کی۔ اتنے میں کسی صاحب کا ٹیلی فون آ گیا وہ صاحب آغا صاحب کے بینک ہی کے کوئی افسر تھے۔ آغا صاحب نے ان کو ہدایت دی کہ

حکومت کے قرضوں میں بینک کی زیادہ رقم نہ لگائی جائے بلکہ جس قدر ممکن ہو کم سے کم رقم انوسٹ کی جائے۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ہدایات اس لیے دی جا رہی ہیں کہ ایک سال کے بعد بینک حکومتی تحویل میں جانے والے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ہم لوگ رخصت ہونے لگے۔ میں پہلے باہر آ گیا مگر جوش صاحب وہیں رک گئے اور پندرہ بیس منٹ کے بعد واپس آئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ آغا صاحب جوش صاحب کی مالی امداد بھی فرماتے تھے۔

آغا صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ روشن علی بھیم جی صاحب کے مکان گئے۔ بھیم جی صاحب تو گھر پر موجود نہ تھے مگر ان کی بیگم صاحبہ نے ہمارا استقبال کیا۔ چائے اور بسکٹ سے تواضع کی۔ تھوڑی دیر بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ شام کو جوش صاحب کے گھر جب تمام احباب جمع ہوئے تو جوش صاحب نے بتایا کہ اسلام آباد میں ان کے مکان کا کوئی بندوبست نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے جوش صاحب سے وعدہ کیا کہ اس سلسلے میں کوشش کروں گا۔

عزیز الرحمٰن خاں صاحب کا جوش صاحب کے لیے مکان کا بندوبست:

میرے ایک عزیز کسٹم میں چیف لاء آفیسر تھے۔ ان کے ایک صاحبزادے اشفاق الرحمٰن خان صاحب ایبٹ آباد میں کاروبار کرتے تھے ان کا ایک مکان اسلام آباد میں تھا جو خالی پڑا ہوا تھا۔ میں نے عزیز الرحمٰن خان صاحب سے جب جوش صاحب کے لیے مکان کی ضرورت کا ذکر کیا تو وہ اس بات کے لیے تیار ہو گئے کہ اپنے بیٹے سے بات کر کے وہ مکان جوش صاحب کو دلوا دیں گے۔ اور یہ بات طے ہو گئی کہ اب کے جب جوش صاحب اسلام آباد جائیں گے تو میں اور عزیز بھائی بھی وہاں پہنچ جائیں گے اور اگر وہ مکان جوش صاحب کو پسند آ جائے تو متعلقہ وزارت سے کہہ کر جوش صاحب کو دلوا دیا جائے۔ میں نے جب اس بات کا ذکر جوش صاحب سے کیا تو وہ بہت خوش ہو گئے۔ کہنے لگے کہ میں پندرھویں کو لاہور جا رہا ہوں وہاں تین چار دن قیام کروں گا اور انیسویں جون کو راولپنڈی پہنچوں گا۔ آپ دونوں مجھے فلیش مین ہوٹل میں مل جائیے۔ اس طرح مسئلہ حل ہو گیا۔ تیرھویں جون کو میرے ایک عزیز دوست جو عزیز الرحمٰن خان صاحب کے خالہ زاد بھائی بھی تھے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ

مجھے جوش صاحب سے ملنے کا بہت اشتیاق ہے۔ اب کے جب تم جوش صاحب کے گھر جاؤ تو مجھے بھی لے چلو ان کا نام سید حیات شاہ تھا اور وہ بھی میرے ساتھ کسٹم افسر تھے۔ شاہ صاحب بڑے عالم فاضل اور ہفت زبان انسان تھے۔ عربی فارسی بے تکلف لکھتے پڑھتے اور بولتے تھے۔ مادری زبانوں میں پشتو، ہندکو اور پنجابی زبانیں شامل تھیں۔ اردو میں تو وہ عالم اور فاضل تھے ہی۔ بعد میں انگریزی بھی سیکھ لی تو اس پر بھی عبور حاصل کر لیا۔ جب انھوں نے جوش صاحب سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں ان کو لے کر اسی شام جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ سورج کے غروب ہونے میں تھوڑی دیر تھی۔ جوش صاحب لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے قریب راغب صاحب مراد آبادی تشریف فرما تھے۔ کاغذ قلم ہاتھ میں تھا۔ جوش صاحب سے کچھ سوالات کر رہے تھے اور جوش صاحب جو جواب دیتے وہ اسی طرح لکھ لیتے۔ میں نے شاہ صاحب کا تعارف کروایا "جوش صاحب یہ میرے بہت بے تکلف دوست ہیں سید حیات شاہ۔ عربی، فارسی، انگریزی، پشتو، پنجابی، ہندکو اور اردو زبانوں پر عبور رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ مذہب اور عربی، فارسی اور اردو ادب کا وسیع مطالعہ ہے۔ آپ سے ملنے کے خواہش مند تھے اس لیے آپ کو پہلے سے اطلاع کیے بغیر ہی میں انھیں لے آیا۔ امید ہے آپ خیال نہ فرمائیں گے"۔ جوش صاحب کہنے لگے ارے بھئی تم اتنے قابل آدمی کو میرے گھر لائے ہو یہ تو میرے لیے بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ مگر یہ بتاؤ Is he a gentleman? میں نے عرض کی کہ اس معاملے میں یہ سخت مذہبی اخلاق کے حامل ہیں۔ اس پر راغب صاحب نے فوراً ایک کاغذ پر یہ رباعی لکھ کر مجھے دے دی۔

مردِ خوش حال شاہ کو لاتے ہیں   صہبا کش لاالہٰ کو لاتے ہیں
خورشید علی خان بہ میخانۂ جوش   ہمراہ حیات شاہ کو لاتے ہیں

قلم برداشتہ ۱۳۔۶۔۶۲

جوش صاحب نے تیسرے مصرع میں یہ تبدیلی فرما دی۔ "خورشید علی خاں بہ گداخانۂ جوش"۔ جوش صاحب نے "شاہ" کی نسبت سے "گدا" کا لفظ استعمال کیا۔ حالانکہ راغب صاحب نے حقیقت حال بیان کی تھی کیونکہ اس وقت واقعی مے خانہ سجا ہوا تھا اسی لیے انھوں نے دوسرے مصرع میں "صہبا" کا لفظ استعمال کیا تھا اور یہ بھی ظاہر ہے کہ

راغب صاحب، جوش صاحب کے در دولت کے لیے گدا خانے کا لفظ استعمال نہیں کر سکتے تھے اس لیے راغب صاحب نے کہا جوش صاحب یہ لفظ یعنی "گدا خانہ" صرف آپ ہی استعمال کر سکتے تھے۔ خاکسار یہ جرات کیسے کر سکتا ہے؟

اس کے بعد راغب صاحب جو سوالات لکھ کر لائے تھے اور اس کے جواب میں جوش صاحب نے جو کچھ کہا تھا وہ لکھوا لیا تھا۔ ان میں کچھ سوالات اور ان کے جوابات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ جیسا کہ میرے علم میں ہے موجودہ حکومت کے سربراہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کے حسب ایما حکومت پاکستان نے آپ سے تحریری درخواست کی ہے کہ آپ وزارت اطلاعات میں "نگران مطبوعات پاکستان" کا عہدہ قبول فرمالیں۔ کیا یہ صحیح ہے۔

جوش صاحب۔ "جی ہاں"۔

۲۔ حکومت آپ کی خدمات جلیلہ کے سلسلے میں کیا مشاہرہ پیش کرے گی؟

جوش صاحب۔ "سردست دو ہزار"

۳۔ کیا اسلام آباد کی دلربا فضا کراچی کے مقابلے میں دماغی کام کرنے والوں کے لیے زیادہ سازگار ہے؟

زیادہ سازگار ہے (اس کے بعد جوش صاحب نے اپنے قلم سے یہ جملہ بڑھایا) "اور پھر قرب حبیب بھی ہے"۔

ان کے علاوہ اور بھی کچھ سوالات تھے مگر میں نے وہ نوٹ نہیں کیے۔ شاہ صاحب کے اصرار پر جوش صاحب نے کچھ اشعار سنائے۔

تاجلوۂ مسبب اسباب دیکھ لیں
اسباب کی نقاب اٹھاتے رہیں گے ہم

بھر بھر کے جھولیوں میں گہر ہائے بحر علم
ذہنوں کی کارگاہ میں لاتے رہیں گے ہم

جتنی ملے گی خوان جہاں سے غذائے علم
اتنی ہی اور بھوک بڑھاتے رہیں گے ہم

جتنی عطا کرے گا تفکر بلندیاں
کچھ اور بھی سروں کو جھکاتے رہیں گے ہم

اس درجہ آسماں سے نہ شرما کہ اے زمیں
تجھ کو دلہن کی طرح سجاتے رہیں گے ہم

اس کے بعد یہ رباعی سنائی:

جب ذہن میں افکار ابل جاتے ہیں تو قالب اطلاق میں ڈھل جاتے ہیں
دیکھا ہے کہ بارہا خیالات کے پاؤں آفاق کی چادر سے نکل جاتے ہیں

اس کے علاوہ جوش صاحب نے کچھ اور رباعیات سنائیں ۔۔۔ جب چوتھا جرعہ ختم ہوا اور جوش صاحب نے کھانا منگوایا تو میں اور شاہ صاحب نے جوش صاحب سے رخصت ہونے کی اجازت طلب کی۔ جوش صاحب نے بہت کہا کہ اب کھانا کھا کر جاؤ مگر ہم دونوں معافی مانگ کر رخصت ہو گئے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ کل صبح نو بجے تک آجایئے میں پرسوں یعنی پندرھویں کو لاہور جانا چاہتا ہوں۔ کل آجاؤ گے تو ریلوے اسٹیشن چل کر کوپے بک کروا لیں گے۔ میں نے دوسرے دن وقت پر پہنچنے کا وعدہ کر لیا اور وہاں سے رخصت ہو کر شاہ صاحب اور میں اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ ہائے ہائے کس طرح لکھوں کہ میرے عزیز ترین ساتھی شاہ صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے۔

دوسرے دن میں جب جوش صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں محسن صاحب اعظم گڑھی بھی موجود تھے وہ بھی ہمارے ساتھ ہو لیے ۔۔۔ جب ہم کریم آباد کے پل کے قریب پہنچے تو ایک ٹرک غلط رخ سے میری گاڑی کے اتنا قریب آگیا کہ اگر میں گاڑی روک نہ لیتا تو وہ میری گاڑی سے ٹکرا جاتا۔ ٹرک ڈرائیور نے بھی گاڑی آہستہ کر کے اس کا رخ دوسری طرف موڑ لیا۔ جوش صاحب نے جب ٹرک کا رخ دوسری طرف دیکھا تو ارشاد فرمایا:

یہ دیکھو ادھر یہ جادہ مرے آشیاں کا ہے اے برق دلنواز ارادہ کہاں کا ہے؟

میں نے کہا سبحان اللہ جوش صاحب کیا تیور ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آفریدی پٹھان موت کو للکار رہا ہے۔ "یہ دیکھو ادھر یہ جادہ مرے آشیاں کا ہے"۔ واہ واہ خطرات کو دعوت دینا اور اس شان کے ساتھ دعوت دینا صرف آپ ہی کی شان ہے اور پھر برق کو دلنواز کہا ہے جیسے موت دلنواز کھلونا ہو۔ اس وقت جوش صاحب کا شعر اس قدر برموقع تھا کہ میں دل کھول کر اس کی تعریف کر رہا تھا۔ محسن صاحب نے بھی ایک شعر سنایا جو مجھے اس وقت یاد نہیں ہے۔ مگر میں نے کہا جی نہیں اس شعر میں بات اتنی اثر انگیز نہیں ہے اور پھر انداز بیان بھی عامیانہ ہے۔ محسن صاحب مجھ سے اس جواب کی توقع نہ رکھتے تھے کہنے لگے خورشید صاحب

یہ میرا شعر ہے۔ میں نے کہا۔ تو کیا ہوا صرف اس وجہ سے کہ یہ آپ کا شعر ہے، میں اس کی تعریف کرنے سے تو رہا۔ بیچارے محسن صاحب کھسیانے ہو کر خاموش ہو گئے مگر جوش صاحب نے یہ بات محسوس کر لی اور کہا نہیں ایسی بات نہیں ہے محسن صاحب کے شعر میں بھی خوبیاں ہیں آپ نے غور نہیں کیا۔ میں نے کہا ابھی تو میں آپ کے شعر سے لطف اندوز ہو رہا ہوں گھر جا کر محسن صاحب کے شعر پر غور کروں گا۔ بیچارے محسن صاحب اتنے بے مزہ ہوئے کہ مجھ سے کہنے لگے آپ مجھے قائداعظم کے مزار کے پاس اتار دیجیے مگر میں نے کہا نہیں میں آپ کو آپ کے مکان تک پہنچاؤں گا۔ چنانچہ میں نے ان کو ان کے گھر پہنچایا۔ پھر ہم لوگ کینٹ اسٹیشن گئے وہاں جوش صاحب کے لیے کوپا ریزرو کروا کر ڈاکٹر عالیہ امام صاحبہ کے گھر چلے گئے جو کینٹ اسٹیشن کے عقب میں تھا۔ وہاں ڈاکٹر صاحبہ اور ان کے شوہر کاظم امام صاحب نے جوش صاحب کا استقبال کیا۔ ان کے گھر ہم لوگ شام تک رہے۔

دوسرے دن میں صبح ساڑھے سات بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ان کے ساتھ بابا ذہین شاہ تاجی کے گھر گیا۔ بابا صاحب نے جوش صاحب کی ناشتے کی دعوت کی تھی۔ جس کا انھوں نے بہت پرتکلف اہتمام کیا تھا۔ اصلی گھی کے نہایت خستہ پراٹھے تھے۔ خستہ ایسے کہ منہ میں ڈالتے ہی گھل جائیں۔ ان کو چبانے یا دانت لگانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی۔ انڈے کئی قسم سے پکے ہوئے نیم برشت بھی اور خاگینے کی شکل میں بھی۔ کلیجی، گردے کا سالن، قیمہ، دہی بڑے ہر چیز بے حد لذیذ۔ ہم لوگوں نے خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ اس کے بعد کڑھے ہوئے دودھ کی ربڑی پیش کی گئی وہ اس قدر مزیدار تھی کہ باوجود پیٹ میں گنجائش نہ ہونے کے خوب کھائی۔ آخر میں کشمیری چائے پینے سے تمام کھانا ہضم ہو گیا۔ چائے کے بعد پان اور پان کے ساتھ بابا صاحب کا انتہائی خوشبودار زعفرانی قوام۔ ان تمام تکلفات کے بعد علمی یا یوں کہیے کہ روحانی گفتگو کا آغاز ہوا۔

بابا صاحب تعدد شخصیت:

بابا صاحب نے فرمایا کہ تعدد شخصیت ممکن ہے، یعنی یہ ممکن ہے کہ ایک شخص بہ یک

وقت کئی مختلف مقامات پر دیکھا جا سکے۔ مگر اس کے لیے ایک مشق کرنی پڑتی ہے۔ پہلے اپنے دونوں سانس برابر کرنے پڑتے ہیں۔ پھر ایک تاریک مقام پر لیٹ کر سانس پر کنٹرول کر کے اندر کے سانس میں اسم ذات یعنی "اللہ" اور باہر کے سانس میں "ہو" کہا جائے۔ یہ عمل چالیس (۴۰) دن تک کیا جائے۔ دوران وظیفہ صرف پھلوں اور کچی ترکاریوں کا استعمال کیا جائے اور اس مدت میں جھوٹ، ہر قسم کی برائی، مباشرت یا کسی قسم کی ہیجانی کیفیت پیدا کرنے والی باتوں سے اجتناب کیا جانا چاہیے۔ اس وظیفے کے دوران میں ابتدائی دس بارہ دن تک تو شدید کمزوری محسوس ہوگی مگر اس کے بعد بدن ہلکا ہونا شروع ہو جائے گا۔ اور وظیفے کے اختتام پر آپ اتنے ہلکے پھلکے ہو جائیں گے کہ ایک ہی وقت میں آپ کئی کئی مقامات پر دکھائی دے سکیں گے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ اس عمل کے بعد وہ ایک رات میں دو دو سو میل پیدل چلے ہیں۔ میں اور جوش صاحب حیرت سے بابا صاحب کی باتیں سنتے رہے۔ میں نے کہا بابا صاحب آج ٹی وی کے ذریعے سے تو تعدد شخصیت سمجھ میں آتی ہے مگر کسی روحانی وظیفے کے ذریعہ سے بھی یہ بات ممکن ہو سکتی ہے بظاہر عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن بات یہ ہے کہ جب تک تجربہ کر کے کسی بات کو تسلیم یا رد نہ کیا جائے یہ بھی درست معلوم نہیں ہوتا کہ اس کے متعلق کوئی رائے قائم کی جائے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ یہ میں نے آپ کو اپنا تجربہ بتلایا ہے۔ آپ مانیں یا نہ مانیں آپ کی مرضی۔ جوش صاحب اس تمام گفتگو کے دوران خاموش رہے۔ پھر انھوں نے بابا صاحب سے کہا کہ وہ آج تیز گام سے لاہور جا رہے ہیں۔ وہاں سے پنڈی چلے جائیں گے اس لیے اب اجازت چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں بابا صاحب سے رخصت ہو کر جوش صاحب کے گھر آ گئے۔ شام کو جوش صاحب کے گھر راغب صاحب بھی آ گئے۔ چنانچہ میری گاڑی میں کینٹ اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ راستے میں، میں نے جوش صاحب کو بتایا کہ میں اور عزیز الرحمٰن خان صاحب اسی مہینے یعنی جون کی انیسویں تاریخ کو پنڈی بذریعہ ہوائی جہاز پہنچ رہے ہیں۔ وہیں جوش صاحب کو ان کا اسلام آباد والا گھر بھی دکھا دیں گے اگر انھیں پسند آ گیا تو متعلقہ محکمے سے ضروری کارروائی بھی مکمل کر لی جائے گی۔ جوش صاحب نے کہا کہ وہ بھی اسی دن لاہور سے پنڈی پہنچ جائیں گے۔ اسٹیشن پر جوش صاحب کو ان کے ڈبے میں بٹھا کر ہم لوگ لوٹ آئے۔

دوسرے دن میں نے اور عزیز بھائی نے پنڈی کے لیے پی آئی اے سے اسیوی ہمیع کے لیے اپنی سیٹیں بک کروالیں۔

جوش صاحب کئی سال تک اسلام آباد میں عزیز الرحمن خان صاحب کے کرایہ دار رہے اور خان صاحب نے ہر طرح ان کے آرام کا خیال رکھا۔ اس لیے ضروری ہے کہ قارئین سے عزیز الرحمن خان صاحب اور ان کے صاحبزادے اشفاق الرحمن خان صاحب کا ایک سرسری تعارف کروا دوں۔

عزیز الرحمن خاں:

عزیز الرحمن خان صاحب کا تعلق صوبہ سرحد کے ضلع ہزارہ سے ہے۔ یوں تو سرحد کا تمام صوبہ خوبصورت پہاڑوں اور سبز پوش وادیوں پر مشتمل ہے لیکن اس کی حسین ترین وادی و بجا طور پر جنت ارضی کہلانے کی مستحق ہے وہ وادی کاغان ہے۔ اس کی خوبصورت جھیل سیف الملوک کے متعلق مشہور ہے کہ وہاں پریاں رہتی ہیں۔ اسی علاقے سے متعلق گل بکاؤلی اور شہزادہ سیف الملوک کی رومانی داستان مشہور ہے۔ اس جھیل کے قریب انتہائی شریف النفس، مہمان نواز اور مردانہ وجاہت سے مزین پٹھانوں کی ایک بستی جرید ہے۔ ہمارے عزیز الرحمن خان صاحب جو ایام جوانی میں شہزادہ سیف الملوک سے کم وجیہہ نہ تھے اسی بستی سے تعلق رکھتے ہیں۔ خان صاحب کے بڑے بھائی مطیع الرحمن خان صاحب جو علوم دین پر عبور رکھنے کے سبب سے مولوی صاحب کہلاتے تھے، حیدرآباد دکن میں آکر آباد ہوگئے تھے۔ وہیں شادی کی اور محکمہ تعلیمات سے وابستہ ہوگئے۔ عزیز الرحمن خاں صاحب نوجوانی میں اپنے بھائی کے پاس حیدرآباد دکن چلے گئے۔ وہاں انھوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا اور آبکاری کے محکمے میں ملازم ہوگئے۔ میرے والد، چچا، ماموں اور دیگر بہت سے عزیز بھی اسی محکمے سے وابستہ تھے۔ اور یوں ہماری ملاقات عزیز بھائی سے ہوگئی۔ پہلی ہی ملاقات میں ان کے ظاہری اور باطنی حسن نے مجھے اس قدر مسحور کیا کہ پھر عمر بھر مم دست نوازش بن گیا ہے طوق گردن کا۔ عزیز الرحمن خان صاحب گو ہمارے بزرگوں کے ساتھیوں میں سے تھے مگر ان کا برتاؤ ہم بھائیوں کے ساتھ اس قدر محبت اور شفقت کا رہا ہے

کہ ہم سب انھیں عزیز بھائی کہتے ہیں۔ نہایت سرخ و سفید رنگ، سروقد و جاہت و مردانگی کا مجسمہ۔ مضبوط جسم میں فولادی اعصاب اور اس میں دردمند دل جیسے سنگلاخ پہاڑوں میں ٹھنڈے میٹھے پانی کا چشمہ۔

میں اور میرا چھوٹا بھائی نعمت اللہ خاں، بچپن سے ان کو اپنا ہیرو سمجھتے تھے۔ عزیز بھائی کی شخصیت اس قدر سحرانگیز تھی کہ مشکل ترین وقت میں بھی ان کو اپنے قریب پا کر ہمارا حوصلہ بلند ہو جاتا تھا اور ہم خود کو ناقابل شکست سمجھنے لگتے تھے۔ عزیز بھائی کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ مسرت، طمانیت اور رجائیت سے معمور ہوتا تھا۔ بقول سرور بارہ بنکوی:

جن سے مل کر زندگی سے پیار ہو جائے وہ لوگ

آپ نے شاید نہ دیکھے ہوں مگر ایسے بھی ہیں

عزیز بھائی اپنی نوکری کے سلسلے میں شہر حیدرآباد سے باہر اضلاع پر رہتے تھے مگر جب وہ شہر میں آ کر رائل ہوٹل میں قیام کرتے تو ہم دونوں بھائی ان کے پاس پہنچ جاتے اور ہماری کوشش یہ ہوتی کہ وہ جتنے دن حیدرآباد میں رہیں ہم بھی ان کے ساتھ ہی رہیں۔ عزیز بھائی کی مہمان نوازی ان کے دوستوں اور واقف کاروں کے حلقے میں ضرب المثل تھی۔ کوئی ضرورت مند ان کے پاس سے مایوس نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اپنے محکمے میں ایک مثالی افسر مشہور تھے اور ان کے ساتھی عہدہ دار ان کو اپنا ہیرو سمجھتے تھے۔ انھوں نے حیدرآباد کے ایک معزز گھرانے کے رکن جناب سردار خان صاحب کی صاحبزادی سے شادی کی۔ حیدرآباد میں عام طور پر شادیاں بڑی دھوم دھام سے ہوتی تھیں مگر عزیز بھائی کی شادی تو ایک یادگار شادی تھی۔ کئی ہفتے تک پرتکلف دعوتیں اور رقص و موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں۔ ایک میلے کا سا سماں رہتا تھا۔

پاکستان بننے کے بعد وہ حیدرآباد کی ملازمت ترک کر کے مع اہل و عیال کراچی منتقل ہو گئے اور اب تک کراچی ہی میں ہیں۔

کراچی میں وہ بحری کسٹم کے محکمہ سے وابستہ ہو گئے اور اپنی بہادری، معاملہ فہمی اور قانونی مہارت کی وجہ سے بہت جلد چیف لا آفیسر کے عہدے پر متعین کر دیے گئے۔ نوکری کے دوران ہی انھوں نے ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا اور جس جانفشانی، جرات اور قابلیت

کے ساتھ انھوں نے اس نوزائیدہ مملکت پاکستان کی بالیاتی سرحدوں کے تحفظ میں اپنی بہترین صلاحیتیں صرف کیں۔ اسی کی وجہ سے وہ محکمے کے سربرآوردہ افسروں میں شمار کیے جاتے تھے۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے ان کو یہاں بھی بہت نوازا مگر ایک نوجوان اور بہادر بیٹے کی بے وقت شہادت نے ان کی بیگم کو اس قدر متاثر کیا کہ وہ بالآخر اس صدمے سے جانبر نہ ہو سکیں اور عزیز بھائی جو صبر، تحمل اور قوت برداشت کا کوہ گراں تھے بظاہر تو مسکراتے رہے مگر اندر ہی اندر دل کے مریض ہو گئے۔

اشفاق الرحمٰن خان:

ان کے چار بیٹوں میں تیسرے نمبر پر اشفاق الرحمٰن خاں تھے جن کو ہم لوگ محبت سے چھوٹو بھائی کہتے تھے۔ خلوص، محبت، بڑوں کی عزت، ماں باپ کی خدمت اور انکسار کے جذبات کو اگر کوئی انسانی پیکر میں دیکھنا چاہے تو چھوٹو بھائی سے بہتر مثال شاید ہی اس کو کہیں مل سکے۔

کھلتا ہوا گندمی رنگ، گھنے بال، بڑی بڑی مونچھیں، درمیانے سے ذرا نکلتا ہوا قد۔ جسم مٹاپے کی طرف مائل۔ ہر وقت چہرے پر محبت بھری مسکراہٹ۔ جب بھی آپ سے ملیں گے نگاہیں نیچی۔ ہر خدمت کے لیے ہر وقت تیار۔

چھوٹو بھائی نے اپنے ماں باپ کی جس طرح خدمت کی اس کی نظیر ملنا ناممکن ہے۔ انھوں نے جاں نثاری کے جذبے کو حقیقت بنا دیا اور اپنے والدین پر قربان ہو گئے۔ آج جب میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں، چھوٹو بھائی اس دنیا میں نہیں ہیں۔

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنج ہائے گراں مایہ کیا کیے

میں بھی خیالات میں بہہ کر کہاں سے کہاں نکل گیا۔ یہ تو بہت بعد کے واقعات ہیں ہم پھر ۱۹ جون ۱۹۶۷ء کی صبح کو واپس چلتے ہیں جب میں اور عزیز بھائی پی آئی اے کی پرواز سے پنڈی روانہ ہوئے۔ پنڈی ایئرپورٹ پر چھوٹو بھائی اپنی کار میں ہمارا انتظار کر رہے تھے وہ ایبٹ آباد سے وہاں پہنچے تھے۔ ایئرپورٹ سے ہم لوگ فلیش مین ہوٹل گئے اور کمرہ نمبر ۲۱ میں

قیام کیا۔ سامان کمرے میں رکھ کر ہم لوگ ریلوے اسٹیشن گئے جہاں جوش صاحب لاہور سے آنے والے تھے۔ ہم لوگ جب اسٹیشن پہنچے تو تھوڑی ہی دیر میں ریل کار آ گئی۔ میں نے جوش صاحب سے عزیز الرحمٰن خاں صاحب اور ان کے صاحبزادے اشفاق الرحمٰن خان صاحب کا تعارف کروادیا۔ جوش صاحب نے کہا کہ وہ ایسٹ پاکستان گیسٹ ہاؤس میں قیام کریں گے۔ چنانچہ ان کو وہاں پہنچا دیا گیا۔

جوش صاحب کے لیے مکان کا بندوبست:

دوسرے دن ہم لوگ جوش صاحب کو لے کر اسلام آباد کے شالیمار سیکٹر ۶ پہنچے۔ جہاں عزیز بھائی کا مکان تھا۔ جوش صاحب کو وہ مکان پسند آ گیا۔ چنانچہ وہاں سے ہم لوگ اسٹیٹ آفس گئے جہاں متعلقہ حکام سے مل کر ضروری کارروائی کے بعد جوش صاحب کو اس مکان میں رہنے کی اجازت مل گئی۔ حکومت نے اس مکان کا کرایہ سولہ سو روپے مقرر کیا جو خود حکومت ادا کرے گی۔

دوسرے دن میں اور جوش صاحب کلام خاں صاحب کے ساتھ علوی صاحب سے ملنے منسٹری آف انفارمیشن گئے۔ جوش صاحب نے ان کو بتایا کہ انھوں نے مکان کا انتخاب کر لیا ہے۔ اب منسٹری ضروری کارروائی کر کے اس کا قبضہ ان کو دلوا دے۔ علوی صاحب نے ڈپٹی سیکرٹری صاحب کو بلا کر کچھ ہدایات دیں۔ ڈپٹی سیکرٹری صاحب نے تمام کارروائی مکمل کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت طلب کی۔ جوش صاحب راضی ہو گئے۔ علوی صاحب نے چائے پلائی اور تھوڑی دیر وہاں بیٹھ کر ہم لوگ واپس آ گئے۔

ایبٹ آباد کی سیر:

عزیز بھائی کو جب میں نے بتایا کہ منسٹری والوں نے مکان تیار کرنے کے لیے ایک ہفتے کی مہلت مانگی ہے تو انھوں نے کہا کہ یہ ایک ہفتہ یہاں ہوٹل میں گزارنے کے بجائے جوش صاحب کو لے کر ایبٹ آباد کیوں نہ چلیں؟ جب ہم نے جوش صاحب کو یہ بات بتائی تو وہ تیار ہو گئے۔ چنانچہ ہم لوگ ۲۲ ویں جون کو چھوٹو بھائی کی مرسیڈیز کار میں ایبٹ آباد

روانہ ہو گئے اور وہاں ان کے گھر قیام کیا۔

وہاں عزیز بھائی کی روایتی مہمان نوازی اور چھوٹو بھائی کی دلداری نے جوش صاحب کو بے حد متاثر کیا۔ اس زمانے میں صوبہ سرحد میں مفتی محمود صاحب کی حکومت تھی اور انھوں نے وہاں شراب کا استعمال ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ ویسے بھی عزیز بھائی خود شراب کے استعمال کو بہت برا سمجھتے تھے۔ جب جوش صاحب کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ متفکر ہوئے۔ ہم لوگوں کو جس کمرے میں ٹھہرایا گیا تھا وہ مکان کی بالائی منزل میں تھا اور وہاں عام طور پر گھر والوں کی آمد و رفت کا امکان کم رہتا تھا۔ اور اس کمرے کی کھڑکی سے باہر پہاڑوں کا منظر بہت ہی دلفریب تھا۔ میں شام کو مغرب کے وقت زینے کا دروازہ بند کر کے کھڑکی کھول دیتا تھا اور جوش صاحب کسی کی مداخلت کے بغیر پیمانہ بکف طلوع ہو جاتے تھے۔ ایک شام جوش صاحب نے کہا جب وہ بمبئی میں تھے تو وہاں کی حکومت نے یکم اپریل سے شراب نوشی پر پابندی عائد کر دی تھی۔ اس پر جوش صاحب نے یہ شعر کہا تھا۔

یکم اپریل ہی کو منع مے کا حکم ہوتا ہے
یہ دن کیا بے وقوفی کے لیے کچھ عام ہے ساقی

میں نے کہا جوش صاحب آپ یہ شعر مفتی محمود صاحب کو لکھ کر بھیج دیجیے۔ جوش صاحب نے کہا جناب آپ دیکھنا ہم رندوں کی آہ کے اثر سے مفتی صاحب کی حکومت زیادہ دن نہیں چلے گی۔ میں نے پوچھا کہ کیا بھٹو صاحب ان کی حکومت کو ختم کر دیں گے۔ جوش صاحب نے کہا جی نہیں، مفتی صاحب خود چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ اس وقت تو میں جوش صاحب کی یہ بات مذاق سمجھا تھا مگر حیرت انگیز طور پر ان کی یہ پیش گوئی جلد ہی درست ثابت ہوئی۔

ایبٹ آباد کوئی زیادہ بڑی بستی نہیں ہے۔ وہاں عزیز الرحمٰن خاں صاحب کے ملنے والوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ ان کے گھر جوش صاحب ملیح آبادی ٹھہرے ہوئے ہیں چنانچہ دوسرے دن سے لوگ جوش صاحب سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ ایک شام میجر سرور اور ان کی بیگم بھی ملاقات کے لیے آگئیں۔ بیگم سرور نے بتایا کہ وہ فیض صاحب کی عزیزہ ہیں

اور جب بھی فیض صاحب ایبٹ آباد آتے ہیں انھی کے گھر قیام کرتے ہیں اور یہ جب لاہور جاتی ہیں تو فیض صاحب کی مہمان ہوتی ہیں۔ دونوں میاں بیوی کی گفتگو بہت ہی سطحی اور اپنی بڑائی لیے ہوئے تھی اور عام طور سے جوش صاحب ایسی ذاتی نوعیت کی گفتگو میں بالکل دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ ان کی یہ گفتگو غیر دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ اتنی طویل ہو گئی تھی کہ مغرب کا وقت قریب آنے لگا۔ جوشؔ صاحب بار بار گھڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر عزیز بھائی نے ان دونوں کو نیچے بلوا لیا اور جوشؔ صاحب نے گہرا اطمینان کا سانس لے کر یہ شعر پڑھا۔

افف بہت سخت بور جوڑا تھا ایک گھوڑی تھی ایک گھوڑا تھا

دوسرے دن عزیز بھائی نے یہ طے کیا کہ جوشؔ صاحب کو ایبٹ آباد کے تفریحی مقامات دکھائے جائیں۔ ظاہر ہے جوشؔ صاحب کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ ہم لوگ صبح ناشتہ کر کے چھوٹو بھائی کے ساتھ ان کی کار میں ایبٹ آباد سے روانہ ہوئے۔ پہلے مانسہرہ گئے۔ وہاں عزیز بھائی کے ایک دوست کے گھر تھوڑی دیر کے لیے رکے۔ انھوں نے جب دیکھا کہ جوشؔ صاحب ان کے گھر آئے ہیں تو ہم لوگوں کی بڑی خاطر تواضع کی اور بہت اصرار کیا کہ ایک رات ان کے گھر رک جائیں تاکہ وہ اپنے دوستوں کو جمع کر کے ایک شعری نشست کا اہتمام کر سکیں مگر جوشؔ صاحب نے معذرت چاہی اور ہم لوگ وہاں ان کی میزبانی سے تقریباً ایک گھنٹہ لطف اندوز ہو کر مانسہرہ کے آثار قدیمہ دیکھنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں بڑی بڑی چٹانوں پر اشوک اعظم کے فرامین لکھے ہوئے ہیں جو مہاتما بدھ کی تعلیمات پر مشتمل ہیں۔ یہ کتبات دیکھتے ہوئے اور پہاڑی علاقوں کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم لوگ ڈاڈر پہنچے جو ایبٹ آباد سے تیس (۳۰) میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ علاقہ بڑے بڑے خوبصورت درختوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اس قدر صحت افزا ہے کہ یہاں دق کے مریضوں کے لیے سینی ٹوریم بنایا گیا ہے۔ اور سیاحوں کے لیے گیسٹ ہاؤس بہت خوبصورت مقام پر واقع ہے۔ وہاں ہم لوگوں نے بیٹھ کر چائے پی اور جنگل کی سیر کو پیدل چل پڑے۔ ایک مقام پر دیکھا کہ ایک شخص درخت کی شاخیں کاٹ کر ہاتھ میں پکڑنے والی چھڑیاں بنا رہا ہے۔ اس کی لکڑی نہایت مضبوط ہوتی ہے اور صبح کی مشی کے وقت ہاتھ میں رکھنے کے

لیے نہایت موزوں اسٹک کا کام دیتی ہے۔ میں نے ایک چھڑی بنوائی اور جوش صاحب نے ایک چھڑی لی۔ غالباً دس دس روپے میں ایک ایک چھڑی خریدی گئی تھی۔ جوش صاحب اس تفریح سے بہت خوش ہوئے۔ وہاں بارہ ایک بجے تک گھوم کر گھر واپس آ گئے۔

اس شام کو جوش صاحب نے کہا آج ایک رباعی کہی ہے۔ تم بھی سن لو۔

ناشاک کو انسان ہٹا دیتا ہے ۔۔۔ پھولوں کو کلیجے سے لگا لیتا ہے
کھدتی نہیں حافظے کی تختی پہ جو بات ۔۔۔ اس بات کو نسیان بھلا دیتا ہے

غرض تین چار دن عزیز الرحمٰن خان صاحب اور اشفاق الرحمٰن خاں صاحب کی میزبانی سے لطف اندوز ہو کر ہم لوگ عزیز بھائی کی کار میں ایبٹ آباد سے اسلام آباد کے لیے روانہ ہوئے۔ اس مرتبہ ہم لوگوں نے نگلیات کے راستے سے سفر کیا۔

اسلام آباد واپسی:

صبح سویرے ناشتہ کر کے ایبٹ آباد سے روانہ ہوئے تھے اور تقریباً دس گیارہ بجے نتھیا گلی پہنچے۔ وہاں اشفاق خان صاحب کا ایک مکان ہے جہاں بیٹھ کر ہم لوگوں نے چائے پی اور روانہ ہو گئے۔ راستہ نہایت پرپیچ پہاڑوں کے درمیان سے گزرتا ہے اور اکثر جگہ نہایت خطرناک موڑ آتے ہیں اس کے علاوہ راستے کے اتار چڑھاؤ ایسے ہیں کہ صرف بہت ماہر ڈرائیور ہی ان راستوں پر گاڑی چلا سکتا ہے مگر ہمارے چھوٹو بھائی نہایت مہارت سے بلاتکلف ان خطرناک راہوں پر گاڑی چلاتے رہے۔ راستے میں ایوبیہ، مری، گھوڑا گلی، کوزہ گلی اور نہایت خوبصورت وادیاں اور سرسبز و شاداب شاہ بلوط اور سفیدے کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کی سیر کرتے ہوئے سہ پہر کے قریب راولپنڈی پہنچ گئے اور جوش صاحب کو ایسٹ پاکستان گیسٹ ہاؤس پہنچا کر ہم، عزیز بھائی اور اشفاق خاں صاحب ہوٹل فلیش مین آ گئے۔

دوسرے دن جوش صاحب کے ساتھ عزیز الرحمٰن خاں صاحب اور ان کے صاحبزادے منسٹری آف انفارمیشن پہنچے وہاں معلوم ہوا کہ اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ والوں نے کرائے کے تعلق سے تمام دستاویزات تیار کر لی ہیں چنانچہ عزیز الرحمٰن خاں اور اشفاق الرحمٰن خاں نے قانونی

کارروائی مکمل کی۔ اس کے بعد اسٹیٹ ڈپارٹمنٹ والوں نے مکان کو فرنش کرنے کے لیے ایک ماہ کی مہلت مانگی۔ جس پر جوش صاحب راضی ہو گئے۔ اب چونکہ ہم لوگوں کا کام ختم ہو چکا تھا اس لیے جوش صاحب تو پنڈی ہی میں رہ گئے اور میں اور عزیز بھائی کراچی واپس آ گئے اور اشفاق خاں صاحب واپس ایبٹ آباد چلے گئے۔

گل کہسار:

کراچی واپس آ کر میں اپنے کاموں میں ایسا الجھا کہ بہت دنوں تک جوش صاحب کے ساتھ نامہ و پیام نہ ہو سکا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ پہلی جولائی ۱۹۷۲ء کو جوش صاحب نئے مکان F-208 شالیمار 8 اسلام آباد میں منتقل ہو گئے تھے۔ ایک روز جب ہم لوگ پنڈی میں تھے تو جوش صاحب نے عزیز الرحمن خاں صاحب سے پوچھا تھا کہ ان کے مکان کا نام کیا ہے تو خاں صاحب نے کہا تھا کہ گو ابھی تک انھوں نے اس مکان کا کوئی نام نہیں رکھا مگر ان کے ذہن میں اس کا ایک نام ہے اگر جوش صاحب اس کو مناسب خیال فرمائیں تو وہی رکھ لیں جوش صاحب نے کہا وہ کیا نام ہے؟ خاں صاحب نے کہا "دغر گل"۔ جوش صاحب نے دریافت کیا اس کے کیا معنی ہیں۔ عزیز بھائی نے کہا یہ پشتو زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں "پہاڑی پھول" جوش صاحب نے برا سا منھ بنا کر جواب دیا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ شلوار پہنے کھڑا ہوا ہے ارے بھائی آپ نے "گل کہسار" کو خواہ مخواہ شلوار پہنا دی"۔ چونکہ یہ مکان مرگلہ کی پہاڑیوں کے قریب میدان میں واقع تھا اس لیے سب نے اس کا نام "گل کہسار" پسند کیا اور پھر اسی نام سے یہ مکان معروف ہوا۔

خیر یہ تو بیچ میں ایک خیال آ گیا جس کا میں اس سے پہلے ذکر کرنا بھول گیا تھا۔ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ کراچی آ کر میں کچھ تو اپنے کاموں میں اور کچھ اپنے بھائی نعمت اللہ خاں کی بیماری کے سلسلے میں مصروف ہو گیا۔ اسی مدت میں نعمت اللہ خاں کی بڑی صاحبزادی نے کراچی یونیورسٹی سے نفسیات میں ایم۔ اے پاس کر لیا تو ان کی شادی عزیز الرحمن خان صاحب کے بھتیجے ضیاء الرحمن خاں صاحب سے طے ہو گئی اور دوسری جولائی کو یہ شادی ہو گئی۔

جوش صاحب کا پہلا خط:

ادھر ایک مہینہ تک انتظار کرنے کے بعد جوش صاحب نے ۳۱ جولائی ۱۹۶۷ء کو مجھے ایک خط لکھا جو حسب ذیل ہے۔

ایف۔۲۰۸

شمالی ناظم آباد

۳۱۔۷۔۶۷

آپ نے تو کمال کر دیا خورشید صاحب۔ بے صبری اور وہ بھی اس قدر بھرپور۔ یہاں سے گئے تو پھر کروٹ ہی نہیں لی۔ ایک دیلا پتلا خط بھی نہیں بھیجا۔ میرے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ آپ اس قدر بے مروت انسان ہیں۔

جفائیں دیکھ لیاں، بے وفائیاں دیکھیں
بھلا ہوا کہ تری سب برائیاں دیکھیں!

خورشید کی ظلمت فشانیوں کا صید زبوں

جوش

لفافہ پر یہ پتا تحریر ہے۔

خورشید علی خاں فراموش کنندہ دوستاں

BN.15 کراچی

یہ خط مجھے دوسری اگست کو ملا اور دوسرے دن یعنی تیسری اگست کو میں نے اس کا جواب بھجوا دیا۔

بی۔۱۵

بلاک این۔ شمالی ناظم آباد

۳۔۸۔۶۷ء

قبلہ صاحب نظراں ..... تسلیم

آپ کا ۳۱ جولائی کا تحریر کردہ خط مجھے دوسری اگست کو ملا۔ اور بقول غالب:

غلط نہ تھا مجھے خط پر گماں تسلی کا نہ مانے دیدۂ دیدار جو تو کیونکر ہو؟

حضور والا! آپ فکر و قرطاس و قلم اور بیان و معنی کے بلا شرکت غیرے حکمراں علم کے خدیو، تفکر کے شہریار۔ تحریر آپ کی لونڈی قلم آپ کا غلام اور مجھ وجود بے بود پر یہ قہر۔ ذرا غور تو فرمایئے کہ جو شخص آپ کی دوری کے غم میں پہلے ہی عدم آباد میں رہتا ہو وہ آپ کی نظر التفات کا محتاج ہے یا چشم غضب کا۔
مگر مجھے دیکھیے:

میں سادہ دل آزردگی یار سے خوش ہوں
یعنی سبق شوق مکرر نہ ہوا تھا

اس لیے کہ:

مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوہ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو تم سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی

آپ سے جدا ہو کر میں یہاں اس شہر آماجگاہ آفات و فسادات کے ایک کنج تنہائی میں بیٹھا اپنی قسمت پر آنسو بہا رہا ہوں۔ میری تنہائی کا سرمایہ حیات آپ کا تصور ہے جو ہر وقت میرے ساتھ رہتا ہے۔ صبح پانچ بجے بیدار ہوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ آپ قریب کے پلنگ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ منہ میں پان ہے۔ آنکھیں بند ہیں اور دماغ عالم بالا کی لامحدود بلندیوں پر محو پرواز۔ چہرہ نور علم سے منور ہر سانس میں غروش انا الحق لیے ہوئے، آپ کے اطراف ایک نور کا ہالہ ہے اور اس ہالے میں بخط جواہر یہ الفاظ کندہ و تابندہ ہیں۔

مجھ کو تو پیغمبری دے اور نہ شاہنشاہ کر
ہو سکے تو سر موجودات سے آگاہ کر
اپنے اصلی خال و خد سے آشنا کر دے مجھے
بندگی اک جہل مطلق ہے خدا کر دے مجھے

اس عالم محویت میں آپ نہ جانے کب سے ہیں اور کب تک رہتے اگر میں دخل در معقولات کر کے آداب بجا نہ لاتا۔ میری آواز سن کر آپ عالم بالا کی سیر سے اس کرۂ خاکی پر لوٹ آتے ہیں۔ میرے دریافت کرنے پر کہ آپ کیا سوچ رہے تھے آپ فرماتے ہیں، ارے کیا بتلاؤں خورشید علی خاں، علت العلل کی تلاش ہے جو ابھی تک فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ میں عرض

کرتا ہوں کہ حضور والا یہ کام اب فلسفہ کا نہیں رہا اس کو سائنسدانوں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اب ہم کو اس وقت تک انتظار کرنا پڑے گا جب تک وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتے۔ ارے بھائی اس وقت تک ہم کہاں رہیں گے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ آپ ہی نے تو کہا ہے کہ:

مجھ کو نہ ملا تو اے نگار آفاق　　بچ کر مری اولاد سے جائے گا کہاں

آپ فرماتے ہیں اچھا اب چلو قریب کے باغ میں ٹہل کر آتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آپ اور میں نسیم صبح کی فرحت بخش آغوش میں قدم گن رہے ہیں۔ تین ہزار قدم ہو گئے۔ اب ہاتھوں کی ورزش ہوئی۔ بیس دفعہ ہاتھ اوپر نیچے کیے گئے۔ پھر بنچ پر لیٹ کر ٹانگوں کی ورزش ہوئی۔ چہل قدمی اور ورزش ہو چکی۔ گھر لوٹ آئے اور شیو کرنے کے بعد آپ فرماتے ہیں بھائی میں غسل کے لیے جا رہا ہوں۔ آپ ناشتے کے لیے کہہ دیجیے۔ غسل ہوا ناشتے سے فارغ ہو کر کپڑے تبدیل کیے۔ اب حضور کہاں تشریف لے چلیے گا؟ چلو ذہین شاہ صاحب تاجی کے گھر چلتے ہیں۔ میں گاڑی چلا جا رہا ہوں۔ آپ ساتھ بیٹھے ہیں۔ ذہن جولانیوں پر ہے۔ آپ سے گفتگو ہو رہی ہے۔ آپ علم کی دولت لٹا رہے ہیں اور میں سمیٹ رہا ہوں۔ فلسفہ، ادب، اخلاقیات، الٰہیات، عمرانیات ہر موضوع پر آپ اظہار خیال فرما رہے ہیں۔ میں سوالات کر رہا ہوں آپ جواب کے موتی لٹا رہے ہیں۔

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبی قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

اتنے میں بابا صاحب کا مکان آ جاتا ہے۔ آپ بلا تکلف خلوت کدۂ شاہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور میں آپ کا دامن پکڑے پیچھے پیچھے چلا جاتا ہوں۔ اللہ اللہ کیا ٹھنڈک ہے۔ ایک طرف ایرکنڈیشنر چل رہا ہے تو دوسری طرف حسن علیٰ قدر مراتب جلوہ افروز ہے۔ ہماری آمد پر بزم نگاراں دوبارہ مرتب ہوتی ہے۔ اب شمع محفل آپ ہیں۔ اور موضوع سخن بھی بدل گیا ہے۔ اب عرش و فرش کی باتیں ہو رہی ہیں۔ خدا اور روح کی باتیں، حیات اور موت کی باتیں، عدم اور وجود کی باتیں، کرہ جنت نگاہ تو باتیں فردوس گوش پھر شاعری کا دور شروع ہوتا ہے۔ بابا صاحب اپنا کلام سناتے ہیں۔ پھر آپ کا کلام نور علیٰ نور۔ غرض دو تین گھنٹے ایسے گزرتے ہیں کہ یہ پتا نہیں چلتا کہ کب آئے تھے کہ رخصت ہونے لگتے ہیں۔

بابا صاحب کے آستانے سے رخصت ہو کر میں عرض کرتا ہوں کہ چلیے برنس روڈ کی لسی پیتے ہیں۔ ہاں بھئی خوب یاد دلایا چلو۔ لیجیے برنس روڈ پر پھلوں کے ٹھیلوں سے ملی ہوئی گاڑی کھڑی ہے۔ دوکاندار نے ہم کو دیکھ لیا ہے۔ اس نے فوراً ایک چھوٹی سی داڑھی والے شخص کے ہاتھ سے آپ کے لیے ایک گلاس میں کلی کو پانی بھجوایا۔ اور جب آپ نے کلیاں کر لیں تو وہ دو گلاس لسی لے آیا۔ لسی پی۔ پان کھایا۔ اب ایک بج رہا ہے۔ چلو بھئی اب گھر چلیں۔ حضور اب آپ اپنے گھر کہاں جائیے گا۔ چلیے خاکسار کے مکان وہاں کمرہ خالی ہے آپ وہیں آرام فرمائیے گا۔ اچھا بھئی چلو۔ اس غریب خانے کی قسمت جاگی۔ آپ کمرے میں آرام فرما رہے ہیں۔ تین بجے آپ بیدار ہوئے۔ غسل ثانی فرمایا اور کمرے سے باہر تشریف لائے۔ مجھے دیکھ کر فرمایا۔ غسل کے بعد اب آپ کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا ہے اس کے بعد چائے پی اور پھر علم کے خزانے لٹائے جا رہے ہیں۔ شام ہو رہی ہے اور احباب جمع ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ راغب صاحب۔ فراست رضوی۔ ڈاکٹر عالیہ امام۔ سرور بارہ بنکوی۔ سلامت علی خاں دیکھیے سب جمع ہیں کہ آفتاب غروب ہوا چراغ جام روشن ہوا۔ سلامت علی خاں آپ کا ساتھ دے رہے ہیں۔

کیا میکدے کا رتبہ عالی ہے مرحبا   مسند پہ انبیا تو پس خم ملائکہ

گل بیز و مشک ریز و جنوں خیز دے چکاں   صلِّ علیٰ فضائیں گہر بار و درفشاں

میں نے دو گلاس بھرے ایک آپ کے سامنے رکھا دوسرا سلامت علی خاں کے سامنے۔ راغب صاحب فرما رہے ہیں۔

خورشید علی خان ہیں ساقی راغب   اور حضرت جوش بادہ خواروں کے امام

ایک دو تین پچیس پچیس منٹ میں ایک ایک جام ختم کر کے آپ چوتھے جام پر پہنچے ہیں۔ میں کھانا لے کر حاضر ہوتا ہوں۔ جوش صاحب یہ کباب لالو کھیت کی چورنگی والے کبابی کی دوکان کے ہیں۔ بھئی واہ واہ یہ آپ نے خوب کام کیا۔ ...... کھانا ختم ہوا۔ آپ کلیوں سے فارغ ہوئے۔ ایک کپ دودھ میں ایک چمچ اسپ غول کی بھوسی ملا کر آپ پی لیتے ہیں۔ اب چلیے حضور آرام فرمائیے۔ اچھا بھئی اب ہم انتقال فرماتے ہیں۔ سو بات کی ہے ایک بات آؤ سو جائیں۔ سب احباب رخصت ہو جاتے ہیں۔ وہ دیکھیے آپ محو خواب ہیں اور

میری نیند اڑی ہوئی ہے ڈرتا ہوں کہ آنکھ جھپکی اور دامان خیال یار ہاتھ سے چھوٹا۔ بھلا بتلائیے اس حسین ورنگین دنیا سے کون باہر آنا چاہے گا۔ آپ کو خط تو اس وقت لکھوں جب آپ کو اپنے سے جدا محسوس کروں۔ اور میرے لیے جدائی اور موت ایک ہے مگر آپ نے مجھے جھنجوڑ کر اس غفلت سے بیدار کر دیا ہے مگر اس احساس مسرت کا کیا ٹھکانا کہ میں آپ کو یاد تو رہا۔

گرچہ ہے کس کس برائی سے و لے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

حضور والا! دراصل بہت مدت سے میں آپ کے خط کا منتظر تھا۔ یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آپ نے مکان میں کس تاریخ کو منتقل ہوئے۔ فرنیچر کا کیا ہوا۔ نوکر کا کوئی انتظام ہوا یا نہیں۔ ٹیلی فون لگا یا نہیں اگر لگ گیا ہے تو نمبر کیا ہے۔ یہ ساری باتیں میں آپ سے پہلے معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اور پھر آپ کے نئے پتے پر خط لکھنا چاہتا تھا۔ یہاں تو اس مدت میں کراچی اس قدر ہنگاموں کی آماجگاہ بنا رہا کہ گھر سے نکل ہی نہ سکا۔ ویسے بھی کرفیو کی وجہ سے گھر میں قید رہنا پڑا۔ اسی لیے عزیز الرحمٰن خان صاحب سے بھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اب جبکہ آپ اپنے مکان میں منتقل ہو چکے ہیں تو خط پابندی سے لکھتا رہوں گا۔

اگر کوئی تازہ کلام ہوا ہو تو ضرور ارسال فرمایئے۔ کلام خاں صاحب کو میرا سلام فرما دیجیے۔ کراچی تو آپ کے جانے سے بالکل سونا ہو گیا ہے۔

اپنی ہی ظلمتوں کا شکار اور آپ سے روشنی کا طلبگار

طالب دید

خورشید

اس خط کے بعد جوش صاحب کا دوسرا خط ۲۲ ستمبر ۷۰ء کا لکھا ہوا کسی صاحب کے ذریعہ دوسرے دن مجھے ملا۔ لفافے پر یہ پتہ تحریر ہے۔

خورشید علی خاں آرام دلِ عاشقاں
B-15N ناظم آباد نمبر تین
کراچی

۲۰۸ - ۶

شالیمار - ۸

اسلام آباد

۲۳ - ۹ - ۷۶ء

سپہر

تابندہ باد حضرت خورشید۔ کئی بار آپ کو خط لکھنے کی ترنگ پیدا ہوئی اور ہر بار یہ سوچ کر رک گیا کہ قدرت اللہ شہاب آپ کے باب میں کوئی آخری بات کہ یا طے کر دیں تو خط لکھوں۔ اسس کم بخت اسمبلی نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے، شہاب صاحب کو لاکھوں بار فون کر چکا ہوں کہ ان سے مل کر آپ کے مسئلے کو حسب مراد طے کرا دوں لیکن ہر بار جواب آیا کہ اسمبلی گئے ہوئے ہیں۔ بہرحال سعی میں لگا ہوا ہوں۔ خدا میری سعی کو مشکور فرمائے۔ یقین فرمائے آپ یاد اور بہت یاد آتے ہیں۔ جی چاہتا ہے یا تو خود کراچی پہنچ جاؤں یا آپ کو یہاں بلا لوں مگر اس عالم کون و فساد میں جی چاہنے سے کیا ہوتا ہے اور آسمان سے آواز آتی ہے۔ "تمام لے گردھاری لال کا- ل"۔ اپنے بھائی سے جو بہت ہی اچھے آدمی ہیں میرا سلام کہیے۔ اب ان کی صحت کا کیا عالم ہے اور ذرا پتا چلائیے سلامت علی خان کا۔ ان کے سر پر جو مصیبت آئی تھی ٹلی کہ نہیں۔ ان کا پتا بھی لکھیے۔ اور ان کی بیگم اور ان کے بچوں سے میری دعا کہیے۔

رخسانہ بی بی کے پاس ہونے کی مبارک باد کا دلی شکریہ قبول کیجیے۔ آپ کو یہ سن کر افسوس ہو گا کہ اس کی صحت روز بروز گر رہی ہے اور الھڑپن کی بنا پر ڈاکٹر جو دوا دیتا ہے اس کے استعمال سے بے پروائی بھی برتتی ہے۔ ایک عشرے کے بعد لاہور جا کر اس کو سمجھاؤں گا کہ اپنی جان سے اس قدر غفلت نہ برتے۔ کل فلیش مین ہوٹل کی طرف سے گزرتے ہوئے آپ کی معشوق کو دیکھا۔ بڑی ٹنک کے ساتھ ٹھمک ٹھمک کر قدم اٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ بے ساختہ جی چاہا کہ اس کو جھٹ سے اٹھا کر اپنی موٹر کار میں ڈال لوں اور عمر عیار کے مانند اس کو زنبیل میں ڈال کر اور اس کی زبان میں "سوزن" لگا کر آپ کے نام پارسل کر دوں اور جب وہ چھم سے آپ کے خلوت کدے میں قدم رکھے اسی آن آپ کی بیگم دھم سے کود پڑیں چپت

سے اور عاشق و معشوق دونوں کی پشت پر دھما دھم کے پڑنے لگیں اور پھر آپ کی چیخ اور اس کا پیشاب نکل جائے۔

آپ کی بہن اختر نے بھولے سے بھی یاد نہیں کیا لیکن ان تک میری شکایت نہ پہنچایئے گا۔

آپ کا چاہنے والا

جوش

اسلام آباد میں الحادستان کا سفیر

جب بھی کانٹوں نے پاؤں برمائے — تیری نگری کے پھول یاد آئے

جی ہاں یہ بڑا دردناک سانحہ ہے کہ،

دل کا طوفاں دماغ تک پہنچا — گھپ اندھیرا چراغ تک پہنچا

دل حکمت میں چبھ گیا بھالا — کیا کرے اب تو پھنس گیا سالا

جوشس صاحب نے اس خط میں جس "معشوق" کا ذکر فرمایا ہے اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ جب پہلی مرتبہ جوش صاحب پنڈی میں فلیش مین ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور میں کلام خاں صاحب کے گھر مقیم تھا تو شام کو میں جوش صاحب سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ اکثر جوشس صاحب اپنے کمرے کے سامنے ورانڈے میں کرسیاں ڈال کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ ایسی ہی ایک شام تھی۔ میں اور جوشس صاحب ورانڈے میں بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے اسس شام پنڈی کا موسم بہت خوشگوار ہو گیا تھا۔ بادل چھا رہے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ اتنے میں ایک کرسچین خاتون جو اس ہوٹل کی دیکھ بھال پر متعین تھیں، نہایت دلکش انداز میں لہراتی ہوئی ہماری طرف آنے لگیں۔ ہوا کی وجہ سے ان کی زلفیں بار بار چہرے پر پڑ رہی تھیں اور وہ ایک ادائے دلربائی کے ساتھ نازک ہاتھوں سے بار بار انھیں ہٹا رہی تھیں۔ میں نے کہا جوشس صاحب آپ نے جو فتنۂ خانقاہ کا نقشہ کھینچا ہے وہ دیکھیے سامنے چلی آ رہی ہے۔

اس آفت زمانہ کی سرشاریاں نہ پوچھ نکھرے ہوئے شباب کی بیداریاں نہ پوچھ
رخ پر ہوائے شام کی گلباریاں نہ پوچھ کاکل کی ہر قدم پہ فسوں کاریاں نہ پوچھ

عالم تھا وہ خرام میں اس گلعذار کا
گویا نزول رحمت پروردگار کا

جوش صاحب نے یہ سنتے ہی ایک نعرہ لگایا۔ "وہ مارا۔ تو آپ پر بھی حسن کا اثر ہونے لگا۔" میں نے کہا کہ اب تک تو مجھے کسی "حسن" نے اتنا متاثر نہیں کیا کہ میں یہ کہوں کہ مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے البتہ کبھی کبھی کسی کی کوئی ادا اچھی معلوم ہو جاتی ہے۔ ہاں البتہ میں آپ کے ذہنی اور فکری حسن گرہ گیر کے دام میں ضرور اسیر ہو چکا ہوں۔

آں دل کہ رم نمودے از خوبرو جواناں دیرینہ سال پیرے بردش بیک نگاہے

اتنے میں وہ خاتون ہمارے پاس آ کر کھڑی ہو گئیں۔ جوش صاحب نے انھیں مے نوشی کی دعوت دے دی۔ اس نے نہایت دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "ہم کو ڈیوٹی پر ڈرنک کی اجازت نہیں ہے۔ شکریہ۔ میں تو معلوم کرنے کے لیے حاضر ہوئی تھی کہ آپ کو یہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف تو نہیں ہے"؟ جوش صاحب نے کہا۔ "ارے بہت سخت تکلیف ہے۔ یہاں مجھے اکیلے ڈرنک کرنا پڑتا ہے"۔ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ "آپ اکیلے کہاں ہیں یہ آپ کے دوست آپ کے ساتھ بیٹھے تو ہیں"۔ جوش صاحب نے کہا۔ "ارے بی بی تم کو نہیں معلوم یہ سخت ملا آدمی ہے"۔ اس نے پھر اسی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف اشارہ کر کے کہا۔ "آپ میری طرف سے جوش صاحب کا ساتھ دیجیے تاکہ ان کو آئندہ تنہائی کا شکوہ نہ ہو"۔ اور یہ کہہ کر کھلکھلاتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ اس وقت سے جوش صاحب نے اسے میری معشوقہ کہنا شروع کر دیا۔ بس اتنی بات تھی۔

جوش صاحب نے اس خط میں قدرت اللہ صاحب شہاب کا جس کام کے سلسلے میں ذکر کیا ہے وہ ذرا تشریح طلب ہے۔ ہوا یوں تھا کہ میں نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک تفصیلی اسکیم مرتب کی تھی۔ وہ اسکیم جوش صاحب کو بہت پسند آئی تھی۔ پنڈی کے قیام کے دوران میں جو لوگ جوش صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے ان میں فیض احمد فیض اور قدرت اللہ شہاب بھی تھے۔ شہاب صاحب مرکزی وزارت تعلیم کے سیکرٹری تھے۔

جوش صاحب نے شہاب صاحب سے میرا تعارف کروایا اور یہ بھی کہہ دیا کہ میں نے ایک تعلیمی اسکیم مرتب کی ہے۔ پھر شہاب صاحب کی فرمائش پر میں نے وہ اسکیم ان کو دے دی۔ انھوں نے کہا کہ آج کل حکومت ایک تعلیمی پالیسی مرتب کر رہی ہے اگر آپ کی یہ اسکیم اس قابل ہوئی کہ اس کو اس پالیسی کا حصہ بنا لیا جائے تو پھر میں آپ کو زحمت دوں گا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ شریک ہو کر اس پالیسی کی ترتیب میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ چنانچہ دوسرے دن شہاب صاحب نے حکومت کی تعلیمی پالیسی کا مسودہ مجھے دیا اور کہا کہ آپ اس پر غور کر کے مجھے بتلائیں کہ آپ کی اسکیم سے یہ پالیسی کس حد تک مماثلت رکھتی ہے اور کہاں کہاں مختلف ہے۔

میں نے دو تین دن میں اس پر اپنی رائے لکھ کر ان کو دے دی۔ میں نے اپنی اسکیم میں تعلیمی پالیسی کو روبہ عمل لانے کے لیے ایک پروگرام دیا تھا اور ایک مثالی اسکول کے قیام کے لیے تفصیل بیان کی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ اگر حکومت ایسا کوئی مثالی اسکول کراچی یا اسلام آباد میں قائم کرنا چاہے تو میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔ جوش صاحب نے بھی شہاب صاحب سے کہا کہ اگر حکومت اسلام آباد میں ایسا اسکول قائم کرے تو وہ خود بھی اس میں کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ مگر جوش صاحب کی کوششوں کے باوجود حکومت نے ایسی کسی اسکیم کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

نعمت اللہ خاں کا انتقال:

اکتوبر ۷۰ء میں میرے بھائی نعمت اللہ خاں کی طبیعت زیادہ خراب رہنے لگی اور ان کے دل کے دوروں میں شدت پیدا ہو گئی۔ وہ دراصل بے حد فرض شناس، محنتی اور دیانت دار پولیس افسر تھے۔ مارشل لا کے افسر بھی قانونی مشوروں کے لیے ہر وقت ان کو بلاتے رہتے تھے۔ حاکمانِ عدالت بھی بہت مشکل اور الجھے ہوئے مقدمات میں ان سے قانونی مشورے طلب کرتے رہتے۔ وہ اپنے فرائض منصبی کے سلسلے میں رات دن اس قدر مشغول رہتے تھے کہ مشکل سے چوبیس گھنٹوں میں دو تین گھنٹے آرام کرتے ہوں گے اس کے علاوہ ذہنی طور پر مشغول رہنے کی وجہ سے ان کی صحت بری طرح متاثر ہو رہی تھی۔ میں نے لاکھ سمجھایا کہ چند ماہ

کے لیے چھٹی لے کر آرام کر لیں مگر احساس ذمہ داری نے انھیں آرام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۳۰ اکتوبر کو رات تین بجے شدید دل کا دورہ پڑا۔ بیوی اور بیٹی نے کہا کہ وہ مجھے ٹیلی فون کر کے بلالیں گی تاکہ ان کو امراض قلب کے ہسپتال میں داخل کروا دیا جائے تو یہ کہہ کر انھیں منع کر دیا کہ "اس وقت بھائی جان سو رہے ہیں انھیں پریشان مت کرو۔" میں حسب عادت صبح اٹھ کر ٹہلنے چلا گیا اور جب آٹھ بجے گھر لوٹا تو بیوی نے بتایا کہ نعمت کی بیٹی کا ٹیلی فون آیا تھا ان کی طبیعت خراب ہے اور مجھے بلایا ہے۔ میں فوراً ان کے گھر جو ناظم آباد پولیس اسٹیشن میں واقع تھا، پہنچا۔ جیسے ہی میری گاڑی کی آواز سنی وہ فوراً باہر آئے اور گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہم لوگ جناح ہسپتال کے امراض قلب کے دوا خانے پہنچے جہاں ڈاکٹر حامد شفقت صاحب نے جو ان کے معالج تھے، معائنہ کیا اور ان کو ہسپتال میں داخل کر لیا۔ ہسپتال میں ان کو انجکشن لگا کر سلا دیا گیا مگر سینے کا درد کسی طرح کم نہیں ہو رہا تھا۔ اسی طرح دو دن گزر گئے۔ تیسرے دن درد کم ہوا اور طبیعت میں کچھ بہتری کے آثار پیدا ہوئے۔

ڈاکٹروں نے مجھ سے ایک انجکشن منگوایا جو بہت مہنگا تھا مگر دل کے دورے کے وقت لگایا جاتا ہے۔ وہ انجکشن مہنگا ہونے کے علاوہ اس زمانے میں مشکل سے دستیاب ہوتا تھا۔ میں نے اپنے ایک بہت ہی محبت کرنے والے دوست قیوم صاحب سے درخواست کی۔ وہ الفنسٹن اسٹریٹ پر اسٹینڈرڈ میڈیکو کے مالک تھے۔ انھوں نے کوشش کر کے وہ انجکشن فراہم کر دیا۔ میں نے نعمت کو وہ انجکشن دیتے ہوئے کہا کہ اس کو بہت حفاظت سے اپنے پاس رکھیں تاکہ اگر خدانخواستہ پھر تکلیف ہو تو کام آئے۔ اب نعمت کی طبیعت سنبھل گئی تھی اور آہستہ آہستہ نارمل ہوتی جارہی تھی مگر وہ ابھی تک خطرے سے پوری طرح باہر نہیں ہوئے تھے۔ چوتھی نومبر کو ایک مریض دل کے دورے کی حالت میں ان کے کمرے کے ایک پلنگ پر لاکر لٹایا گیا۔ وہ غریب آدمی تھا۔ اس کی بیوی رو رہی تھی اور بہت پریشان تھی۔ ڈاکٹروں نے اس کو بھی وہی انجکشن لانے لیے کہا تھا مگر نہ تو اس کے پاس اتنے پیسے تھے اور نہ کوئی آدمی جو بازار جا کر بھاگ دوڑ کر کے انجکشن ڈھونڈ کر لا سکے۔ جب نعمت کو معلوم ہوا تو انھوں نے فوراً اپنے پاس رکھا ہوا انجکشن اس کو دے دیا۔ اس شخص کو جب وہ انجکشن لگا اس کی حالت سنبھلنے لگی اور وہ ٹھیک ہو گیا۔

مگر دوسرے دن یعنی ۵ نومبر کی رات کو جب ایک بجے نعمت کو دوبارہ دورا پڑا تو ان کے لیے کوئی علاج نہ تھا۔ میرے ایک عزیز رات کو ان کے ساتھ ان کی دیکھ بھال پر مامور تھے، جب تک وہ ڈاکٹر کو بلاتے، ان کی حالت زیادہ خراب ہو گئی۔ ڈاکٹر نے آ کر وہ انجکشن طلب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تو ایک رات قبل ہی ان کے ساتھی مریض کو لگایا جا چکا ہے۔ ڈاکٹر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ پھر بھی ان سے جو کوشش ہو سکتی تھی انھوں نے کی مگر دنیا کا درد اپنے دل میں رکھنے والے اس اللہ کی نعمت کے دن پورے ہو چکے تھے۔ یہ بانکا مجاہد مسکراتا ہوا رات ایک بجے اپنے خالق حقیقی سے جا ملا مگر کون کہتا ہے کہ میرا بھائی مر گیا وہ آج بھی ہر لمحہ میرے ساتھ رہتا ہے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ انھی دنوں جوش صاحب کے چھوٹے بھائی رئیس احمد خاں کا بھی ملیح آباد میں انتقال ہو گیا تھا۔ میں نے جوش صاحب کو ان کے بھائی کے پرسے کا خط لکھا تو نعمت اللہ خاں کے انتقال کی خبر بھی لکھ دی۔ اس کے جواب میں جوش صاحب نے لکھا۔

اسلام آباد

۲۲۔۱۱۔۷۶ء

ہائے خورشید علی خاں، ہم دونوں پر آسمان ٹوٹ پڑا ہے۔ ہم دونوں کے چھوٹے بھائی وہاں چلے گئے ہیں، جہاں سے کوئی واپس نہیں آیا ہے۔

بنال بلبل اگر با منت سر یاریست
کہ ما دو عاشق زاریم و کار ما زاریست

اس وقت میرے دل کا یہ عالم ہے کہ آپ کو، ہاتھ سنبھال سنبھال کر خط لکھ رہا ہوں لیکن قلم ہے کہ قابو میں نہیں ہے۔ حروف کی شکلیں بگڑتی چلی جا رہی ہیں۔

اس وقت رات کے دو بجے ہیں۔ سناٹا ہر طرف چھایا ہوا ہے اور دل اس قدر زور زور سے دھڑک رہا ہے کہ اس کی کھٹ کھٹ کانوں میں گونج رہی ہے۔

ہم دونوں کے بھائی ہم سے منھ موڑ کر چلے گئے اور سب سے بڑا سانحہ یہ ہے کہ ہم جی رہے ہیں۔
میں اپنی زندگی سے پشیمان ہوں۔ خورشید علی خاں، آخر میں کب تک نہیں مروں گا۔

اس ہول ناک کرے میں موت سے زیادہ کوئی چیز یقینی و لازمی نہیں ہے۔ یہ دنیا نہیں بوچڑ خانہ ہے اور اس بوچڑ خانے کا چلانے والا ایک ایسا قصاب ہے کہ اگر اس کو یزید و شمر کہا جائے تو یزید و شمر ازالۂ حیثیت عرفی کا دعویٰ دائر کر دیں۔

آخر ہم یہاں ایک سب سے الگ تھلگ اور سب سے بے پروا مسافر کی طرح کیوں نہیں رہتے۔ آخر یہ کیا پاگل پن ہے کہ ہم یہاں اقربا اور احباب سے محبت کرتے ہیں اور

بدل اگر نہ خلد ہر چہ از نظر گزرد　　　خوشا روانی عمرے کہ در سفر گزرد

پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ لیکن ہم نامرادوں کے سینے میں ایک ایسا دل ہے جو محبت کے بغیر دھڑک ہی نہیں سکتا۔ ہم کسی سے بھی دل نہیں لگاتے۔ دل لگانا نہیں چاہتے۔ مگر یہ سرکش و نامراد دل ہمارے علی الرغم دوسروں سے محبت کرنے لگتا ہے۔ حیف صد حیف ہماری ساخت پر۔ بہر حال ہم دونوں اس وقت لہولہان ہیں۔ اگر ہم ایک دوسرے کے قریب ہوتے تو شاید کچھ ہٹ جاتا ہمارا غم آپ پھر بھی اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ہیں جن کی معیت سے کچھ نہ کچھ غم ہٹ ہی جاتا ہوگا۔ میں نامراد یہاں بالکل تنہا ہوں۔ بیوی، بیٹی، بیٹا کوئی بھی میرے پاس نہیں۔ دن بھر تو لکھنے پڑھنے میں وقت گزر جاتا ہے لیکن غروب کے وقت دل ڈوبنے لگتا ہے۔ ہائے میں کیا کروں، کدھر جاؤں۔

آپ ہی کی طرح آپ کا لہولہان دوست

جوش

یہ منسلک خط، ذہین شاہ کے حوالے کر دیجیے۔ ان کا پتا یاد نہیں۔

بابا ذہین شاہ صاحب تاجی کو جوش صاحب نے لکھا۔
نامے کنفر از اسلام آباد

۲۲۔۱۱۔۷۵ء

قبلہ ذہین شاہ بابا۔ ڈھائی بجے رات کو حسب معمول بیدار ہوا تھا۔ اب چار میں پانچ

مٹ باقی ہیں۔ ہمارے پرہول کرۂ ارض کا حقیقی رنگ یعنی گھپ اندھیرا، زمین و آسمان کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور پچھلے پہر کا اتھاہ سناٹا بول رہا ہے۔

میں آج گھر میں تنہا ہوں۔ پورا خاندان بیوی سمیت، کراچی میں ہے اور میں جغد کے مانند خرابۂ افراسیاب پر بیٹھا نوبت بجا رہا ہوں۔ یہ سچ ہے کہ میں خلوت پسند آدمی ہوں مگر شام کے وقت جلوت کو جی چاہنے لگتا ہے اور اسی بنا پر جب آفتاب غروب ہونے لگتا ہے تنہائی کی اداسی میں میرا دل ڈوب کر رہ جاتا ہے۔ خدا کی بے پایاں "رحمت" نے آثار ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ مجھ پر انشاء اللہ آج نہیں تو کل اور کل نہیں تو پرسوں دل کا دورہ ضرور پڑے گا۔ تنہائی میں کچھ لمحے تڑپوں گا اور پھر مر جاؤں گا۔ خس کم جہاں پاک۔ بچپا کر آنکھیں بند کر لیں تو کچھ بھی نظر نہیں آتا لیکن آنکھیں کھول کر دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ حیات انسانی ایک عبرت ناک ٹریجڈی اور کرۂ خاکی ایک ہولناک مقتل ہے۔

جہاں بسمل گہ درد است آسائش کہ دید ایں جا
بقدر حسرت جانی ہر کسے بر خود تپید ایں جا

آسمان و زمین اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ مرض حیات کا واحد علاج موت ہے۔

حزیں از پائے رہ پیما بسے آشفتگی دیدم
سر شوریدہ بر بالین آسائش رسید ایں جا

(کتبۂ لوح مزار حزیں)

بابا صاحب، حقائق بے نہایت تلخ ہیں۔ کون ان سے منہ موڑ سکتا ہے۔ اقوال و اساطیر سے ہم کب تک فریب کھائیں۔ اور کب تک چند اوہام آبائی کے سامنے سر جھکائیں۔

قبلہ و کعبہ، آپ بڑے مزے میں ہیں۔ رومی و غزالی آپ کے سامنے بانسری بجا رہے ہیں۔ تخیلات اور تاویلات کی وجدانی دیواریں آپ کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ آبائے ذوالاحترام پھولوں کی چادر آپ کے سر پر تانے ہوئے ہیں اور اولیائے کرام آپ کو لوریاں دے رہے ہیں اور اس بنا پر آپ اس دوزخ زندگی میں بیٹھے جنت کی ہوائیں کھا رہے ہیں۔ لیکن میں نامراد، منطق کے تپتے سورج، اور دلائل کے چمکتے نیزوں کے سامنے سینۂ عریاں کیے کھڑا ہوں۔ مجھ سے ہاں کوئی پوچھے کہ یہ کارخانۂ عالم کیا ہے اور اس کارخانے کا جنرل منیجر کیسا ہے۔

ایں مرسیہ کہ بر غالب ناکام چہ رفت
می تواں گفت کہ ایں بندہ خداوند نہ داشت

کہتے ہیں کسی بادشاہ کے ملک پر اس کے حریف نے چڑھائی کی۔ بادشاہ نے دوسری پلٹنوں کے ساتھ ساتھ لانبے تڑنگے ہیجڑوں کی بھی ایک پلٹن بنائی اور اس کو میدان جنگ میں بھیج دیا۔ دشمن کی فوج ان ہیجڑوں کے قد و قامت دیکھ کر ہراساں ہو گئی۔ سالار فوج نے جب سماں دیکھا تو اپنے سپاہیوں کا دل بڑھانے کے لیے اس نے گرجتی آواز میں نعرہ لگایا کہ اے بہادرو! تکڑے اڑا کر رکھ دو ان ہیجڑوں کے۔ (دشمن کے سپاہ سالار کو یہ مطلق پتا نہیں تھا کہ وہ دراصل ہیجڑے ہیں۔ اس نے تو یہ لفظ بزدلوں کے معنی میں استعمال کیا)

ہیجڑوں نے جیسے ہی یہ نعرہ سنا۔ تلواریں پھینک دیں، پلو سر پر ڈال لیے اور تالیاں بجا بجا کر ناچنے گانے لگے "قربان جاؤں پہچان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا"۔

اس طرح فکر کی زمین پر کھڑے ہو کر جب میں دنگاۂ بغاوت اٹھاتا اور چلاتا ہوں کہ یہ سب دھوکا ہے تو آسمان سے آواز آنے لگتی ہے "قربان جاؤں پہچان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا" تاتا تھیا تاتا تھیا مان لیا" "قربان جاؤں پہچان لیا"۔

میں ہوں آپ کی ذات اور صرف ذات سے محبت اور بے پناہ محبت کرنے والا

جوش

رند آفاق نوش

تغیر یا موت بابا صاحب کے خیالات:

دوسرے دن جب میں جوش صاحب کا یہ خط لے کر بابا صاحب کے گھر گیا تو قبلہ اپنے کمرے میں کسی خاتون کو دیوان حافظ کے رموز سمجھا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بہت محبت اور تپاک سے ملے۔ خاتون کو رخصت کیا۔ صوفے سے اٹھ کر تخت پر بیٹھ گئے اور مجھے اپنے قریب بٹھا لیا۔ اتنے میں اور لوگ بھی آ گئے۔ بابا صاحب نے مجھ سے آنے کا سبب دریافت کیا تو میں نے جوش صاحب کا خط دے دیا۔ بابا صاحب خط لے کر پڑھنے لگے۔ پڑھتے

جانتے اور مسکراتے جاتے۔ خط پڑھ کر ایک طرف رکھ دیا اور یوں گویا ہوئے۔ ۰ انسان کی ایک خرابی یہ ہے کہ وہ خدائی راز اپنی محدود عقل اور اس سے زیادہ محدود حواس کے توسط سے سمجھنا چاہتا ہے۔ انسانی عقل اس کائنات کی لامحدود حقیقتوں کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اسی طرح علت تخلیق کو بھی کوئی انسان خواہ وہ کتنا ہی بڑا فلسفی یا سائنس دان کیوں نہ ہو، نہیں سمجھ سکتا۔ ہم کسی شے کی ماہیت کو تو سمجھ سکتے ہیں مگر وہ شے ویسی کیوں ہے اس کا جواب عقل انسانی کے لیے محال ہے۔ مثلاً ہم پانی، ہوا یا کسی پتھر کے اجزائے ترکیبی تو عقل کے ذریعہ معلوم کر سکتے ہیں مگر پانی کو سیال ہوا کو لطیف اور پتھر کو سخت کیوں بنایا گیا ہے یا انھیں تخلیق ہی کیوں گیا ہے یہ معلوم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح اس کائنات میں تغیر کو ایک ابدی اور اٹل قانون کے طور پر کیوں نافذ کیا گیا اور تخلیق حسن کو قانون تغیر کا کیوں پابند کیا گیا، یہ سب امور مرضی الٰہی سے متعلق ہیں اور خالق کائنات اپنے ارادے اور اس کے اظہار میں وحدہ لاشریک ہے۔ یہ ساری کائنات استثنیٰ نا آشنا قانون تغیر کے تابع ایک تخلیقی بہاؤ میں بہہ رہی ہے اور ہم جسے اپنی عاقبت نااندیشی سے موت سمجھتے ہیں، وہ حیات نو کا پیش خیمہ ہے۔ حیات کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ ہر لمحہ ہم نیا وجود اختیار کرتے رہتے ہیں جو پچھلے وجود کی موت پر تعمیر ہوتا ہے۔ جب یہ سلسلہ انسان کی پیدائش سے پہلے سے چل رہا ہے تو مرنے کے بعد کیسے ختم سمجھا جائے اور یہ کیوں نہ سمجھا جائے کہ حیات کسی اور منزل میں داخل ہو گئی ہے۔ جس کی ماہیت ہم اپنی اس عقل کے ذریعہ سے نہیں سمجھ سکتے۔ جب بچہ باپ کی کمر سے ماں کے پیٹ میں منتقل ہوتا ہے تو باپ کی پیٹھ میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ ماں کے پیٹ سے نکل کر دنیا میں آتا ہے تو ماں کے پیٹ میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ پھر بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپا اور اس دوران میں ہر آن تبدیلیوں سے گزرتا رہتا ہے اور بالآخر اس کے اس ظاہری وجود میں ایسی تبدیلی آ جاتی ہے کہ وہ دنیا والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے جسے ہم موت کہتے ہیں۔ مگر یہ موت خود نہ معلوم کس زندگی کی ابتدا ہے مگر چونکہ ہم عقل سے جو صرف ظاہری حواس کے ذریعہ سے ادراک کر سکتی ہے اس کو نہیں دیکھ سکتے اس لیے سمجھتے ہیں کہ زندگی کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن وہ لوگ جو روح کی ابدیت کے قائل ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ روح اللہ تعالیٰ کا حکم ہے تو وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ حکم ایک دفعہ

نافذ ہو کر کبھی ختم نہیں ہوتا۔ روح کا ظاہری پیکر جب اس سے جدا ہو جاتا ہے تو وہ حکم پھر ارادہ خداوندی کی طرف لوٹ جاتا ہے اور خدا کے ذہن میں وہ حکم محفوظ رہتا ہے۔ قرآن اسی بات کو بیان فرماتا ہے جب وہ کہتا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یعنی۔ ہم اللہ ہی کے ارادے اور حکم سے عالم وجود میں آئے اور پھر اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔ کبیر داس نے اسی مفہوم کو اس طرح بیان کیا ہے "ہر مرے تو ہم مریں، اپنی مرے بلا"۔

بابا صاحب ذرا رکے تو میں نے کہا۔ قطع کلام کی معافی چاہتا ہوں۔ خود جوش صاحب کی بھی ایک رباعی اسی مفہوم کی ہے۔ بابا صاحب نے فرمایا سنایئے۔

میں نے رباعی سنائی:

ہر روز بپا جشن کریں گے اے جوش
پیمانہ سرخوشی بھریں گے اے جوش
کیا موت کی ہستی ہے کہ دامن چھولے
اللہ مرا تو ہم مریں گے اے جوش

بابا صاحب نے فرمایا جی ہاں یہ کبیر داس ہی کے الفاظ جوش صاحب نے دہرائے ہیں مگر جوش صاحب مجموعہ اضداد ہیں ایک طرف فلسفی کا دماغ رکھتے ہیں جو حقائق کی معرفت رکھتا ہے۔ دوسری طرف شاعر کا دل رکھتے ہیں جو قانون تغیر سے پریشان ہو جاتا ہے۔ بابا صاحب کی دلچسپ باتیں بارہ بجے تک چلتی رہیں۔ اس دوران مٹھائی پھل اور چائے سے سب اہل محفل لطف اندوز ہوتے رہے اور کئی خواتین پانی پر دم کروا کروا کے لے جاتی رہیں۔ ایک خاتون نے بابا صاحب سے ہاتھ ملایا اور کچھ نوٹ ان کی مٹھی میں دبا دیے۔ بابا صاحب نے فرمایا۔ تم اتنے برس سے ملنے آتی ہو آج تک ایسا نہیں ہوا، اب ایسا کیوں ہے؟ وہ خاتون کوئی میمن تھیں۔ انھوں نے التجا کی کہ بابا صاحب یہ میری خواہش ہے اسے آپ قبول فرما لیں اور اگلی اتوار کی شام ہمارے گھر نکاح کی تقریب ہے اور میری خواہش ہے کہ نکاح آپ پڑھائیں۔ شاہ صاحب نے فرمایا۔ دیکھوں گا اگر کوئی ضروری کام نہ ہوا تو آؤں گا۔ مجھے وہاں بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے بابا صاحب سے اجازت طلب کی اور رخصت ہو کر پروفیسر احمد علی صاحب کے گھر چلا گیا۔

پروفیسر احمد علی صاحب:

احمد علی صاحب کا مکان بہادر آباد میں بابا صاحب کے مکان کے قریب ہی واقع ہے۔ وہ بہت محبت اور اخلاق سے ملے جیسا کہ ان کا دستور ہے۔ پروفیسر صاحب ترقی پسند تحریک کے اولین قافلہ سالاروں میں سے ہیں۔ انگریزی اور اردو ادب دونوں پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ غالب کے طرفدار بھی ہیں اور سخن فہم بھی۔ میرے دریافت کرنے پر اپنی ایک تازہ تصنیف سے کچھ حصے پڑھ کر سنائے۔ یہ کتاب انگریزی میں ہے اور امریکہ میں زیر طباعت تھی۔ اس کتاب میں انھوں نے اردو کے کلاسیکی شعرا جیسے میر تقی میر، غالب اور ان کے ہم عصر شعرا کا کلام اور ان کی شاعری کے مواد کا معاشرتی پس منظر بیان کیا ہے اور ان حالات کا تجزیہ نہایت عالمانہ اور محققانہ انداز میں کیا ہے جن حالات میں ان بڑے شعرا کی فکر پروان چڑھی۔ اسی سلسلے میں پروفیسر صاحب نے "غزل" کا مفہوم بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ "غزل دراصل غزال کی وہ چیخ یا کراہ" ہے جو وہ اس وقت نکالتا ہے جب زخمی ہونے کے بعد بھاگتے بھاگتے کہیں ایسی جگہ پھنس جائے جس کے آگے اس کے لیے سوائے موت کے اور کہیں جائے فرار باقی نہ رہے تو اس وقت آواز میں جو ناامیدی غم اور کرب کے جذبات شامل ہو جاتے ہیں، اس کو غزل کہتے ہیں۔ اسی طرح محبوب کے عطا کردہ غم جو غم دوراں سے مل کر شاعر کے حساس دل سے کراہ بن کر لب فریاد تک آ جاتے ہیں ادب میں غزل کے نام سے موسوم ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ غالب نے کہا ہے کہ:

نے گل نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز　　　میں ہوں اپنی شکست کی آواز

یا

دل میں آ جائے ہے ہوتی ہے جو فرصت غش سے
اور پھر کون سے نالے کو رسا کہتے ہیں

پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ میر نے جس عطار کے لونڈے کا ذکر کیا ہے وہ خود ہمارا معاشرہ ہے۔ ہم بھی کیا سادہ لوگ ہیں کہ جس معاشرے سے ہمیں غم ملتے ہیں، ہم اسی معاشرے سے ان کے علاج کی توقع رکھتے ہیں۔

غالب کے متعلق پروفیسر احمد علی صاحب کا خیال ہے کہ غالب کوئی فلسفی نہ تھا بلکہ اپنے ماحول اور زمانے کا گہرا وجدان رکھتا تھا۔ اس لیے اس کا ہر شعر حقیقت سے ہم آہنگ

ہے۔ پروفیسر صاحب کے خیال میں غالب کسی ڈومنی پر عاشق نہیں تھا بلکہ بہادر شاہ کے محلات میں سے کسی بیگم پر عاشق تھا۔ غالب کا ایک شعر ہے کہ:

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں
طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

کے متعلق انھوں نے فرمایا کہ اس شعر کے دوسرے مصرع میں آمد آمد کے بعد اضافت نہیں ہے بلکہ طوفان کی آمد کا اعلان ہے۔ چونکہ فصلِ بہار ہے اور بہار کے موسم میں ہر قسم کا جوش اور طوفان آتا رہتا ہے اس لیے جوشِ بہار میں جب طوفان کی شکل پیدا ہو جائے گی تو آشیانے کا تنکا بھی باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے اے عندلیب ابھی سے ایک مٹھی تنکے اپنے آشیانے کے لیے محفوظ کر لے۔

غرض پروفیسر صاحب سے دو بجے تک بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے اپنی تصنیف انگریزی کتاب کے جستہ جستہ حصے پڑھ کر سنائے۔ میں دو بجے ان سے رخصت ہو کر کوئی تین بجے گھر پہنچا۔

میں نے دوسرے دن جوش صاحب کے خط کا جواب لکھ کر سپردِ ڈاک کر دیا اور بابا صاحب سے جو گفتگو ہوئی تھی اس کی تفصیل بھی لکھ دی۔ مگر بہت دنوں تک جوش صاحب کا کوئی خط نہیں آیا۔ معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے مزاج پرسی کا ایک اور خط لکھا۔ بالآخر فروری کے پہلے ہفتے میں ان کا یکم فروری ۸۲ء کا لکھا ہوا خط ملا۔

۱۔ دوسرے مصرع میں پہلی آمد کے بعد وقف اور دوسری آمد کی دال کو مکسور ہونا چاہیے ورنہ مصرع بحر سے خارج ہو جائے گا۔

۱۹۷۳ء کے واقعات

مکتوب کافر

از

اسلام آباد

۱۔۲۔۷۳ء

سرِشام

حضرت خورشید۔ سورج ڈوبنے والا ہے اور میں کانپتے ہاتھوں سے آپ کو خط لکھ رہا ہوں یعنی شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند۔ بیماری سے اس قدر نڈھال ہوں کہ بات جا جا کر لکھ رہا ہوں، پھر بھی حروف کی شکلیں بگڑتی چلی جا رہی ہیں۔ اب لکھا نہیں جاتا۔ اگر خدا نخواستہ زندہ رہا تو کل لکھوں گا۔

لیجیے تاریخ بدل گئی۔ آج دوسری فروری ہے اور حضرت اکبر الٰہ آبادی کے قول:

افسوس ہے کہ زندہ ہوں کہنا پڑا ہے حال

کیا مختصر جواب یہ ہوتا کہ مر گیا

کے مطابق آپ سے اپنا حال بیان کر رہا ہوں۔ آج خلافِ معمول دیر اور بہت ہی دیر سے بیدار ہوا۔ رات کو سوا سات بجے تکیے پر سر رکھ دیا تھا۔ بہت دیر میں نیند آئی۔ دماغ سوتے میں تمام رات باتیں کرتا رہا اور میرے آخری مجموعۂ کلام۔ محمل و جرس "کا دیباچہ لکھتا رہا۔ نیند کا رشتہ بار بار ٹوٹتا اور جڑتا رہا۔ اب خدا خدا کر کے سات بجے بیدار ہوا اور کراہ کراہ کر خط

لکھ رہا ہوں۔ بات یہ ہے کہ میرا دل اب آہستہ آہستہ دم توڑ رہا ہے۔ بھوک بند ہو چکی ہے۔ سانس کھینچ کھینچ کر لیتا ہوں۔ ناتوانی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ کھڑا ہوتا ہوں تو پنڈلیاں کانپنے لگتی ہیں۔ جی اس قدر اداس ہے کہ خوش مزاجی مفقود ہو چکی ہے۔ فانی کی طرح چپ چپ اور مغموم رہنے لگا ہوں۔ خون اور پیشاب کا امتحان اور ایکس رے سے کسی خاص مرض کا پتہ نہیں چلتا۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپ کے اعضائے رئیسہ نارمل ہیں لیکن اسے کیا معلوم کہ میں آہستگی کے ساتھ ختم ہوتا اور بجھتا چلا جا رہا ہوں۔ چوں قضا آید طبیب ابلہ شود۔ اس بجھاوٹ کے باوجود ارادہ کر رہا ہوں کہ بیتے عشرے میں کراچی آ کر آپ سب سے مل لوں اور آخری بار سب کو گلے لگا لوں۔ بہت دن سے دل گواہی دے رہا تھا کہ یہ ۱۹۸۲ء میرا آخری سال ہو گا۔ سو بحمداللہ کہ اس کے آثار اب ظاہر ہو چکے ہیں۔ ہائے میری فتنہ آخر الزماں بھی تقریباً ایک سال سے بیمار ہے اور اس کی بیماری کا تسلسل گھن کی طرح میری زندگی کو چاٹے جا رہا ہے۔ ہم تبرک ہیں بس اب کر لے زیارت مجنوں"۔

آپ کا چاہنے والا

جوش مرحوم

جوش صاحب کی آمد اور گورنر ہاؤس میں قیام:

چھٹی فروری ۱۹۸۲ء کو جوش صاحب کا ٹیلی فون پنڈی سے آیا کہ وہ دسویں فروری بروز ہفتہ بذریعہ تیز گام کراچی آ رہے ہیں اور مجھ سے کہا کہ میں راغب صاحب کو ساتھ لے کر کینٹ اسٹیشن ضرور آؤں۔ چنانچہ میں اور راغب صاحب مرادآبادی تقریباً دس بجے دسویں فروری کو اسٹیشن پہنچ گئے۔ تیز گام دس بج کر ۴۵ منٹ پر کینٹ اسٹیشن پہنچی ہم نے جوش صاحب کا استقبال ان کے کوپے میں جا کر کیا اور جب ہم لوگ اسٹیشن کے باہر آئے تو دیکھا کہ جوش صاحب کے لیے گورنر صاحب کا عملہ کھڑا ہوا ہے اور گورنر ہاؤس کی گاڑی سیڑھیوں سے لگی کھڑی ہے۔ میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے تو انھوں نے کہا کہ اس دفعہ میر رسول بخش صاحب تالپور نے ان کو ٹیلی فون کر کے خاص طور پر بلوایا ہے اور یہ بھی خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ انھی کے مہمان ہوں۔ جوش صاحب نے اپنا سامان تو

گورنر ہاؤس کی گاڑی میں رکھوا کر اس کو رخصت کیا اور خود میری گاڑی میں بیٹھ گئے اور کہا کہ گورنر ہاؤس چلیے ۔ چنانچہ ہم تینوں گورنر ہاؤس پہنچے گیٹ پر سیکورٹی والوں نے جب جوش صاحب کو دیکھا تو فوراً ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی ۔ اس طرح جب ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو وہاں کے عملے نے ہم لوگوں کو گورنر ہاؤس میں شاہی مہمان خانے کے ایک عالیشان کمرے میں پہنچا دیا جہاں جوش صاحب کا سوٹ کیس اور بستر پہلے سے موجود تھا ۔ جوش صاحب نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے ہی تھے کہ چائے ، بسکٹ ، سموسے اور پھل وغیرہ آگئے ۔ ہم لوگ چائے پی رہے تھے کہ میر رسول بخش صاحب تالپور گورنر سندھ تشریف لے آئے ۔ ان کے ساتھ ملٹری سیکرٹری اور عملے کے دوسرے ارکان بھی تھے ۔ میر صاحب نے نہایت احترام اور محبت سے جوش صاحب سے معانقہ کیا اور دریافت کیا کہ ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف یا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ؟ جوش صاحب نے تو کہہ دیا کہ انھیں وہاں کیا تکلیف ہو سکتی ہے مگر میں نے کہا میر صاحب ، ہم لوگ تو یہ چاہتے ہیں کہ جب تک جوش صاحب کراچی میں قیام کریں ہم ان کے ساتھ ہی رہیں مگر آپ نے ان کو گورنر ہاؤس میں ٹھہرا لیا ہے جہاں کی سیکورٹی کی وجہ سے ہمارا ہر وقت آنا جانا مشکل ہو گا اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو ہم انھیں اپنے غریب خانے پر لے جاؤں اور آپ سے ملنے تو جوش صاحب ہر وقت آتے ہی رہتے ہیں ۔

میر صاحب نے فرمایا سائیں! جب تک میں یہاں ہوں یہ گورنر ہاؤس بھی غریب خانہ ہی ہے ۔ پھر اپنے ملٹری سیکرٹری سے کہا کہ جوش صاحب سے ملنے کے لیے جو صاحب خواہ کسی وقت آئیں ، ان کو نہایت احترام سے لا کر ملایا جائے ۔ پھر فرمایا سائیں کبھی مجھ فقیر کو بھی تو جوش صاحب کی خدمت کا موقع دیجیے ۔ اس پر راغب صاحب نے فی البدیہہ یہ قطعہ گورنر ہاؤس کے پیڈ کے ورق پر لکھ کر میر رسول بخش صاحب کو دیا ۔

مداحِ اہلِ بیتِ نبیؐ ہیں رسول بخش
ہوں سدا بہار مسرت کے پھول بخش
منصب گورنری کا جو بخشا ہے سندھ کی
اس منصبِ جلیل کی مدت کو طول بخش

ٹالپور صاحب قطعہ پڑھ کر مسکرائے اور بولے راغب صاحب اس دفعہ آپ کی دعا قبول ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ مجھے بہت تعجب ہوا کہ میر صاحب نے یہ بات کیوں کہی۔ مگر یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ اس واقعے کے تیسرے دن یعنی ۱۳ ویں فروری کو ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میر رسول بخش ٹالپور کو استعفیٰ دینا پڑا۔ بہرحال یہ تو بعد کی بات ہے۔ اس وقت جوش صاحب سفر کی تھکان کی وجہ سے آرام کرنا چاہتے تھے اس لیے ہم لوگوں نے شام کو آنے کا وعدہ کیا اور گھر آ گئے۔

مغرب سے کچھ پہلے میں اور راغب صاحب گورنر ہاؤس پہنچے تو میر صاحب بھی جوش صاحب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں میں جو باتیں ہو رہی تھیں ان سے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ بھٹو صاحب کے تعلقات میر صاحب کے بڑے بھائی میر علی احمد ٹالپور سے بہت خراب ہو گئے ہیں اور بھٹو صاحب علانیہ علی احمد صاحب کو برا بھلا کہنے لگے ہیں جو رسول بخش صاحب کے لیے سخت تکلیف دہ ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے کہا کہ مجھے اپنے بڑے بھائی کی عزت اور شرافت گورنری کے منصب سے زیادہ عزیز ہے لہٰذا میں نے گورنری کو خیرباد کہنے کا دوٹوک فیصلہ کر لیا ہے۔ اس کے علاوہ ممتاز بھٹو صاحب کا رویہ بھی ان کے لیے پسندیدہ نہیں ہے۔ مگر ہمارے پہنچنے کے بعد گفتگو کا رخ شعر و شراب کی طرف مڑ گیا۔ سورج غروب اور جوش صاحب طلوع ہو گئے ..... اور شاعری شروع ہو گئی۔ اتنے میں کچھ اور احباب بھی آ گئے۔ جوش صاحب کے نواسے بھی ان سے ملنے آ گئے۔ جوش صاحب نے کہا کہ اسلام آباد میں بڑی تنہائی ہے اور کراچی کے احباب انھیں بہت یاد آتے ہیں۔ اس رات ہم سب گورنر صاحب کے مہمان تھے۔ انھوں نے نہایت پرتکلف کھانے کا انتظام فرمایا تھا۔ جوش صاحب نے میری طرف دیکھ کر فرمایا، خورشید علی خاں! کیا بات ہے تم پر توہٹ کر جوانی آ رہی ہے؟ میں نے کہا جوش صاحب یہ آپ کی محبت کی نظر ہے بلکہ آپ کا حسن نظر ہے اور بقول ماہر القادری صاحب:

میرے حسن نظر کی بدولت   کوئی زہرہ جبیں بن گیا ہے

راغب صاحب نے اسی وقت گورنر ہاؤس کے پیڈ پر ایک رباعی لکھ کر پڑھ دی:

کس درجہ وجیہ و خوبصورت ہوں گے   شایانِ محبت و رفاقت ہوں گے

اس وقت بھی شعلہ ہیں لوکپن میں ضرور　　خورشید علی خاں بھی قیامت ہوں گے

فی البدیہہ بموجودگی حضرت جوش ملیح آبادی مدظلہ

راغب مراد آبادی۔ ۱۔ ۲۔ ۷۳ء

غرض اسی قسم کی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں اور ہم لوگ تقریباً ۹ بجے جب جوش صاحب بستر پر لیٹ گئے، اپنے گھر لوٹے۔ دوسرے دن جوش صاحب اپنے گھر والوں سے ملنے فیڈرل بی ایریا کے مکان آئے اور یہاں شام تک ٹھہر کر شام کو گورنر ہاؤس کی گاڑی میں واپس چلے گئے۔

اس کے دوسرے دن بارھویں فروری کو میں، راغب صاحب، فراست رضوی اور ڈاکٹر عالیہ امام سب لوگ دن ہی سے جوش صاحب کے کمرے میں جمع ہو گئے۔ اس دفعہ میں اپنا ٹیپ ریکارڈر بھی ساتھ لے گیا اور جوش صاحب نے جو کچھ سنایا وہ ٹیپ کر لیا۔ پہلے تو انھوں نے کچھ رباعیات سنائیں پھر اپنی تازہ نظمیں "فشار دوشیزگی" اور "دو شعلوں کے درمیان" سنائیں۔ اس کے بعد ایک "مکالمہ مابین شبیر حسن خاں آفریدی اور جوش ملیح آبادی" سنایا۔ یہ مکالمہ دراصل "ای گو اور سوپر ای گو" (Ego and Superego) کے درمیان کشمکش کا آئینہ دار ہے۔ شبیر حسن خاں آفریدی علامت ہیں ایک مفکر فلسفی اور دانشور کے ضمیر کی اور جوش ملیح آبادی ایک حسن پرست اور رومانی جذبات رکھنے والے شاعر کی بنیادی جبلتوں کے آئینہ دار ہیں۔ اس مکالمے سے جوش صاحب کی شخصیت کی داخلی کشمکش کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

آئیے آپ کو بھی رندان پختہ مغز کی اس بزم خاص میں لیے چلتے ہیں۔ آپ بھی بقدر پیمانۂ فہم اس سے لطف اٹھائیے۔

پہلے رباعیات سنیے۔

تاریخ نے کی عقدہ کشائی کیا کیا　　ماضی نے جھلک اپنی دکھائی کیا کیا
نکلا جو بصد شکوہ سلطاں کا جلوس　　شاعر کی گدائی مسکرائی کیا کیا

راغب صاحب نے کہا جوش صاحب یہ بہت پرانا مال ہے۔ غالباً ۱۹۳۰ء کی رباعی ہے۔ جوش صاحب نے کہا جی ہاں مال تو پرانا ہے مگر تاثیر ہمیشہ نئی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ:

کم کن غرور ناز کہ دیداست روزگار
چین قبائے قیصر و طرف کلاہ کے

اسکے بعد یہ رباعی پڑھی:

شادی ایک آن کا ہے پیغام نشاط
پھر موت کے دم تک اک مسلسل سکرات
گزرے گا ادھر سے کل جنازے کا جلوس
جس رہ سے گزر کے آج نکلی ہے برات

بنو بی بی بنے کو ترپائیں گی
رخصت جو ہوئیں تو پھر نہیں آئیں گی
اٹھی ہے جنھوں نے آج مکھڑے سے نقاب
منھ ڈھانپ کے ایک دن چلی جائیں گی

بنو بی بی تمھیں یہ رلوائیں گے
دولہا صاحب بڑے ستم ڈھائیں گے
گھوڑے پہ جو بیٹھ کر یہاں آئے ہیں
تابوت میں لیٹ کر چلے جائیں گے

رخسار ہیں تجھ تو پیکر سمن
کیا حسن خدا شکن ہے اللہ غنی
زلفیں ترے مکھڑے پہ جو آجاتی ہیں
خود طور سے آتی ہے صدائے ارنی

چکھتا ہوں زبان گل سے شہد کو کو
پیتا ہوں تخیل کے سبو میں پی ہو
احساس پہ ناپتا ہوں طول الوان
انفاس پہ تولتا ہوں وزن خوشبو

اس رباعی کے تخیل کی نزاکت کی سب نے دل کھول کر داد دی۔

اس کے بعد جوش صاحب نے اپنی تازہ نظمیں سنائیں۔ پہلی نظم کا عنوان ہے "فشار دوشیزگی"۔

فشارِ دوشیزگی

یہ ازل سے ہے عشق کا دستور
فرش سے بام عرش تک جائے

بات پردوں میں یہ گل چٹکے
اور سارا نگر مہک جائے

نظروں نظروں میں خواہ باتیں ہوں
پھر بھی آواز دور تک جائے

اور خصوصاً کسی حسینہ کی آنکھ
جب کبھی غیر سے اٹک جائے

پھر تو بس ناروا جسارت کی
پل میں ہر کان تک بھنک جائے

تن میں فرقِ صالحین کرام
سن کے یہ ماجرا چٹک جائے

فرطِ شرمندگی سے کعبے کا
سر جھکے اور منہ لٹک جائے

ہر زباں ہر مکاں سے اٹھ اٹھ کر
شورِ تشنیع دور تک جائے

حسن ظنوں کے بل چلے پھر بھی
سیکڑوں کوس تک دھمک جائے

آتشِ قہر کشتگانِ رسوم
یہ دھمک سنتے ہی بھڑک جائے

متقیانِ زماں کے صبر کا جام
شدتِ جہل سے چھلک جائے

آہوں کی کمان خدنگ انداز
فرقِ معصوم پہ کڑک جائے

ایک اک روسیاہ کی پسلی
شوقِ تسخیر سے پھڑک جائے

ابلقِ خزاں کے طعنوں سے
دلِ نازِ بہار پک جائے

ہاں اسی خوف سے وہ کوشاں ہے
کہ نہ آنسو کوئی ٹپک جائے

ڈر رہی ہے کہ وقتِ آرائش
نہ کلائی کہیں مڑک جائے

میں جب آؤں تو چھت سے کھڑکے پر
نہ کہیں چاندنی چٹک جائے

کہیں ایسا نہ ہو دمِ گفتار
کہ گلے میں صدا اٹک جائے

کہیں ایسا نہ ہو کہ سسکی سے
شیشۂ رازِ دل درک جائے

دلِ آشفتہ کار کا چھالا
نہ کہیں آنکھ میں ٹپک جائے

پھر بھی کیوں کر چھپائے سوزِ دروں
جب کسک دل کی آنکھ تک جائے

کیا چھپیں الجھنیں کہ جب سر سے
بار بار اوڑھنی ڈھلک جائے

پھول سونگھے تو فرطِ حرماں سے
رخ پہ کانٹا سا اک کھٹک جائے

زور سے سانس لے تو خونِ جگر
جلد رخسار سے چھلک جائے

اُٹھیں ملنے کے واسطے آنکھیں
اور فضا میں نظر بھٹک جائے

جب تبسم لبوں پہ کھینچ کے لائے
فرطِ غم آنکھ میں چمک جائے

چپ رہے تو نگاہ چیخ اٹھے
اور چلے تو قدم بہک جائے

لٹ ہٹائے تو ہاتھ کانپ اٹھیں
لب ہلائے تو دل دھڑک جائے

ضبط کرلے جو ایک ہچکی بھی
سو جگہ سے قبا مسک جائے

تمام حاضرینِ محفل نے ایک ایک شعر کی دل کھول کر داد دی۔ ہر شعر بار بار پڑھوایا گیا اور ہر ایک نے مصرع اٹھایا۔ اور جب یہ نظم ختم ہوئی تو دوسری نظم جو دراصل ان کی تازہ وارداتِ عشق کی منظوم تفصیل ہے، سنائی۔

دو شعلوں کے درمیان

پھر وہی شغلِ آہ و زاری ہے
پھر وہی زندگی ہماری ہے

گنبدِ شیب میں بصد ہیجان
گونج اٹھا ہے شباب کا طوفان

دن کو چھاپے ہوئے ہے آدھی رات
شور افگن ہے جیٹھ میں برسات

کال سے تپ رہا تھا جو صحرا
آ گئی ہے ارے وہاں بسیا

دل کے قبضے میں آ چکا ہے دماغ
گھپ اندھیرے کی جیب میں ہے چراغ

آہ برلب ہے لیلیٰ ادراک
کاسۂ سر میں اڑ رہی ہے خاک

بند ہے بابِ شرحِ ذات و صفات
غرقِ حیرت ہیں فکر کے لمحات

سوگ میں ہو چکی ہیں اب ٹھنڈی
چوڑیاں نو عروسِ حکمت کی

دوش پہ تجربوں کا لاشا ہے
جوش صاحب! یہ کیا تماشا ہے

کس طرف ہے دماغ کی شاہی
اب کہاں ہے وہ نازِ آگاہی

ہونٹ ہیں خشک اور آنکھیں نم
خیریت تو ہے قبلۂ عالم

مجھ پہ آنسو بہاؤ اے یارو
خشک دل ہو تو کنکریں مارو

ہاں یہ موقع ہے صوفیانِ کرام
جلد لوٹو ثواب غیبت کا
بن کے نَسادو اٹھو پئے تشہیر
کہ ہے حکمت الٰہ و فکر پناہ
توڑ بیٹھا ہے رشتۂ دارین
کیوں کہ اسے کم نظر جہول و ظلوم
کہ ہے سرکار دختران قمر
اے حریفانِ علم و جہل پناہ
کہ کوئی گل رخ و سراپا ناز
اشک آنکھوں سے جب بہاتی ہے
باشناسندگان علم و نظر
بکھری جب پہاڑ اٹھاتی ہے
کیا کہوں دل مرا ہے کیوں بے چین
ناز عذرا ہیں قمر سلمیٰ ہیں
کوک دونوں کنواریاں دونوں
لچکاتے بدن بہکتی چال
بل آڑے ہیں اور ٹیڑھی مانگ
کپکپاتی کمان پنڈوں میں
جب بدن میں ہوا سنکتی ہے
سانس لیتی ہیں جب بہ فرطِ نمو
ناز مکھڑوں پہ جب مچلتا ہے
چولیوں میں غضب کی وہ ہمکان
ہائے کولہوں کا ہر قدم پہ گھماؤ
آمد آتش جوانی ہے

شہر بھر میں کرو مجھے بدنام
ہاں یہی وقت ہے عبادت کا
اس خطا پہ چلاؤ طنز کے تیر
پختہ سر پختہ مغز پختہ نگاہ
دو نگاران شوخ کے مابین
تم کو یہ بات ہو سکے معلوم
کیا گزرتی ہے قلبِ شاعر پہ
تم ہو اس سانحہ سے کب آگاہ
دوش پہ ڈال کر ردائے نیاز
لو ستاروں کی تھرتھراتی ہے
تم کو اس بات کی نہیں ہے خبر
نبض آفاق ڈوب جاتی ہے
دو نگاران شوخ کے مابین
ہائے میں کیا کہوں کہ وہ کیا ہیں
خیر سے ہیں کنواریاں دونوں
سینے اونچے کمر سے نیچے بال
الھڑیں الہڑائیں اوٹ پٹانگ
رسمساتی اٹھان پنڈوں میں
خون میں کم سنی جھنکتی ہے
دوڑ جاتی ہے دور تک خوشبو
خال و خد سے عبیر ابلتا ہے
جوں حبابوں کی آب جو میں اٹھان
ڈگمگائے بھنور میں جیسے ناؤ
آگ پہ کم سنی کا پانی ہے

جلدی جلدی جو بات کرتی ہیں
لعل لب سے ہوا کترتی ہیں

جھولتی ہیں جو صحن گلشن میں
کوک اٹھتی ہیں کوئلیں تن میں

زیرِ دل آنچ سنسناتی ہے
عرق گالوں میں جھن جھناتی ہے

مسکراتی ہیں جب بہ ناز و ادا
تیغ اٹھتا ہے رنگ مکھڑوں کا

ہائے کیسی پڑی ہے یہ افتاد
صید ہے ایک اور دو صیاد

پہلے تھی ایک ہی سے آنکھ لڑی
دوسری آ کے دھم سے کود پڑی

جس نے آ کے اٹھائے وہ طوفان
کہ خطا ہو گئے مرے اوسان

پہلی آئی بناز و سرمستی
دوسری چل پڑی زبردستی

میں نے اس سے کہا کہ اے الھڑ
مجھ کو زلفوں کے دام میں نہ جکڑ

ایک گل رخ کے نام اے نادان
کر چکا ہوں میں رہن دل کا مکان

میرے دل پر چلا نہ تیرِ نگاہ
حملہ آور نہ مجھ پہ ہو اللہ

سن کے یہ التجا بصد افسوں
اس نے منہ پھیر کر کہا "اونسوں"

الاماں سو کٹاؤ اونسوں میں
ہاتھ کا وہ گھماؤ اونسوں میں

دل مرا ہو گیا تہ و بالا
اف کلائی کے لوچ کا بھالا

پھر بپا ہو گیا وہی غوغا
آج سے تیس سال پہلے کا

ہائے دل کا نہ کیوں ہو کام تمام
اک حسیں چہرہ ہے تو اک گلفام

ایک میں حلم ایک میں چھلبل
ایک گمبھیر دوسری چنچل

ایک میں شاعری کا سوز و گداز
ایک میں راگنی کا عشوہ و ناز

اس کے مکھڑے پہ ہے جمالِ شعور
اس کے چہرے پہ شوخیوں کا وفور

ایک شیدا ہے شعر و حکمت پر
ایک جولاں رہے شرارت پر

اس طرف دانت میں دبی ہوئی پور
انگلیوں کی ادھر چٹختی پور

صبح صادق کا ایک میں ہے رنگ
صبح کاذب کی دوسری میں امنگ

رہن قزاک ابھی ہیں اس کے بان
اور یہ کڑکا رہی ہے سر پہ کمان

اس طرف تنگ رہتے ہیں بند قبا
اس طرف کھل رہے ہیں نام خدا

اک طرف شرم کی لچکتی شاخ
ایک طرف جھن جھن چٹاخ پٹاخ

اس کو دیکھو تو یہ بگڑتی ہے
اس کو دیکھو تو وہ جھگڑتی ہے

ایک کہتی ہے جی جلاتے ہو
اس کو سینے سے کیوں لگاتے ہو

ایک کہتی ہے ظلم کرتے ہو
کیوں جی اب دوسری پہ مرتے ہو

ایک کہتی ہے رندمست ہو تم
ایک کہتی ہے بت پرست ہو تم

رسم راہ وفا کے تارک ہو
تم موحد نہیں ہو مشرک ہو

خود تو دونوں کے درمیاں اصلا
کھل کے ہوتا نہیں کبھی جھگڑا

دونوں الزام مجھ پہ دھرتی ہیں
آنکھوں آنکھوں میں طنز کرتی ہیں

ٹوکتی ہیں نظر سے باہوں کو
تاڑتی ہیں مری نگاہوں کو

اس کشاکش میں ایک کو بھی آہ
دیکھ سکتا نہیں جھو کے نگاہ

دم بدم ٹوکتی ہیں جڑتی ہیں
داہنے بائیں نظریں مڑتی ہیں

اس پہ جچتی ہے ایک پل جو نظر
آنکھ سے مارتی ہے وہ ہنٹر

یوں نگاہوں میں ہے مرور و عبور
جیسے ڈھیلوں سے بدحواس طیور

میں اِدھر جاؤں یا اُدھر جاؤں
یا دوراہے پہ گھٹ کے مر جاؤں

جاں مضطر ہے دل مشوش ہے
کردگارا! بڑی کشاکش ہے

ہر نفس قہر آسمانی ہے
کچھ بھی ہو دل میں اب یہ ٹھانی ہے

اپنی پہلی کا در نہ چھوڑوں گا
دوسری کا بھی دل نہ توڑوں گا

اس کو رکھوں گا قلب سوزاں میں
اور اسے حجلۂ رگ جاں میں

دوسری پہ جان واروں گا
اور پہلی پہ جان واروں گا

اس واردات قلبی کے ہر شعر بلکہ مصرع پر لوگوں نے حیرت زدہ ہو کر داد دی کیونکہ اس مثنوی میں انھوں نے پہلی مرتبہ کھل کر اعتراف حقیقت کیا ہے۔ اس کے بعد جوش صاحب نے ایک اور نظم سنائی۔

سینے پہ چل رہی ہیں دھندلکے میں گولیاں / یوں کھا رہی ہیں نیند میں الھڑ جھکولیاں
چھپیاں چشم ناز میں گھولے ہوئے ہیں رنگ / اور ہو رہی ہیں دھوم سے ڈوروں میں ہولیاں
بند قبا سے یوں ہے ترنگوں کی چھیڑ چھاڑ / گویا گلی سے باد سحر کی ٹھٹھولیاں
مکھڑوں کی گرد و پیش میں چنگاریوں کے غول / زلفوں کی چھاؤں میں ہیں گھٹاؤں کی ٹولیاں
یوں ایک آنکھ میچ کے ظالم کترنہ کور / تیروں سے بھر گئی ہیں نگاہوں کی جھولیاں
فرط حجاب سے ہیں ترنگیں دبی ہوئیں / جس طرح شال باف میں پانوں کی ڈھولیاں
گالوں پہ ہے وہ رنگ کی چہکار وقت صبح / جس طرح پھول بن میں پرندوں کی بولیاں

پھر جوش صاحب نے فرمایا کہ آنگن میں بیٹھی چاند دیکھ رہی تھی۔

یوں جا رہی ہیں مست نگاہیں سوئے قمر / پریوں کی جیسے دوش ہوا پر ٹھٹولیاں
نکہت سے یوں تن میں ہیں ورزیں پڑی ہوئیں / انگڑائیوں میں جیسے مسکتی ہیں چولیاں

جوش صاحب نے نظم ختم کی تو میں نے کہا۔ جوش صاحب آپ کی ان تازہ واردات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشقی کا کوئی موسم نہیں ہوتا اور انسان خواہ عقل و شعور کی کتنی بلندی پر کیوں نہ پہنچ جائے اور عمر کی خواہ کسی منزل میں کیوں نہ ہو وہ جنسی جذبات کی گرفت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ بقول غالب

خانہ زاد زلف ہیں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں
ہیں گرفتار وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

جوش صاحب۔ مگر یہ ہے بری بات، بہت بری بات ہے۔

میں۔ جی نہیں۔ یہ بری بات نہیں ہے۔ دراصل فطرت کے جتنے تقاضے ہیں آپ ان کو برا نہیں کہہ سکتے۔ یہ جو آپ ان جذبات کو برا کہہ رہے ہیں تو ماحول کی قدروں کا خیال فرما رہے ہیں ورنہ جب آپ ان کیفیات کو شعر میں بیان فرماتے ہیں تو بلا جھجک تمام جزیات تک بیان کر جاتے ہیں اور فن شاعری کے سہارے عشق و محبت کے جذبات کو زندگی کی اعلیٰ ترین اقدار کے طور پر پیش کر کے ان ہی باتوں کو قابل فخر بنا دیتے ہیں۔ تو سچی بات یہ ہے فطرت کے تقاضوں میں در حقیقت کوئی برائی نہیں ہے۔

جوش صاحب۔ جی ہاں مگر عقل منہ پر تھوکتی ہے۔

می۔ یہاں دراصل عقل ماحول سے ڈر جاتی ہے۔ وہ مروجہ معاشرتی قدروں سے خوفزدہ ہو جاتی ہے جیسے آپ عقل کا منہ پر تھوکنا فرما رہے ہیں۔

جوش صاحب۔ مگر صاحب، جو کچھ بھی ہو عقل اس کو تسلیم نہیں کرتی۔

رؤف صاحب۔ جوش صاحب! کیا آپ "یادوں کی برات" کے نئے ایڈیشن میں ان واقعات کا اضافہ فرمائیں گے۔

جوش صاحب۔ جی ہاں ضرور۔

می۔ یہ تو انیسواں رومانس ہو گا بلکہ اس کو انیس (الف) اور انیس (ب) کہنا چاہیے کیونکہ ان دونوں واقعات کو ایک بریکٹ میں لکھنا چاہیے۔

جوش صاحب۔ جی ہاں، جی ہاں۔ مگر صاحب یہ بہت بڑا سانحہ ہے۔ ضمیر لعنت کرتا ہے مگر دل اس کی پروا نہیں کرتا۔ اس کشمکش کو میں نے ایک مکالمے کے انداز میں بیان کیا ہے اس میں میں نے اپنی شخصیت کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک شبیر حسن خاں آفریدی ہیں جو ضمیر کی آواز بن کر معاشرتی اخلاقی اقدار کی وکالت کرتے ہیں اور منطقی استدلال کے ذریعے سے دانائی اور علم کے علمبردار ہیں۔ دوسرے جوش ملیح آبادی ہیں جو حسن پرست شاعر ہیں اور دل کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اب آپ یہ مکالمہ سنیے۔ اس میں، میں نے بہت سختی سے اپنا محاسبہ کیا ہے۔

مکالمہ

مابین شبیر حسن خاں آفریدی اور جوش ملیح آبادی

شبیر حسن خاں صاحب فرماتے ہیں۔ "ہائیں! یہ کیا دیکھ رہا ہوں۔ ارے یہ کس گلی میں دبکتے گھٹنے اور دھڑکتے دل کے ساتھ ٹہل رہا ہے۔ او باغی اور بھگوڑے جوش! فرق مبارک پر ماہ و سال کے یہ انبار اور چشم بد دور یہ طفلانہ رفتار۔ اللہ اللہ یہ غروب کا ہنگام اور نام خدا یہ کوچہ طفلاں میں خرام۔ یہ خارستان اضمحلال اور گلگشت کوچہ گل عذار۔ تجھ کو گیسوؤں کے پیچ و خم سے نکالا اور عقدہ ہائے کائنات کے سلجھانے کی راہ پر ڈالا۔ تجھ کو افلاک کے، حواس چھک لینے والی

چکا چوند کے میدان سے بچایا اور ثوابت و سیار کے آنکھیں کھول دینے والے دائرے میں لایا۔ تیرے افسوں فروش دل کو بجھایا اور تیرے طاق میں آفتاب داغ جگایا۔ تجھ کو مجنوں کے گلی ڈنڈا کھیلنے کے میدان سے ہٹا کر سقراط کی دانش گاہ میں داخلہ دلایا اور چار دن میں سفیدی کی طرف مڑ جانے والی کالی زلفوں کی خواب آور چھاؤں سے اٹھا کر تجھ کو علم و نظر کے ادبی سائے میں بٹھایا لیکن اے دانش و رنگ کے رسیا قلندر سے جوش۔ تو پھر بھی راہ راست پر آنا تھا نہ آیا۔ (پورا محاکمہ کیا ہے تحقیق کے ساتھ) اور ایک الھڑ کی صرف ایک موج تبسم کی پکار سن کے اگاڑی پچھاڑی تڑا کر جادہ حکمت سے پل بھر میں بھاگ کھڑا ہوا اور بالکل اس لونڈے کی طرح جو استاد کا تھپڑ کھا کر مکتب سے اس برق رفتاری سے دیدیا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے کہ اس کی ایڑیاں اس کی کمر پر بجنے لگتی ہیں۔ حیف صد حیف کہ تیری بانسوں اور گودوں پر جان چھڑکنے والی شاعری نے تجھ کو مجھ سے چھین لیا۔ افوہ! یہ کم بخت شاعری۔ یہ بلائے بد شاعری۔ یہ بلیں اچھلتی۔ دندناتی کودتی۔ ولولاتی۔ پھاندتی۔ پھلانگتی۔ شلنگیں بھرتی۔ ہوائیوں کی طرح اڑتی، لٹوؤں کی طرح گھومتی اور بگولوں کی مانند لگراتی شاعری۔ یہ چنچل چلبلی۔ شبابی۔ چنچور۔ چٹوری۔ چھلاوا، اچھال چھکا اور اوباتی چھوکری شاعری جو ہر صبح کو نئی نئی وادیوں میں جھومتی۔ ہر رات کو نئے نئے چاندوں کو چومتی۔ ہر آن نئے نئے مکھڑوں کے بوسوں کو لبوں کے نیچے میں ڈوبتی۔ نئے نئے ساحلوں پر منڈوے چھواتی۔ نئی نئی پائلوں کو جھنکاتی۔ نئی نئی گلیوں میں دھونی رماتی اور جب اس چتناغ چپاغ کو نچلے بیٹھنے کا اشارہ دیا جاتا ہے تو آسمان کی طرف اشارہ کر کے گانے لگتی ہے۔

در ہیچ مقام نہ گذارد بہ درنگے   از بوے بہ بوے برد از رنگ بہ رنگے

افسوس اس متواتر دھمال اور مسلسل دھما چوکڑی سے کبھی نہ تھکنے والی اور ہر اودھم کے بعد تازہ دم ہونے والی چھوکری کے مزاج کی افتاد ہی کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو اس کو رنگینیوں کی غذا سے محروم کر دیا جائے تو وہ خون تھوک کر مر جائے۔ اور اس مداق کو اگر ایک آن کے لیے بھی رت جگوں کے ہم ہموں، رنگینیوں کے زمزموں، چڑیوں کی چوں چاں، سارنگیوں کی روں روں، شراب کے پیالوں، الھڑوں کے گالوں، پھولوں کی کلیوں، رنگ رلیوں، تانوں کے بلکوروں، طبلے کی ٹکوروں، گوپیوں کی ہولیوں، گوریوں کی ٹولیوں، بازاروں میں

بچے کنوروں، بالیوں کی ٹکڑیوں کے کھنکتے ڈوروں اور چھلّوں، چھّوں، چوکڑیوں، چھم چھماہٹوں، تنتوں، قلقلوں، قلقاریوں، سکیوں اور بانسوں بوسوں، برکھا کے گھنگھوں، چیت کی رتوں، ناگنوں ناگنوں اور میلوں ٹھیلوں سے دور کر دیا جائے تو یہ چھوکری دریا سے نکلی ہوئی مچھلی کی مانند ساحل حیات پر تڑپ کر دم توڑ دے گی۔ کاش اسے جوشش تو مجنونایا ہوتا۔ مسخرہ ہوتا، مجذوب ہوتا، مراثی ہوتا، مستری ہوتا، مداری ہوتا، ماشیا ہوتا، مالی ہوتا، موچی ہوتا، مستر ہوتا، مولوی یا مفتی ہوتا، جو کچھ بھی ہوتا لیکن شاعر نہ ہوتا۔

جوش۔ اللہ اللہ آپ کے سے حلیم کی زبان اور ایسے ہیجانی الفاظ کا طوفان۔ آپ مجھ سے عمر میں بڑے ہیں جو بھی جی میں آئے کہہ لیجیے۔ پھر بھی خطا معاف اتنی دقیقہ سنجی کے باوجود آپ اس بات کو پا نہیں سکے کہ اس سراپا ناز کی نیاز مندانہ موج تبسم کی پکار پر ایک میرے سے شاعرانہ مزاج رکھنے والے کا تاب حکمت سے فرار مطلق ارادی نہیں قطعاً اضطراری عمل تھا۔ اور کسی اضطراری عمل پر احتساب و سزا جائز نہیں۔ بندہ پرور! مجھ سے کہیں زیادہ آپ اس اٹل ناقبول حقیقت کبریٰ سے واقف ہیں کہ یہ پورا نظام ارض و سماوات اور یہ تمام ناقابل شمار اشیاء کائنات بے نہایت سخت اور اسی قدر دشمن بے مروتی کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں۔ علت و معلول کی ناشکستنی زنجیر میں اور کسی فرد کو خواہ وہ کتنا ہی بے پناہ شخصیت کا مالک کیوں نہ ہو یا سب سے بڑا طرم باز خاں ہی کیوں نہ ہو یہ مجال نہیں کہ علت و معلول کی اس زنجیر کو توڑ یا اس کو توڑنے کا تصور بھی کر سکے۔ اس بے رو رعایت حلقہ جبریت میں اس طفلانہ مفروضے کی گنجائش نکل ہی نہیں سکتی کہ انسان چونکہ مادر قدرت کا سب سے چھوٹا اور اس بنا پر سب سے زیادہ لاڈلا بچہ ہے۔ اس لیے قدرت نے مادرانہ شفقت کے جوش میں آکر اپنے اس دلارے کو نظام شمسی کے حلقہ جبر سے نکال کر میدان قدرت میں گلگشت فرمانے کی اجازت دے دی اور اس سوتیلی دنیا میں اسے میرے سگے بیٹے جو جی چاہے سو کر کی اجازت سے دی ہے۔ آپ خود اس بات کو جانتے اور مانتے ہیں کہ ہر فرد کے دماغ کی انفرادی ساخت اس کے خانوں کی تنگی و فراخی اس میں بھرے ہوئے مصالحوں کی کمیت و کیفیت، عناصر ترکیبی کی مقدار و عددیت، جذبہ، عقل اور تحمل کا عدم توازن، فرد کا ذاتی میلان، قوام کی پختگی و خامی، فطری مرغوبات و مکروہات کی کشمکش اور نسلی، ماحولی، غذائی، موسمی تاثرات کے پیدا کردہ مزاج کی نوعیت ہی

انسان پر حکومت کرتی ہے۔ جدھر جی چاہتی ہے اس کو لے جاتی ہے۔ بعض اپنی سرکار ذات کے خوشامد خورے یہ دعویٰ کرتے چلے جاتے ہیں کہ ہم جو چاہے سو کر سکتے ہیں۔ کاش ان بھنوؤں کو یہ معلوم ہوتا کہ چاہنا ہی سرے سے ہمارے اختیار میں نہیں۔ ارے غضب خدا کا ترس کھانے کے بدلے آپ اس نامراد کو ڈانٹ پھٹکار رہے ہیں۔ جس بدبخت کے سر پر قد آدم بجلی گر چکی ہو۔ جس کی عقل کے بخیے ادھیڑ ڈالے گئے ہیں۔ جس کے حواس کو جھلس کر رکھ دیا گیا ہے۔ جس کی عقل اس کی چھری سے ذبح کر ڈالی گئی ہے۔ جو تمام یونان کے سیاحوں کی فہرست سے خارج کر کے نجد کے بیدادیوں کے رجسٹر میں درج کر دیا گیا ہے اور جس کو اس دوشیزہ کی غم انگیز شاعری نے جس کی ذات خود موضوع شعر ہے مرکز حواس سے اس طرح گرا دیا ہے کہ اور تو اور اب وہ خود اپنے سے بھی آنکھیں نہیں ملا سکتا۔ گوریوں کے گزند رسیدہ مظلوم پر سب و شتم فرمانا آپ جیسے دانا کے شایان شان ہیں۔

شبیر حسن خاں۔ ارے اس قدر مظلوم نہ دکھا اپنے کو۔ یہ عذاب جو تجھ پر نازل ہے تو نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنے سر پر لادا ہے۔ اس آگ کو جو تیرا احاطہ کیے ہوئے ہے تو نے ہزاروں جتن کر کے خود سلگایا ہے۔ مجھ کو پتا چل چکا ہے اے جوش کہ جب کبھی بہ تقاضائے بشریت مجھ پر غفلت، ربودگی یا خواب گراں کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو نے معاشقے سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا ہے اور اس نادان کے دل کو موہ لینے کی نیت سے اس کو جھوم جھوم کر اپنا کلام سنایا۔ تو نے اس کی نوبصارت کنواری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سوزندہ نگاہ سے دیکھا ہے جو سنگ و آہن تک سے لو نکال دے سکتی ہے۔ تو نے اس نادان کو اپنے سینے سے لگایا اور بھینچ بھینچ کر سیکڑوں بار دبایا اور یہاں تک کہ تو نے اپنے دھڑکتے دل کے ضربات اس کی رگ رگ میں دوڑا دیے ہیں۔ تو نے اپنی شدید چسپیدگی سے اس کو موسم بہار سے پہلے ہی چٹکا دیا ہے اور اس عمل کے تواتر سے تو نے اپنی دانائی اور اس کی نادانی دونوں پر ظلم ڈھایا ہے اور اس دوہرے ظلم کے باوجود اپنے کو مظلوم کہہ رہا ہے۔

اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

جوش۔ ارے سر پیٹ کر مر جانے کی بات ہے۔ آپ کا یہ غیر حکیمانہ ارشاد کہ میں دیدہ و دانستہ اس بلائے بے پناہ میں گرفتار ہوا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے اپنی طینت و سرشت

پر حاوی ہو کر اپنے ارادے سے اقدامات کیے ہیں۔ حالانکہ انسانی افکار و کردار و گفتار تمام کے تمام طینت و سرشت کے بطن سے پیدا ہوتے ہیں اور ہمارا ارادہ ایک اضطرار سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتا۔ آپ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ ہم اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے خالق نہیں ہیں۔ ہماری تمام خواہشوں اور تمام آرزوؤں اور تمام تمناؤں اور تمام ترنگوں اور تمام ولولوں کا سرچشمہ ہمارے وجود کی میزان کل، ہماری طینت کے مجموعی فرمان سے اور ہمارے دلوں سے خود بہ خود پھوٹتا ہے اور جس وقت کسی ولولے کا چشمہ پھوٹتا ہے، بارگاہ عقل میں گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ اس وقت عقل اپنے حجرے سے باہر آ کر ہماری خواہش کے خط و خال کو پرکھتی ہے۔ اگر عقل کے نزدیک وہ خواہش جائز ہوتی ہے تو وہ اس کو پروانہ راہداری دے دیتی ہے اور اگر اس کے نزدیک وہ خواہش ناجائز ہوتی ہے تو وہ اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اس آدمی کے جسم میں اگر عقل قوی تر ہوتی ہے تو وہ خواہش کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کو بے بس کر دیتی ہے اور اگر خواہش عقل سے زیادہ طاقتور ثابت ہوتی ہے تو وہ عقل کو دھکا دے کر اس کو اس کے حجرے میں بند کر دیتی ہے اور ارادے کو جو چپراسی کی وردی پہنے برآمدے کے اسٹول پر بیٹھا ہوتا ہے، آواز دے کر بلاتی ہے اور اس کے کاندھے پر بیٹھ کر عمل کے دائرے میں آجاتی ہے۔

اسس تمام صورت حال سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ ہم سو فی صد مقہور ہیں اور ایک فی صد بھی قادر نہیں۔ آپ اس جبریت کے قانون سے واقف ہوتے ہوئے بھی مجھ سے فرما رہے ہیں کہ میں اپنی اس آشفتگی کا خود ذمہ دار ہوں۔ یہ تو ایسی بات ہے گویا جولیس سیزر کا جگری دوست بروٹس اس پر تلوار سے حملہ کر رہا ہے اور سیزر حیرت سے اچھل کر کہہ رہا ہے Otto-Brutus۔ خان صاحب! کسی بڑے سے بڑے دیوتا کی بھی یہ مجال نہیں کہ حسن اپنے خلعت ناز کو اتار کر اور لباس نیاز پہن کر اس کے سامنے آئے اور سرمگیں آنکھوں سے آنسو بہائے اور وہ پگھل کر نہ رہ جائے۔ خان صاحب! انصاف سے کام لیجیے اور خدا لگتی کہیے۔ جب وہ دوشیزہ اترے مکھڑے اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ میرے سامنے سوگوارانہ در آئی تو کیا میں اس فتنۂ آخر الزماں کی طرف سے منہ پھیر کر جھٹ پٹ تازہ وضو کے بدھنے کی طرف۔ کیا میں بیٹھ جاتا مصلے پر نمازیں پڑھنے۔ پہن لیتا جامہ احرام اور کرنے لگتا کعبہ کا طواف اور دبک کر بیٹھ

جانا کسی منفق کے داہڑے کی مقدس چھاؤں میں۔

شیر حسن خاں۔ تو میرے کٹتے ہوئے اسلحے سے مجھ پر حملہ کر رہا ہے۔

کس نیا موخت علم تیر از من　　　که مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

میں ان ہتھیاروں سے زخمی ہونے والا نہیں۔

جوش صاحب۔ خان صاحب بہادر، غصہ آ چکا ہے آپ کو اور اس بنا پر آپ منطق سے منہ پھیر چکے ہیں۔

شیر حسن خاں۔ بس چبا چبا کر باتیں نہ کر۔ نہیں آئے گا میرے سامنے نہیں ترک کرے گا زلفوں کی چھاؤں کو اور نہیں باز آئے گا تو جنون سے۔

جوش۔ منع کمن ز عشق کہ اے منفق زماں　　　معذور دار مت کہ تو اورا نہ دیدہ ئی

آپ جس چیز کو میرا جنون فرما رہے ہیں وہ اس کے جلد جمال نہیں۔

با حسنش ایں جنوں کہ تو بینی تحمل است

ناصح ملامتے کمن ایں نا شکیب را

شیر حسن خاں۔ اچھا، سمجھ گیا۔ اس لونڈیا کا زہر تجھ پر پوری طرح چڑھ چکا ہے۔ تجھ پر۔ تجھ حکمت کے خمک حرام پر۔ تو پھر اے خیرہ سر جوش ادیکھ میرے ہاتھ کے گرز گراں کو۔ ہوشیار، خبردار۔

جوش۔ سمجھ گیا۔ پٹھنوں کی رگ پھڑک چکی ہے۔ منہ سے کف نکل رہا ہے۔ اس پیشانی پر شکنیں پڑ چکی ہیں جس سے حکمت کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں۔ سچ کہا ہے کسی دانائے روزگار نے کہ پٹھان حکیم و جنیری کیوں نہ ہو جائے، اندر سے رہتا ہے پٹھان ہی۔

عاقبت گرگ زادہ گرگ شود　　　گرچہ با آدمی بزرگ شود

اور اس کے فوراً بعد اس طرف گرز چلنے کی آواز اور اس طرف سر سے دھل دھل خون بہنے آغاز۔

خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا۔

بروز پیر ۱۲ فروری ۱۹۵۳ء بوقت شب

گورنر ہاؤس۔ کراچی

میر رسول بخش تالپور کا استعفیٰ:

اور اسی کے ساتھ ہی یہ دلچسپ محفل بھی اختتام کو پہنچی اور نہ صرف یہ محفل رندہ اس اختتام کو پہنچی بلکہ اس کے دوسرے ہی دن یعنی تیرھویں فروری ۱۹۷۳ء کو میر رسول بخش صاحب تالپور کی گورنری کا بھی خاتمہ بالخیر ہو گیا اور وہ اپنے گھر اور جوش صاحب ٹیکسی میں اپنے گھر واقع فیڈرل بی ایریا آ گئے۔

شام کو جب میں جوش صاحب سے ملنے گورنر ہاؤس جانے کی تیاری کر رہا تھا تو ان کا ٹیلی فون آیا کہ وہ اپنے گھر منتقل ہو گئے ہیں اور شام کو میں ان کے گھر پر ہی ان سے ملوں۔ جوش صاحب نے راغب صاحب اور دوسرے احباب کو بھی ٹیلی فون پر اپنی منتقلی کی اطلاع دے دی تھی چنانچہ ہم سب احباب ان کے گھر پر جمع ہو گئے۔ پھر جوش صاحب نے میر صاحب کے استعفے کی تفصیل بتلائی۔ میر صاحب کو شکایت تھی کہ بھٹو صاحب کا رویہ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ اہانت آمیز ہو گیا تھا اور ان جیسے خوددار آدمی کا بھٹو صاحب کا ساتھ دینا بہت دشوار تھا۔ اس کے علاوہ ممتاز بھٹو صاحب جو سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے میر صاحب کے ساتھ تعاون نہیں کر رہے تھے اس لیے میر صاحب نے استعفیٰ دے دیا۔ جوش صاحب چونکہ بھٹو کی فہم و فراست کے قائل تھے، اس لیے انھوں نے میر صاحب کے استعفے پر زیادہ گفتگو نہیں کی اور بات چیت کا رخ ادب اور شاعری کی طرف موڑ دیا گیا۔ اس کے بعد شام کی محفلیں جوش صاحب ہی کے گھر پر منعقد ہوتی رہیں یہاں تک کہ انیسویں فروری کی صبح جوش صاحب تیزگام سے لاہور روانہ ہو گئے۔

اس کے بعد جوش صاحب دوسری اپریل پیر کے دن کراچی واپس تشریف لائے اور زیادہ تر میرے گھر قیام کیا۔ پہلے دن تو وہ اپنے ہی گھر ٹھہرے مگر جب میں ان سے ملنے گیا تو انھوں نے بتایا کہ ان کا ٹیلی فون خراب پڑا ہے اور چونکہ ان کی گاڑی اسلام آباد بھیج دی گئی ہے اس لیے اب ان کو سواری کی بھی دقت ہو رہی ہے۔ تو میں نے کہا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو میرے گھر چلیے وہاں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ اس طرح دوسرے دن سے جوش صاحب میرے گھر منتقل ہو گئے۔ میں نے جوش صاحب کو بتایا کہ نفسیات کے مضمون کا مطالعہ کرنے کے لیے میں نے جامعہ کراچی کے شعبہ نفسیات میں ایم اے کی کلاس میں داخلہ لے لیا

ہے۔ جوش صاحب سن کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ حصول علم میں جو بھی وقت گزرے وہ عین عبادت ہے اور پھر اپنی ایک رباعی سنائی۔

یہ جو انسان کی سب طراری ہے
اک وقت گزارنے کی بیماری ہے
افسوس کہ بے معرفت راز حیات
جینا کتنی شدید بے کاری ہے

اس مرتبہ جوش صاحب تین دن میرے گھر رہے۔ ہم دونوں صبح سویرے بیدار ہو جاتے اور دور تک ٹہلنے چلے جاتے۔ اس دوران میں ہمارا موضوع گفتگو علم نفسیات ہوتا۔ میں نے جوش صاحب کو بتایا کہ ایک دن مجھے خیال آیا کہ انسانی نفسیات کا مطالعہ کرنا چاہیے چنانچہ میں نے نفسیات کی چند کتابیں خرید کر ان کا مطالعہ شروع کر دیا مگر جلد ہی یہ محسوس کیا کہ جب تک اس علم کی اصطلاحات سے اچھی طرح واقفیت نہ ہو، یہ مضمون کما حقہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ چنانچہ میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا ہے۔ ساتھ ہی میں نے جوش صاحب کے یہ گوش گزار کر دیا کہ میری جماعت میں چونسٹھ (۶۴) لڑکیاں اور مجھ سمیت صرف چار (۴) لڑکے ہیں۔ جوش صاحب کو اس بات سے خوشی ہوئی کہ لڑکیوں میں طلب علم کا جذبہ اور خواہش لڑکوں سے بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ جس ملک کی مائیں تعلیم یافتہ ہو جائیں اس ملک کا مستقبل یقیناً محفوظ ہو جاتا ہے۔ میں نے انھیں یہ بھی بتایا کہ آج کل شعبہ نفسیات کی صدر ایک نہایت قابل خاتون ڈاکٹر فرخ زیڈ احمد ہیں۔ ان کے علاوہ تمام اساتذہ نہایت قابل اور اپنے اپنے مضامین میں ماہر ہیں۔ اساتذہ چونکہ مجھ سے عمر میں چھوٹے ہیں اس لیے وہ سب دوستوں کی طرح میرا خیال کرتے ہیں۔ یونیورسٹی میں کچھ لڑکے میرے بہت قریبی دوست بن گئے تھے۔ طالب علم ساتھیوں میں سید ساجد علی ساجد میرے ہم جماعت تھے۔ محبت، شرافت، ہمدردی اور خلوص کو انسانی پیکر میں دیکھنا ہو تو ساجد صاحب کو دیکھ لیجیے۔ ساجد خود بھی اچھے شاعر ہیں۔ نوجوان، خوبصورت اور صحت مند ہیں اور ہر شخص کی مدد کے لیے حتی المقدور تیار رہتے ہیں اس لیے کلاس کے ہیرو ہیں۔ ان کے علاوہ جاوید ایف ام خاں اور معید خاں گو ام اے فائنل کے طالب علم ہیں مگر وہ بھی میرے دوستوں میں شریک ہیں۔ یونیورسٹی کے میرے حلقہ احباب میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام ہیں مگر میں نے ان کا ذکر جوش صاحب سے نہیں کیا۔ البتہ جاوید، معید اور ساجد کو جوش صاحب سے ملوایا۔ جوش صاحب نے جاوید خاں

کا کلام سن کر ان کے کلام اور گلے دونوں کی داد دی۔ جاوید ترنم سے پڑھتے ہیں اور جب کلام سناتے ہیں تو مغنی آتش نوا بن جاتے ہیں۔

غالب لائبریری:

اس مرتبہ جوش صاحب کو مرزا ظفرالحسن صاحب نے غالب لائبریری میں مدعو کیا اور چھٹی اپریل بروز جمعہ ان کے ساتھ ایک شام منانے کا اہتمام کیا۔ میں، جاوید، معید، ساجد اور راغب صاحب، جوش صاحب کے ساتھ ٹھیک پانچ بجے غالب لائبریری پہنچے۔ وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ مرزا ظفرالحسن نے جوش صاحب کا استقبال کیا۔ ان کے ہمراہ ادارہ یادگار غالب کے نائب معتمد جناب سحر انصاری، مسلم ضیائی صاحب، محسن صاحب بھوپالی، حمایت علی صاحب شاعر اور بہت سے شعرا اور ادیب موجود تھے۔ سب نے جوش صاحب کو خوش آمدید کہا۔ مرزا صاحب نے جوش صاحب کو کرسی صدارت پر بٹھا کر جلسے کی کارروائی کا آغاز فرمایا۔

انھوں نے ان مشکلات کا ذکر کیا جو اس لائبریری کے قیام کے سلسلے میں انھیں پیش آئیں۔ پھر اس کی وجہ تسمیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب نہ صرف اپنے دور کا بلکہ آنے والے ادوار میں بھی فکر کا منارہ نور ہے۔ جس سے آنے والی تمام نسلیں راہ نمائی حاصل کرتی رہیں گی۔ انھوں نے کہا کہ اس لائبریری کے قیام کا مقصد نئی نسل کو غالب کی فکر سے متعارف کرانا ہے۔ اسی لیے انھوں نے یہ لائبریری غالب کے نام سے موسوم کی ہے اور ان کی یہ کوشش ہے کہ غالب پر شائع ہونے والی کوئی کتاب ایسی نہ رہے جو اس لائبریری میں موجود نہ ہو۔

اس کے بعد جوش صاحب نے غالب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب حیات انسانی کا بہت بڑا نباض تھا۔ وہ بہت بڑا مفکر اور فلسفی تھا۔ اس کو اہل بیت سے بہت محبت تھی اور اسی محبت کی بنا پر وہ خدا پر بھی اعتراض کر گزرتا ہے۔ وہ خدا کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ تم ہماری تکلیفوں سے مسرت حاصل کرتے ہو اور یہ کہ "ساز تازیہ و بم واقعہ کربلا" یعنی یہ کہ تم Sadist ہو۔ لوگوں نے پوچھا۔ جوش صاحب آپ کو غالب کا کون سا شعر پسند ہے؟

جوش صاحب نے کہا۔ یوں تو اس کے بہت سے اشعار پسند ہیں مگر ایک شعر ان کے خیالات کا ترجمان ہے۔

زندگی اپنی جو اس طور سے گزری غالب ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ایک صاحب نے پوچھا۔ جوش صاحب آزاد شاعری کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے۔

جوش صاحب نے کہا ہر صنف سخن اچھی ہے اس میں اظہار خیال کے لیے بہت وسعت ہے مگر ابھی تک اس کو کوئی ایسا شاعر نہیں ملا جو اس صنف میں اظہار کا حق ادا کر سکے۔

اس کے بعد جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی گئی۔ پہلے تو انھوں نے کچھ رباعیات سنائیں۔ پھر "عظمت انسانی" پر اپنے مسدس کے چند بند سنائے۔ اس کے بعد ایک نظم "دو نگاران شوخ کے مابین" سنائی۔ یہ جوش صاحب کی تازہ واردات عشق کی تفصیل ہے۔

نظم ختم ہوئی تو محسن صاحب بھوپالی مائک پر آئے۔ پہلے تو انھوں نے جوش صاحب کا لائبریری تشریف لانے پر شکریہ ادا کیا اس کے بعد ان سے دریافت کیا کہ "آپ نے اپنے ابتدائی زمانے میں بہت سی قومی نظمیں کہی ہیں۔ انگریزوں کے خلاف بھی کہا ہے۔ ہندوستان میں جو بھی اہم واقعہ ہوتا تھا وہ آپ کی توجہ اپنی طرف مبذول کرواتا تھا مگر گذشتہ پچیس (۲۵) برس سے اور خاص طور پر آج کل کچھ دنوں سے پاکستان میں ایسے ایسے انقلابات آئے مگر آپ نے ان پر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

جوش صاحب نے کہا۔ اب میری توجہ زیادہ تر آفاقی مسائل کی طرف ہے اور فکر کے ایسے موضوعات جو بین الانسانی اور زیادہ گہری فکر کے متقاضی ہیں، میری توجہ کا مرکز ہیں۔

محسن بھوپالی نے کہا۔ یہ جو نظم آپ نے ابھی سنائی ہے جس میں دو لڑکیوں کے ساتھ آپ کے عشق کی تفصیل ہے۔ یہ کون سا آفاقی مضمون ہے۔

جوش صاحب نے کہا۔ "محبت آفاقی موضوع ہے"۔

راغب صاحب نے پوچھا۔ جوش صاحب، اسماعیل میرٹھی کے بعد کسی نے بچوں کے لیے اچھا ادب پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ حالانکہ آپ جیسے بڑے آدمیوں کو اس طرف متوجہ ہونا چاہیے۔

جوش صاحب مسکرا کر کہنے لگے۔ "آپ کا مطلب ہے ہم بچوں کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوئے۔ اس پر سب لوگوں نے قہقہہ لگایا۔ ایک صاحب نے جوش صاحب کی کتاب "یادوں کی برات" کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی اجازت چاہی اور جوش صاحب نے خوشی سے اجازت دے دی۔ اس کے بعد مرزا ظفرالحسن صاحب نے جوش صاحب کو لائبریری کا معائنہ کروایا اور ان کی تمام کتابوں پر ان کے دستخط لیے۔ پھر انھوں نے سب کا شکریہ ادا کیا اور یہ محفل برخاست ہو گئی۔

میں اور جوش صاحب وہاں سے رخصت ہو کر لیاقت آباد کی چورنگی گئے اور وہاں ایک کبابی کی دوکان سے کباب خرید کر اپنے گھر آگئے۔ راستے میں جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتے ہیں کیونکہ وہ ساتویں تاریخ کو یعنی دوسرے ہی دن لاہور واپس جا رہے ہیں تو ایک رات اپنے گھر قیام کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کو ان کے گھر پہنچا دیا اور چونکہ میرے گھر کچھ مہمان آنے والے تھے اس لیے جوش صاحب سے اجازت لے کر اپنے گھر آگیا۔

دوسرے دن میں اور راغب صاحب صبح ہی جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے اور ان کو لے کر کینٹ اسٹیشن گئے جہاں سے وہ بذریعہ کراچی ایکسپریس لاہور روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد کئی مہینے تک جوش صاحب سے نہ کوئی خط و کتابت ہو سکی اور نہ اس کا آنا کراچی ہوا۔ میں کچھ تو اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ کچھ اپنے بڑے بیٹے مسعود علی خاں کی شادی اور کچھ چھوٹے بیٹے پرویز علی خاں کی ایرفورس میں پاسنگ آؤٹ پریڈ کے سلسلے میں رسالپور اور پشاور میں رہا۔

کراچی یونیورسٹی کا مشاعرہ:

اس دوران میں پانچویں جون ۱۹۷۳ء کو جامعہ میں ہفتہ طلبہ منایا گیا اور ایک مشاعرے کے مقابلے کا بھی اہتمام کیا گیا جس میں طلبہ اور طالبات نے حصہ لیا۔ مولانا ماہرالقادری صدر تھے اور جناب راغب مرادآبادی جج کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ میں اس جلسے میں شریک تھا۔ اس وقت میرا لباس شلوار قمیص، قراقلی ٹوپی اور پشاوری چپل پر مشتمل تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا کہ طلبہ اور طالبات مجھے بہت مشکوک نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ابھی



جامعہ کراچی کا مشاعرہ
خورشید علی خاں اور راغب مرادآبادی

maablib.org

اس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی تھی کہ طلبہ کی انجمن کے نائب صدر میرے پاس آئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ جناب! آپ کا تعلق سی آئی اے سے تو نہیں ہے۔ میں بہت ہنسا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو کیسے اس بات کا شک ہوا۔ کہنے لگے آپ کا لباس بالکل سی آئی اے والوں کا سا ہے اور آپ شکل سے بھی سی آئی اے کے ایجنٹ معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا آپ میرے ساتھ آئیے۔ میں انھیں لے کر راغب صاحب اور ماہر صاحب کے پاس گیا اور ان کو سارا واقعہ سنایا تو وہ بھی ہنسنے لگے۔ راغب صاحب نے فی البدیہہ ایک قطعہ ان صاحب کو سنایا۔

یہ منظر ہم نے دیکھا جامعہ میں ۔۔۔ کہیں اس کو حقیقت اب کہ اسٹنٹ

یہ تھا ملبوس کا فیضان "خورشید" ۔۔۔ بنے سی آئی اے کے آج ایجنٹ

ماہر صاحب نے کہا۔

لباس بھی کبھی دھوکے میں ڈال دیتا ہے ۔۔۔ کسی کو وہم کسی کو گمان دیتا ہے

پھر جب میں نے انھیں بتایا کہ میں اسی جامعہ کا طالب علم ہوں تو انھیں بہت تعجب ہوا۔ اتنے میں جاوید خاں سعید خاں اور ساجد بھی آ گئے۔ اور جب ان کو یہ بات معلوم ہوئی تو سب نے قہقہہ لگانا شروع کر دیا اور نائب صدر معافی مانگتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ اسی دن کی بات ہے کہ کوئی چالیس پچاس طالبات نے راغب صاحب کو گھیر لیا۔ ہر ایک کے ہاتھ میں آٹوگراف بک تھی اور ہر طالبہ راغب صاحب سے آٹوگراف لینا چاہ رہی تھی۔ راغب صاحب کا کمال یہ تھا کہ ہر ایک سے اس کا نام پوچھتے اور ہر لڑکی کی شکل و صورت اور حسن و ادا کے لحاظ سے کسی کی بک پر ایک شعر، کسی پر رباعی اور کسی پر قطعہ لکھ دیتے اور اس لڑکی کا نام ایک شعر میں ضرور استعمال کرتے۔ اس دن ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ راغب صاحب پر اشعار کی بارش ہو رہی ہے اور آمد کا یہ عالم تھا کہ بقول غالب:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں ۔۔۔ غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

غرض رات دیر تک یہی حالت رہی اور بڑی مشکل سے ہم لوگ راغب صاحب کو اس نازحسیناں سے بچا کر گھر لائے۔

جوش صاحب سے جب بہت دنوں تک کوئی خط و کتابت نہ ہو سکی تو آخر ان کا ایک

نہایت مختصر دو سطروں کا خط آیا۔ یہ خط ان کی منسٹری کے پیڈ پر تھا۔

GOVERNMENT OF PAKISTAN

MINISTRY OF INFORMATION & BROADCASTING

AUQAF AND HAJ

208 Shalimar 8/1 Islamabad

۱۔۸۔۷۳ء

میاں کچھ تو منہ سے بولیے، سر سے کھیلیے۔ گپ چپ کے لڈو کھائے کب تک بیٹھے رہیے گا۔ ایسی تیسی میں جائے یہ خاموشی۔

جوش

اس خط کے جواب میں، میں نے جوش صاحب کو لکھا۔

کراچی

بی۔ ۱۵ این۔ شمالی ناظم آباد

۸۔۸۔۷۳ء

قبلہ صاحب نظراں! تسلیم۔ آپ کے دو سطری تریاق نے دماغ کی چولیں ہلا دیں مگر بخدا یقین مانیے کہ۔

گرچہ دوریم بیاد تو قدح می نوشیم   بعد منزل نہ بود در سفر روحانی

جب سے یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے پڑھائی میں بے حد مصروف ہو گیا ہوں اور نفسیات کے مضمون سے جیسے جیسے واقفیت بڑھتی جا رہی ہے انسانی رویوں کی پیچیدگیاں واضح ہوتی جا رہی ہیں اور اس قدر لطف آ رہا ہے کہ بیان نہیں کر سکتا۔ افسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے اتنے سال ضائع کیے اور اتنے بنیادی علم سے ناواقف رہے اور اب تو جی چاہتا ہے کہ جیسے تمام عمر یونیورسٹی میں اس علم کی تحقیق و تفتیش میں گزار دوں۔

بالا از سپہر رباتی نہ کند مرغ اسیر　　　　خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

لیکن آج سے تیس (۳۰) سال پہلے جب میں یونیورسٹی کا طالب علم تھا، اس زمانے میں علم نفسیات کا تعلق فلسفے کے شعبے سے تھا مگر اب وہ سائنس کے شعبے میں داخل ہے اور اس میں تحقیق اور تجربوں کا طریقہ وہی ہے جو سائنسی مضامین کے تجربوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ موضوع اس قدر دلچسپ اور عقل گیر ہے کہ جب آپ کراچی تشریف لائیں گے تو آپ سے تفصیل سے گفتگو ہوگی۔

چمن امید کہ آپ بہت یاد آتے ہیں۔ یہاں یونیورسٹی میں اپنے دوستوں سے ہر وقت آپ ہی کا ذکر خیر ہوتا رہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہاں کی مشغولیت کے باعث آپ کو خط نہ لکھ سکا مگر:

اے غائب از نظر کہ شدی ہم نشین دل　　　　می بینمت عیاں و دعا می فرستمت

آپ بتائیے۔ کوچہ جاناں کا طواف جاری ہے؟ یا خود اسلام آباد میں نزول رحمت پروردگار ہو رہا ہے؟ اس مدت میں اگر کوئی تازہ کلام ہوا ہو تو ضرور عنایت فرمائیے۔ یہاں سب احباب آپ کو یاد کرتے ہیں۔ جاوید، ساجد، معید اور بہت سی طالبات جن کو آپ نہیں جانتے، آپ کی خدمت میں سلام شوق پیش کر رہی ہیں اور اس خواہش کے ساتھ کہ ”گر قبول افتد زہے عز و شرف“

جواب کا منتظر

طالب دید خورشید

اس کے جواب میں جوش صاحب کا خط وصول ہوا۔ انھوں نے لکھا۔

اسلام آباد۔

۱۸۔۸۔۷۳ء

صبح کو چار بج کر چودہ منٹ پر یہ خط شروع کر رہا ہوں۔ دور دور تک اندھیرا اور سناٹا چھایا ہوا ہے۔ آپ کے طلوع ہونے میں ابھی بہت دیر ہے۔ کمرے میں روشنی ہوتے ہی میدان

کے تمام پروانے اور کیڑے کوڑے ٹوٹ پڑے ہیں مجھ پر۔ تمام میز بھری ہوئی ہے حشرات الارض سے۔ اللہ اللہ کتنے جانوں کے لشکر پوشیدہ گھانس پھونس میں۔ ۱۹۲۳ء میں ایک غزل کہی تھی۔ اس کا ایک شعر بے ساختہ یاد آرہا ہے۔

یہ کس کی حیات افروز نظر نے چھیڑ دیا ہے عالم کو
ہر خاک کے ادنیٰ ذرے میں ہنگامہ ہے لاکھوں جانوں کا

ان تمام حشرات میں بالکل وہی نظام کارفرما ہے جو میری زندگی پر حاوی ہے اور ان سب کے وظائف اعضاء بھی میرے ہی سے ہیں۔ فرق صرف شعور کا ہے۔ یہی شعور دولت بیدار ہے اور ایک زبردست آزار بھی۔

کل سارا دن۔ اس ۔۔ کے ساتھ گزرا۔ اس کی بڑی بہن نے کہا بھی کہ اب جوش صاحب کو آرام کرنے دو۔ اپنے کمرے میں چلی جاؤ لیکن وہ فتنہ روزگار میرے پہلو سے نہیں اٹھی اور عشوہ و ناز کے خنجر مارتی رہی۔

روزگار نے مجھ پر اس ضعیف عمر میں دو کٹیلی چھوکریوں کو مسلط کر دیا ہے۔ ہر چند میرے چہرے پر ماہ و سال کی شکنیں دوڑ چکی ہیں اور میرے خط و خال کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن روح کائنات نے خدا جانے ان لونڈیوں پر کیا جادو کر دیا ہے کہ وہ میری دل داری پر کمر باندھے رہتی ہیں۔ وہ میرے چہرے کے بھیانک پن کو دیکھتی ہی نہیں۔ وہ کہتی ہیں ہم کو حسین چہرے کی نہیں، حسین ذہن کی ضرورت ہے۔ ارے کروڑوں کم سنوں میں ایک آدھ چھوکری اسی مزاج کی بھی نکل آتی ہے جو شام کے غروب کی تیرگی کو طلوع کی جگمگاہٹ میں تبدیل کر دیتی ہے۔

ان الھڑوں سے متاثر ہو کر ایک نظم کہی ہے۔ آپ بھی سن لیں۔

ترانۂ شکر

دیارِ خال و خد کے حکمراں ہیں ۔۔۔ کہ ہم محبوبِ قوم گل رخاں ہیں
کبھی کرنوں کا منہ اترا ہوا ہے ۔۔۔ گھنی زلفوں کے ہم پر سایباں ہیں
نہ کیوں نازاں ہوں اپنی ذات پر ہم ۔۔۔ کہ ملجائے نیاز دلبراں ہیں

زہے قسمت ہماری آرزو میں
بڑی حسرت سے حوریں تک رہی ہیں
ابھی تک ہیں حکایت در حکایت
برہمن ہیں مگر ایسے برہمن
بحمد اللہ کہ ہم اس عمر میں بھی

کسی کی آنکھ سے آنسو رواں ہیں
خدایا ہم یہ کس کے میزباں ہیں
ابھی تک داستاں در داستاں ہیں
کہ شاہنشاہ اقلیم بتاں ہیں
تمنائے دل دوشیزگاں ہیں

حسینوں کی رفاقت سے ہم اے جوش
زہے قسمت کہ اب تک نوجواں ہیں

ملاحظہ فرمائی آپ نے ایک بوڑھے کھوسٹ کی یہ نظم؟ حوریاں رقص کناں ساغر و پیمانہ زدند۔ آپ نے حضرت حافظ کا یہ شعر تو بارہا سنا ہو گا۔

گرچہ پیرم تو شبے تنگ در آغوشم گیر
کہ سحر گہ ز کنار تو جواں بر خیزم

شاید یہ جواں بر خیزم کا کھیل اس غرض سے کھیلا جا رہا ہے کہ میری شدت عشق کا لوہا پگھل کر رقت قلب کے سانچے میں ڈھل جائے اور میں عشقیہ شاعری کی مانگ کو صندل سے بھر سکوں۔ کوثر صاحب نیازی تو مجھ کو کراچی لے جانا چاہتے ہیں لیکن وہ تسنیم ذی نفس کہہ رہی ہے کہ میرا بھی رزرویشن ہو جائے تو ساتھ چلنا۔ اب دیکھیے اس کا رزرویشن کب ہوتا ہے۔ آج کوثر صاحب شام کو میرے گھر آ رہے ہیں۔ ان سے کہوں گا کہ اس کے سفر کا بھی بندوبست کر دیں ورنہ میری جوتی جائے گی کراچی۔

آپ کا چاہنے والا
جوش لب نوش

جوش صاحب نے لفافے پر یہ پتہ لکھا۔

سیدنا خورشید علی خاں، معلم روحانیاں
۱۵ بی / ۱ این
نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

بی۔ ۱۵ بلاک این
شمالی ناظم آباد
کراچی
۱۴۔ ۱۰۔ ۷۳ء

حضرت پیر و مرشد۔ آداب۔ آپ کا محبت نامہ وصول ہوئے تقریباً اک ماہ سے زیادہ ہو گیا ہے مگر میں اس مدت میں یہ امید کر رہا تھا کہ آپ کسی دن کراچی ضرور تشریف لے آئیں گے مگر "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ"۔ اللہ تعالیٰ آپ کے جوش عشق اور عالم شباب کو ہر لحظہ بہار در آغوش اور محبوب در بستر رکھے۔ میں نے چونکہ سقراط کے مکتب میں داخلہ لے لیا ہے اس لیے صحرائے نجد سے رخصت ہو کر اپنے گریبان کے چاک کو رفو کر لیا ہے۔

قبلہ! جنسی طلب بے شک حیات انسانی میں ایک نہایت طاقتور جذبہ ہے لیکن بخدا تحقیق و تجسس کی دنیا بھی اس قدر رنگین، حسین اور سحرانگیز ہے کہ اس کا ہر آن نئے نئے روپ میں جلوہ گر ہونے والا حسن دامن دل کو اپنی طرف کھینچ کر کہتا ہے کہ بس اسی جگہ تمام عمر بسر کر دو۔

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

آج کل نفسیات پر، یورپ، امریکہ، جرمنی، روس اور جاپان میں بے انتہا تجربے ہو رہے ہیں اور یہ معلوم کیا جا رہا ہے کہ کس قسم کے مہیج (Stimulus) کا ہمارے کردار (Behaviour) پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے اور کوئی انسان کن محرکات (Motivation) کے تحت ایک خاص قسم کا عمل کرتا ہے۔ یہ تجربے کیے جا رہے ہیں کہ مختلف انسانوں پر بھوک پیاس جنسی محرومی اور بے آرامی کا کیا رد عمل ہوتا ہے۔ اگر ایک انسان اور دوسرے انسان کے رد عمل میں فرق ہے تو اس کے داخلی اور خارجی اسباب کیا ہیں؟ خارجی اسباب میں جغرافیائی اور معاشرتی ماحول، تہذیبی ورثہ، حکومتی، سیاسی، معاشی، معاشرتی گروہی ماحول، رسوم و رواج اس شخص کا طبقاتی مقام۔ اس کی تہذیبی اور تمدنی اقدار۔ اس کا علم، اس کے تجربات۔ اسی طرح اس کی داخلی کیفیات مثلاً اس کی جسمانی صحت مختلف قسم کے غدود اور اعضاء کا عمل اور رد عمل، خون کی کمی یا زیادتی، کسی مرض کی کیفیت، احساسات کی شدت یا کمی جذباتی کیفیت، اعصابی نظام

کی طاقت یا کمزوری۔ غرض یہ تمام خارجی اور داخلی عوامل کس حد تک انسان کے کردار اور اس کے رویوں (Behaviour) کو متاثر کرتے ہیں۔ ہم علم نفسیات میں انفرادی اور اجتماعی طور پر مختلف قسم کے میسجات کے ذریعہ سے انسانی اعمال میں تبدیلی کے عمل کا مطالعہ کرتے ہیں اور مصنوعی یا قدرتی ماحول میں مختلف قسم کے میسجات کی کمی یا زیادتی کے اثرات کا رویئے کی تبدیلی سے متعلق قوانین معلوم کرتے ہیں۔

معاف فرمایئے میں اپنی دھن میں نہ جانے کیا کیا کہہ گیا اور یہ بھول گیا کہ میں کس سے مخاطب ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک مرتبہ کراچی میں جب میں نے آپ سے یہ عرض کیا تھا کہ "بیشک جنسی جذبہ انسانی کردار و عمل کا ایک طاقتور محرک ہے مگر یہی سب کچھ نہیں ہے۔ میرے لیے حصول علم اور نئی نئی معلومات حاصل کرنے کی خواہش جنسی جذبے سے زیادہ پر کشش ہے" تو آپ نے ایک دل کش ادا کے ساتھ مسکرا کر یہ شعر پڑھا تھا۔

ز نقص تشنہ لبی داں بہ عقل خویش مناز
دلت فریب گر از جلوۂ سراب نخورد

آپ کراچی کب تشریف لارہے ہیں۔ خدارا جلد آیئے۔ آپ سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے"۔ سب احباب آپ کو بے حد یاد کرتے ہیں۔

آپ کا چاہنے والا
خورشید

اس خط کے جواب میں جوش صاحب نے لکھا۔

"درخشاں باد حضرت خورشید۔ آپ کا نفسیات میں الجھا ہوا اور بجھا ہوا خط ملا۔ پڑھ کر جی گھبرانے لگا۔

ایک بجے رات سے جاگ رہا ہوں مجھ کو از روئے حساب اٹھنا چاہیے تھا ڈھائی بجے صبح کو، ڈیڑھ گھنٹے پیش تر بیدار ہو گیا۔ کچی نیند میں بیدار ہو جانے کے باعث دماغ سالا اونگھا ہوا ہے اور ایسا معلوم ہو رہا ہے گویا کسی بوڑھی عورت کے آغوش میں بھنچا ہوا۔ اوبھی اوبھی سانسیں لے رہا ہوں۔

کچھ نہ پوچھیے کہ یہ گذشتہ پہاڑ سے چھ مہینے کیسے گزارے۔ ان پورے چھ مہینوں میں بالکل تنخواہ نہیں ملی اور وہ بحرانی عالم رہا کہ اللہ دے اور بندہ لے۔ میری جگہ دوسرا ہوتا تو لوگوں کو ڈھیلے مارنے لگتا۔

بارے خدا خدا کر کے اب بھٹو صاحب نے تعلیمات کی وزارت میں تقرر کر دیا ہے اور پچھلی تنخواہ بھی مل گئی ہے۔

یہاں ایک "اکاڈمی آف لیٹرز" قائم کی جانے والی ہے۔ میں نے قدرت اللہ صاحب شہاب سے کہا ہے کہ وہ اس سلسلے میں آپ سے کام لیں۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا ہے کہ میں آپ سے اس کی اسکیم لکھا کر انھیں دکھاؤں تاکہ کام آگے بڑھ سکے۔ اب آپ اس اکاڈمی کے تمام مقاصد اور ضوابط لکھ کر مجھے جلد بھیج دیں۔

اس وقت دماغ سویا ہوا ہے۔ قلم نہیں چل رہا ہے۔ ذہن پر ایک ڈھکن سا رکھا ہوا ہے۔ آپ نے شہاب صاحب کو جو اسکیم دی تھی اسی لائن پر دوسری اسکیم مرتب کر دیجیے۔ ابھی کراچی آنے کا قصد نہیں ہے۔ "ص" کا فون آیا تھا بلانے کا لیکن کیسے جاؤں۔ چھ مہینے سے لاہور بھی نہیں گیا۔ اسی سے آپ میری مجبوری کا اندازہ لگا سکتے ہیں ارے بڑی گھٹن ہے طبیعت میں۔ کانوں میں دل کے دھڑکنے کی آواز آ رہی ہے۔ سناٹا سائیں سائیں کر رہا ہے۔

نیاز مند

جوش

اسلام آباد

۳۔۱۱۔۷۳ء

چار بجنے میں گیارہ منٹ باقی ہیں۔۔۔ والسلام

اس خط کے جواب میں، میں نے جوش صاحب کو لکھا کہ قدرت اللہ شہاب جو اکاڈمی آف لیٹرز قائم کرنا چاہتے اس کا مقصد کیا ہو گا؟ ویسے ممکن ہے قدرت اللہ صاحب ایسی اکاڈمی کے قیام میں سنجیدہ ہوں مگر مجھے ہرگز یہ امید نہیں کہ حکومت کوئی ایسا ادارہ قائم کرنے میں ان سے تعاون کرے گی جس کے ذریعہ سے ترقی پسند انقلابی فکر معاشرے میں رائج

ہو گئے۔ حضور والا بد قسمتی سے ہمارا ملک اس خطہ میں واقع ہے جہاں بہت طاقتور بین الاقوامی بھوتوں کا سایہ ہے اور ہمارے معاشرے کی تعمیر میں اتنی خرابیاں مضمر ہیں کہ نہ معلوم ان بھوتوں کے اثرات سے نکلنے میں ہمیں کتنی دہائیاں لگ جائیں۔ لیکن پھر بھی ہمارا کام کوشش کرنا ہے۔ ناامید ہو کر بیٹھ جانا نہیں۔ اور پھر جب آپ جیسا مفکر اعظم شاعر انقلاب اس طرف متوجہ ہو تو ہم کیا کچھ نہیں کر سکتے؟ آپ کے جواب کا منتظر۔

خاکسار

خورشید

اس کے جواب میں جوش صاحب نے لکھا۔

افق اخلاص کے تاباں خورشید پائندہ و تابندہ ورخشندہ باد[1]

آپ اکاڈمی کا مقصد دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ سو بندہ پرور اس کا مقصد انقباض جہل اور انشراح علم کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

اس مقصد کے حصول کی خاطر فلموں۔ ڈراموں۔ رسالوں۔ کتب خانوں۔ درس گاہوں۔ مقالوں۔ جلسوں۔ تصنیفوں۔ تالیفوں اور ترجموں سے کام لیا جاسکتا ہے۔

چالاک صوفیوں اور مجذوب شاعروں نے قوالوں کی "آہ ہے وا" اور مشاعروں کی "سبحان اللہ" کی وساطت سے عشق و جنون کو ابھار اور عقل و شعور کو بھینچ کر بالعموم ایشیا اور بالخصوص ہندوستان و پاکستان کو جذبات کی افیون پلا پلا کر اتنا عقیل کر رکھا ہے۔ اس غنودے سے لوگوں کو جگانا اور حکمت و منطق کی راہ پر چلانا ہمارا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ اقوال و اساطیر نے ہماری عقل کا گلا گھونٹ رکھا ہے اور ہمارے دماغ کو ایک ایسے ڈھرے پر ڈال دیا ہے کہ ہم بے بنیاد ایقان کو اوڑھنا بچھونا بنا چکے اور عقائد کا دودھ پی پی کر تجسس و تحقیق کو ایک شیطانی عمل سمجھنے لگے ہیں۔ ان خرافات کے جادو گھر سے انسان کا نکالنا سب سے بڑا شرف و مجد ہے۔

آپ ان باتوں پر نگاہ کر کے اکاڈمی آف لیٹرز کا ڈھانچا تیار کریں اور ایک ہفتے کے اندر بھیج دیں تاکہ میں آپ کو یہاں بلالوں۔

جی ہاں اب وہ آگہی سے معلقیت باقی نہیں رہی ہے۔ بال و پر نکل آئے ہیں۔ لاہور

---

[1] درخشندہ کی وہ میں اشباع کا عیب ہے۔ جوش

جانے کی طاقت آ گئی ہے۔ ام الشعرا کی آمد کا انتظار ہے، وہ آ لیں تو لاہور جا کر کوے جاناں کا طواف کر آؤں۔ اس سفر میں آپ میرے تصوری ساتھی ہوں گے۔ اور جب چلنے لگوں گا تو چلے ہوئی۔ فلیش مین، جا کر آپ کی معشوق طناز کو بھی آنکھوں میں رکھ کر لاہور لے جاؤں گا تاکہ اثنائے سفر میں آپ کا دل بشاش رہے۔

کل رات ایک شعر و سخن اور ناؤ نوش کی محفل میں شریک ہوا تھا۔ سامعین خام تھے۔ داد تو سب نے بہت چیخ چیخ کر دی مگر ان کی آنکھوں میں چوں کہ سخن فہمی کی دمک نہیں پائی، اس لیے اہل بمبئی کے بقول، "مجا نہیں آئی"۔ رات کو دیر سے گھر پہنچا۔ نئے لحاف میں لیٹا، روئی کی گرمی نے جسم کو تو آرام پہنچایا لیکن خالی روئی سے کیا ہوتا ہے جب تک کہ "دوئی" نہ ہو۔ بستر کو ٹٹولا کسی چکا دینے والے پنڈے کو پہلو میں نہیں پایا۔ کروٹوں پر کروٹیں لیں لیکن نشے کے باوصف دیر تک نیند نہیں آئی۔

میں شاید مرتے دم تک بوڑھا نہیں ہوں گا۔ میر انیس نے فرمایا ہے کہ جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی۔ لیکن یہاں معاملہ برعکس ہے۔ یہاں تو یہ عالم ہے کہ "جو آ کے نہ جائے وہ جوانی دیکھی"۔ اچھا اب ٹہلنے کا وقت آ گیا ہے۔ آسمان کی سیاہی پر ہلکی سی گلابی سفیدی آ چلی ہے۔

آپ کا جوش

۲۰۸ الف شالی مار ۸/۱

اسلام آباد ۱۲ - ۱۱ - ۷۳ ۔

مخلہ خوباں خورشید علی خاں

B-15 Block "N"

نارتھ ناظم آباد کراچی

ہر چند نیا قلم خریدا ہے لیکن سالا چل نہیں رہا ہے۔ بار بار انگلیوں سے ایڑ دے رہا ہوں حرام زادے کو۔

maablib.org

اکاڈمی آف لیٹرز کا دستور:

بی۔ ۱۵ بلاک این
شمالی ناظم آباد۔ کراچی
۲۰۔ ۱۱۔ ۷۳ء

حضرت پیر و مرشد۔ آداب! آپ کا محبت نامہ ملا۔ آپ کا خلوص اور محبت میرے لیے باعث افتخار ہے۔

ہے تجلی تری سامان وجود   ذرہ بے پرتو خورشید نہیں

سبحان اللہ! چار لفظوں میں آپ نے جو "اکاڈمی آف لیٹرز" کا مقصد بیان فرمایا ہے وہ بلاغت کی معراج ہے۔ معنی کی ایک کائنات آپ نے ان چار لفظوں میں بند فرما دی ہے۔ یہ بلاغت اور معنی آفرینی صرف آپ ہی فرما سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی "اکاڈمی آف لیٹرز" کا نصب العین اس سے زیادہ اختصار و جامعیت کے ساتھ بیان ہی نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس اکاڈمی کا کوئی دستور بنایا گیا تو اس کے سرورق پر صرف یہ چار الفاظ۔

"انقباض جہل و انشراح علم"

لکھ دینا اس کے نصب العین کی وضاحت کے لیے کافی ہوں گے۔ آپ نے مقصد بیان فرمانے کے بعد اس کے حصول کے طریقوں کی بھی توضیح فرما دی ہے۔ یعنی "اس مقصد کے حصول کی خاطر، فلموں، ڈراموں، رسالوں، کتب خانوں، درس گاہوں، مقالوں، جلسوں، تصنیفوں، تالیفوں اور ترجموں سے کام لیا جا سکتا ہے"۔

جناب والا! اگر آپ اس اکاڈمی کو قدرت اللہ صاحب شہاب کی اعانت سے قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میں سمجھوں گا کہ پاکستان کا مستقبل محفوظ ہو گیا۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ملک کی تعمیر و ترقی، ہماری حکومتوں کی تشکیل، ان کا قیام، ان کا خاتمہ، ان کا دستور، ہماری داخلی و خارجی حکمت عملی، ہماری معاشی اقتصادی و تجارتی پالیسی، ہماری سیاسی جماعتوں کی شکست و ریخت، ہماری مذہبی جماعتوں کی تشکیل اور نوی تعمیر میں ان کے اثرات ہمارا سماجی اور معاشرتی ڈھانچا اور سیاسی سماجی اور جمہوری

ادارے سیاسی گروہ بندیاں، یہ سب کے سب حالات جن سے کسی قوم کی تعمیر اور ترقی کی راہیں متعین ہوتی ہیں۔ خود ہمارے ملک کے محب وطن باشعور تعلیم یافتہ افراد کی دسترس سے باہر ہیں۔ جناب والا! ہمارا ملک بین الاقوامی طاقتوں کے ہاتھوں اغوا ہو چکا ہے۔ آج ہم اقوام غالب کے عالمی مقاصد کے حصول کے آلہ کار بن کر رہ گئے ہیں۔

جب ہم نے پاکستان بنایا تھا تو ہمارا مقصد اس نئی مملکت کی تشکیل سے ایک ایسا اسلامی معاشرہ قائم کرنا تھا جہاں تمام انسان بلا لحاظ اوطان، ادیان و لسان، محبت اور اخوت کے رشتوں میں منسلک ہوں۔ جہاں تعلیم مفت اور عام ہو۔ جہاں عدل و انصاف ہو۔ جہاں شخصی اثرات کے بجائے قانون کی حکم رانی ہو۔ امن و خوش حالی ہو۔ کوئی شخص بے روزگار، ننگا یا بھوکا نہ ہو۔ جہاں جامعات اور درس گاہیں، تحقیق و تجسس، علم و تفکر کے گہوارے ہوں۔ جہاں معاشرے میں اسلامی عدل کے تحت نہ مترفین ہوں اور نہ محرومین ہمارے جمہوری ادارے مستحکم اور ہمارا دفاعی نظام ناقابل تسخیر ہو۔ ہم نہ صرف اپنے لیے بلکہ تمام دنیا کے لیے عام طور پر اور اپنے پڑوسی ملکوں کے لیے خاص طور پر امن، بھائی چارے اور تعاون کے علم بردار ہوں۔ ہم دنیا کے کسی ملک کی طرف جارحانہ عزائم نہ رکھیں اور نہ کسی ملک کو اپنے ملک کی جغرافیائی حدود کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنے کی اجازت دیں۔ ہم نے ایک ایسی جنت ارضی کا خواب دیکھا تھا جہاں قرآن کے الفاظ میں " و من دخلہ کان آمناً " اور جہاں امن کا یہ عالم ہو کہ " ولا خوف علیہم ولا ھم یحزنون " نہ کسی متنفس کو کسی قسم کا کوئی خوف ہو اور نہ انھیں کوئی داخلی حزن و ملال ہو۔ مگر

با ورچہ خیالیم و فلک درچہ خیال است

اور فلک کس خیال میں تھا؟ اسے علامہ اقبال کے الفاظ میں سنیے:

اثر یہ بھی ہے اک میرے جنون فتنہ ساماں کا
مرا آئینہ دل ہے قضا کے رازداروں میں
نشان برگ گل تک بھی نہ چھوڑ اس باغ میں گلچیں
تری قسمت سے رزم آرائیاں ہیں باغبانوں میں

چھپا کر آستیں میں بجلیاں رکھی ہیں گردوں نے
عنادل باغ کے غافل نہ بیٹھیں آشیانوں میں
وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں

جب علامہ اقبال ہم کو ان تباہ کن نتائج سے آگاہ کر رہے تھے تو کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ ہماری بربادیوں کے کیا مشورے "آسمانوں" میں ہو رہے ہیں۔ مگر جوش صاحب آپ نے دیکھا کہ پاکستان بننے کے صرف چوبیس سال کے اندر ہمارے ملک میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو گیا۔ پاکستان کی تخلیق کے وقت کشمیر کے مسئلہ کو متنازع چھوڑ دینا۔ لیاقت علی خاں کو قتل کروا دینا۔ غلام محمد جیسے مفلوج شخص کی نادر شاہی۔ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی۔ امریکہ میں پاکستان کے سفیر محمد علی بوگرہ کا وزارت عظمٰی پر تقرر یہ سب کارروائی اس لیے کی گئی کہ پاکستان کو بغداد پیکٹ کے ذریعہ سے روس کے اطراف دفاعی حصار میں شریک کیا جا سکے۔ اور ناروے اور آئس لینڈ سے جرمنی تک شمالی اوقیانوس کی تنظیم (N.A.T.O) کے ذریعہ سے جو دائرہ روس کے اطراف یورپ میں کھینچا گیا اس کو ترکی، عراق، ایران کے بعد پاکستان کی شمولیت کے ذریعہ سے جنوب وسطی ایشیا میں مکمل کیا جاتے۔ اس دفاعی تنظیم کے مقاصد کی تکمیل کے لیے پاکستان میں فوجی آمریتوں کا قیام اور ان طویل المیعاد آمریتوں کی تقویت کے لیے جاگیرداروں، وڈیروں، سرداروں، نوابوں، سرمایہ داروں اور مذہبی پیشواؤں کی سرپرستی۔ ملک میں سیاسی انتشار یہ تمام ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ بقول کیفی اعظمی:

میرے مرنے پر فرشتہ موت کا بدنام تھا
وہ ہنسی والے الگ بیٹھے تھے جن کا کام تھا

یہ داستان غم یہیں ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ سول بیوروکریسی کو خوف زدہ کرنے کے لیے سرکاری ملازمین کو جبری طور پر وظیفہ دے کر سبکدوش کیا گیا اور ان کی جگہ نااہل اور ایسے سفارشی لوگوں کو بھرتی کیا گیا جو اپنے حاکموں کی مرضی کے مطابق ہر غیر قانونی کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ملک میں قانون کی حکومت کو ختم کر کے رشوت اور سفارش کا بازار گرم

کر دیا گیا اور سب سے بڑی خرابی یہ ہو گئی کہ عاملہ اور عدلیہ کو سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ بار بار دستور ملک کی دھجیاں اڑا کر سیاسی اور جمہوری اداروں کو پنپنے نہیں دیا گیا۔

تعلیمی اداروں کو علم و تحقیق کے مراکز کے بجائے سیاسی گروہ بندیوں، مذہبی، علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ اختلافات کے اڈوں میں تبدیل کر کے نوجوان نسل کے ذہنوں کو زہر آلود کر دیا گیا اور ہمارے تعلیمی اداروں میں نفرت اور تشدد کی ایسی فضا پھیلائی گئی کہ نئی نسل کے لیے حصول علم ناممکن ہو کر رہ گیا۔

پھر جب جاگیر دار، نواب، سردار اور وڈیرے حکومتی ذرائع پر قابض ہو گئے تو انھوں نے سرکاری خزانے کو ذاتی مفاد اور اپنے سیاسی استحکام کی خاطر دونوں ہاتھوں سے لوٹا اور جب خزانہ خالی ہو گیا تو عالمی اداروں کے سامنے کاسۂ دریوزہ گری لے کر بھیک مانگنے لگے۔ آج پوری قوم ان بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ہاتھوں میں گروی ہے۔ ہماری معاشی اقتصادی، سیاسی اور دفاعی ضرورتوں کی تکمیل ان کی مرضی کی تابع ہوتی ہے۔ ہم اپنی قومی آمدنی کا بیشتر حصہ قرضے کے سود میں ادا کرتے ہیں اور اسی طرح اقوام غالب کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالے پھر رہے ہیں۔

حضور والا ان تمام باتوں کو آپ سے زیادہ اور کون جانتا ہے۔ حقائق بے نہایت تلخ ہیں۔ ہم پانی کے بلبلوں کی طرح سطح حیات پر ابھرتے اور فنا ہو جاتے ہیں۔ نہ ذوق ارتقا پسندی نہ شوق تعمیر۔ صرف محکوم حوادث۔ نہ ماضی سے عبرت نہ حال پر قدرت نہ مستقبل پر حکومت۔ یہ ہے ہماری قوم کا المیہ بقول غالب:

بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

آہ یہ قوم نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روز مکافات اے خدائے دیر گیر؟

لیکن ان تمام باتوں کا شعور رکھ کر اور اپنی قوم کو تباہی کے راستے پر سرپٹ دوڑتے ہوئے دیکھ

کہ ہمیں شتر مرغ کی طرح ریت میں منہ چھپا کر حقائق سے منہ نہیں موڑنا چاہیے۔ کیونکہ بقول آپ کے:

انساں کی تباہیوں سے کیوں ہے دل گیر | کابل میں بدل جائے گی کل یہ زنجیر
اس آدم فرسودہ کے زیر تخریب | اک آدم نو کی ہو رہی ہے تعمیر

تو جناب والا اگر ہم اس "دانش گاہ فکر و قلم" کے ذریعے سے اس آدم نو کی تعمیر میں حصہ لے سکے۔ اپنے عوام کے شعور کو بیدار کر سکے اور ان کو اپنے معاشرے کی تباہی کا احساس دلا کر اس کے بنیادی اسباب کی طرف متوجہ کر سکے تو یقین مانیے ہماری زندگی کا مقصد حاصل ہو جائے گا۔ مگر میں یہ بھی خوب سمجھتا ہوں کہ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ اول تو ہماری اس اسکیم کو حکومت کی تائید حاصل نہیں ہو سکے گی کیونکہ یہ بات نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتی ہے کہ ہماری حکومت کی ترجیحات بالکل دوسری ہیں لیکن اگر کسی حکومت نے اتنی جرات دکھائی بھی تو پھر وہ حکومت باقی نہیں رہے گی لیکن بہرحال اس وقت آپ اور قدرت اللہ صاحب مل کر اس اکاڈمی کی بنیاد ڈال ہی دیجیے اور مجھے قدرت اللہ صاحب شہاب سے یہ قوی امید ہے کہ وہ آپ کو اس اکاڈمی کا صدر بھی بنا دیں گے۔

اس طرح اگر یہ اکاڈمی آف لیٹرز قائم ہو جائے تو اس کا دفتر اسلام آباد میں ہو گا اور یہ ادارہ گو اپنے مالیاتی امور میں وزارت تعلیم سے منسلک ہو گا مگر تمام انتظامی امور میں یہ خود مختار ہو گا۔ آہستہ آہستہ اس کی شاخیں صوبائی مراکز میں قائم کی جائیں گی۔ اس طرح کراچی، لاہور، پشاور اور کوئٹہ میں اس کی ذیلی شاخیں قائم کی جائیں گی۔ ان شاخوں کے لیے صدور کا انتخاب مرکز کرے گا جو ایسے مقامی دانشوروں میں سے ہو گا جو اپنے ملک کے تمام مسائل کا حقیقی ادراک رکھتے ہوں۔ جن کا جذبہ حب الوطنی ہر قسم کے شبہے سے بالاتر ہو۔ اور جو علم اور تحقیق کی طرف معروضی اور سائنسی نقطہ نظر رکھتے ہوں اور جن کے ذہن ہر قسم کی توہم پرستی اور تعصب سے پاک ہوں۔ جو تحریر و تقریر پر عبور رکھتے ہوں۔ پھر ہر ادارہ اپنے اپنے علاقے کے ترقی پسند باشعور ادیبوں، شاعروں، ناول ڈرامے اور افسانہ نگاروں، ماہرین تعلیم، صحافیوں، کالم نگاروں، اخبار کے ایڈیٹروں، ٹی وی اور ریڈیو کے پروڈیوسروں اور فلمی دنیا کے ڈائریکٹروں کو اپنے اپنے حلقے کی اکاڈمی کا رکن بنائے گا۔

مرکز ان تمام صوبائی اداروں کے کام کی نگرانی کرے گا اور ان کو ہدایات جاری کرے گا۔ کم از کم سال میں ایک مرتبہ اداروں کے صدور مرکز میں جمع ہوں گے اور آپس میں تبادلۂ خیالات کر کے اگلے سال کی پالیسی کا تعین اور گزرے ہوئے سال کے کام کا جائزہ لیں گے۔

جب یہ ادارے قابل اعتماد دانشوروں کے ذریعے سے مستحکم بنیادوں پر استوار ہو جائیں تو آہستہ آہستہ اس علاقے کے تمام تعلیمی ادارے ان کے کنٹرول میں دے دیئے جائیں۔ ان اداروں میں ماہرین تعلیم پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جائے جو اپنے اپنے علاقے کے تعلیمی مراکز کی نگرانی کرے۔ ہر مرکز کے معیار تعلیم کو جانچے اور ان مدارس کو غیر معیاری اور نااہل اساتذہ سے پاک کر کے ایسے اساتذہ کا تقرر کرے جو بہترین کردار، اچھی صحت اور درس و تدریس کا اعلیٰ شوق اور صلاحیت رکھتے ہوں جن کے ذہن ہر قسم کے تعصب سے پاک ہوں اور علم کی طرف معروضی اور سائنٹفک نقطۂ نظر رکھتے ہوں اور جو اپنے مضمون میں مہارت اور تحقیقی رجحان رکھتے ہوں۔ ہر مدرسے میں تعلیم جبری طور پر لازمی اور حتی الامکان مفت ہونی چاہیے۔ یہ ادارے، مدارس میں ہر جماعت کا نصاب تعلیم مقرر کریں۔ جس حد تک ممکن ہو نصاب کی کتابیں تصنیف، تالیف اور ترجمہ کروائیں اور اس مقصد کے لیے اعلیٰ ترین صلاحیتوں اور علمی معیار کے اصحاب کا انتخاب کریں اور ان کو اپنی کتابوں کا معقول معاوضہ ادا کریں۔ اساتذہ کو مالی اعتبار سے بے فکر کر دینا چاہیے۔ ان کو معاشرے میں نہایت عزت اور احترام کے مقام پر فائز کرنا چاہیے۔

تمام تعلیمی اداروں کو ہر قسم کی سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعتوں کے اثرات سے پاک کر کے طلبہ کو صرف اور صرف حصول تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہیے۔ کسی طالب علم یا کسی استاد کے لیے کسی سیاسی یا فرقہ وارانہ جماعت سے وابستگی کو سنگین جرم قرار دینا چاہیے۔

بہرحال یہ ایک سرسری سا خاکہ جو میرے ذہن میں آیا وہ میں نے عرض کر دیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس موضوع پر خود آپ کا ایک تفصیلی مضمون غالباً دس بارہ سال قبل کسی رسالے میں چھپ چکا ہے اگر اس کی کوئی کاپی آپ کے پاس ہو تو وہ قدرت اللہ صاحب کو دے دیجیے اور ایک نقل مجھے بھی ارسال فرما دیجیے۔ یہ خط ذرا طویل ہو گیا ہے مگر چونکہ موضوع ہی ایسا ہے اس لیے مجبوری ہے۔ آپ کراچی کب تشریف لا رہے ہیں۔ ہم

۱۔ ماہنامہ سفینہ کراچی میں جسے راغب مراد آبادی نکال رہے تھے اور جس کے سرپرست حضرت جوش تھے۔

وگ بے انتہا آپ کے منتظر ہیں۔ آپ کے بغیر کراچی کی ساری رونقیں ختم ہو گئی ہیں۔

آپ کا چاہنے والا

خورشید

اس خط کا کوئی تحریری جواب تو جوش صاحب نے نہیں دیا مگر ٹیلی فون پر مجھے بتایا کہ انھوں نے میرا پورا خط ہی قدرت اللہ صاحب کو دے دیا مگر انھوں نے بھی اس کا کوئی جواب اس وقت تک نہیں دیا۔ اور جیسا کہ میں نے خدشہ ظاہر کیا تھا ایک فارسی محاورے کے مطابق اس دفتر بے معنی کو گائے کھا گئی اور گائے کو قصائی نے کاٹ دیا اور اس طرح یہ قصہ ختم ہو گیا۔

maablib.org



سلامت علی خان، حضرت جوشؔ، اور خورشید علی خان،
بی ۔ ۵۱، بلاک این ۲ والے مکان میں۔



خورشید علی خاں اور حضرت جوشؔ ملیح آبادی

۱۹۷۴ء کے واقعات

اس کے بعد جوش صاحب کا ۲۲۔۱۔۷۴ء کا لکھا ہوا حسب ذیل خط وصول ہوا۔

لیجیے خورشید علی خاں میں یہاں سے پانچویں فروری کو تیز گام سے کراچی روانہ ہو رہا ہوں۔ چھٹی فروری کو کینٹ اسٹیشن پر موٹر لے کر آ جائیے گا۔ میں اپنے یہاں نہیں۔ آپ کے گھر قیام کروں گا۔ کھانا آپ کے ذمے ہو گا اور پینے کا بار میں خود اٹھاؤں گا۔
اپنے یہاں اس لیے نہیں ٹھہروں گا کہ وہاں نہ سواری ہے اور نہ ٹیلی فون۔ بڑی گھلاوٹ بے تکلفی کے ساتھ مطلع فرمائیے کہ میرے قیام سے آپ یا آپ کی بیگم کو کوئی الجھن تو نہیں ہوگی۔

آپ کا مخلص

جوش

۲۲۔۱۔۷۴ء

اسلام آباد

جوش صاحب کی کراچی آمد:

میں نے اسی دن جوش صاحب کو مطلع کر دیا کہ آپ نے اپنے آنے کی خوشخبری دے کر بے چینیاں بڑھا دی ہیں اور یہ مژدۂ جانفزا سنا کر کہ آپ غریب خانے کو عزت و رونق

بخشیں گے۔ میرا یہ حال ہو گیا ہے کہ:

میں اور حظِ وصل خدا ساز بات ہے　　　جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

میں انشاء اللہ آپ کے تمام عشاق کے ساتھ چھبیس فروری کو کینٹ اسٹیشن پر آپ کا منتظر رہوں گا۔

چھبیس فروری کو میں، راغب صاحب، سرور اقبال اور فراست رضوی کینٹ اسٹیشن گئے۔ اور جوش صاحب بذریعہ تیز گام گیارہ بجے کینٹ اسٹیشن پہنچے اور میں تمام احباب کے ساتھ جوش صاحب کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔

اس دفعہ جوش صاحب کوئی دس دن کراچی میں میرے ساتھ رہے۔ ہر روز روز عید اور ہر شب شب برات تھی۔ روزانہ احباب جمع ہو جاتے دنیا کا کون سا موضوع ہے جو موضوع گفتگو نہ ہوتا تھا۔ ڈاکٹر عالیہ امام، سرور بارہ بنکوی، راغب مراد آبادی، فراست رضوی، سرور اقبال، سلامت علی خان تمام احباب جوش صاحب کو گھیر لیتے۔ میں اور جوش صاحب روزانہ سورج نکلنے سے پہلے بیدار ہو جاتے اور دور تک ٹہلنے چلے جاتے۔

ایک مرتبہ رات دیر تک جاگے۔ دوسرے دن صبح دیر سے بیدار ہوئے تو جوش صاحب نے اسی دن ایک نظم کہی جسے میں نے جوش صاحب کی آواز میں ٹیپ کر لیا۔

صبح دیر سے بیدار ہونے پر

خانۂ تاباں خورشید علی خاں
نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

آج سوتا رہا میں دیر تک　　　روسیہ نیند پر خدا کی مار
آج بھی پی سکا نہ آنکھوں سے　　　بادۂ ناب صحت افکار
آج بھی روح میں نہ گونج سکی　　　دف و چنگ شعور کی جھنکار
آج بھی ڈھونڈتی رہی مجھ کو　　　طائران صبوح کی چہکار
آج بھی حیف ہو گیا برخاست　　　لیلیٰ رقص و رنگ کا دربار
آج بھی حیف تابہ دیر صبح　　　کھٹکھٹاتے رہے در بیدار

آج بھی ذہن میں جھنک نہ سکا | منہ اندھیرے کی خامشی کا ستار
آج بھی نیند نے تلف کر دی | حسن فطرت کی دولت بیدار
آج بھی سرنگوں رہا مجھ میں | ناز الوان و عشوہ اشجار
آج بھی کنج میں اداس رہی | نکہت زلف دختران بہار
حیف دوشیزگان مشرق سے | آج بھی ہو سکا نہ بوس و کنار
آج بھی کھل نہ پائے سینے میں | طرف ہائے ثوابت و سیار
آج بھی سن سکا نہ جھونکوں سے | لحن ہائے پیمبران کبار
آج بھی دل میں چبھ گئی برچھی | آج بھی سر پہ چل گئی تلوار
آج بھی تا بہ شام وائے نصیب | سطح جودت رہے گی ناہموار
چاہ غفلت سے ہائے کب نکلا | لٹ گیا جب یہ مصر کا بازار
حسن کے قافلوں پہ قافلے آئے | اور جاگا نہ قافلہ سالار
لائی تھیں گوندھ کر جنھیں حوریں | حیف گردن میں پڑ سکے نہ وہ ہار
جل رہے ہیں الاؤ سینے میں | وقنا ربنا عذاب النار
نہ کیا کعبہ سحر کا طواف | تف ہے اے جوش حسن کے غدار
تجھ پہ اے بخت نارسا لعنت | تجھ پہ اے خواب ناسزا پھٹکار
تو نے اچھا کیا بہت اچھا | اے سپاہ صباح زمزمہ بار
کر سر جوش بے بصیرت پر | ٹھوکروں کے لگا دیے انبار

گریہ سحر گاہی:

ایک رات تین بجے میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ جوش صاحب کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ میں نے آہستہ سے پردہ ہٹا کر اندر جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ جوش صاحب مسہری کے سرہانے کا ٹیکا لیے نیم دراز حالت میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ آنکھیں بند ہیں اور روتے روتے ہچکی بندھ گئی ہے..... میں سخت پریشانی کے عالم میں اندر داخل ہو گیا۔ میں نے پوچھا جوش صاحب! خیریت تو ہے۔ آپ کا مزاج کیسا ہے؟ کہیں خدانخواستہ کوئی تکلیف تو نہیں؟

میری آواز سن کر جوش صاحب کسی گہرے استغراق سے چونکے۔ مجھے دیکھتے ہی سنبھل کر بیٹھ گئے۔ رومال سے آنسو پونچھ کر کہنے لگے۔ ارے آپ کب آ گئے؟ میں نے کہا کہ اتفاق سے میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ آپ کے کمرے میں روشنی ہو رہی ہے۔ جب میں کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر بہت گھبرا گیا کہ آپ رو رہے ہیں۔ کہنے لگے اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ مجھ پر اس قسم کی کیفیت اکثر طاری ہو جاتی ہے۔ میں نے اس کا سبب دریافت کیا تو کہنے لگے ارے خورشید علی خاں، تمھیں کیا بتاؤں کہ میں کس عذاب میں ہوں۔ جب میں نے بار بار دریافت کیا تو کہنے لگے۔ علت العلل ۔ کی تلاش ہے۔ ارے ہمارے حواس اس قدر محدود کیوں بنائے گئے ہیں کہ ہم خالق کائنات و حیات کا کما حقہ ادراک نہیں کر سکتے۔ اپنی اس مجبوری اور اس محدودیت پر روتے روتے مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ بھی کیسا ستم ہے کہ وہ جس قدر ہمارے حواس کی گرفت سے دور دکھائی دیتا ہے، اس کے ساتھ عشق کی شدت میں اسی قدر اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

میں نے کہا جوش صاحب آپ کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا مکالمہ یاد ہے۔ جب خدا دریافت فرماتا ہے۔ اے جوش دل میں ہے کہ جگر میں، کہاں ہے درد؟

آپ فرماتے ہیں۔ اے واقفِ بطونِ دو عالم ... کہیں نہیں

خدا۔ کیا دل تڑپ رہا ہے مرے وصل کے لیے

جوش۔ اللہ رے عارفانہ تجاہل کہیں نہیں

اور پھر آپ کی وہ دعا،

مجھ کو تو پیغمبری دے اور نہ شاہنشاہ کر
ہو سکے تو سرِ موجودات سے آگاہ کر
اپنے اصلی خال و خد سے آشنا کر دے مجھے
بندگی اک جہلِ مطلق ہے خدا کر دے مجھے

جوش صاحب! اگر میں آپ کی فکر کو کچھ سمجھ سکا ہوں تو کیا آپ کے ذہن نے۔ تشخص کا جو بت تراش رکھا ہے اس کے دید کی آرزو میں آپ کی یہ کیفیت تو نہیں ہے؟ ظاہر ہے کہ جذبہ عشق کے وجود پذیر ہونے کے لیے کسی نہ کسی پیکر محسوس کا ہونا ضروری ہے اور جب

آپ اس بات کے قائل ہیں کہ یہ تمام کائنات اپنی بے نہایت پوشیدہ اور ظاہر وسعتوں کے ساتھ خود توانائی مطلق کا صفاتی مظہر ہے اور اس صفاتی مظہر میں آپ اور میں بھی شامل ہیں تو پھر آپ کا جذبہ عشق مجازی تو ہو سکتا ہے، حقیقی نہیں ہو سکتا۔ جوش صاحب! سب سے بڑی خرابی تشخص سے پیدا ہوتی ہے خواہ وہ ذہنی ہو یا خارجی۔ جب ہم اس توانائی مطلق کو مشخص کرتے ہیں تو اسی کے ساتھ اس کے وجود کو کائنات سے الگ کر دیتے ہیں، حالانکہ کسی ذرے کا وجود بے پرتو خورشید ممکن ہی نہیں۔ عالم خلق جو صرف صفاتی مظہر ہونے کی وجہ سے الگ الگ صورتیں رکھتا ہے، اپنی عینیت میں اسی وحدت کی تجلی کا مظہر ہے۔ بقول غالب:

یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں　　ہے منحصر وجود صور پر نمود بحر

اس حقیقت کو آج جس طرح علم طبیعیات نے واضح کر دیا ہے اس سے پہلے فلسفے کے ذریعے سے ممکن نہیں تھا۔ اس وقت وہ صرف ایک نظریے کی حیثیت رکھتا تھا۔ آج یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ تمام اجسام کائنات مالی کیول یا سالمات پر مشتمل ہیں اور مالی کیول یا سالمات ایٹم یا جوہر سے مل کر بنے ہیں اور جوہر توانائی کا تشخص ہے تو اس توانائی کو کائنات سے جدا تصور کر کے اس کے عشق میں آنسو بہانا میری فہم سے بالاتر ہے۔

معاف فرمائیے گا، میں آپ ہی کے دلائل سے آپ سے گفتگو کرنے لگا۔ ہماری ان باتوں میں صبح نمودار ہو گئی۔ جوش صاحب مسکراتے ہوئے پلنگ سے اٹھے اور منہ ہاتھ دھو کر فرمایا چلو اب صبح کی مشی کا وقت ہو گیا ہے۔ باہر ٹہل کر آئیں اور ہم دونوں نسیم صبح کے جھونکوں میں ٹہلتے ہوئے دور نکل گئے۔ ایک مقام پر رک کر ہم لوگوں نے ورزش کی اور ایک گھنٹے کی تفریح کے بعد گھر آئے۔ جوش صاحب نے شیو اور غسل کیا۔ اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ ہم ناشتہ کر ہی رہے تھے کہ سلامت علی صاحب آ گئے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر ہم تینوں پہلے سبط حسن صاحب کے دفتر گئے۔ وہاں جوش صاحب نے "یادوں کی برات" کے تعلق سے آمدنی اور خرچ کا حساب لیا۔ سبط حسن صاحب نے حساب کر کے جو آمدنی ہوئی تھی اس کا چیک جوش صاحب کو دے دیا۔ وہاں سے یونائیٹڈ بینک گئے وہاں برنی صاحب سے ملنے کے بعد بابا ذہین شاہ صاحب تاجی کے آستانہ پر پہنچ گئے۔

بابا صاحب جوش صاحب سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ پھل مٹھائی اور چائے سے

تواضع کرنے کے بعد شاعری شروع ہو گئی۔ بابا صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا ایک شعر بے حد پسند آیا۔ جوش صاحب نے بھی مکرر سنانے کی فرمائش کی۔ شعر یہ تھا۔

ٹھہر سکا نہ حرم میں دل رسیدہ دیر

یہاں خدا کے تصور میں بت گری سی ہے

کوئی دو بجے تک یہ محفل شعر و سخن گرم رہی۔ پھر ہم گھر آ گئے۔ تقریباً روز کا یہ معمول تھا کہ صبح ناشتہ کر کے ہم دونوں نکل جاتے۔ کبھی آغا حسن صاحب عابدی کے ہاں، کبھی مشتاق احمد صاحب یوسفی کے دفتر اور کبھی روشن علی بھیم جی کے گھر تھوڑی دیر گزار کر بابا صاحب کے مکان چلے جاتے اور سہ پہر گھر آ کر ایک گھنٹہ آرام کرتے اور شام کو تمام احباب ہمارے گھر میں جمع ہو جاتے اور اس وقت رخصت ہوتے جب جوش صاحب اپنی خواب گاہ میں چلے جاتے۔

بیگم کرنل نذیر کے گھر جوش صاحب کی دعوت:

چودھویں فروری کو جوش صاحب کی دعوت بیگم کرنل نذیر نے کی۔ ہم لوگ بابا صاحب کے گھر سے ڈاکٹر عالیہ امام اور ان کے شوہر کاظم امام صاحب کے ہمراہ بیگم صاحب کے مکان واقع ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی پہنچے۔ بابا صاحب بھی ہمارے ساتھ تھے۔ کرنل صاحب کے انتقال کے بعد بیگم صاحب اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہیں۔ موسیقی کا بہت شوق ہے خود بھی اچھا گا لیتی ہیں۔ گو عمر کافی ہے اور آواز میں جوانی کا رچاؤ کم ہو گیا ہے مگر راگ راگنی سے خوب واقف ہیں۔ ڈاکٹر عالیہ امام خود بہت اچھا گاتی ہیں اور موسیقی کے فن سے بھی واقف ہیں۔ سب کی فرمائش پر انھوں نے چند گیت سنائے۔ اتنے میں ٹی وی کے اداکار قاضی واجد آ گئے۔ وہ اس گھر کے ایک بے تکلف فرد معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے بیگم صاحب کی موسیقی سے واقفیت کی بہت تعریف کی۔ پھر سب حضرات کی فرمائش پر بیگم صاحب نے ہارمونیم سنبھالا اور گیت شروع کیا۔

بیگم صاحب۔ بھگو دی موری ساری رے ...... دیکھو بھیگے نہ چولی

دیکھو جی ...... بلم نہ مارو پچکاری

گیت کی لے، اس کا راگ، اس کے الفاظ اور بیگم صاحب کی نرت۔ جی چاہتا تھا یہ بھول کا کھیل کبھی ختم نہ ہو۔ سب نے دل کھول کر داد دی اور ہر شعر کئی کئی دفعہ گوایا گیا۔ جیسے جیسے گیت آگے بڑھ رہا تھا بیگم نذیر کی آواز اور ان کے ساز کی موسیقی نے وہ سماں باندھا کہ معلوم ہوتا تھا

بساط نغمہ پہ گویا کنول کھلاتے ہوئے
کھڑی ہوئی ہے جوانی نقاب اٹھاتے ہوئے

گیت ختم ہوا تو غزل کی فرمائش ہوئی۔ بیگم صاحب یوں غزل سرا ہوئیں:

اک دن وہ مل گئے تھے سر رہ گزر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں

ڈاکٹر عالیہ امام نے مصرع اٹھایا۔ پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں۔

جوش صاحب نے داد دی۔ واہ واہ واہ۔

بیگم صاحب نے دوسرا شعر شروع کیا۔

انداز احتیاط محبت تو دیکھیے
میری نظر کہیں ہے تو ان کی نظر کہیں
ان دوستوں کی کارگزاری تو دیکھیے
دل سے لگا لگا کے ادھر کی ادھر کہیں

غرض بیگم نذیر نے گائیکی کے سحر سے وہ سماں باندھا کہ ہر شخص خود فراموشی کے عالم میں وجد کر رہا تھا۔ اگر آپ آنکھیں بند کر کے انھیں سنیں تو معلوم ہو گا کہ ہندوستان کی بیگم اختر نغمہ سرا ہیں۔ غرض یہ محفل جو فردوس گوش تھی، نہ معلوم کتنی دیر کے بعد لذت کام و دہن پہ ختم ہوئی۔

کینٹ پبلک ہائی اسکول میں جوش صاحب کا خطاب بہ طالبات:

دوسرے دن بیگم نور جہاں، پرنسپل پبلک ہائی اسکول برائے خواتین کینٹ نے جوش صاحب سے مل کر یہ استدعا کی کہ وہ سولھویں فروری ۷۲ء کو ان کے مدرسے کے جلسہ تقسیم اسناد

میں شرکت فرما کر اپنے ہاتھ سے لڑکیوں کو اسناد تقسیم فرمائیں۔ جوش صاحب نے جلسے میں شرکت کا وعدہ فرما لیا اور اس تقریب کے لیے ایک خطبہ بھی تحریر فرمایا۔ دوسرے دن یعنی سولھویں فروری کو میں اور جوش صاحب صبح آٹھ بجے بیگم نور جہاں کے مکان پہنچ گئے۔ انھوں نے بہت پر تکلف ناشتے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ ہم لوگ نو بجے تک ناشتے سے فارغ ہو کر مدرسے پہنچ گئے۔ جوش صاحب کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ تقسیم اسناد کی کارروائی شروع ہوئی۔ جوش صاحب نے اسناد تقسیم کیں اور اس کے بعد بچیوں سے یوں خطاب فرمایا۔

"اے بچیو! پیاری بچیو۔ راج دلاری بچیو۔ میں مردوں کے کارہائے نمایاں سے واقف اور ان کی عظمت کا لوہا ماننے والوں میں سے ہوں لیکن تم میں اور مردوں میں یہ فرق ہے کہ وہ لوہے کی چادریں ہیں تم ریشم کے پلو ہو۔ وہ کڑی دھوپ ہیں تم سہانی چاندنی ہو۔ وہ معمار ہیں تم تاج محل ہو۔ وہ تلوار ہیں تم شاخ ہائے گل ہو۔ وہ شعلے ہیں تم شب نم ہو۔ وہ چمن آرا ہیں تم سر سے پاؤں تک چمن ہو۔ ہاں یہ تم اور صرف تم ہو جنھوں نے اس وحشی جانور یعنی مرد کو رام کیا ہے اور اس کوہ و بیاباں میں گھومنے والے کے پاؤں میں خاردار زنجیریں ڈال دی ہیں۔ مردوں کے گلے میں زمانہ حال کے پھندے پڑے ہوئے ہیں۔ تمھاری گودوں میں زمانہ مستقبل جھک رہا ہے۔ تمھارے لہجے، تمھارے نشست و برخاست کے طریقے اور تمھاری نظریں ایسے خاموش مدرسے ہیں جن کے سانچے میں ڈھل کر نئی نسلیں پروان چڑھیں گی اور تمھارے کلمات زندگی بھر ان کے خون میں دوڑتے رہیں گے۔

اے بچیو! میں چاہتا ہوں تم اپنی اہمیت سے آگاہ ہو جاؤ اور ابھی سے تیاری شروع کر دو ان فرائض کی جن کا بار تمھارے شانوں پر آنے والا ہے۔ چوٹی سے پکڑ لو وقت رواں کو اور یاد رکھو کہ یہ زندگی چھوٹے چھوٹے لمحوں کے موتیوں کا اک گندھا ہوا ہار ہے اگر تم نے اس کا ایک دقیقہ بھی ضائع کر دیا یا ایک موتی بھی توڑ ڈالا تو یہ ہار بدنما ہو کر رہ جائے گا اور ایک موتی کے بقدر تمھاری زندگی گھٹ جائے گی۔

وقت کا دھارا بڑی تیز رفتاری کے ساتھ ہر آن دھڑا دھڑ بہتا چلا جا رہا ہے۔ اور ہر سانس ایک نئی تبدیلی پیدا کر رہی ہے۔ یہ تبدیلی کا کاروبار اس سرعت سے جاری ہے

کہ آئینے میں تم اپنے چہرے کو دوبارہ دیکھ نہیں سکتیں۔ اس لیے کہ تمھارا چہرہ اور آئینہ دونوں تغیرات کے دھارے میں بہتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لیے اس کم سنی کے موڑ کو غنیمت جانو اور آئندہ زمانے کے واسطے مسلح ہو جاؤ۔ بیشک یہ تمھارے کھیل کود کے دن ہیں لیکن کھیل کود کی لے کو اس قدر بڑھنے نہ دو کہ وہ تمھارے حصول علم کے رشتے کو کاٹ دے۔

بچیو! گھبرا گھبرا کر علم حاصل کرو۔ اپنے دماغوں کے دریچوں کو کھولو اور اپنے شعور کی لوؤں کو ہر آن اکساتی رہو۔ میں تم کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ علم سے جی چرا کر اگر آج ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھو گی تو تمام عمر دھوپ تمھارا تعاقب کرتی رہے گی۔ لوگ کہتے ہیں کہ قدرت نے تم کو مردوں کی طرح قوی بنانے میں بخل سے کام لیا ہے لیکن ان کو اس حقیقت کا علم نہیں کہ تمھاری نزاکت کے اندر وہ سختی ہے جو مردوں کی فطرت کے لوہے کو گلا ڈالتی ہے۔ اگر تم نہ ہوتیں تو یہ کرۂ ارض تاریک رہتا۔ انسانیت و شرافت اور شاعری کو فروغ حاصل نہ ہوتا۔ اگر تم سیف ساں نگاہیں نہ چبھوتیں تو انسان کے دل سے فاسد مادہ نکل نہ سکتا اور نوع بشر کی آفاقی محبت کا چراغ حشر کے دن تک نہ جل سکتا۔

تم پر مردوں کو ترجیح دینے والے کہتے ہیں کہ قدرت نے آج تک تم میں سے کسی کو پیغمبری کا مرتبہ عطا نہیں کیا ہے اور میں یہ کہتا ہوں کہ اس کو پیغمبری کی حاجت کیا ہے جس کو جوہر تخلیق بخش کر خدائی کا منصب عطا فرما دیا گیا ہے"۔

خطاب ختم ہوا تو بچیوں نے تالیوں کی گونج میں جوش صاحب کو پھولوں کے ہاروں سے لاد دیا اور اس طرح تقریب تقسیم اسناد اختتام کو پہونچی۔

اس کے دوسرے دن ۱۸ فروری کو جوش صاحب صبح تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے۔ اس کے بعد ۲۳ اپریل ۶۲ء کا لکھا ہوا خط راغب صاحب کے توسط سے ۲۶ اپریل کو مجھے ملا۔ جوش صاحب نے لکھا تھا:

"نور افشاں جہان و جہانیاں، خورشید علی خاں۔ لیجیے پھر نزول اجلال ہو رہا ہے میرا کراچی میں۔ اٹھائیسویں اپریل کو تیز گام سے چلوں اور انتیسویں کو شہر کراچی پہنچوں گا۔ کیلی کانٹے سے درست ہو کر اسٹیشن آ جائیے گا۔ سلامت علی خاں اور میاں راغب کو بھی اطلاع



"مامن" میں
حضرت جوشؔ ملیح آبادی



"مامن" میں
خورشید علی خاں، راغب صاحب، جوشؔ صاحب، نسیم احمد صاحب اور فرخ جمال (نواسۂ جوشؔ)

دے دیجیے گا اور شعرائے امرد کو بھی۔

نیاز کوش

مرحوم جوش

۲۳۔۳۔۷۲ء

۲۵۱ ۹/۳۔G

متصل Libyon ایمبیسی

۹۰ اسٹریٹ۔اسلام آباد

ضروری۔ خورشید علی خاں کا پتا یاد نہیں رہا۔ یہ خط آج ہی ان تک پہنچا دیجیے۔

"ماسن" میں جوش صاحب کا قیام:

چنانچہ اٹھائیسویں اپریل کو میں، سلامت علی خاں، راغب مرادآبادی، فراست رضوی اور سرور اقبال کینٹ اسٹیشن پہنچ گئے اور جوش صاحب کو اپنے ہمراہ لے آئے۔ اس دفعہ جوش صاحب کے قیام کا انتظام "ماسن" میں کیا گیا جو نارتھ ناظم آباد کے بلاک اے میں واقع ہے۔ یہ مکان میرے چچا جناب عبدالقیوم خاں صاحب کے (جو ریاست حیدرآباد کی طرف سے پاکستان میں ایجنٹ جنرل تھے) انتقال کے بعد ورثا میں مجھے ملا تھا اور اس وقت خالی تھا۔ وسیع لان، کشادہ کمرے اور ٹیلی فون سب سہولتیں مہیا تھیں۔ جوش صاحب یہاں کے قیام سے بہت مطمئن اور خوش تھے۔ اس کے علاوہ ہم سب احباب ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ صبح سویرے میں اور جوش صاحب لان پر ٹہلتے، ایک گھنٹے بعد ہاتھوں کی ورزش کرتے پھر جوش صاحب تو شیو اور غسل میں مشغول ہو جاتے اور میں ناشتے کا بندوبست کرتا۔ پھر دونوں ساتھ ناشتہ کرتے۔ اتنے میں اکثر سلامت علی خاں یا راغب صاحب آ جاتے۔ اکثر ڈاکٹر عالیہ امام اپنی بہن ہما اور شوہر کاظم امام صاحب کے ساتھ آ جاتیں۔ اگر کسی دن دس بجے تک کوئی نہ آتا تو میں اور جوش صاحب مختلف احباب سے ملاقات کے لیے چلے جاتے۔ شام کو ہم لوگ لان پر کرسیاں ڈال کر بیٹھ جاتے۔ اس وقت بلاناغہ تمام احباب جمع ہو جاتے۔ ایسی ہی ایک شام کو راز صاحب مرادآبادی، راغب صاحب مرادآبادی، سلامت علی خاں، سرور بارہ بنکوی، ڈاکٹر عالیہ امام، فراست رضوی اور

سرود اقبال جب سب جمع ہو گئے تو شاعری شروع ہوئی۔ راز صاحب اور راغب صاحب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ اس کے بعد جوش صاحب نے ایک نظم سنائی۔ جس کا عنوان ہے:

اور اس کے باوجود

نوعِ انساں ہے گو تہ و بالا — شامِ تجگار ہے سحر چھالا
چہرۂ زندگی ہے مٹیالا — دم گلے میں ہے آگ کا ہالا

اور نہیں کوئی پوچھنے والا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

سیل کا شور ہے بیاباں میں — رات لرزاں ہے باد و باراں میں
ناؤ ہے قلزمِ خروشاں میں — موت جولاں ہے موجِ طوفاں میں

اور مانجھی ہے گھور متوالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

ہر ترنم رواں ہے جانب آہ — ہر ترانے کے دوش پر ہے کراہ
حادثوں کی ہے زندگی پہ نگاہ — خیر سے دیوِ مرگ ہے نوشاہ

اور نوعِ بشر ہے شہ بالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

پیکِ فریاد کم سنوں کی ٹھٹھول — زہر کے راستے پہ میٹھے بول
وعدۂ رزق میں ہزاروں جھول — گھور ندی میں ناؤ ڈانواڈول

گھپ اندھیرے کے منہ میں اجیالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

گاہ دیپک بجھا گئی صرصر — گاہ آندھی سے اڑ گیا چھپر
جل گیا آگ سے کبھی گھر بھر — ناگ نے گاہ ڈس لیا آ کر

اور بس نے کبھی کچل ڈالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

گاہ بیوی ہی اجل کا شکار   گاہ بیٹی پہ چل گئی تلوار
گاہ اماں کو کھا گیا آزار   گاہ باوا پہ گر پڑی دیوار

گاہ بیٹے پہ چل گیا بھالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

بند ہیں رقص و رنگ کی راہیں   ٹن ہیں پہلو تو سرد ہیں باہیں
زمزموں پر سوار ہیں آہیں   شہر ہیں موت کی چراگاہیں

دہر ہے آنسوؤں کا پرنالہ
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

ہر نفس ہے خروش دعوت شر   جانب خیر کیا اٹھاؤں نظر
صبح کو توبہ کی جو شرما کر   تو بڑے ناز سے بصد قدر

شام کو آ گئی مدھو بالا

اس مصرع پر سب حاضرین ایک ساتھ بول اٹھے۔

جوش صاحب پھر تو ضرور سبحان ربی الاعلیٰ ۔۔۔

جوش صاحب اس داد پر مسکرائے اور اگلا بند سنایا۔

ہو گا مرقد میں بھی سوال و جواب   مر کے بھی جھیلنا پڑیں گے عذاب
کنج تربت کی توڑ کر محراب   پیش رب جائے گا برائے حساب

جبر قدرت کی گود کا پالا
پھر بھی سبحان ربی الاعلیٰ

اس طرح یہ محفل شعر و سخن رات دیر تک جاری رہی۔ اور سب نے مل کر یہ طے کیا کہ دو دن بعد جمعہ تیسری مئی کو دن میں ۱۰ بجے سے ایک شعری نشست منعقد کی جائے جس میں دیگر شعرا کے علاوہ بابا ذہین شاہ صاحب تاجی کو بھی مدعو کیا جائے اور تمام احباب کے لیے دوپہر کے کھانے کا بھی بندوبست کیا جائے۔ شعرا کا انتخاب اور ان کو مطلع کرنے کا کام راغب صاحب اور فراست رضوی کے ذمے کیا گیا۔ بابا صاحب کو خود جوش صاحب نے مدعو کیا۔



"مامن" میں
حضرت بابا ذہین شاہ تاجی اور جوشؔ ملیح آبادی چند احباب کے ساتھ



"مامن" میں
راغب صاحب، جوشؔ صاحب، نسیم احمد صاحب، اور فرخ جمال نواسہ جوشؔ



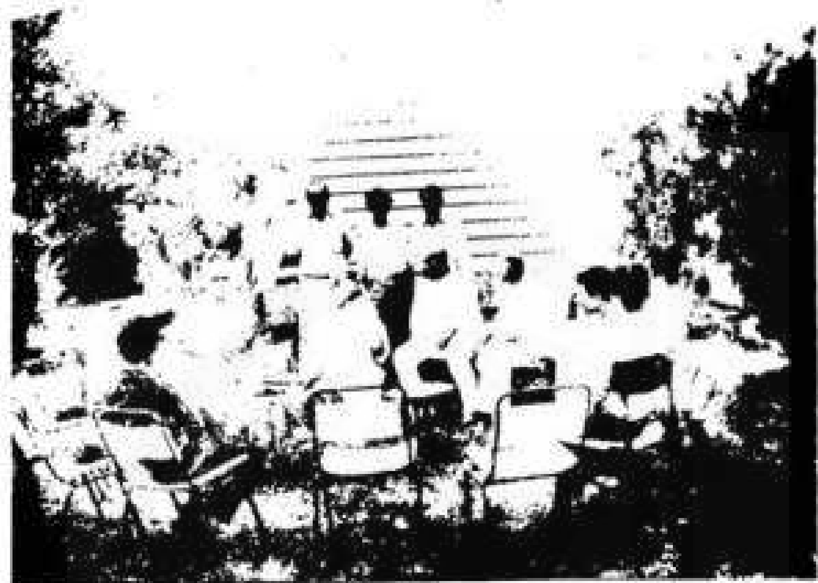
"مامن" میں

راغب صاحب، خورشید علی خان، جوش صاحب، نسیم احمد صاحب



"مامن" میں

سلامت علی خاں صاحب، راغب صاحب، بابا صاحب اور جوش صاحب



"مامن" میں

بابا ذہین شاہ تاجی صاحب اور جوشؔ صاحب معروفِ گفتگو ہیں، خورشید علی خاں، سجاد حیدر صاحب

راغب صاحب، منور عباس صاحب اور نسیم احمد صاحب



"مامن" میں

راغب صاحب، خورشید علی خاں، نسیم احمد صاحب اور فرخ جمال (نواسۂ جوشؔ)

جوشؔ صاحب کے ساتھ



راقب صاحب بابا ذہین شاہ تاجی صاحب اور جوش صاحب

maablib.org

تیسری مئی کو تمام احباب نو بجے ہی سے جمع ہونے شروع ہو گئے۔ حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، راز مرادآبادی، سرور بارہ بنکوی، راغب مرادآبادی۔ دس بجے کے قریب بابا صاحب بھی تشریف لے آئے۔ فراست رضوی اور سرور اقبال بھی آ گئے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کاظم امام، سلامت علی خاں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے مہمانان گرامی تھے جن کے نام اس وقت مجھے یاد نہیں آ رہے ہیں۔ تقریباً دس بجے جوش صاحب کی صدارت میں مشاعرہ شروع ہوا۔ سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ جب بابا صاحب کی باری آئی تو انھوں نے یہ غزل پڑھی:

خاک سے لالہ و گل سنبل و ریحاں نکلے ــــ تم بھی پردے سے نکل آؤ کہ ارماں نکلے
شیخ مے خانے میں آنے کو مسلماں آیا ــــ کاش مے خانے سے نکلے تو مسلماں نکلے
کیا کوئی ہم سا حسیں زیر زمیں اور بھی ہے ــــ پھول کیوں چاک جگر چاک گریباں نکلے
بند آنکھیں کیے ہم منتظر جلوہ رہے ــــ جب کھلی آنکھ تو خود جلوۂ جاناں نکلے
رنگ و بو قافلہ در قافلہ آئے تھے ذہیں ــــ چند اڑتے ہوئے سایے تھے گریزاں نکلے

سب نے ہر شعر کی دل کھول کر داد دی۔ جوش صاحب نے یہ شعر کئی دفعہ پڑھوایا۔

بند آنکھیں کیے ہم منتظر جلوہ رہے ــــ جب کھلی آنکھ تو خود جلوۂ جاناں نکلے

اس کے بعد جوش صاحب نے بہت سی رباعیات سنائیں۔ شاعری ختم ہوئی تو سب نے کھانا کھایا اور جمعہ کی نماز سے پہلے یہ نشست برخاست ہو گئی۔

پانچویں مئی کو جناب منور عباس صاحب ایڈووکیٹ کے وہاں دوپہر کے کھانے کی دعوت تھی۔ بابا صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ جوش صاحب نے اپنا طویل مسدس جس کا عنوان ہے "زندگی اور موت، محمدؐ اور آل محمدؐ کی نظر میں" یہ ۸۹ بندوں پر مشتمل طویل مسدس ہے۔ جوش صاحب کے مراثی کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ واقعہ کربلا کو حق و باطل کی کشمکش میں ایک علامتی جدوجہد کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ جس میں حضرت امام حسین علیہ السلام کو ایک انقلاب آفریں تعمیری اقدار حیات کی حامل شخصیت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مسدس کا یہ انقلابی پہلو قدیم مرثیہ نگاروں کے برعکس ترقی پسند فکر کا آئینہ دار ہے۔ مسدس یہ تھا۔

زندگی اور موت

"محمد و آلِ محمد کی نظر میں"

ہاں انا ہے وہ دبیرِ نفس و دارائے حیات
شور جس کا گرمیِ دن، گل بانگ جس کی سرد رات

جس پہ مبنی جذبۂ حفظِ حیات و حبِ ذات
کیا زمیں کیا آسماں جس کے جلو میں کائنات

کج اسی کے بانکپن سے ہے کلاہِ زندگی
یہ رسولِ ذہنِ انساں ہے الٰہِ زندگی

یہ انا ہے وہ قدم جو ڈگمگا سکتا نہیں
جس میں استغنا کے ہاتھوں جھول آ سکتا نہیں

یہ کسی طوفان کو خطرے میں لا سکتا نہیں
یہ چراغِ داوری ہے جھلملا سکتا نہیں

یہ دلوں کی آبرو یہ ولولوں کی جان ہے
رحلِ نفسِ آدمی پر یہ انا قرآن ہے

آدمی ہو اور اپنی ذات پر چیں بر جبیں
زندگی اور اپنی عینیت پر الٹے آستیں

یہ تو ممکن ہے کہ انساں توڑ دے حبلِ متیں
حشر تک لیکن انا سے ہاتھ اٹھا سکتا نہیں

یہ انا ہی تو محافظ ہے بشر کی جان کا
یہ نہ ہو تو دم نکل جائے غریب انسان کا

دوست احباب و ملک و دودمان و اقربا
جود و خلق و رحم و عشق و نفرت و بیم و رجا

شفقت و قربانی و اخلاص و ایثار و سخا
حُبِ دنیا، حُبِ عقبیٰ، حُبِ حق، حُبِ خدا

جزر و مد یہ سب کے سب ہیں جوئے احساسات کے
کتنے لاتعداد رخ ہیں ایک حبِ ذات کے

ثبت ہر انساں کے دل پر ہے یہ مہرِ خیال
میں ہوں صدرِ علم و بدرِ عقل و سلطانِ جمال

معتبر ہے صرف میرا فعل میرا انفعال
مجھ سے بڑھ جائے یہ کس میں تاب یہ کس کی مجال

ذات میری افتخارِ مہر و نازِ ماہ ہے
مجھ سے برتر ہے کوئی تو کون؟ خیر اللہ ہے

قابلِ برداشت جب رہتا نہیں دردِ حیات
ڈھونڈھتی ہے تلملاہٹ زہر میں راہِ نجات
اس عمل سے عقلِ انسانی میں آتی ہے یہ بات
ارتکابِ خودکشی تک ہے جنونِ حبِ ذات

آدمی جیتا ہے ساز و رنگِ عشرت کے لیے
اور مرتا بھی ہے تو دفعِ اذیت کے لیے

شاداں ہوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے
نقدِ جاں کھوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے
کاٹتا بوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے
جاگتا، سوتا ہے تو اپنی خوشی کے واسطے

کام رکھتا ہے فقط اپنے ہی مرغوبات سے
کس قدر انسان کو ہے عشق اپنی ذات سے

سوچتا ہے آدمی ارض و سما کچھ بھی نہیں
زیرِ محرابِ فلک میرے سوا کچھ بھی نہیں
مجھ سے کٹ جائیں اگر تو انبیاء کچھ بھی نہیں
رشتہ مجھ سے توڑ ڈالے تو خدا کچھ بھی نہیں

جملہ اشیا ہیچ ہیں محبوبِ آب و گل ہوں میں
سب ہیں اعضا سینۂ فرشِ زمیں کا دل ہوں میں

یہ عجب دھن ہے کہ ہر فردِ بشر کے روبرو
صرف اپنا مدعا ہے صرف اپنی آرزو
صرف اپنا کروفر ہے صرف اپنی آبرو
صرف اپنا ذکر اپنی فکر اپنی گفتگو

کان دھرتا ہی نہیں کوئی کسی کی بات پر
کس قدر لٹوٹ ہے انسان اپنی ذات پر

خواہ کتنی برہمی ہو خواہ کتنی ابتری
خواہ کتنا ہی جھنجھوڑیں گردشیں افلاک کی
خواہ کتنی ہی بلاؤں میں گھری ہو زندگی
پھر بھی جینے کی دعائیں مانگتا ہے آدمی

تھرتھراتا تلملاتا بلبلاتا ہے بشر
زندگی کو پھر بھی سینے سے لگاتا ہے بشر

نغمہ برلب جام برکف گل بداماں زندگی
قوسِ طرفِ کوہ و محرابِ خمستاں زندگی
جوئے رنگ و چشمۂ آبِ چراغاں زندگی
موجِ رقص و دجلۂ آہنگ و الحاں زندگی

موجِ سوزِ دل ہے اس کے شعلۂ آواز میں
حرفِ کن کے زمزمے ہیں اس کے ساز میں

زندگی وحشی عناصر کا مہذب شاہکار   ربطِ صبح و شام ضبطِ ریگ زار و جوئے بار
اعتدالِ آب و آتش امتزاجِ نور و نار   خرمن و برقِ تپاں کا تعلقِ بوس و کنار

ایک تکوینی ضمانت امتناعِ جنگ کی
ایک تعمیری ہم آغوشی بلور و سنگ کی

زندگی اضداد کا پیمان لطف و اتفاق   اک ہم آہنگی میانِ جذبۂ وصل و فراق
یک اٹل میثاق مابین جمود و انشقاق   خیر و شر کا صلح نامہ شمع و صرصر کا وفاق

شبنم و خورشید کا عہدِ وفا ہے زندگی
دیکھیے تو بت، پرکھیے تو خدا کی زندگی

زندگی فرماں روائے کشورِ دنیا و دیں   موجدِ حرفِ خدا و رحمت للعالمیں
نوعِ انساں کے لیے اے محرمانِ دور بیں   موت سے بڑھ کر کوئی شے قابلِ نفرت نہیں

زندگی تکریم ہے توقیر ہے تمکین ہے
موت شاہوارِ حق کی سب سے بڑی توہین ہے

موت اندھیاری، گھٹا ٹوپ آہنوسی تیرہ فام   بے رکوع و بے سجود و بے قعود و بے قیام
مضمحل، سن، منجمد، یخ بستہ، وحشی، افسردہ، خام   بے حرارت، بے حکایت، بے بصارت، بے خرام

اس کے پتھریلے کلیجے میں کسک ہوتی نہیں
اس کے دیدوں میں مروت کی چمک ہوتی نہیں

بانگِ شست موت سے اٹھتا ہے سینوں سے دھواں   فرقِ ہستی پر کڑک اٹھتی ہے وحشت کی کماں
دل پہ رکھ دیتا ہے خوفِ مرگ وہ بارِ گراں   بولنے لگتی ہیں سہمی زندگی کی ہڈیاں

کوئی نرم آواز کوئی داستاں بھاتی نہیں
موت یاد آ جائے تو راتوں کو نیند آتی نہیں

یہ سیہ رو آن میں دن کو بنا دیتی ہے رات   اس کے اک جھونکے سے بجھ جاتی ہے قندیلِ حیات
تو اس کا شامیانہ، سسکیاں اس کی قنات   اس کی نا ہموار کاندھوں پر نکلتی ہے برات

مسکرا کر آنسوؤں کے تار پر گاتی ہے موت
ہچکیوں کی گونج میں پازیب جھنکاتی ہے موت

کتنی شکنوں میں بھرتی ہے یہ کرب ارتعاش　　سوچتی رہتی ہے یہ کتنے کلیجوں کو خراش

روز آئینے کیا کرتی ہے کتنے پاش پاش　　کتنے بوڑھوں سے جواں بیٹوں کی نعش بے تلاش

کیا بتائیں روز کتنے پھول مرجھاتی ہے موت

ماؤں سے کتنے جیتے چھین لے جاتی ہے موت

موت کیڑوں کی غذائے خستہ، قبروں کا فشار　　استخواں سوز و نفس گیر و توانائی شکار

جاں فگار و نطق دزد و روح کوب و جسم خوار　　اس کی شامیں نالۂ جانکاہ، صبحیں سوگوار

اسکے دام سخت میں آکر اکڑ جاتے ہیں لوگ

دفن جلدی سے نہ ہو جائیں تو سڑ جاتے ہیں لوگ

لیکن اس کے باوجود اے محرمان این و آں　　سخت حیراں ہوں کہ تھا وہ کون دانائے زماں

موت کو جس نے دیا نام حیات جاوداں　　اس قدر پر ہول بیہڑ کو بنایا گلستاں

زہر کو کس نے حریف آب حیواں کر دیا

اس اپنی تلوار کو کس نے رگ جاں کر دیا

نوع انساں کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام　　مرد غازی کا کفن ہے خلعت عمر دوام

نصب کس نے کردیے مقتل میں حوروں کے خیام　　جانتے ہو اس دبیر ذہن انسانی کا نام؟

جو انوکھی فکر تھا جو اک نیا پیغام تھا

اس حکیم نکتہ پرور کا محمدؐ نام تھا

اے محمدؐ۔ اے سوار توسن وقت رواں　　اے محمدؐ اے طبیب فطرت و نباض جاں

اے محمدؐ۔ اے فقیہ نفس و نقاد جہاں　　موت کو تو نے وہ بخشی آب و تاب جاوداں

زندگانی کے پجاری موت پر مرنے لگے

لوگ پیغام اجل کی آرزو کرنے لگے

خلق کو تو نے تمنائے شہادت بخش دی　　اس تمنائے شہادت نے شجاعت بخش دی

پھر شجاعت نے بھبکنے کی حرارت بخش دی　　اس حرارت نے گداؤں کو حکومت بخش دی

اس قدر عجلت سے تو روئے زمیں پر چھا گیا

دی چکرا گئے تاریخ کو غش آ گیا

خاک کے ذرات کو تو نے ثریا کر دیا / آگ کو پانی کیا۔ پانی کو صبا کر دیا

موت کی کالی بلا کو رشکِ سلمیٰ کر دیا / آخری ہچکی کو گلِ بانگِ مسیحا کر دیا

سر سے خوفِ نیستی کی یوں بلائیں ٹال دیں

آدمی نے موت کی گردن میں باہیں ڈال دیں

یہ تصور موت کا جیسے ہی سوئے کربلا / وقت دوراں پرور کے تاریخی تقاضے سے مڑا

خون میں تیرے گھرانے کے تلاطم آ گیا / لشکرِ صبحِ فروزاں۔ شام کی جانب چلا

دفعتاً قصرِ جفا مسمار ہو کر رہ گیا

رعبِ شاہی نقش بر دیوار ہو کر رہ گیا

اے محمدؐ۔ موت وہ تیرے نواسے کو ملی / آج تک جس سے درخشاں ہے ضمیرِ آدمی

اللہ اللہ روشنی تیرے چراغِ ذہن کی / کربلا کی دھوپ پر چھٹکی ہے اب تک چاندنی

یہ انی پر سر نہیں تیری انا کا تاج ہے

کربلا تیرے نظامِ فکر کی معراج ہے

آشنا بحرِ صداقت کا حسین ابنِ علی / مدرسہ درسِ شہادت کا حسین ابنِ علی

معجزہ فکری نجابت کا حسین ابنِ علی / حوصلہ تیری نبوت کا حسین ابنِ علی

جس نے بجھنے دی نہ شمعِ آدمیت وہ حسین

سانس جس کے دم سے لیتی ہے مشیت وہ حسین

دار و گیرِ کربلا پر اے شہیدِ محترم / عقل نازاں ہے مگر جذبات کی آنکھیں ہیں نم

چونکہ تیرے جذبۂ نصرت میں ہے آہنگِ غم / اس لیے آنسو چڑھاتے ہیں تری بالیں پہ ہم

دل کا یہ فرمان ہے لغزش نہ آئے پاؤں میں

جشنِ فتحِ کربلا ہو آنسوؤں کی چھاؤں میں

لیکن آنسو وہ جو برسائیں شرارِ زندگی / جس سے نکلے گوہرِ عز و وقارِ زندگی

جس کے قبضے میں ہو تیغِ آب دارِ زندگی / جن کی رنگینی میں کروٹ لے بہارِ زندگی

جو گریں شادابیٔ اہلِ جہاں کے واسطے

گھن جو بن جائیں غرورِ خسروی کے واسطے

ہاں وہ آنسو جن میں طوفاں ہو خروشِ خوفِ حق — جن کے گرنے کی صدا میں ہو شہادت کا سبق
جن کے آگے رنگ ہو نازِ جہاں بانی کا فق — جن کی آب و تاب میں تاریخ کے جھلکیں ورق

جن میں جوہر پرفشاں ہو تیشۂ فرہاد کے
غرق کر دیں جو سفینے بحرِ استبداد کے

سوگواری کا مزا جب ہے رفیقانِ کبار — رخ پہ تابِ عزم ہو آنکھوں میں آبِ ذوالفقار
ہم عناں ہوں طبلِ جنگ و نالۂ بے اختیار — دل میں حرمانِ خزاں ہو سر میں سودائے بہار

بات جب ہے غم ابھارے جذبۂ پیکار پر
ایک دل پر ہاتھ ہو ایک ہاتھ ہو تلوار پر

جب حکومت قصر ہائے معدلت ڈھانے لگے — جب غرورِ اقتدار اقدار پر چھانے لگے
خسروی آئین پر جب آگ برسانے لگے — جب حقوقِ نوعِ انسانی پہ آنچ آنے لگے

رن میں در آ، بازوئے خیبر شکن سے کام لے
ان مواقع پر حسینی بانکپن سے کام لے

کس طرف جانا ہے تجھ کو سوچ اے مردِ خدا — اک طرف زہرِ فنا ہے اک طرف نہرِ بقا
یا پہن لے تاجِ کردارِ شہیدِ کربلا — یا محیطِ کشورِ باطل میں جا کر ڈوب جا

یا عنانِ ذہنِ عالم جانبِ حق موڑ دے
یا حسین ابنِ علی کا نام لینا چھوڑ دے

سانس لینے کو نہیں کہتے ہیں دانا زندگی — ہر نفس اک طرحِ نو کی ہے تمنا زندگی
ہر قدم تسخیرِ قدرت کا ہے سودا زندگی — خون میں ہے ارتقا کا شور و غوغا زندگی

سرد ہے جس کا لہو وہ آدمی بے جان ہے
بے دلوں پر زندگی دراصل اک بہتان ہے

اہلِ نخوت ہیں سوارِ ابلقِ لیل و نہار — اور تو فقدانِ جرأت سے مجسم انکسار
تیری آنکھوں میں نہیں رقصاں بغاوت کے شرار — سر ہے تیرا اور پائے صاحبانِ اقتدار

قوتِ باطل پہ جو انساں چھا سکتا نہیں
حشر میں وہ مصطفےٰ کو منہ دکھا سکتا نہیں

اے حسینؑ اے غیرتِ حق کے امین ذی وقار
اے دیارِ حرمتِ انساں کے واحد شہریار

اے پیمبر نورِ یزداں اے بہ میداں ذوالفقار
ہاں پکار اپنے محبوں کو سرِ میداں پکار

نیند کے رونده ہوئے غفلت شعاروں کو جھنجھوڑ
ہو چکی ہے صبح اپنے سوگواروں کو جھنجھوڑ

دیر کو گھیرے ہوئے ہے شورِ طبل و برق و باد
گھر میں برپا ہے تلاطم در پہ ہے ابنِ زیاد

فوج میری سو رہی ہے اور سر پہ ہے جہاد
کس طرف یارب نکل جائے یہ عبدِ نامراد

الاماں، حدِ نظر تک ہے سیاہی، کیا کروں
کوئی سنتا ہی نہیں میری، الٰہی کیا کروں

داورا بلچل ہے پھر برپا میانِ مشرقین
ہر نظر ہے ایک ماتم ہر نفس ہے ایک بین

تخت پر سرمایہ داری ہے بصد اجلال و زین
اور ٹس سے مس نہیں ہوتے محبانِ حسینؑ

ہے یہی ایمان تو ایمان کو میرا سلام
اک فقط ایمان کیا قرآن کو میرا سلام

کبریا، پروردگارا، کردگارا، داورا
کب سے میری قوم گہری نیند میں ہے مبتلا

کب سے پامالِ ضمیرِ خواب ہے میری صدا
نیند آنکھوں کی اڑا دے، جوت سینوں کی جگا

یا لگا دے سینۂ مومن میں داغِ زندگی
یا بجھا دے اے خدا میرا چراغِ زندگی

یہ طویل مسدس داد و تحسین کے شور میں اپنے اختتام کو پہنچا۔ تمام سامعین نے ہر بند بلکہ ہر مصرع پر اس قدر زور شور سے داد دی کہ یہ تمیز کرنا مشکل تھا کہ یہ "کربلا" اور "امام حسینؑ" کے ناموں سے اظہارِ عقیدت ہے یا ان ناموں کو علامتوں کے طور پر استعمال کر کے جو انقلاب کا پیغام دیا گیا اس کی حرارت سے خون جوش مار رہا ہے۔ مگر بظاہر تو یہ تعریفوں کا جوش عقیدت ہی کی کرشمہ سازی معلوم ہو رہا ہے تھا۔ مگر بقول غالب:

نہیں گر سر و برگِ ادراکِ معنی
تماشائے نیرنگِ صورت سلامت

مرثیے کے موضوع پر گفتگو:

بہرحال مسدس ختم ہوا تو میزبانوں نے دسترخوان بچھا دیا۔ ناؤ نوش کے بعد محفل برخاست ہوئی۔ میں اور جوش صاحب اپنے گھر آ گئے۔ سہ پہر میں جب جوشؔ صاحب آرام سے فارغ ہو کر ورانڈے میں آ کر بیٹھ گئے اور ہم لوگ چائے پینے لگے تو جوشؔ صاحب نے کہا۔ "کوئی موضوع چھیڑو"۔ میں نے کہا جوش صاحب! میں خود آپ سے گفتگو کرنا چاہ رہا تھا۔ ہمارے معاشرے کی سب سے بڑی بدقسمتی یہ ہے کہ اس میں آپ جیسا انقلابی ذہن کا مالک اور اس قدر قادر الکلام شاعر موجود ہے مگر لوگ اس کے کلام کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ آپ کے تمام مرثیوں میں انقلاب کا پیغام اس قدر واضح اور اثرانگیز طور پر نمایاں ہے کہ اسے کوئی شخص نظر انداز کر ہی نہیں سکتا۔ مگر ہمارے عوام کے بلکہ زیادہ تر خواص کے بھی عقائد گزیدہ ذہن جن کو فرقہ وارانہ نفرت کا خون پلا پلا کر پروان چڑھایا گیا ہے اور جو ماتم کرنے اور آہ و بکا ہی کو اہل بیت نبیؐ سے عقیدت کا اظہار سمجھتے ہیں۔ ان کی جذباتی پہنچ صرف حضرت زینبؑ کے بے ردا سر، اصغر معصوم کے تیر حلق اور امام عالی مقام کے سر بریدہ جسم کی تفصیل سے آگے نہیں جا سکتی اور اس کے بعد ان کا تمام جذبہ ایمانی اپنے مخالف فرقے کے مسلمانوں کو ابن زیاد، شمر اور یزید کا طرف دار اور جانشین سمجھ کر واجب القتل قرار دینے لگتا ہے۔ حالانکہ اس واقعے کو ہزار سال سے زیادہ ہو گئے ہیں مگر انتقام کی آگ ٹھنڈی ہونے کے بجائے صاحب اقتدار استحصالی گروہوں کے ہاتھوں ہر وقت بھڑکتی رہتی ہے اور اسلام جو دنیا میں امن اور سلامتی کا پیغامبر بن کر انسانیت سے جہالت، تنگدلی، فرقہ واریت، استحصال اور ہر طرح کی منفی اقدار کو ختم کر کے تمام باطل طاقتوں کے خاتمے کے لیے کل انسانوں کا متحدہ محاذ بنانے کی خاطر خدا کا آخری پیغام بن کر نازل ہوا تھا اور جس نے اپنے زمانے میں دنیا کی عظیم طاغوتی طاقتوں کے ایوانوں کو متزلزل کر دیا تھا اور انسانوں کا خون چوسنے والے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ معاشرے کے خداوندان باطل بادشاہوں، قبائلی سرداروں، مذہبی پیشواؤں کے چنگل سے انسان کو آزاد کروا کے اسے خلیفۃ اللہ کے منصب جلیلہ پر فائز کر دیا تھا اور جس کو قرآن کے الفاظ میں یہ مژدۂ جانفزا سنایا گیا تھا کہ "لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم" اور "ولقد کرمنا بنی آدم" کا واجب الاحترام مقام عطا فرما کر

دین اسلام کو ان کی زندگی کا لائحہ عمل مقرر فرمایا اور یہ تاکید بھی فرما دی کہ - "ولا تکونو من المشرکین۔ من الذین فرقوا دینھم و کانو شیعا" (دیکھو ان مشرکین میں سے نہ ہو جانا جنھوں نے دین میں اختلاف کیا اور گروہوں میں بٹ گئے) لیکن اسلام کے سیاسی دشمنوں نے اس گھر کو اسی کے چراغ سے جلا کر خاک کر دیا اور کیا یہ سر پیٹنے اور ماتم کرنے کی بات نہیں کہ جنگ جمل سے لے کر جنگ کربلا تک مسلمانوں نے ہی مسلمانوں کے خون کے دریا بہائے اور اسلام کی وحدت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور قرآن کی اس واضح تنبیہ کو کہ "و کانو شیعا" نظر انداز کر کے متحارب فرقوں میں بٹ گئے اور ہر فرقہ - "کل حزب بمالدیھم فرحون" (ہر ایک کے پاس جو کچھ ہے وہ اسی میں مگن ہو گیا)۔ آپ اپنے مراثی میں جس انقلابی پیغام کو مسلمانوں تک پہنچانا چاہتے ہیں اس تک کتنے ذہنوں کی رسائی ممکن ہے؟ اور کیا ان کے ذریعہ سے مسلمانوں کو متحد کرنے کا کام لیا جا سکتا ہے۔ مثلاً "حسین اور انقلاب" میں یہ بند۔

پھر گرم ہے فساد کا بازار دوستو سرمایہ پھر ہے برسر آزار دوستو
ہٹکے ہے خوف اندک و بسیار دوستو تلوار ہاں اٹھی ہوئی تلوار دوستو

جو تیز تر ہو خون امارت کو چاٹ کر
رکھ دے جو سیم و زر کے پہاڑوں کو کاٹ کر

یا یہ بند۔

پھنکارتے ہیں دہر میں پھر سیم و زر کے ناگ گونجے ہوئے ہیں گنبد گرداں میں غم کے راگ
پھر موت رخش زیست کی تھامے ہوئے ہے باگ تا آسماں بلند ہو اے زندگی کی آگ

فتنے کو اپنی آنچ کے چولھے میں جھونک دے
ہاں پھونک دے قبائے امارت کو پھونک دے

اور جو مسدس آج ہی آپ نے منور عباس صاحب کے گھر میں پڑھا، اس کا خاص طور پر یہ بند۔

جب حکومت قصر ہائے معدلت ڈھانے لگے جب غرور اقتدار اقدار پر چھانے لگے
خسروی! آئین پر جب آگ برسانے لگے جب حقوق نوع انسانی پہ آنچ آنے لگے

دل میں درد آ بازوئے خیبر شکن سے کام لے
ان مواقع پر حسینی بانکپن سے کام لے

تو آپ یہ بتلائیے کہ جن عقیدت مندوں کی محفلوں میں یہ انقلابی پیغام سنایا جاتا ہے ان میں سے کتنے لوگ اس پیغام کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور کتنے لوگوں کے جذبات سرمایہ دارانہ نظام اور مغرور و جابر اہل حکومت کے خلاف مشتعل ہوتے ہیں۔ اول تو خود آپ کے معتقدین کو اسی بات پر اعتراض ہے کہ آپ مرثیے کو مسدس کیوں کہتے ہیں۔ دوسرے آپ کے مسدسوں میں بکی عنصر کا فقدان ہے۔ جب آپ کے اتنے طاقتور انقلابی کلام پر یہ رد عمل ہو تو آپ ان لوگوں سے کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ معاشرے میں کوئی تعمیری انقلاب برپا کریں گے؟

میں اپنی رو میں کہتا چلا گیا اور جوش صاحب نہایت صبر و سکون سے بیٹھے سنتے اور ہاں ہاں کرتے رہے لیکن جب میں خاموش ہوا تو جوش صاحب نے کہنا شروع کیا۔ "خورشید علی خاں! یہ تو تم نے بالکل درست کہا ہے کہ مرثیوں سے ہمیشہ آہوں اور آنسوؤں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسین کے کردار کو پیش کر کے مسلمانوں کو یہ بتایا جائے کہ حسینی کردار کے حامل بن کر دنیا کی باطل طاقتوں کے سامنے کبھی سر نہ جھکانا۔ آزادی کی جنگ میں بدیسی سامراج کے خلاف میں نے اپنی شاعری اور خاص طور پر ان مسدسوں سے بھرپور کام لیا اور لوگوں کے ذہنوں میں غور و فکر کی شمع روشن کرنے کی کوشش کی مگر انقلابی ذہن بہت آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

ہر گام پہ ہے فکر کو قرنوں کی ضرورت
اور عمر کی تقدیر میں ہے برق خرامی

اور جب تک تمام لوگوں میں تعلیم عام نہ ہو، ذہنی انقلاب پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے کہا جوش صاحب نفسیات کا ایک اصول یہ ہے کہ عمل کی قوت محرکہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی جذبہ ہوتا ہے۔ یہ جذبہ دراصل داخلی تقاضا ہے عمل کا۔ اس طرح جب تک کوئی خیال یا فکر جذبے میں تبدیل نہ ہو وہ عمل کو انگیخت نہیں کر سکتی۔ اور مرثیوں میں جو جذبہ ابھارا جاتا ہے وہ غم اور ماتم کا ہے تو ماتم کا جذبہ جس عمل میں ڈھلے گا وہ صرف غم اور ماتم ہی کا عمل ہو گا اور اس کا دوسرا رد عمل ان اشخاص سے شدید نفرت ہو گی جو اس غم کا باعث بنے۔ اردو مرثیے میں آپ نے پہلی مرتبہ انقلابی فکر داخل کی ہے مگر واقعات کربلا پر ابھی تک جو غم اور بین کے نہایت

گھرے اور دبیز بادل چھائے ہوئے ہیں جن کو مرثیہ گو شعرا نے طوفانی جھکڑوں میں تبدیل کرنے میں اپنا تمام زور فن اسس طرح استعمال کیا ہے۔ "صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے"۔ یہاں تک کہ میر انیس جیسا عظیم قادر الکلام شاعر بھی مرثیے کے متعلق کہتا ہے۔

لفظا بھی چست ہوں مضمون بھی عالی ہووے

مرثیہ درد کی باتوں سے نہ خالی ہووے

اور اسی لیے کسی نے مرثیے کو مسدس کا نام نہیں دیا سوائے آپ کے۔ مگر خود آپ کے عقیدت مند حضرات یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ نے مرثیے کو مسدس کہہ کر اس کے مقصد کو فوت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب آپ پر بھی یہ اعتراضات ہوں تو آپ کیسے امید کر سکتے ہیں کہ آپ اس صنف سخن کے ذریعہ سے لوگوں کے جذبات کو سینہ کوبی سے ہٹا کر معاشرتی انقلاب کی طرف منتقل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور مرثیوں سے پیدا شدہ نفرت کو الفت بین المسلمین میں تبدیل کر سکیں گے اور تمام مسلمانوں کو ملوکیت اور سرمایہ داری کے خلاف متحد کر سکیں گے۔ جوش صاحب نے کہا کہ ہمارا کام کوشش کرنا ہے اور جیسا کہ میں نے ابھی کہا ہے ذہنی انقلاب تو آہستہ آہستہ ہی آتا ہے اور میں نے مرثیے کو مسدس کہہ کر یہی کوشش کی ہے۔

شیر بانو صاحبہ کے گھر شبیر حسن خاں کی دعوت:

یہ دلچسپ گفتگو جاری تھی کہ ڈاکٹر عالیہ امام آگئیں۔ اس شام جوش صاحب کی دعوت ان کی بہن کے گھر تھی۔ چنانچہ ہم لوگ ان کے ساتھ ان کی بہن کے گھر حسین ذی سلوا ٹاؤن چلے گئے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کی بہن شیر بانو، میجر عبداللہ زیدی کی شریک حیات ہیں۔ ان کے بہن بھائی ان کو بوا کے پیارے نام سے پکارتے ہیں۔ یہ حسن فہمی کا نہایت اعلیٰ ذوق رکھتی ہیں اس لیے حضرت جوش کی پرستار اور ادیبوں اور شاعروں کی قدردان ہیں۔ مکان گو بہت بڑا نہیں ہے مگر اس کی زیب و زینت مکین کے اعلیٰ ذوق جمال کی آئینہ دار ہے۔ گیٹ ہی سے رنگ برنگ کے گلاب دامن دل کھینچنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو گلہائے رنگ رنگ پائے نگہ میں زنجیر ڈال دیتے ہیں۔ شاید غالب نے ایسے ہی مقام کے لیے کہا تھا۔

گلشن میں بندوبست بہ رنگ دگر ہے آج

قمری کا طوق حلقۂ بیرونِ در ہے آج

مکان کے عقب میں بڑا لان ہے۔ آج شام تمام مہمانوں کی نشست کا انتظام اسی لان پر کیا گیا تھا۔ جب تمام شعرا حضرات جمع ہوگئے تو محفل سخن گرم ہوئی۔ جوش صاحب نے پہلے تو کچھ رباعیات سنائیں پھر سب کی فرمائش پر اپنی نظم "جوانی یاد آتی ہے" سنائی۔

مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

قریبِ شام جب دھیمی ہوا نوحے سناتی ہے
سسکتے کنج پر جب سوگواری دوڑ جاتی ہے
شفق جب زندگی پر خون کے آنسو بہاتی ہے
میانِ گلستاں ظالم خزاں کی رتھ جب آتی ہے
اور اس کی رو میں جب ہر ایک پتی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

تھکے سے جھٹپٹے میں اونگھنے لگتے ہیں جب منظر
فضا کی سوگواری اوڑھ لیتی ہے سیہ چادر
طلسمی وادیوں میں اک ذرا سا شہر سے ہٹ کر
کماں کی طرح بل کھاتے ہوئے غمناک ساحل پر
مرے دل کے سمندر میں ندی جب ڈوب جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نظر آتا نہیں اک پھول بھی جس وقت دامن میں
سسکتی ہے دھندلی سی چاندنی جب صحنِ گلشن میں
کوئی آوارہ طائر شب کو بولا تھا ہے جب بن میں
اور اک ویرانِ عشرت گاہ کے خوابیدہ روزن میں
ہوا جس وقت آدھی رات کو سیٹی بجاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

سبک سارنگیاں جب گونجتی ہیں بزمِ خوباں میں
گھنی زلفوں کی مہکیں تیرتی پھرتی ہیں ایواں میں
نگاہوں کے سلیقے ڈوب جاتے ہیں جب افشاں میں
اور اس موقع پہ مجھ آشفتہ قسمت کی رگِ جاں میں
نکیلی راگنی جب ڈوب کر برچھی لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

انگیٹھی کے کنارے جب بہ فیضِ جامِ زر افشاں وہ راتیں بولتی ہیں جو کبھی تھیں قلزمِ الحاں
پرانی داستانیں جب پہنچتی ہیں نئے عنواں اور اس موقع پہ گھبرا کر بہ یادِ وعدۂ جاناں

نظر جب ایک عاشق کی گھڑی کی سمت جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

افق پر چھوٹتا ہے صبح کا جس وقت فوارا تھرکتا ہے سنہری وادیوں میں سرمئی دھارا
شفق کا دھوپ چھاؤں کا چھن لیتا ہے اندھیارا نظر آتا ہے آدھے چاند کے آغوش میں تارا

اور اپنی سیج کو جب زندگی ویران پاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

فلک کی جگمگاہٹ سے فضا کی مسکراہٹ سے افق کی تھرتھراہٹ سرد شبنم کی لگاوٹ سے
چمن کی خاک گل پرور کی دھیمی گنگناہٹ سے نسیم صبح کے سواج بوسوں کی چٹاچٹ سے

کلی میں جب چٹکنے کی تمنا رسماتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ہوائے سرد چھوتی ہے لٹیں جب روئے ترکاں کی جگر میں پینگ لیتی ہے مہک انفاس خوباں کی
گلابی روشنی سے آنکھ کھل جاتی ہے بستاں کی اور اس کے ساتھ ہی پہلی کرن صبح بہاراں کی

جب اس اجڑے ہوئے سینے میں چھو کر لوٹ جاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

لچکتی ہے سر دوش ہوا جب شکریں سردی لرزتے ہیں ستارے دوڑتی ہے چاند پر زردی
دلوں کو گدگداتی ہے تمنائے جہاں گردی مہک جاتی ہے جب دھندلی فضا کی مخملی وردی

کلائی میں نویلی صبح جب کنگن گھماتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

طرب کا رنگ اڑا کر جشن کی دھوموں کو مرجھا کر ربابوں کو بجھا کر راگ کے شعلوں کو کجلا کر
فضا کو کپکپا کر مجلسی مکھڑوں کو سنولا کر صبا کی تھپکیاں کھا کھا کر آئینوں کو دھندلا کر

قریب صبح جب شمع شبستاں جھلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جھلکتی ہے ستاروں کی ردا جب خوش نواؤں پر — برستی ہے نکیلی کج کلاہی دل رباؤں پر
اترتی ہے مٹھاس آئینہ پیکر مہ لقاؤں پر — صدا سی راگنی گھنگرو بجاتی ہے ہواؤں پر
نشیلی بھیرویں مکھڑے سے جب گھونگھٹ اٹھاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

گرجتے گونجتے کم بخت ساون کے مہینے میں — لگا دیتی ہے پانی کی جھڑی جب آگ سینے میں
شب غم کے دہکتے کھولتے ٹھنڈے سفینے میں — بلکتی زندگی جب ڈوب جاتی ہے پسینے میں
مری سوئی ہوئی رم جھم کو جب برکھا جگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

ابھرتا ڈوبتا ہے چاند جب ابر گریزاں میں — کبھی پلکا کبھی کاجل تھرک اٹھتا ہے میداں میں
ہوائے ساحل پرنم کھٹکتی ہے رگ جاں میں — ستارے غوطہ زن ہوتے ہیں گنگا کے شبستاں میں
محل جمنا کو جب گنگا گلے سے لگاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

لرزتے ہیں در و دیوار پر یادوں کے جب سائے — نظر آتے ہیں جب گم کردہ سر رو بال بکھرائے
جھلک اٹھتے ہیں جب وہ چاند کب سے تھے جو گہنائے — ہوا آتی ہے جب بیتے ہوئے لمحوں کو مہکائے
فضا جب گھپ اندھیرے میں بھی راتیں جلاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

مرا یہ چہرہ جو گوہر فروش و گل بداماں تھا — متاع گل رخاں تھا دولت محمل نشیناں تھا
کلیسائے نگاراں کعبۂ اصنام دوراں تھا — جو کل کی بات ہے بت خانۂ قوم حسیناں تھا
اب اس سے جب بچا کر آنکھ مری آنکھیں پھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

اٹھائے دوش پر گم کردہ لمحوں کی ملاقاتیں — ملاقاتیں، دعائیں، شکریے، شکوے، مناجاتیں
لیے چاندی کی تھالی میں دلکش کندنی باتیں — مری گردن میں باہیں ڈالتی ہیں چاندنی راتیں
اور ان راتوں میں جب ہاتھوں کی مہندی جھلملاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

جہاں میری تمناؤں نے کل دھومیں مچائی تھیں
گھنی زلفوں کے سائے میں جہاں نیندیں جگائی تھیں
جہاں شیریں لبوں پر مدتوں مہریں لگائی تھیں
جہاں گل رت جگوں نے صبح تک راتیں بجائی تھیں
مجھے پہچان کر جب وہ گلی آنسو بہاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کوئی الھڑ گلی میں رات کو صد ہا جتن کرتی
ٹھٹھکتی ڈولتی، تھمتی ٹھٹھرتی سسکیاں بھرتی
لرزتی، ہانپتی، رکتی، بہکتی، بھولتی، مڑتی
سمٹتی کانپتی مڑتی، جھجکتی جھینپتی ڈرتی
کسی کا در جب اک انگلی سے آکر کھٹکھٹاتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

حیا سے کانپ کر جھک کر بہجوم شرمساری سے
کلائی میں سبک کنگن گھما کر بے قراری سے
ذرا سا لڑکھڑا کر اک ادائے بادہ خواری سے
دھنک سی کھینچ انگڑائی لے کر طرحداری سے
کسی کو دیکھ کر جب کوئی کم سن مسکراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

کلی کو غرق سوز و ساز کر جاتا ہے جب بھنورا
نیاز عاشقی کو ناز کر جاتا ہے جب بھنورا
خوشی کو لطیف آواز کر جاتا ہے جب بھنورا
کلی کو چوم کر پرواز کر جاتا ہے جب بھنورا
اور اس کے بعد جب تا دیر ٹہنی تھرتھراتی ہے
مجھے بے ساختہ اپنی جوانی یاد آتی ہے

نیلے آسمان پر تیرھویں شب کا ماہ کامل نور افشانی کر رہا تھا۔ چاندنی رات۔ جوش صاحب کا انداز بیان اور ہر بند کا محاکاتی تاثر اس غضب کا تھا کہ ہر شخص اپنی اپنی یادوں کے دریچے وا کیے ہوئے گم کردہ لمحوں کے تصور میں کھویا ہوا تھا اور جتنے چاند ماضی کے دھندلکوں میں گہنا گئے تھے اس طرح سامنے آ گئے کہ ہر شخص کا ذہن چاہ یوسف کی طرح جیسے نور بن گیا تھا۔

جوش صاحب نے واہ وا کے شور میں نظم ختم کی مگر ہر شخص پر ایک عالم بے خودی طاری تھا۔ سب لوگ اس وقت چونکے جب ہوا نے لذت کام و دہن کی طرف مدعو کیا۔

کھانے میں اس قدر تکلف کیا گیا تھا کہ بقول میر صاحب:

سراپا پہ جس جا نظر کیجیے　　　وہیں عمر ساری بسر کیجیے

غرض یہ پر لطف محفل رات دیر گئے اپنے اختتام کو پہنچی اور میں جوش صاحب کو لے کر اپنے گھر آ گیا۔

رات دیر سے سوئے تھے مگر صبح سویرے بیدار ہو گئے۔ آج جوش صاحب لاہور روانہ ہونے والے تھے۔ اس لیے ان کے چہرے پر غیر معمولی مسرت کے آثار تھے۔ بات بات پر ہنسی کے فوارے چھوٹ رہے تھے۔ دس گیارہ بجے تک راغب صاحب مراد آبادی، فراست رضوی اور سرور اقبال بھی آ گئے۔ ہم لوگ ۲ بجے گھر سے روانہ ہو کر کینٹ اسٹیشن پہنچے اور جوش صاحب تین بج کر پینتالیس منٹ پر تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے۔ اس طرح جوش صاحب کا یہ سفر کراچی اختتام کو پہنچا۔

جوش صاحب کیا گئے کہ گھر کی ساری بہاریں رخصت ہو گئیں۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ "آپ کے جانے کے بعد مامن" کاٹ کھانے کو آ رہا ہے۔ گھر کی رونق ختم ہو گئی۔ الان ویران ہو گیا۔ دوست احباب کوئی منھ نہیں دکھاتا۔

تم گلستاں سے گئے ہو تو گلستاں چپ ہے
شاخِ گل کھوئی ہوئی مرغِ خوش الحاں چپ ہے
افقِ دل پہ دکھائی نہیں دیتی ہے دھنک
غم زدہ موسمِ گل ابرِ بہاراں چپ ہے

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا

اس کے جواب میں جوش صاحب کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ ایک خط تو بالکل کاروباری نوعیت کا تھا مگر دوسرا ..... خیر آپ دونوں ہی خط پڑھ لیجیے۔ ایک خط میں لکھا تھا۔

"حضرت خورشید۔ اس وقت کاروباری موڈ ہے اس کے سوا اور کچھ نہیں لکھوں گا۔ "Like a good boy" سبط حسن کے پاس جائیے اور ان کے حساب کو جانچیے اور چیک بھجوا دیجیے۔

اب ۔۔۔۔ لکھے گا اس سے زیادہ۔

آپ کا اسیر اخلاص و مودت
جوش
(۳۵۱) ۹/۴ ۔ ایمبیسی روڈ، ساتھویں اسٹریٹ
اسلام آباد۔ ۲۰۔ ۵۔ ۷۴ء

قلم بگڑ چکا ہے ۔۔۔۔ بد خط بنائے دے رہا ہے مجھ کو۔
میری طرف سے عالم گیر قدر ۔۔۔۔۔ سے ملیے اور ثواب کمائیے۔

اسی کے ساتھ دوسرا خط بھی تھا۔ لکھا تھا۔

(۳۵۱) ۹/۴ ۔ ایمبیسی روڈ، ساتھویں اسٹریٹ
اسلام آباد
۲۰۔ ۵۔ ۷۴ء

ہمہ پہر۔

راج دلارے اور پیارے خورشید۔ آج ہی صبح کو ایک خط لکھ چکا ہوں آپ کو۔ وہ سالا خط "کاروباری" خط تھا۔ ہر چند اس خط میں بھی "کاروبار" ہے۔ لیکن یہ پہلے خط کے مانند بیہودہ نہیں ہو گا۔

چلیے "کاروباری" بات سن لو۔

سبط حسن نے دو ہزار روپیوں کے چیک کے ساتھ حساب بھیجا ہے۔ حساب کا سمجھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔ آپ دیکھیں اور سوچیں کہ کیا چال چلی ہے ۔۔۔۔۔۔۔ سبط حسن نے۔

اس کے دوش بدوش "یادوں کی برات" کے پہلے ایڈیشن کی رقم بھی سبط حسن کے گلے میں انگلیاں ڈال کر اگلوائیے۔

اس سلسلے میں آپ کو شفیع الحق سے ملنا ہو گا اور ان سے بار بار ملنا پڑے گا۔ جائیے اور

میری خاطر بار بار جائیے ورنہ کل رقم ڈوب جائے گی۔

کیا بتاؤں اتار کا وقت ہے تمام اعصاب ڈھیلے ہو رہے ہیں، بڑی مشکل سے قلم چل رہا ہے۔ آپ کو اپنا مکان دیکھ کر میری یاد آ رہی ہے۔ مجھ سے پوچھیے کہ میرے دل کا کیا عالم ہے۔ شام کو آپ کی لان پر بیٹھ کر جی کس قدر خوش ہوتا تھا یاران خرابات آتے اور چھاتے تھے۔ اب وہ ساری خوشی غم میں تبدیل ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا ہم چھٹانک بھر تھے ہیں صرف اس لیے کہ بعد کو دو من روئیں۔ لعنت اس کارخانے اور اس کے بنانے والے پر۔

ارے یہ کیا حرامی پن ہے کہ جس بات سے ہم ..... بگڑتے ہیں ..... زمانہ اسی بات میں ..... تھما دیتا ہے۔

اب ہم دونوں سالے رو رہے ہیں صرف اس جرم میں کہ ملے کیوں تھے۔ آپ کی لان پر بیٹھ کر پیے کیوں تھے۔

ہات کانپ رہا ہے۔ طبیعت بجھی ہوئی ہے۔ زیادہ لکھنا مشکل ہے۔

آپ کا شیدائی

جوش

اس خط کے ملنے کے بعد میں سبط حسن صاحب سے ان کے دفتر میں ملا۔ انھوں نے مجھے تفصیل سے تمام حساب سمجھایا۔ "یادوں کی برات" کی طباعت کے اخراجات کا گوشوارہ ان کے پاس ایک رجسٹر میں درج تھا۔ پھر جن جن دوکانداروں کو جتنی جتنی جلدیں فروخت کے لیے دی گئی تھیں اور ان سے جو کمیشن مقرر ہوا تھا اور جیسے جیسے ان سے قیمت وصول ہوتی گئی، وہ تمام تفصیل تاریخ وار اس رجسٹر میں درج تھی۔ آمدنی میں سے دو ہزار کا ایک چیک وہ ارسال کر چکے تھے اور دوسرا چیک ارسال کر رہے تھے۔ میں نے جو کچھ سبط حسن صاحب کے ریکارڈ میں دیکھا اس سے جوش صاحب کو مطلع کر دیا۔ اس کے بعد میں اپنے کاموں میں کچھ ایسا مصروف ہو گیا کہ ایک مہینے سے زیادہ جوش صاحب کو کوئی خط نہ لکھ سکا۔ اتنی مدت تک خط نہ بھیجنے سے جوش صاحب خفا ہو گئے اور انھوں نے سخت برہمی کا خط لکھا۔

جوش صاحب کا خط۔

مرے آپ بھی منور عباس "یوسوس فی صدور الناس" کے مانند وہ نکلے جن کو، مسٹر آنکھ اوٹ پہاڑ اوٹ" سمجھا جاتا ہے۔ میرے کراچی سے آنے کے بعد آپ نے ایک سطر بھی نہیں لکھی مجھ کو۔

مبارک ہو یہ سرد مہری، یہ طوطا چشمی، یہ ابوسفیانیت۔

جس نے بھی معاویہ کا نمک کھایا۔ دوستوں پر ظلم ڈھایا ہے۔ اب جی میں یہ ٹھانی ہے کہ اب کی آیا تو آپ کو خبر ہی نہیں کروں گا اور بے ملے واپس آ جاؤں گا۔

نام خورشید اور دل میں یہ ظلمت شدید، المدد یا حضرت یزید۔

جوش

یعنی۔ اے وائے بر اسیرے، کز یاد رفتہ باشد۔

۶۔ ۷۔ ۷۴ء۔ نصف النہار

اپنا پتا کیوں لکھوں، جواب کی تشنگی نہیں۔ بھاری پتھر تھا۔ فقط چوم ہی کر چھوڑ دیا۔

اس عتاب نامے کے جواب میں، میں نے لکھا کہ "حضور والا اس سے پہلے آپ کو ایک خط لکھ چکا ہوں جس میں "یادوں کی برات" کے تعلق سے جو حساب سبط حسن صاحب نے دیا تھا وہ بھی شامل تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو یاد نہیں رہا۔"

اس کے جواب میں جوش صاحب نے لکھا۔

"میری جان، خط ملا، غصہ فرو ہو گیا اور آنے لگا پیار آپ پر۔ آپ کا جلد جلد خط نہ آئے تو بلبلا اٹھتا ہوں اور اس بلبلاہٹ میں آپ پر برس پڑا۔ میں اس مہینے کی سترھویں یا چوبیویں کو کراچی آ رہا ہوں، جب آؤں گا کپکپا کر آپ کو کلیجے سے لگاؤں گا۔

شفیع الحق کے نام کا خط منسلک ہے۔ مل لیجیے۔ آپ میرے کام کے واسطے اپنا کام چھوڑ کر دوڑتے ہیں آپ کی اس ادا پر غور کرتا ہوں تو بڑے زناٹے کے ساتھ پیار آنے لگتا ہے آپ پر۔

آپ کا

جوش

(۱۵۳) ایف ۳/۶ اسٹریٹ (۲۰) اسلام آباد

پرسوں لاہور جا رہا ہوں ایک ہفتے کے لیے۔ دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے۔

جوش صاحب کی کراچی آمد:

اس کے بعد جوش صاحب تیرھویں اگست ۷۲ء کو کراچی تشریف لائے اور ان کے ساتھ ہی کراچی میں پھر سے بہار آ گئی۔

محفل عشق میں وہ نازش دوراں آیا
اے گدا خواب سے بیدار کہ سلطاں آیا
اے گل تازہ سے کھل بادہ سر جوش ابل
کہ نگار چمن و شاہد مستاں آیا
دور اے زہد! کہ وہ زہد شکن آ پہنچا
رخصت ایماں! کہ وہ غارت گر ایماں آیا

اس مرتبہ انھوں نے اپنے ہی مکان میں قیام کیا۔ روز صبح نو بجے میں اور جوش صاحب گھر سے نکل پڑتے۔ زیادہ تر بابا صاحب کے آستانے پہنچ جاتے۔ پھر وہاں دوپہر تک نہایت دلچسپ باتیں ہوتیں۔ شاعری ہوتی۔ سہ پہر کو گھر آ جاتے اور شام کو جوش صاحب کے مکان پر تمام احباب جمع ہو جاتے اور یہ محفل اس وقت برخاست ہوتی جب جوش صاحب لیٹ جاتے۔

فسانۂ عزائم صاحب:

ایک دن میں اور جوش صاحب گھر سے دس بجے نکلے تو بابا صاحب کے گھر جانے کے لیے تھے مگر راستے میں راغب صاحب کے دفتر پر رک گئے۔ وہاں فراست رضوی اور ڈائریکٹر نسیم احمد صاحب بھی آ گئے۔ ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ کچھ اور لوگ آ گئے



راغب مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، خورشید علی خاں مصروفِ نا و نوش

maablib.org

ایک صاحب نے جوش صاحب سے کہا، جوش صاحب! آپ کے مزاج کیسے ہیں؟

جوش صاحب نے خیریت بتانے کے بجائے فرمایا۔ جناب مزاج کیفیت مفرد ہے اس لیے ہم کہیں گے "آپ کا مزاج کیسا ہے" نہ کہ مزاج کیسے ہیں۔ پھر گفتگو کا رخ زبان کی غلطیوں کی طرف مڑ گیا۔ تو جوش صاحب نے کہنا شروع کیا مرض کی "ر" متحرک ہے نہ کہ ساکن ..... مگر ارض زمین کے معنوں میں بولا جاتا ہے اس کی "ر" ساکن ہے مگر قدما کے نزدیک متحرک تھی ..... رکن کی جمع "ارکان" ہے نہ کہ اراکین ..... اگر شراب سے اچھو لگ جائے تو اسے کانا لگنا کہتے ہیں۔ عام طور پر لوگ لکھتے ہیں "آج کل ہلکی چادر اوڑھنی پڑتی ہے" یہ غلط ہے "چادر اوڑھنا پڑتی ہے" درست ہے۔ غرض زبان کی اصلاح میں ایک بج گیا تو جوش صاحب نے بابا صاحب کو ٹیلی فون کر کے کہا۔ "بابا صاحب میں آپ سے ملنا چاہتا تھا مگر وہ فسانہ عزائم صاحب ایسے پیچھے پڑے ہیں کہ کیا کروں پے در پے ایسے موانع پیش آئے کہ میں مجبور ہو گیا ہوں۔ کل اگر زندہ رہا تو ضرور حاضر خدمت ہوں گا"۔

جوش صاحب کی دعوتیں:

غرض دو بجے تک راغب صاحب کے دفتر میں بیٹھ کر گھر آ گئے۔ دوسرے دن صبح ہی بابا صاحب کے ہاں پہنچ گئے۔ وہاں نہایت پر تکلف ناشتے کا اہتمام تھا۔ خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا۔ پھر دوپہر تک بہت پر لطف باتیں ہوتی رہیں۔ شام کو جوش صاحب کی دعوت بیگم (کرنل) نذیر کے ہاں تھی۔ ڈاکٹر عالیہ امام، راغب صاحب، بابا صاحب اور بہت سی خواتین مدعو تھیں۔ بیگم صاحبہ خود بہت اچھا گاتی ہیں اور فن سے واقف ہیں۔ انھوں نے کچھ ٹھمریاں کچھ دادرے سنائے۔ پھر فرمائش پر کچھ غزلیں بھی سنائیں۔ موسیقی کے بعد کھانا شروع ہوا جوش صاحب کے پسندیدہ کباب کئی قسم کے تھے۔ غرض کوئی گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔

دوسرے دن اٹھارویں اگست کو بیگم نورجہاں پرنسپل پبلک ہائی اسکول برائے خواتین کے گھر ناشتے کی دعوت تھی اور اس کے بعد ایک شعری نشست کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔ میں اور جوش صاحب صبح آٹھ بجے ان کے گھر پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد اور مہمان بھی آ گئے۔

نام تو ناشتے کا تھا مگر ٹھہرانے اور عشائیے سے زیادہ اہتمام کیا گیا تھا، اس کے بعد شاعری شروع ہوئی۔ میں تو اس بزم میں صرف اس لیے شریک ہو گیا تھا کہ

روشن ہے بزم شعلہ رخاں دیکھتے چلیں　　　اس میں وہ ایک نور جہاں دیکھتے چلیں

دو بجے یہ محفل برخاست ہوئی اور ہم لوگ اپنے گھر آ گئے۔

ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر دعوت:

جوش صاحب کے کراچی کے قیام کے دوران میں سب سے زیادہ شاندار دعوت ڈاکٹر عالیہ امام صاحبہ کے گھر ہوئی تھی۔ عالیہ کو جوش صاحب سے واقعی بے انتہا عقیدت اور محبت تھی اور وہ تقریباً روز ہی جوش صاحب سے ملنے ان کے گھر آجایا کرتی تھیں۔ جوش صاحب کے گھر میں ان کی حیثیت بالکل ایک فرد خاندان کی سی تھی۔ بیگم جوش بھی ان کو اپنی بیٹی کی طرح چاہتی تھیں۔ جوش صاحب اکثر عالیہ کے گھر چلے جاتے اور وہاں تمام دن قیام کرتے تھے۔ ڈاکٹر عالیہ امام کی شخصیت کثیر الجہات ہے۔ وہ جادو بیان مقررہ بھی ہیں اور خوش فکر ادیبہ بھی۔ وہ طالب علم بھی ہیں اور معلمہ بھی۔ خارزار سیاست کی جادہ پیما بھی ہیں اور محفل دانشوراں کی روح رواں بھی۔ ترقی پسند انقلابی ذہن بھی رکھتی ہیں اور پابند صوم و صلوٰۃ بھی۔ ماتم گسار اہل بیت رسول بھی ہیں اور اصحاب رسول سے عقیدت بھی۔ انھیں غم روزگار بھی ہے اور غم جہاں بھی۔ مختصر ایک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی۔ ایک شام وہ جوش صاحب کے گھر تشریف لائیں تو چہرے سے کچھ فکرمند دکھائی دے رہی تھیں۔ جوش صاحب نے فرمایا عالیہ خیریت تو ہے آج تم چونچال دکھائی نہیں دے رہی ہو؟ عالیہ کہنے لگیں کیا بتائیں جوش صاحب ہمارا حال تو بقول غالب یہ ہے کہ

ہزار آفت و یک جان بے نوائے اسد　　　خدا کے واسطے اے شاہ بے کساں فریاد

راغب صاحب نے فرمایا کہ میں آپ کو ایک نسخہ بتاتا ہوں، وہ لکھ لیجیے اور اس پر عمل کیجیے۔ پھر ایک کاغذ پر یہ اشعار لکھ کر عالیہ کو دیے۔

مشکلیں ہوں گی خود بہ خود آساں　　　صدق دل سے بس ایک کام کریں

نام مشکل کشا کا ورد مدام　　　ڈاکٹر عالیہ امام کریں

عالیہ نے پرچے لے کر راغب صاحب کا شکریہ ادا کیا پھر کہا کہ مگر اس وقت میں جس غرض سے یہاں آئی ہوں وہ یہ ہے کہ پرسوں یعنی ۲۲ ویں اگست کو آپ سب حضرات شام پانچ بجے میرے غریب خانے پر تشریف لائیں۔ میں نے چند اور احباب کو بھی مدعو کیا ہے وہ سب جوش صاحب کا کلام سننا چاہتے ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا تو پھر اس میں فکرمند ہونے کی کیا بات ہے۔ ہم سب پرسوں وقت مقررہ پر تمھارے گھر پہنچ جائیں گے۔ عالیہ نے جوش صاحب کا شکریہ ادا کیا اور رخصت ہو گئیں۔

چنانچہ ۲۲ ویں اگست کو میں چار بجے شام جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں راغب صاحب بھی موجود تھے۔ پھر ہم تینوں ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر چلے گئے۔ انھوں نے اپنے وسیع و عریض وارنڈے میں فرشی نشست کا اہتمام کر رکھا تھا۔ تمام وارنڈہ سفید براق چاندنیوں اور زریں گاؤ تکیوں سے سجا ہوا کسی مغل بادشاہ کا دربار معلوم ہو رہا تھا۔ جگہ جگہ گلاب اور چنبیلی کے گجرے رکھے ہوئے تھے۔ فرش کے ایک سرے پر ایک تخت رکھا گیا تھا جس پر نہایت خوبصورت قالین بچھا ہوا تھا اس پر زربفت کا گاؤ تکیہ رکھا ہوا تھا اور تخت کے اوپر ایک نہایت خوبصورت منڈوا بنایا گیا تھا جس پر گلاب اور موتیے کے پھولوں کی لڑیاں پھیلا دی گئی تھیں۔ اس مسند شاہی کو "یادوں کی برات" کے نوشہ سے زینت بخشی گئی۔ پھر آہستہ آہستہ دوسرے مہمان بھی آنے شروع ہو گئے۔ جی الانا صاحب اور ان کے صاحبزادے پیار علی الانا جو اس وقت سندھ کے وزیر تعلیم تھے، تشریف لائے۔ وزیر تعلیم کے ساتھ معتمد تعلیم پناہ علی شاہ صاحب بھی آ گئے۔ جب تمام مہمان جمع ہو گئے تو عالیہ امام کی بھانجی عذرا بانو نے ہارمونیم پر گیت سنایا۔ جس کے بول تھے۔

ارے دیکھو جی مورا جیا چرائے لیو جائے

جوش صاحب نے اس ٹکڑے کی دل کھول کر داد دی اور خود بھی کئی دفعہ دہرایا۔ ارے دیکھو جی کا جواب نہیں۔ واہ واہ واہ۔ ارے دیکھو جی مورا جیا چرائے لیو جائے۔ جوش صاحب جھوم جھوم کر داد دے رہے تھے۔ جب گیت ختم ہوا تو دوسرا گیت شروع ہوا۔

اندھریا ہے رات سجن رہیو کہ جیہو؟

جوش صاحب نے اس گیت کی بھی خوب داد دی۔ پھر فرمایا۔ ہندی شاعری میں عورت عاشق

ہوتی ہے مگر عشق میں بے پناہ خواہش سپردگی کے باوجود وہ کبھی اپنی عزت نفس کو مجروح
نہیں ہونے دیتی۔ میں نے اس کیفیت کو اس طرح ادا کیا ہے کہ

میرے نزدیک ہیچ ہے وہ نیاز　　　　جو نہ پہنچے بہ حدِ عشوہ و ناز

تو عورت کی شدید یہ خواہش ہے کہ اس کا محبوب رات کو اس سے جدا نہ ہو مگر خود اس
خواہش کا اظہار نہیں کرتی بلکہ اس کو ڈراتی ہے کہ اندھیرا ہے رات گھنی۔ پھر Suggest کرتی
ہے مگر بہ انداز استفسار کہ رہیو کہ جیو؟ یہ نہیں کھل کر رہ جاؤ۔ کسی اور شاعر نے اس کو اس
طرح کہا ہے۔

رات آدھی آ گئی کیا جاؤ گے ڈر جاؤ گے
صبح کو جانا مرے گھر سے ہوا کھاتے ہوئے

جب گانے کا دور ختم ہوا تو جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش ہوئی۔ جوش صاحب نے
پہلے تو رباعی سنائی۔

نکلی لبِ گل سے آہ خوشبو بن کر　　　　سر میں آئی رمیدہ آہو بن کر
سرے گئی دل میں ان کی تصویر لیے　　　　تصویر ٹپکنے لگی آنسو بن کر

اس کے بعد ایک نظم سنائی۔ جس کا عنوان تھا۔ "سہانی سزائیں"۔

سہانی سزائیں

کیا اک بت کو پھر معمور لطف بے کراں تو نے
یہ مجھ پر کیا ستم ڈھایا خدائے انس و جاں تو نے
محبت کے شرارے دے کر اک اٹھتی جوانی کو
جلا ڈالا مری فرزانگی کا خانماں تو نے
کسی نوخیز کے اڑتے ہوئے آنچل کی بُرش سے
اڑا دیں مری جیب تمکنت کی دھجیاں تو نے
متاعِ عقل کو میری نگاہوں میں سبک کر کے
ملا دی خاک میں افکار کی جنس گراں تو نے

افق دیکھی جو میری سمت آیات و افسوں پر
تو دل کے پار کر دی ایک گھوڑے کی سناں تو نے

مرے آگے رخ و گیسو کی دیواریں کھڑی کر دیں
مرا دھاوا جو دیکھا سوئے قصر لامکاں تو نے

جو شمع ذات کو میں آندھیوں کی زد پہ لے آیا
مسلط کر دیا آنکھوں پہ زلفوں کا دھواں تو نے

سبق لیتے مجھے دیکھا جو خار و خس کے مکتب میں
مجھے الجھا دیا سرو و سمن کے درمیاں تو نے

مجھے گرم عمل جب چلچلاتی دھوپ میں پایا
ہنکا دیں میری جانب گھڑگھڑاتی بدلیاں تو نے

جو کانٹے میری منطق کے چبھے قلب عقائد میں
تو دے دیں پھول سی باہوں کی مجھ کو بدھیاں تو نے

نمد پوشی پہ قانع ہو گئی جب پختگی میری
تو میرے دوش کو دے دی قبائے پرنیاں تو نے

مرے سینے کے شعلوں کو جو کجلاتے ہوئے دیکھا
تو اک الھڑ کے دل میں بھر دیا سوز نہاں تو نے

مرے انفاس سے اٹھتی نہیں اب نکہت گل بھی
کیا ایسا نڈھال اے دشمن تاب و تواں تو نے

مجھے آغوش تنگ و تند برنائی میں بھنچوا کر
مری فرزانگی کی توڑ ڈالیں پسلیاں تو نے

جو میں گرجا سراب دیں کے متوالوں کی حلقوں پر
تو مجھ کو بخش دی موسیقی آب رواں تو نے

جب آدھی رات میں طے کر چکا اقلیم حکمت کی
تو پہنا دیں مجھے زلف رسا کی بیڑیاں تو نے

مقفل کر چکا میں در جب ایوان سماعت کا
تو نازل مجھ پہ کر دی اک انیلی نغمہ خواں تو نے

مرا پتھراؤ جب دیکھا فراز عرش و کرسی پر
تو دل میں کھول دی میرے نگینوں کی دوکاں تو نے

جو میں نے صلح کر لی کوزہ قامت ذوق پیری سے
تو کڑکا دی مرے سر پر جوانی کی کماں تو نے

مرے طبل بغاوت کی گرج پہنچی جو تا گردوں
تو رشوت میں عطا کر دیں کھنکتی چوڑیاں تو نے

جو آنچ آتے ہوئے دیکھی حرم کے آشیانے پر
تو بھر دیں جوش کے دل میں کروڑوں بجلیاں تو نے

تالیوں کی گونج اور واہ واہ کے شور میں جوش صاحب کی نظم ختم ہوئی۔ جوش صاحب کو عالیہ نے اتنے ہار پہنا رکھے تھے کہ ان کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ اس وقت تمام گلاب کے پھولوں کا چہرہ خوشی سے سرخ ہو رہا ہے کہ چہرہ جوش کے بجائے وہ مرکز نگاہ بنے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب نے تمام ہار اتار کر پہلو میں رکھ لیے۔ اس کے بعد کھانا شروع ہو گیا۔ اس دوران میں پی اللا صاحب نے مجھے اپنی انگریزی کی چار نظمیں دے کر کہا کہ جوش صاحب سے ان کا منظوم اردو ترجمہ کروا دیں۔ میں نے وہ نظمیں لے کر کہا کہ کوشش کروں گا اگر جوش صاحب کا موڈ ہوا تو وہ ترجمہ کر دیں گے۔ کھانا ختم ہوا تو سب مہمان رخصت ہوئے اور ہم لوگ کوئی ایک بجے اپنے گھر پہنچے۔ دوسرے دن صبح ہی میں جوش صاحب کے گھر گیا اور ان کو اللا صاحب کی نظمیں دے کر ان سے درخواست کی کہ وہ ان کا منظوم ترجمہ کر دیں۔ جوش صاحب نے کہا پڑھ کر سناؤ۔ میں نے انگریزی میں وہ نظمیں پڑھ کر سنا دیں۔ فرمایا ان میں سے ہر ایک کا مطلب بھی بیان کرو۔ میں نے وہ بھی کر دیا تو انھوں نے وہ کاغذات رکھ لیے۔

کسٹم کلب کا مشاعرہ:

اسی دن یعنی چوبیسویں اگست کو رات میں کسٹم کے پریونٹیو کلب میں مشاعرہ تھا جس کی صدارت مولانا کوثر نیازی فرمانے والے تھے۔ مولانا اس زمانے میں وزیر اطلاعات و نشریات تھے۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ - تمہارے دوستوں میں کوئی ایسا ہے جو کسٹم کلب کے قریب رہتا ہو جہاں ہم دن میں جا کر قیام کر سکیں اور جو ہمارے کمرے کو دوپہر میں اتنا تاریک کر دے کہ ہم سمجھیں کہ سورج ڈوب گیا ہے اور ہم تین بجے دن ہی میں ڈرنک وغیرہ سے فارغ ہو کر سو جائیں اور رات بارہ بجے بیدار ہوں تو یہ کہا جائے کہ صبح ہو گئی ہے اور ہم غسل کر کے مشاعرے میں ایک بجے کے قریب پہنچ جائیں۔ میں نے مشاعرے کے منتظم اور پریونٹیو کلب کے نائب صدر انوار احمد صاحب صدیقی کو ٹیلی فون کر کے جوش صاحب کی خواہش کا اظہار کر دیا۔ انوار بھائی نے کہا کہ ان کا مکان کسٹم کلب سے بالکل متصل ہے اگر میں جوش صاحب کو بارہ بجے دن تک وہاں پہنچا دوں تو وہ تمام انتظام کر دیں گے۔ غرض میں جوش صاحب کو لے کر بارہ بجے کیماڑی انوار احمد صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ انوار بھائی نے اپنے بیڈروم میں گہرے نیلے رنگ کے پردے ڈلوا دیئے تھے۔ ایر کنڈیشنر چلا دیا اور نہایت آرام دہ بستر پر جوش صاحب کو لٹا دیا۔ گھڑی میں تین بجے کا الارم لگا کر گھڑی ان کے بستر کے قریب اسٹول پر رکھ دی۔ جب جوش صاحب سو گئے تو گھڑی کو تین گھنٹے آگے کر دیا اس طرح کہ جب تین بجے کا وقت ہو تو گھڑی میں چھ بجیں اور جوش صاحب سمجھیں کہ اب سورج غروب ہو چکا ہے تو ان کو ڈرنک اور رات کے کھانے سے فارغ کر کے پانچ یا چھ بجے تک پھر سلا دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا گھڑی نے تین بجے، چھ بجے کا الارم بجایا۔ جوش صاحب بیدار ہو گئے کمرے میں اتنا اندھیرا تھا کہ شام کا گمان ہوتا تھا۔ ان کا منہ ہاتھ دھلا کر ڈرنک کا سامان رکھ دیا گیا۔ میں ساتھ بیٹھا رہا۔ انوار بھائی مشاعرے کے انتظامات میں مشغول تھے مگر بار بار آ کر دریافت کرتے رہتے تھے کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟ غرض جوش صاحب پینے اور کھانے سے فارغ ہو گئے تو ان کو دوبارہ سلا دیا گیا۔ اس کے بعد میں بھی انوار بھائی کے ساتھ کلب کے انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ دس بجے کے بعد مہمان آنے شروع ہو گئے۔ مولانا کوثر نیازی تشریف لے آئے تو کلب کے سیکریٹری کاظم صاحب نے مشاعرے کا آغاز کیا اور مولانا کا شکریہ ادا کرتے

ہوئے کہہ دیا کہ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ مولانا کوثر نیازی - وزیر مملکت - حکومت پاکستان نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود ہمارے لیے وقت نکالا اور اس مجلس شعرا کو اپنی شرکت سے زینت بخشی۔ سیکرٹری صاحب کا جواب مولانا نے اس طرح دیا کہ۔ کسٹم والے اپنے فرائض میں بہت سنگدل ہوتے ہیں وہ اپنا محصول وصول کرنے میں کسی سے بھی رعایت نہیں کرتے۔ اب یہی دیکھیے کہ ایک طرف تو مجھے مہمان خصوصی بنا کر مسند صدارت پر بٹھا دیا مگر اس کے ساتھ ساتھ میرے منصب وزارت سے محصول بھی کاٹ لیا اور مرکزی وزیر کے بجائے مجھے وزیر مملکت بنا دیا"۔ مولانا کے اس دلکش طنز پر محفل تو زعفران زار بن گئی مگر میاں کاظم مارے شرم کے اتنے بوکھلائے کہ ان کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کریں۔ بالآخر انوار بھائی نے ان کی طرف سے مولانا سے معافی مانگی اور مولانا نے بہ کمال شفقت و مہربانی بات کو ہنس کو ٹال دیا۔ حالانکہ "گر بگر بیٹھتے وہ لائق تعزیر بھی تھا"۔

راغب صاحب مرادآبادی نظامت کے فرائض ادا کر رہے تھے۔ ہر شاعر کو وہ فی البدیہہ شعر میں دعوت سخن دیتے اور جب تک وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر مائیکروفون تک پہنچتے ان کی شان میں ایک رباعی یا ایک قطعہ فی البدیہہ پڑھ دیتے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ تمام مہمانان گرامی تشریف لے آئے۔ فیض صاحب بھی آگئے۔ سب کی نگاہیں جوش صاحب کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مولانا کو انوار بھائی نے بتا دیا تھا کہ جوش صاحب ایک بجے تک آجائیں گے۔ چنانچہ میں اور انوار بھائی بارہ بجے جوش صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔ ان کی گھڑی تین بجا رہی تھی۔ جوش صاحب اپنی نیند پوری کر چکے تھے۔ اٹھ کر غسل کر کے تازہ دم ہو کر ایک بجے ڈائس پر تشریف لے آئے۔ مولانا نے استقبال کیا اور اپنے پہلو میں بٹھا لیا۔ جب تمام شعرا اپنا اپنا کلام سنا چکے تو آخر میں جوش صاحب کی باری آئی۔ جوش صاحب نے کچھ رباعیات سنائیں اور پھر اپنی نظم "عذاب دوراں" سنائی۔

عذاب دوراں

خداوندا سفر دشوار رکھا جائے گا کب تک

مرے جادے کو ناہموار رکھا جائے گا کب تک

ان ابنائے جہالت حاکمانِ زشت فطرت کو
مرا آقا مرا سردار رکھا جائے گا کب تک

اس شعر پر مولانا کوثر نیازی نے فرمایا۔ جوش صاحب! یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ ہماری وزارت سے اب دوسری وزارت (وزارت تعلیم) میں منتقل ہو چکے ہیں ورنہ لوگ سمجھتے کہ آپ کا اشارہ میری طرف ہے۔ مگر جوش صاحب نے صرف ایک مسکراہٹ سے ان کا جواب دیا اور کلام سناتے رہے۔

مجھے ان جاہلان و سوقیانِ سفلہ پرور میں
خداوندا ذلیل و خوار رکھا جائے گا کب تک
مرے قلبِ زر افشانی و ذوقِ سخاوت کو
بغیر درہم و دینار رکھا جائے گا کب تک
اسیرانِ کعب و کاشی کے دیوانوں کے نرغے میں
مجھے مقبلۂ کفار رکھا جائے گا کب تک
اس انساں کو جو زنجیرِ دو عالم توڑ بیٹھا ہے
میانِ سبحہ و زنار رکھا جائے گا کب تک
الٰہی ان سماعت مردہ مادر زاد بہروں میں
مجھے شرمندۂ گفتار رکھا جائے کب تک

آخر میں مولانا کوثر نیازی نے اپنا کلام سنایا اور سفیدیٔ سحر کی نمود پر یہ مشاعرہ اپنے اختتام کو پہنچا۔

جوش صاحب کی لاہور روانگی:

سات مئی کو جوش صاحب تیز گام سے لاہور جانے والے تھے۔ میں صبح ہی ان کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب نے مجھے لالہ صاحب کی چاروں نظمیں مع ترجمے کے لوٹا دیں اور فرمایا رات تین بجے ہی سے آنکھ کھل گئی تھی۔ طبیعت موزوں تھی۔ میں نے ان چاروں نظموں کا ترجمہ کر دیا ہے تم دیکھ لو"۔ اتنے میں ڈاکٹر عالیہ امام اور راغب صاحب بھی آ گئے۔ سب نے

زد بہت پسند کیا۔ ترجمہ کا ایک ایک لفظ جوش صاحب کی رجائیت، زندہ دلی اور ان کے نظریۂ حیات کی توانائی کا آئینہ دار ہے۔ اصل نظموں سے جب آپ ترجموں کا مقابلہ کریں تو پہلے ہی لفظ سے آپ کو جوش صاحب کا رجائی انداز نمایاں محسوس ہو گا مگر اس کے باوجود پوری نظم کا مفہوم نہایت خوبصورتی سے ادا ہو جاتا ہے۔

الانہ صاحب کی نظموں کا منظوم ترجمہ:

پہلی نظم اور اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمایئے۔

The light of the inner shrine

Do not like yesterdays cyclonecome, its teeth bloody with destruction

Come like the spring,as the harbingerof joy and song

Let laughtersprout from every branch of the tree,

Where the birds may sit, lost in song and ecstasy,

Time will age, but the hills will remain ever young,

Like some trees remaining green in every season,

Remove the gloom that doze with in my door ways;

Wipe away the cobwebsof despair that darkens my to-day.

Come tomorrow with laughter,joy and sunshine,

And enable me to behold the light of inner shrine.

نورِ باطن

چلی آؤ اے جان گاتی ہوئی — لچکتی لہکتی لجاتی ہوئی

نہیں آؤ کل کا سا طوفان بن کر — تباہی، سیاہی کا عنوان بن کر

بڑھو اس طرف مسکراتی ہوئی — جوانی کی جھلکیں دکھاتی ہوئی

چلی آؤ گھونگھٹ اٹھائے ہوئے	بہاروں میں خود کو بسائے ہوئے
چھڑا دو مجھے بند غم سے چھڑا دو	مرے آنسوؤں کے دیے کو بجھا دو
گلابی سا مکھڑا بگڑنے نہ دو	مہ و سال کی ضرب پڑنے نہ دو
گرجتی ہوئی گنگناتی بڑھو	ترنگوں کی مرلی بجاتی بڑھو
کہ دلوں کی چمکتی رہے	دوانی جوانی بھٹکتی رہے
ترانوں سے دنیا کو معمور کر دو	مرے کعبۂ دل کو پر نور کر دو

نظم نمبر ۳۰

Your help and guidance

If man feeds innocence with morsals of hate,

Which abounds on the dinner table of life,

Then the bladder of innocence will become diseased with hate,

Learning to paint the nuances of colour from the ravages of war,

Will accustom your brush to dip itself in dark and dismal colours.

Shun the path and ways of mutilation and destruction.

Pitch your dreams to the stars of hope and cheer,

And trumpet the music of the song of love.

Is this possible for me while thorns and thistles abound.

On my life's journey, without your help and guidance?

ترجمہ

مولا مدد دے

اے دوستو، ساتھیو، رفیقو	نفرت کی غذا نہ دو بشر کو
یہ چیخ اجاڑ دے گی محفل	نفرت کی غذا ہے سم قاتل
مے خانۂ روزگار میں ہاں	چھلکاؤ شراب حب انساں
بوئے گل کی چلت پھرت لو	بارود کی بو میں سانس مت لو

دھبے سارے لہو کے دھو دو — رنگ گل میں قلم ڈبو دو

توپوں کو دباؤ، لے ابھارو — کانٹوں کو بناؤ پھول یارو

قلعے جنگ و جدل کے ڈھا دو — لوہا تلوار کا گلا دو

سر پہ آئی بلا کو رد کر — اے روح بشر مری مدد کر

نظم نمبر ۳

The links of common brotherhood

The tide of light had ebbed beyond the horizen
That swallowed the sun like a whale chewing a fish
And my mind wandered across the countless corridors of stars
While the moon looked on with a smile on its face
The exhausted waves of the dying day shed tears
On the aged shores of life's declining years
Inspite of this age of atom and hydrogen bomb
The hand of history was busy at the wheel of human wheels
Trying to forge on earth links of common brotherhood,
Only if I could be alive when history accomplishes this task.

ترجمہ

حب انسانی

صبح تاباں افق دل پہ نمودار ہوئی — جنس دنیا تھی وہ سب مصر کا بازار ہوئی

راہ محبت میں جو حائل تھی وہ دیوار گئی — شکر صد شکر کہ نفرت کی شب تار گئی

شورش جنگ سے الفت کے فسانے ابھرے — ایٹمی بم کے دھماکوں سے ترانے ابھرے

چہرۂ تاریخ پہ اک دور زر افشاں دمکا — ماضی مردہ سے مستقبل انساں دمکا

عقل کی ضرب سے زنجیر جنوں ٹوٹ گئی — چرخ پہ وحدت انساں کی کرن پھوٹ گئی

رات کی سانس رکی ختم ہوئی بے خبری
آئی گاتی ہوئی گلشن میں نسیم سحری

بجلیاں گر گئیں چلتی ہوئی تلواروں پہ
پڑ گئی اوس دہکتے ہوئے انگاروں پہ

خیمۂ امن میں گاتی ہوئی دنیا دیکھوں
کاش! میں زندہ رہوں اور یہ تماشا دیکھوں

نظم نمبر ۲۰۔

The ideal one

In the tower of the mind of every poet is the image
Of her, whom he, a paragon of beauty dreams,
Majnu called her Laila and Dante called her Beatrice,
Immortalizing in song her beauty and her name,
Setting her up on the pedestal of fancy as an idol of an ideal.
The tales that are told of them in verse and rhyme
Are countless and live through successive centuries,
Oh, you, O Ideal of ideals, have I lavished my love
While you and your beauty abide in eternity
My faulty and clumsy verses cannot
Stand the test of time.

ترجمہ

حسنِ ازل

نصب ہیں جب سے فلک پہ ماہ و انجم کے خیام
ہم برابر حسن کے گن گا رہے ہیں صبح شام
دھوم بیداری کی جب سے ہے جہان خواب میں
گونج سازِ حسن کی ہے عشق کی محراب میں

ہاں ازل سے چل رہا ہے عاشقی کا کاروبار
کوئی شیریں پر فدا ہے کوئی لیلیٰ پہ نثار
شمعیں جلتی ہیں قیامت تک رہیں گی تاب ناک
اور اڑ جائے گی وقت صبح پروانوں کی خاک
سب پجاری وقت کے گرداب میں کھو جائیں گے
دیویاں جگمگتی رہیں گی برہمن سو جائیں گے

ان چاروں نظموں کا ترجمہ کرنے کے بعد جوش صاحب نے حسب ذیل نوٹ بھی لکھ دیا۔

" الانا صاحب دولت مند ہونے کے باوجود ہم مفلسوں کا شغل فرماتے ہیں۔ ان کی فکر میں گہرائی اور بیان میں کشش ہے۔ یہ میری برادری یعنی خاندان انسانی کے خاندان سے ہیں اور میں ان کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اب وہ اس مقام تک آ پہنچے ہیں جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں۔

تابندہ باد الانا جوش

۲۶-۸-۷۳ء

ابھی ریل کے وقت میں بہت دیر تھی۔ میں نے ہر نظم کئی کئی دفعہ پڑھی ہر سطر کا مقابلہ انگریزی کے متن سے کیا۔ ہر لفظ کی بلاغت پر گفتگو ہوئی۔ ترجمہ کا کمال یہ تھا کہ ہر نظم پر طبعزاد ہونے کا دھوکہ ہوتا تھا۔ غرض ان باتوں میں دو بج گئے۔ ریل کا وقت پونے چار بجے تھا اس لیے سب مل کر کینٹ اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ جوش صاحب کا کوپے سامنے ہی تھا۔ ان کو آرام سے گاڑی میں سوار کروا کر ان کا بستر سیٹ پر بچھا دیا گیا۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ میرا ارادہ لندن جانے کا ہو رہا ہے۔ وہاں میری بہن ہے جو مجھے بلا رہی ہے اگر آپ بھی ساتھ چلیں تو بہت لطف آئے گا۔ جوش صاحب نے کہا جب تم جانے لگو تو مجھے بتا دینا میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اتنے میں انجن نے رخصتی کی سیٹی بجائی اور ہم لوگ جوش صاحب سے گلے مل کر رخصت ہو گئے۔

اسٹیشن سے میں اور ڈاکٹر عالیہ امام سیدھے جی الانا صاحب کے بنگلے پر پہنچے۔ وہاں پہنچ کر اپنے آنے کی اطلاع کروائی۔ الانا صاحب ہم دونوں کو لے کر ڈرائنگ روم میں گئے جہاں پہلے سے شبنم رومانی صاحب اور چند دوسرے اصحاب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہاں میں نے الانا صاحب کو ان کی نظمیں مع ترجمے کے دے دیں۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں ترجمہ پڑھ کر بھی سناؤں۔ چنانچہ میں نے چاروں نظمیں کو پڑھ کر سنایا۔ اتنے میں پیار علی الانا صاحب بھی آ گئے۔ انھوں نے دوبارہ سنانے کی فرمائش کی لہٰذا دوبارہ سنائی گئیں۔ سب نے بے حد تعریف کی۔ اس کے بعد چائے اور اس کے لوازمات سے ہماری تواضع کی گئی۔ غرض دو گھنٹے وہاں بیٹھ کر اپنے گھر واپس آ گیا۔

اس کے بعد میں اپنے کاموں میں کچھ ایسا مشغول ہو گیا کہ ایک ہفتہ تک جوش صاحب کو کوئی خط نہ لکھ سکا اس پر جوش صاحب خفا ہو گئے۔ انھوں نے ۷ ستمبر کو خط لکھا۔ خط بغیر القاب کے ہے۔

"آپ نے پھر چپ سادھ لی۔ سورج گرہن پھر پڑ گیا۔ ہوا پھر بند ہو گئی۔ پھر شدید حبس ہو گیا۔ آخر یہ کنجوسی کس کام کی۔

پرسوں سلامت علی خاں آئے تھے۔ ایک بیٹے کو بھی ساتھ لائے تھے۔ ان کو دیکھ کر آپ کی یاد ستانے لگی اور کراچی کی ہوا آنے لگی۔

لیجیے یہ خط ہے الانا کے نام ان کا پتا اور پورا نام ذہن میں نہیں۔ آپ جائیں اور ان کو یہ خط دے دیں۔ مناسب ہو تو ان کے بیٹے سے بھی بات کر لیں۔ کام اشد ضروری ہے۔ اس لیے جلد اور قوی ترین الفاظ میں ان سے ملیے۔

میں شیرینی و تلخی کے مابین جی رہا ہوں۔ مسکراتا بھی ہوں اور بسورتا بھی۔

آپ کا شیدائی

جوش غفرانی

(۳۵۱) الف ۲/۶ اسٹریٹ (۹۰) اسلام آباد

۷-۹-۷۳ء ۸ بجنے میں ۵ منٹ

جوش صاحب کا خط لے کر میں دوسرے دن جی الانا صاحب کے دفتر گیا۔ خط میں جوش صاحب نے اپنی بھانجی کے صاحبزادے عرفان ہاشمی کے متعلق سفارش کی تھی کہ ان کو محکمہ تعلیمات میں کوئی اچھی سی نوکری دے دی جائے۔ الانا صاحب نے مجھ سے کہا کہ اسی روز ہوٹل کانٹی نینٹل میں شام ہمدرد منائی جارہی ہے جس میں پیارعلی الانا مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوں گے۔ میں یہ درخواست انھیں دے کر اس پر آرڈر لے لوں اور پھر وہ درخواست ان کو دے دوں تو وہ اس آرڈر پر عمل کروانے کی کوشش کریں گے۔ چنانچہ میں شام کو ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل پہنچا۔ وہاں پیار علی الانا صاحب سے ملاقات کرکے وہ درخواست ان کو دے دی۔ انھوں نے وہ درخواست لے کر رکھ لی اور مجھ سے کہا کہ وہ اس پر غور کرکے جوش صاحب کو جواب بھیج دیں گے۔ اس شام فارسی کے مشہور شاعر نظامی پر مقالے پڑھے جا رہے تھے۔ مقررین میں نیویارک یونیورسٹی کے فارسی کے پروفیسر پیٹر شوئنکی بھی تھے جنھوں نے نظامی پر بہت عالمانہ مقالہ پڑھا۔ پیار علی الانا صاحب نے بھی نظامی پر ایک تعارفی مضمون پڑھا۔ آخر میں اس وقت کے کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر محمود حسین خاں نے نہایت جامع تقریر کی اور محفل برخاست ہوگئی۔

دوسرے دن میں نے جوش صاحب کو الانا صاحب سے ملاقات کی تمام تفصیل خط کے ذریعے بتادی۔ اس خط میں میں نے یہ بھی لکھ دیا تھا کہ میرا ارادہ تیسری اکتوبر کو انگلینڈ کے لیے رخصت ہونے کا ہے اگر وہ بھی چلنا چاہیں تو تیار ہوکر کراچی آجائیں۔ جوش صاحب نے اس خط کا یہ جواب دیا۔

"بڑا غضب کیا خورشید علی خاں آپ نے اچانک اپنی رخصت کی خبر دے کر۔ مرجھا کر رکھ دی آپ نے پھول سی شگفتہ صبح۔ ابھی چار بجے بیدار ہوا۔ میز پر آپ کا خط رکھا ہوا تھا۔ لفافہ چاک کرکے پڑھا، دل چاک چاک ہوگیا۔

طے تو یہ ہوا تھا کہ ہم دونوں ساتھ چلیں گے لیکن آپ نے تنہا جانے پر کمر باندھ لی۔

سرو سیمینا بصحرا می روی   سخت بے مہری کہ بے ما می روی

آپ کے بچھڑ جانے کا اس قدر دھکا لگا ہے کہ خط لکھ رہا ہوں اور حروف کی شکلیں مسخ ہوتی چلی جارہی ہیں۔ ارے ایکا ایکی یہ اشتلا کیسا کھڑا ہوگیا کہ آپ اس قدر جلد جارہے ہیں۔

کچھ روز تو اور توقف کیا ہوتا، ممکن ہے ہمارا ساتھ ہو جاتا۔ اگر آپ اس قدر جلد یورپ چلے گئے تو لکھ رکھیے میری یہ پیش گوئی کہ جب واپس آئیں گے دکان کو نہیں پائیں گے۔ اس کی اینٹ سے اینٹ بج چکی ہوگی اور کوئی وجہ معاش باقی نہ رہی ہوگی۔

جائیے جائیے، میرا دل توڑ کر جائیے۔ آپ جب یورپ سے پلٹ کر آئیں گے، مجھے نہیں پائیں گے۔

یہ میرا آخری خط ہے۔

آپ کی رخصت سے بوکھلایا ہوا

جوش

۱-۱۰-۷۲، اسلام آباد۔ صبح ساڑھے چار آغاز سرما

سلام، آخری سلام۔

میری انگلینڈ روانگی:

میں کراچی سے تیسری اکتوبر ۱۹۷۲ء کو انگلینڈ روانہ ہو گیا اور لندن میں ایک دن ٹھہر کر دوسرے دن یارک چلا گیا جہاں میری چھوٹی بہن قمر خانم اور ان کے شوہر ڈاکٹر شہریار حسین رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب وہاں فل فورڈ (Fulford) ہسپتال میں ملازم تھے۔ ان کا مکان بھی ہسپتال کے حدود میں شہری آبادی سے دور تھا۔ ہسپتال کے اطراف خوبصورت ہرے بھرے میدان، سرسبز و شاداب کھیت اور جنگل نما باغات ہیں مگر یہاں سردی شروع ہو چکی تھی جس سے موسم خزاں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جوش صاحب کا خط مجھے یارک میں ملا۔ میں نے اس خط کے جواب میں ان کو لکھا۔ کہ کچھ ایسے حالات ہوتے چلے گئے کہ مجھے جلدی انگلینڈ آنا پڑا۔ آپ شاید اتنی عجلت میں میرے ساتھ نہ آ سکتے مگر یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ یہاں آنے کی زحمت سے بچ گئے۔ کیونکہ آج کل یہاں موسم بہار رخصت ہو چکا ہے اور خزاں کی عملداری ہے۔ حسینہ فطرت نے اپنا لاجوردی جوڑا اتار پھینکا ہے۔ خزاں کے ڈسے ہوئے خشک شجر عریاں کھڑے ہوئے سرد ہواؤں کے تھپیڑوں سے سینہ کوبی کر رہے ہیں۔ شہر کے گلی کوچے سنسان اور ویران ہیں اگر کہیں اکا دکا پری زاد نظر بھی آ جاتا ہے تو سر سے پیر تک موٹے موٹے

ملبوسات میں مستور۔ نہ لے کرے زیارت مجنوں۔ نہ حسن فطرت کی سحرانگیزی نہ پری زادوں کی جلوہ آرائی۔ لعنت ہے اس شخص پر جو موسم سرما میں دیار مغرب کی سیر کا ارادہ کرے۔

اس خط کے جواب میں جوش صاحب کا ۲۶۔۱۱۔۷۳ء کا لکھا ہوا خط مجھے لندن کے پتے پر ملا۔ انھوں نے لکھا۔

ہم تو چلے گئے تنہا میرا دل توڑ کر اور جانیے۔ دیکھ لیا نتیجہ اس بے وفائی کا؟ اور جاؤ۔۔۔۔ پھوپی اور چچا کو۔

قلم بے حد خراب ہے۔ روشنائی اگل دینے کے بعد بھی حرام زادہ لکھ نہیں رہا ہے۔ جانے سالا۔ ہم بھی اب اس سے کام نہیں لیں گے۔ دوسرا قلم خرید کر آپ کو خط لکھیں گے۔ اپنی صحت سے مطلع کیجیے۔ میرا سارا دل آپ میں لگا ہوا ہے۔

آپ کے فراق کا ڈسا ہوا

جوش

۱۸ الف ۳/۶ اسٹریٹ (۱۰) ایمبیسی روڈ اسلام آباد

۲۶۔۱۱۔۷۳ء (رات کے ایک بجے)

سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار

نووارد کی بدحواسیاں:

اس دفعہ میں پہلی مرتبہ انگلینڈ آیا تھا اور یہاں کے طور طریقوں سے ناواقف تھا اس لیے بعض دلچسپ واقعات رونما ہوئے۔ مثلاً جب میں لندن سے یارک آرہا تھا تو میری پھوپی زاد بہن رضوانہ خانم جن کے گھر میں لندن میں ٹھہرا تھا مجھے ریلوے اسٹیشن پر پہنچانے کے لیے میرے ساتھ آگئیں۔ ہم لوگ ہانسلو ویسٹ سے ٹیوب ٹرین کے ذریعہ سے وکٹوریہ اسٹیشن پہنچے۔ وہاں کافی دیر تک گھومنے اور پریشان ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں سے کوئی ریل گاڑی یارک نہیں جاتی بلکہ کنگ کراس (King Cross) کے اسٹیشن سے جاتی ہے۔ چنانچہ ہانپتے کانپتے پھر ٹیوب اسٹیشن آئے اور وہاں سے کنگ کراس پہنچے۔ وہاں بڑی مشکل سے ٹکٹ گھر کا علم ہوا۔ خیر ٹکٹ خریدا اور پوچھتے پوچھتے گاڑی تک پہنچے۔ میں گاڑی کے پہلے ہی ڈبے میں

سوار ہو کر آرام سے ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔ رضوانہ مجھے ریل میں بٹھا کر اپنے گھر لوٹ گئیں۔ تھوڑی دیر میں گاڑی روانہ ہوئی۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد ٹکٹ چیکر آیا اس نے میرا ٹکٹ دیکھ کر نہایت خوش اخلاقی سے کہا آپ کا ٹکٹ دوسرے درجہ کا ہے اور آپ پہلے درجے میں بیٹھ گئے ہیں۔ کوئی مضائقہ نہیں۔ دوسرا درجہ کھانے کے کمپارٹمنٹ کے ساتھ ہی لگا ہوا ہے۔ میں نے سوچا کہ گاڑی رکے گی تو اتر کر وہاں چلا جاؤں گا۔ چنانچہ میں اپنی سیٹ سے اٹھ کر دروازے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا مگر جب ایک گھنٹے تک گاڑی نہیں رکی اور ٹکٹ چیکر دوبارہ لوٹ کر آیا اور اس نے مجھے دروازے سے لگا کھڑا ہوا دیکھا تو سمجھ گیا کہ میں نووارد ہوں اور وہاں کے ریلوے نظام سے ناواقف ہوں۔ تب اس نے میری رہنمائی کی اور مجھے اندر ہی اندر سے کھانے کے کمپارٹمنٹ میں سے ہوتا ہوا دوسرے درجے میں پہنچا دیا اور ایک نشست کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ یہ آپ کی سیٹ ہے۔ چنانچہ میں وہاں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں پیٹر برو (Peter Borough) کے اسٹیشن پر گاڑی رکی وہاں سے ایک خاتون سوار ہوئیں اور میرے پہلو کی سیٹ پر آکر بیٹھ گئیں۔ جیسے ہی گاڑی روانہ ہوئی ان صاحبہ نے میرے کاندھے پر سر رکھا اور بے خبر سو گئیں۔ جیسے ہم جنوبی ایشیا والوں کے کاندھے بنے ہی اس لیے ہیں کہ انگریزوں کے سروں کا بوجھ برداشت کریں اور میں لحاظ کا مارا اس وقت تک بلا حس و حرکت بیٹھا رہا جب تک کہ یارک کے اسٹیشن پر گاڑی نہیں رکی۔ اور جب گاڑی رکی تو ان خاتون نے نہایت بے تعلقی سے گردن اٹھا کر مجھ سے دریافت فرمایا کہ میں اس اسٹیشن پر اترنے والا تو نہیں ہوں؟ اور جب میں نے اثبات میں سر ہلایا تو انھوں نے اپنا سر اقدس دوسری طرف کرتے ہوئے ارشاد فرمایا اچھا خدا حافظ۔ اور میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ انگریز کے سر کے بوجھ سے سبک دوش ہونے میں کتنا سکون ہے۔ نہ معلوم وہ کیسے سر ہوں گے جن کے متعلق غالب نے یہ آرزو کی تھی کہ:

نیند اس کی ہے، دماغ اس کا ہے، راتیں اس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

کاش مرزا انگلینڈ آسکتے اور اپنے شانوں پر حسینانِ افرنگ کی زلفوں کی ارزانی کا تجربہ کر سکتے۔

دوسرا دلچسپ واقعہ یارک میں میری بہن قمر خانم کے گھر کے قیام کے دوران میں ہوا۔

جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ قمر کا مکان ہسپتال کے احاطے میں تھا۔ یارک کا یہ ہسپتال بہت بڑا شفاخانہ ہے۔ اس میں دوسرے امراض کے ساتھ ساتھ ذہنی مریضوں کے بھی وارڈس ہیں۔ یارک پہنچنے کے دوسرے دن میں اپنی عادت کے مطابق صبح سویرے بیدار ہوگیا۔ گھر سے باہر نکل کر خوب گہرے گہرے سانس لیے طبیعت میں جولانی آگئی۔ صبح نہایت خوشگوار اور روح پرور تھی اور سردی بھی قابل برداشت تھی۔ سوچا سڑک پر کچھ دور دوڑ لگانی چاہیے۔ یہ خیال آتے ہی سنسان سڑک پر بھاگنا شروع کر دیا۔ ابھی تقریباً نصف میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ پیچھے سے ایک گاڑی میں تین چار مضبوط گرانڈیل جوان آئے اور مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھا کہ یہ لوگ کچھ دریافت کرنا چاہتے ہوں گے۔ رک کر دریافت کیا کہ کیا بات ہے؟ تو ایک شخص گاڑی سے اتر کر میرے قریب آیا اور پوچھا کہ آپ کہاں بھاگے جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کیوں؟ آپ کو میرے دوڑ لگانے (Jogging) پر کوئی اعتراض ہے؟ اس نے پھر پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ میں نے کہا کہیں نہیں میں تو صرف صبح کی ورزش کر رہا ہوں۔ اس نے نہایت تعجب سے میری شکل دیکھی اور بڑی زور سے اوہ اوہ کہنے لگا۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ بات کیا ہے تم مجھے اس قدر حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہو؟ اس نے ایک بار پھر مجھے سر سے پیر تک غور سے دیکھا اور پوچھا آپ مریض تو نہیں ہیں؟ میں نے کہا نہیں۔ کیا میں تمھیں مریض دکھائی دے رہا ہوں؟ تب اس نے کہا کہ ہم لوگ ہسپتال کے مرد نرس ہیں ہم نے دیکھا کہ ایک شخص دوڑا جا رہا ہے تو سمجھے کہ کوئی ذہنی مریض شفاخانے سے ڈاکٹروں کی آنکھ بچا کر سویرے سویرے بھاگ رہا ہے۔ وہ لوگ تو مجھ سے معافی مانگ کر لوٹ گئے مگر جب میں نے اپنا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ میں شب خوابی کے لباس میں گھر سے باہر آگیا تھا۔ چنانچہ میں بھی اپنے گھر کی طرف لوٹ گیا۔ لیکن جیسے ہی گھر کے قریب پہنچا۔ دو جوان اور طاقتور خواتین نرسوں نے آکر میرے بازو پکڑ لیے اور نہایت حیرت مگر شفقت بھری نظروں سے مجھے دیکھتی ہوئی کہنے لگیں کہ آپ کو اس قدر صبح سویرے اتنی سردی میں بغیر گرم کپڑوں کے اپنے وارڈ سے باہر نہیں آنا چاہیے تھا۔ پھر دریافت کیا کہ آپ کس وارڈ میں ہیں؟ میں نے بادل ناخواستہ ان خواتین کی گرفت سے خود کو چھڑایا اور کہا کہ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں کوئی مریض نہیں ہوں بلکہ ڈاکٹر شہریار کا عزیز ہوں اور حال ہی

میں پاکستان سے آیا ہوں اور اس وقت صبح کی ورزش کر رہا تھا کہ آپ سب لوگ خواہ مخواہ میرے پیچھے پڑ گئے مگر اب میں اپنے گھر جا رہا ہوں۔ غرض کہ جب انھیں بھی یہ معلوم ہوا کہ میں تازہ واردان بساط ہوائے فرنگ میں سے ہوں اور وہاں کے رسوم سے ناواقف ہونے کی وجہ سے شب خوابی کے لباس میں گھر سے باہر گھوم رہا ہوں تو ان کے منھ سے بھی اسی طرح بے طویل میں اوہ اوہ اوہ نکلا۔ انھوں نے میرے بازو تو چھوڑ دیے مگر وہیں کھڑی ہوئی دیکھتی رہیں کہ میں ڈاکٹر شہریار کے مکان میں جاتا ہوں یا نہیں۔ میں جب گھر پہنچا تو دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔ میں نے گھنٹی بجائی۔ سب لوگ چونکہ محو خواب تھے اس لیے ان کو بیدار ہونے میں دیر لگی۔ اتنے میں کچھ اور نرسیں بھی وہاں جمع ہو گئیں اور مجھے اس طرح دیکھنے لگیں جیسے میں کوئی چڑیا خانے کا جانور ہوں یا افریقہ کا بن مانس۔ اللہ اللہ کر کے قمر نے دروازہ کھولا اور مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی ارے آپ ان ہی کپڑوں میں باہر چلے گئے۔ آپ کو گرم لباس پہن کر باہر نکلنا چاہیے تھا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا خدا کے واسطے اب زیادہ نصیحت مت فرماؤ اور ذرا ان خواتین کو دیکھو جنھوں نے مجھے پاگل خانے سے بھاگا ہوا مریض سمجھ کر میری تفریح خاک میں ملا دی۔ قمر نے جب ان نرسوں کو دیکھا تو اس کی سمجھ میں تمام بات آ گئی۔ اس نے ان لڑکیوں کو سمجھا دیا کہ یہ میرے بھائی ہیں اور چونکہ یہاں نووارد ہیں اس لیے ابھی اس بات سے ناواقف ہیں کہ جیسا دیس ویسا بھیس ہونا چاہیے۔ غرض قمر کی تشریح کے بعد وہ خواتین معافی مانگتی ہوئی رخصت ہو گئیں اور میں ڈاکٹر صاحب کے دوستوں میں کئی دن تک تفریح طبع کا باعث بنا رہا۔

انگریز قوم کا کردار:

برصغیر ہندو پاک سے پہلی مرتبہ انگلستان جانے والوں کو ایک بات جو بہت نمایاں طور پر محسوس ہوتی ہے وہ ہے انگریز قوم میں انسانی ہمدردی اور شرافت کا جذبہ۔ برصغیر کے باشندے اپنے دلوں میں انگریزوں کے خلاف جو نفرت کے جذبات لے کر انگلستان جاتے ہیں۔ انگریز قوم ان کو محبت میں تبدیل کر دیتی ہے۔ وہ قوم ہر ذی حیات سے محبت کرتی ہے۔ انسان تو بہت بڑی ہستی ہے انگریز پودوں اور جانوروں سے بھی اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی انسانوں سے ان کا ڈسپلن، ان کی رواداری، دوسروں کا احترام، دوسروں کے حقوق کی

پاسداری کا احساس اگر کہیں معراج کمال پر دیکھنا ہے تو انگریزوں کو دیکھ لیجیے۔ اگر آپ پیدل چل رہے ہوں اور سڑک عبور کرنا چاہتے ہوں تو صرف اسی مقام سے عبور کر سکتے ہیں جہاں زیبرا کراسنگ کے نشان ہیں اگر آپ نے ان نشانات پر قدم رکھ دیا تو تمام گاڑیاں فوراً رک جائیں گی اور اس وقت تک رکی رہیں گی جب تک آپ سڑک عبور نہ کر لیں۔

جگہ جگہ لیڈی کانسٹبلس بچوں اور خواتین کو اپنی نگرانی میں سڑک عبور کراتی ہیں۔

میں جب یارک میں تھا تو ۱۰ اکتوبر ۷۴ء کو وہاں پارلیمنٹ کے انتخابات ہو رہے تھے۔ شہر میں مختلف مقامات پر پولنگ اسٹیشن قائم تھے۔ ڈاکٹر شہریار اور قمر خانم کا پولنگ اسٹیشن ان کے بچوں کے اسکول میں تھا۔ ہم سب لوگ شام کو ساڑھے سات بجے پولنگ بوتھ گئے۔ میں نے دیکھا کہ ایک ایک آدمی آتا ہے اور نہایت سکون اور اطمینان سے اپنی پسند کے امیدوار کے حق میں اپنا ووٹ ڈال کر چلا جاتا ہے۔ جیسے ہی ہم لوگ اسکول کی عمارت میں داخل ہوئے وہاں دو عورتیں اور ایک مرد بیٹھا ہوا ملا۔ انھوں نے قمر اور ڈاکٹر سے ان کا حق رائے دہی کا نمبر دریافت کیا اور متعلقہ نمبر بتلانے پر انھیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔ پھر ہم لوگ ایک کلاس روم میں داخل ہوئے جہاں دو خواتین اور ایک پولیس والا بیٹھا ہوا تھا۔ پولیس والا تو کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول تھا۔ خواتین نے قمر اور ڈاکٹر کو ووٹ کی دو پرچیاں دیں اور یہ دونوں الگ الگ پارٹیشن میں چلے گئے اور اپنا اپنا ووٹ ڈال کر باہر آ گئے۔ یہ تمام کام اس قدر کم وقت میں اور سکون و اطمینان کے ساتھ مکمل ہو گیا کہ یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ انگلستان کی حکومت کے انتخابات ہو رہے ہیں۔ ووٹ ڈالنے کا سلسلہ رات دس بجے تک چلتا رہا۔ اس کے بعد ووٹوں کی گنتی شروع ہوئی اور دوسرے دن دوپہر کو نتیجے کا اعلان کر دیا۔ لیبر پارٹی کو جس کے لیڈر مسٹر ولسن تھے تین ووٹوں کی اکثریت حاصل ہو گئی۔ پارلیمنٹ کے کل اراکین کی تعداد ۶۳۵ ہے اس میں سے ۳۱۹ لیبر پارٹی کے اراکین منتخب ہوئے۔ قدامت پسند پارٹی (Conservative) جس کے لیڈر مسٹر ہیتھ (Heath) تھے۔ ان کے ۲۷۶ ارکان اور لبرل پارٹی جس کے لیڈر مسٹر جیری تھورپ (Jermy Thorp) تھے۔ ان کے ۱۳ ارکان منتخب ہوئے۔ اس طرح مسٹر ولسن حکومت بنانے کے حقدار ہو گئے۔ حالانکہ ان کو صرف تین ووٹوں کی اکثریت حاصل ہوئی مگر تمام جماعتوں نے انتہائی خوش دلی سے ان کے حکومت بنانے کے حق کو تسلیم

کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت صرف ایسے ہی ماحول میں قائم ہو سکتی ہے۔

دل کا دورہ

جہاں انگلستان کے معاشرے میں بہت سی خوبیاں ہیں وہاں نہ معلوم لندن کی آب و ہوا میں کیا خرابی ہے کہ ہم جیسے مشرق کے لوگ وہاں جا کر عام طور پر دل کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں اکیسویں اکتوبر کو یارک سے روانہ ہو کر بذریعہ بس لندن پہنچا۔ بس کے اڈے سے اپنا سوٹ کیس اٹھا کر ٹیوب کے اسٹیشن جا رہا تھا کہ راستے میں سینے میں درد شروع ہوا اور بڑھتے بڑھتے اس قدر شدید ہو گیا کہ چکر آ گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے وہیں بیٹھ گیا۔ قریب ہی سے ایک ٹیکسی لی اور رضوانہ کے گھر ہانسلو پہنچا۔ رضوانہ نے جب میری حالت دیکھی تو اپنی ڈاکٹر مس ڈی سوزا کو فون کیا وہ فوراً ہی آ گئی۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور کہا کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں کہ اس وقت لندن میں ہیں۔ ہم آپ کا مکمل چیک اپ کروانے کے لیے آپ کو ہسپتال بھیج رہے ہیں۔ یہ کہہ کر اس نے ایمبولینس کو فون کیا اور رضوانہ سے کہا کہ ان کو ہارٹ اٹیک ہے مگر گھبراؤ مت ہسپتال والے ان کا اچھی طرح علاج کریں گے۔ تھوڑی ہی دیر میں ایمبولینس آ گئی اور دو آدمیوں نے مجھے خوب اچھی طرح کمبل میں لپیٹ کر کرسی پر بٹھا دیا اور کرسی اٹھا کر گاڑی میں رکھ دی۔ تھوڑی دیر میں ہم لوگ ویسٹ مڈل سکس کے ہسپتال پہنچ گئے اور مجھے ابتدائی معائنے کے بعد انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل کر دیا گیا۔

لندن کا ہسپتال:

ہسپتال میں پہنچتے ہی مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں انتہائی محفوظ ہاتھوں میں آ گیا ہوں۔ جیسے ہی میں وارڈ میں داخل ہوا ایک نوجوان خوبصورت نرس نے میرا استقبال کیا۔ اس نے مسکراتے ہوئے آنکھ مار کر مجھ سے کہا کہ ارے آپ مسکراتے کیوں نہیں ؟ آپ اچھے خاصے صحت مند نوجوان ہیں۔ ایسی مغموم صورت کیوں بنا رکھی ہے۔ جناب زندگی منہ بسورنے کا نام نہیں بلکہ مسکرانے اور خوش رہنے سے عبارت ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھے

ایک بستر پر لٹا دیا۔ میرے کپڑے بدلے اور شب خوابی کا لباس پہنا کر میرا بلڈ پریشر لیا۔ پھر کارڈیو گرام لیا۔ اس کے بعد ایک مرد نرس مسٹر سنگھ آئے۔ انھوں نے میری کلائی اور سینے پر سے بال صاف کر کے نگارش قلب کے آلات کے تار لگا دیے۔ یہ آلات جو ہر مریض کے سرہانے دیوار پر آویزاں ہوتے ہیں، دل کے مریضوں کی حالت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک آلہ فی منٹ دل کی دھڑکنوں کی تعداد بتلاتا ہے تو دوسرا کارڈیو گرام کو ظاہر کرتا ہے اور ان آلات کی مدد سے ڈاکٹر پر مریض کے دل کا حال بغیر کچھ کہے ظاہر ہو جاتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں اس شعبے کا بڑا ڈاکٹر جو کنسلٹنٹ کے عہدہ پر فائز تھا اور جس کا نام ڈاکٹر کو (Cox) تھا آیا اور میرا معائنہ کرنے کے بعد کہنے لگا کہ فکر کی کوئی بات نہیں آپ بہت جلد ٹھیک ہو کر اپنے گھر چلے جائیں گے لیکن میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں کہ اب آپ کو محتاط زندگی بسر کرنا پڑے گی۔ اب آپ اپنی عادتوں اور طرز زندگی کا تنقیدی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ آپ فطرت کے قوانین کی کہاں کہاں خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ کیونکہ فطرت اپنی خلاف ورزی کو معاف نہیں کرتی۔ اگر آپ نیچر کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے میں کامیاب ہو گئے تو آپ آرام سے عمر طبعی کو پہنچ سکتے ہیں۔ اس کے بعد سے میں نے سگریٹ اور پان تو بالکل ترک کر دیے اور دیگر معمولات زندگی کو اس طرح ترتیب دینا شروع کر دیا کہ قوانین فطرت کی کم سے کم خلاف ورزی کا امکان رہے۔

اس ہسپتال میں مریض کے تمام معائنے مفت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوا اور غذا بھی مفت مہیا کی جاتی ہیں۔ کھانے کا انتظام بہت عمدہ ہے۔ ہر مریض کو اس کی بیماری کی نوعیت کے اعتبار سے غذا کی ایک فہرست دی جاتی ہے جس میں سے وہ اپنی پسند کے کھانوں پر نشان لگا دیتا ہے۔ دوسرے دن وہی غذا اس کو فراہم کر دی جاتی ہے۔ میں صبح میں عام طور پر پھلوں کا رس، مچھلی کا قتلہ، ڈبے کے بین (Beans) مکھن توسٹ اور چائے لیا کرتا تھا۔ دس بجے دن میں ایک کیک کا ٹکڑا اور چائے۔ دوپہر میں سوپ مرغ، مچھلی یا بکرے کا گوشت، پالک کا ساگ، ڈبل روٹی کے سلائس اور میٹھا اور میٹھے میں کبھی پڈنگ اور کبھی آئس کریم۔ یہی غذا رات کو کچھ تبدیلی کے ساتھ۔ اس کے علاوہ صبح چھ بجے اس کے بعد دن میں دس بجے پھر شام چار بجے اور رات دس بجے چائے، کافی، اوولٹین یا ہارلکس جو آپ کی پسند ہو، لے سکتے ہیں۔

یہاں عام طور پر حکومت ایک مریض پر ۴۰ سے ۵۰ پونڈ تک یومیہ خرچ کرتی ہے۔ کھانا دوائیں ڈاکٹروں اور نرسوں کی خدمات بالکل مفت ہوتی ہیں۔ میں جب ہسپتال میں تھا تو وہاں کی پارلیمنٹ نے ایسا قانون بنایا تھا کہ جس کے ذریعے سے تمام خانگی وارڈس (Paying Wards) ختم کر دیے گئے تھے اور اب کوئی شخص صرف دولت کی بنا پر ایسے لوگوں پر ترجیح نہیں پا سکتا جن کو مرض کی شدت کی بنا پر فوری توجہ کی ضرورت ہو۔ ورنہ تو عام طور پر لوگ پیسے دے کر ہسپتال میں داخل ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کا مرض اتنا شدید نہیں ہوتا تھا کہ شفا خانے میں داخلے کی ضرورت لاحق ہو اور غریب لوگوں کو اپنی باری کا انتظار کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ ہر مرض کے لیے اس کے ماہر موجود ہیں اور ان کے الگ الگ ہسپتال ہیں۔ مثلاً کینسر، امراض قلب، ہڈیوں اور ریڑھ کی ہڈی کے امراض، متعدی امراض وغیرہ۔ اگر کسی شخص کا مرض اتنا الجھا ہوا ہو کہ عام ہسپتال میں اس کا علاج ممکن نہ ہو سکے تو اس کو اس مرض کے ماہر ڈاکٹر کے ہسپتال میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ مریضوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنے یا ان کے گھر سے لانے لے جانے کے لیے شفاخانے کی گاڑیاں ہوتی ہیں اور اس کے لیے کوئی رقم نہیں لی جاتی اور یہ تمام سہولتیں کسی شخص کو احسان کے طور پر مہیا نہیں کی جاتی ہیں بلکہ یہ اس مملکت میں مقیم ہر انسان کا حق سمجھ کر دی جاتی ہیں۔ میں تو وہاں ایک پردیسی تھا مگر مجھے دو ہفتے ہسپتال میں اس وقت تک رکھا جب تک میں بالکل تندرست نہیں ہو گیا اور رخصت کرتے وقت ایک ماہ کی دوائیں بھی ساتھ کر دی گئیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے میرا پاسپورٹ لے کر ہوم آفس کو یہ لکھ کر بھجوا دیا کہ یہ تین ماہ تک سفر کرنے کے قابل نہیں ہوں گے اس لیے ان کے ویزا کی مدت اس وقت تک بڑھا دی جائے جب تک ہم انھیں سفر کی اجازت نہ دیں۔

بارے نرسوں کا کچھ بیاں ہو جائے:

شفا خانوں کا بیان اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک وہاں مریضوں کی خدمت کرنے والی نرسوں کا بیان نہ ہو جائے۔

ہاں دل درد مند زمزمہ ساز　　کیوں نہ کھولے در خزینۂ راز

خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گل فشاں ہونا

مجھ سے کیا پوچھتے ہو کیا لکھیے
نکتہ ہائے خرد فزا لکھیے

بارے نرسوں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

جی ہاں یہی نرسیں جو درد کی دوا بھی دیں اور درد لا دوا بھی۔ جن کا تبسم بہار اندر بہار۔ جو ہر قدم اپنے نقش پا سے گل تراشتی۔ مٹکتی۔ تھرکتی۔ مچلتی ناچتی، اچھلتی۔ کودتی۔ گاتی مسکراتی۔ ہنستی ہنساتی۔ چھیڑ چھاڑ کرتی۔ کولہے مٹکاتی۔ پنڈلیاں تھرکاتی۔ کمر لچکاتی۔ لہکتی۔ مہکتی۔ بہکتی ہوتی نرسیں۔ کوئی شعلہ جوالہ تو کوئی برق طور۔ کوئی سراپا دشمن ایماں تو کوئی جان آرزو۔ کوئی پری پیکر تو کوئی بنت مریم۔ مگر ہر ایک مسیحا نفس۔ ان میں انگریز لڑکیاں بھی ہیں۔ آسٹریلوی بھی۔ ایرانی بھی ہیں، ہندوستانی بھی۔ افریقی بھی ہیں چینی اور جاپانی بھی۔ ان میں گوروں کی عکمرانی تو رات میں کالوں کی مگر ہر رنگ میں حیات کا سامان لیے ہوئے۔ انہی میں ایک ترک شیرازی بھی تھی اور نام تھا اس کا شہرزاد۔ نہایت شوخ اور چنچل مگر جب وہ جان بہار وارڈ میں داخل ہوتی تو۔

رنگ ہو پھول ہو خوشبو ہو صبا ہو جیسے
موسمِ گل کی طرح کوئی چلا ہو جیسے

بقول مخدوم محی الدین:

وہ کیا آتا کہ گویا دور میں جام شراب آتا
وہ کیا آتا رنگیلی راگنی رنگیں رباب آتا
مجھے رنگینیوں میں رنگنے وہ رنگیں سحاب آتا
لبوں کی مے پلانے جھومتا مست شباب آتا

اسے رنگین مچھلیوں کا بہت شوق تھا۔ وارڈ میں ایک میز پر کانچ کا ایک بڑا سا برتن (Aquarium) لا کر اس نے رکھ دیا تھا جس میں طرح طرح کی رنگین مچھلیاں تھیں۔ وہ نہایت پابندی سے ان کو غذا ڈالتی تھی اور ہر دوسرے تیسرے دن ان کے برتن کی ریت دھو کر دوبارہ برتن میں ڈالتی اور پانی بدلتی تھی اور جب وہ مچھلیاں تیزی سے ادھر ادھر تیرتیں تو وہ بھی تالیاں بجا بجا کر رقص کرتی اور خوش ہوتی تھی۔ وہ ہر وقت کوئی نہ کوئی ایسی

حرکت کرتی کہ سب مریض ہنسنے لگتے۔

غرض انگلستان کے ہسپتالوں کی فضا اس قدر فرحت بخش اور حیات آفریں ہوتی ہے کہ وہاں انسان اپنی بیماری کا غم بالکل بھول جاتا ہے۔

جب مجھے ہسپتال سے رخصت کیا گیا تو نہ صرف ایک ماہ کی دوائیں بھی ساتھ کی گئیں بلکہ میرے مرض کی تمام رپورٹیں بھی ساتھ کردی گئیں تاکہ پاکستان کے ڈاکٹروں کو مزید علاج کرنے میں سہولت ہو۔

گھر آنے کے بعد میں نے جوش صاحب کو اپنی بیماری اور علاج کی تفصیل سے مطلع کیا ان کا خط لندن کے پتے پر وصول ہوا۔ جوش صاحب نے لکھا:

لاہور (پھر اس کے بعد)

اسلام آباد

خورشید صبح کوہسار اس۔ آج کل فردوس لاہور میں شرف قیام حاصل ہے یعنی ہر صبح صبح بنارس اور ہر شام، شام اودھ کو شرما رہی ہے۔

ابھی ابھی "وہاں" سے اپنی سکونت گاہ یعنی سید شوکت حسین صاحب کے مکان پر آیا ہوں۔ آفتاب کے غروب اور میرے طلوع میں پندرہ منٹ باقی ہیں۔ تنہائی کا عالم ہے اور آپ کی یاد ستا رہی ہے۔ کاش اس وقت آپ بھی ہوتے۔ ہائے ایسے میں ان کو ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ہم۔

آپ میرا دل دکھا کر تنہا لندن چلے گئے۔ میری ہائے آپ پر ایسی پڑی کہ دل کا دورہ پڑ گیا۔ آپ نے "بترس از آہ مظلوماں" سنا ہوگا اب آنکھوں سے دیکھ لیا۔ آپ لندن کس غرض سے گئے ہیں اور کب تک پلٹ کر آئیں گے۔ میں تو ایک ایک پل گن رہا ہوں۔

"یوسف گم گشتہ، باز آید بکنعاں غم مخور"

سردی بہت شدید ہے۔ عید کے دوسرے دن یہاں سے چلا جاؤں گا اور پھر وہی تنہائی ہوگی اور میں۔

میں ہی نہیں اور بھی "کوئی" آپ کو یاد کرتا رہتا ہے۔ کس قدر کشش ہے آپ کی ذات میں۔

کراچی میں نئے لی وڈن کا مشاعرہ تھا۔ میں نہیں گیا۔ آپ کے بغیر کراچی میں کچھ بھی باقی نہیں رہا ہے۔ اس لیے وہاں جانے سے کتراتا ہوں۔ آپ کو وہاں نہیں پاؤں گا۔ دل تھام کر رہ جاؤں گا۔ اب تو آپ اچھے ہو چکے، خوب مزے اڑا رہے ہوں گے۔ وہاں کے جملہ مشاغل نوٹ کرتے جائیے اور مجھ کو یہاں آکر سنائیے۔ کاش میں بھی آپ کے دوش بدوش لندن کی گلیوں میں پھرتا اور حسینوں کے غولوں میں گھرتا۔

لیجیے شام ہو گئی، بوتل سامنے رکھ دی گئی اور گلاس چیخنے لگا کہ بابا ہم کو جلدی سے اٹھاؤ اور منہ سے لگاؤ۔

اچھا میرے دور افتادہ حبیب اب تحریر ختم کر رہا ہوں لیکن پتا تو آپ کا ہمراہ نہیں ہے۔ پنڈی جا کر یہ خط روانہ کروں گا۔

آپ کا شیدائی

جوش ملیح آبادی

۲۳۔۱۲۔۷۴ء

پنڈی پہنچ کر لکھ رہا ہوں۔ آج ۳ جنوری ۷۵ء۔ بے دیر سے بیدار ہوا ہوں۔ چھ بجنے میں گیارہ منٹ باقی ہیں۔ چھپا چھپا بیٹھا ہوں۔ پھنکار برس رہی ہے مجھ دیر بیدار پر۔

جلدی لکھیے کب آئیے گا۔ گھڑیاں گن رہا ہوں آپ کی واپسی کی۔

لاہور شریف میں کچھ رباعیاں، دو تین نظمیں کہیں ہیں اور ایک مطلع۔ پہلے مطلع سن لیجیے۔

چاندنی کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے	گو دل اتنی لطافت میں ڈبوتا ہے مجھے

اب رباعی:

اپنے کو جو وہ رہین تمنا کر لے	خون پر جن و ملک کو شید کر لے
میرے دل کے صنم کدے میں اے جوش	وہ بت ہے خدا کو بھی جو اغوا کر لے

دست افکار کا سبو ٹوٹ گیا	پیمانۂ ذوق جستجو ٹوٹ گیا
جب عشق کے فرمان سے آنسو ٹپکے	تو عقل کی آنکھوں کا وضو ٹوٹ گیا

یہ عمر تری اور یہ محبت کا عذاب
آہوں کے دھوئیں میں گم ہے تیرا مکھڑا

بحرِ غم کے ہیں انکھڑیوں میں گرداب
گویا رخِ صبح پر ہے کہرے کی نقاب

افلاک پہ خندہ زن ہے میری تخییل
آتا ہے مری فکر کے در پر اے جوشؔ

مسجودِ ملائک ہے مرا نفسِ جلیل
پرواز کی بھیک مانگنے کو جبریل

انگلینڈ میں جوش صاحب کا یہ آخری خط تھا۔

بہتر علاج اور بہترین دیکھ بھال کی وجہ سے میں تیزی سے روبہ صحت ہو رہا تھا مگر چونکہ تین ماہ تک ڈاکٹروں نے ہوائی جہاز کے سفر کی ممانعت کر دی تھی اس لیے پاکستان واپس نہ جا سکتا تھا۔ میں ۵ دسمبر کو ہسپتال سے فارغ ہو کر گھر آ گیا لندن میں کچھ دن آرام کر کے واپس پارک فرخام کے گھر چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر شہریار کی زیرِ نگرانی علاج پرہیز اور آرام کیا تو بہت جلد صحت مند ہو گیا۔ اس کے بعد تمام انگلینڈ کی سیر کی۔ لیک ڈسٹرکٹ میں ماؤنٹ رڈیل پر ورڈس ورتھ کا مکان دیکھا۔ یہ علاقہ ونڈر میر (Winder Mere) کہلاتا ہے۔ یہ تمام علاقہ بے حد خوبصورت جھیلوں پہاڑوں اور گھنے درختوں پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد شیکسپیر کا مکان بھی دیکھا جو (Stratford upon Avon) میں ہے۔ میں نے ورڈس ورتھ اور شیکسپیر کی کتابیں ان کے گھروں میں واقع کتب خانوں سے خریدیں۔ انگلینڈ کا جغرافیہ بہت خوبصورت ہے اور اس میں رہنے والے لوگ بھی بہت خوبصورت ہیں۔ انگلینڈ میں رہ کر انگریزوں سے محبت ہو جاتی ہے۔ یہاں کے قلعوں، تفریحی مقامات اور عجائب گھروں کے متعلق اگر لکھا جائے تو ہر موضوع پر ایک ضخیم کتاب تصنیف کی جا سکتی مگر اس وقت میں صرف ایک واقعہ کا ذکر کر کے لندن کے سفر کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے مشہور مستشرق پروفیسر رالف رسل سے ملاقات۔

پروفیسر رالف رسل سے ملاقات:

لندن میں ایک روز میں نے سوچا کہ اردو کے پروفیسر رالف رسل سے ملاقات کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے ان کو اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز (School of Oriental Studies) لندن میں

نے ٹیلی فون کر کے ان سے بات کی۔ پہلے تو اپنا تعارف کروایا کہ میں کراچی سے آیا ہوں۔ جوش صاحب کا دوست ہوں اور غالب کا طرفدار بھی اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں کیونکہ آپ بھی غالب کے طرفداروں میں سے ہیں۔ پروفیسر صاحب یہ تعارف سن کر بہت ہنسے اور فرمایا کہ آپ دلچسپ آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ کیا آپ ۱۰ دسمبر کو گیارہ بجے یہاں کمرہ ۳۵۸ میں تشریف لا سکتے ہیں؟ میں نے وعدہ کر لیا اور تاریخ مقررہ پر گیارہ بجنے میں پانچ منٹ کم پر جب میں کمرہ نمبر ۳۵۸ پر پہنچا تو دیکھا کہ اس پر تالا پڑا ہوا ہے اور وہاں کوئی آدمی بھی دکھائی نہیں دیا جس سے کچھ دریافت کر سکتا۔ پہلے تو خیال آیا کہ پروفیسر صاحب بھول گئے ہوں گے کہ انھوں نے مجھے آج کا وقت دیا تھا۔ پھر خیال آیا کہ شاید میں غلط جگہ آ گیا ہوں۔ وہاں کوئی آدمی بھی نظر نہیں آیا کہ اس سے کچھ دریافت کر سکتا۔ اسی ادھیڑبن میں جب ٹھیک گیارہ بجے تو دیکھا کہ سامنے سے پروفیسر صاحب اپنا بریف کیس اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر فرمایا۔ کیا آپ کو آئے بہت دیر ہو گئی؟ میں نے عرض کیا کہ صرف پانچ منٹ ہوئے ہیں۔ فرمایا مگر میں نے تو آپ کو گیارہ بجے کا وقت دیا تھا۔ یہاں آپ کو خواہ مخواہ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ میں نے عرض کیا کہ یہاں میں نووارد ہوں اور راستوں سے ناواقف۔ اس لیے گھر سے جلدی نکل پڑا کہ ڈھونڈنے میں کہیں مجھے دیر نہ ہو جائے مگر آپ نے پتا اس طرح سمجھایا تھا کہ میں بغیر بھٹکے آسانی سے پہنچ گیا۔ دراصل جوش صاحب کے ساتھ رہ کر پابندیٔ وقت کی اسس قدر عادت ہو گئی ہے کہ پانچ منٹ پہلے پہنچنے کو اچھا سمجھتا ہوں بہ نسبت دیر سے پہنچنے کے۔

پروفیسر صاحب نے جب مجھ سے ٹیلی فون پر بات کی تھی تو فرمایا تھا کہ آپ سے ایک گھنٹہ بات ہو جائے گی مگر جب ہم دونوں نے باتیں شروع کیں اور غالب کی فکر پر اس کے اشعار کی روشنی میں، میں نے اپنا خیال ظاہر کرنا شروع کیا تو تین گھنٹے ہو گئے اور وقت کے گزرنے کا احساس تک نہ ہو سکا۔ جب دو بج گئے تو رسل صاحب نے فرمایا کہ آپ نے جس طرح غالب کے کلام کی تشریح کی ہے اس سے مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں چاہتا ہوں کہ غالب پر آپ کا ایک لیکچر اپنی کلاس میں بھی کرواؤں۔ اسس سلسلے میں وقت اور تاریخ سے آپ کو ٹیلی فون کے ذریعے مطلع کروں گا۔

پھر فرمایا کہ کیا آپ نے کبھی غور فرمایا کہ جب قوم میں غالب جیسے نابغہ روزگار انسان پیدا ہوں وہ قوم انگریزوں کی دو سو برس تک غلام کیوں بنی رہی؟ میں نے کہا کہ چونکہ آپ لوگوں ہی کی حکومت کی ہے اس لیے آپ ہی اس موضوع پر زیادہ بہتر روشنی ڈال سکتا ہوں۔

رسل صاحب نے فرمایا۔ میرے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جب کوئی ذہین آدمی پیدا ہوتا ہے تو وہ شعر کہنے لگتا ہے۔ اس کی تمام ذہنی توانائی، اس کے ناخن گرہ کشا کی تمام صلاحیتیں شاعری کے خم کاکل کی آرائش میں صرف ہو جاتی ہیں اور ہمارے ہاں جب کوئی جینیس (Genious) پیدا ہوتا ہے تو وہ ایجادات کرتا ہے اور ہماری قوم ان ایجادات کے ذریعے سے آپ لوگوں کو ہر محاذ پر شکست دے کر اقتدار پر قبضہ کر لیتی ہے۔

اس کے علاوہ ہماری قوم کا ہر فرد اپنے ملک اور قوم کا وفادار ہے۔ ہمارا ہر مقتدر شخص جو کچھ کرتا ہے اپنے ملک کے مفاد کو پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس آپ کے صاحب اقتدار طبقہ کے پیش نظر صرف اسی کا ذاتی مفاد ہوتا ہے۔ آپ کے بڑے بڑے جاگیردار، نواب اور سربراہان حکومت اپنے مفاد کی خاطر قوم کا سودا کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے اور آپ کے شعرا کی اکثریت ان قوم فروشوں کی تعریف میں لمبے لمبے قصیدے لکھ کر ان کی رعونت اور اپنی مادی خوشحالی میں اضافہ کرتی رہتی ہے۔ مگر ہمارا کوئی شخص خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہ ہو سب سے پہلے اپنے ملک اور قوم کے فائدے کے بارے میں سوچتا ہے۔ اس طرح ایجادات کے ذریعہ سے ٹیکنالوجی کی برتری اور قومی مفادات سے وفاداری یہ دو خصوصیتیں انگریز قوم کی ترقی کا راز ہے۔ اس کے برعکس آپ کے ہاں مشاعروں کے گلچرتے آپ کے مفکروں اور عقل مند لوگوں کی ذہنی صلاحیتوں کو شاعری اور واہ واہ کے سحر میں اس طرح گرفتار کر لیا ہے کہ وہاں کوئی موجد پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا اور اس کو ریاستی سرپرستی حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لیے آپ کے ملک میں ٹیکنالوجی ترقی نہیں کر سکتی جو آج کی دنیا میں ترقی کا واحد ذریعہ ہے۔

پروفیسر صاحب اپنی رو میں وہ سب کچھ کہہ گئے جو غالباً آج تک کسی انگریز نے نہیں کہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ شخص کتنی سچی باتیں کر رہا ہے۔ گو اس کی فکر غالب کے مشکل اشعار کی معنوی باریکیوں تک رسائی حاصل نہ کر سکی مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ انسانی ترقی

اور خوشحالی کے باریک رموز سے تو وہ اس درجہ آگاہ ہے کہ آج بھی دنیا اس کی قوم کی طاقت اور برتری کا لوہا ماننے پر مجبور ہے۔

اور جب میں رالف رسل صاحب کے کمرے سے روانہ ہوا تو میری عجیب حالت تھی۔ میں اندیشہ ہائے دور دراز میں ڈوبا ہوا سوچ رہا تھا کہ انگریز قوم کو سمجھنے کے لیے انگلستان کا سفر کرنا کس قدر ضروری ہے۔

اس کے بعد میں جس دن لندن سے کراچی رخصت ہو رہا تھا اس سے ایک دن پہلے رسل صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ اگلے ہفتے وہ میرا لیکچر طالب پر اپنی کلاس میں رکھنا چاہتے ہیں مگر میں نے عرض کیا کہ میں تو دوسرے دن پاکستان واپس جا رہا ہوں اس لیے معذور ہوں۔ ان کو یہ سن کر افسوس تو ہوا مگر کیا کر سکتے تھے۔ کہنے لگے وہاں جوش صاحب کو میرا سلام کہیے گا۔

۱۹۷۵ء کے واقعات

میری پاکستان واپسی:

میں ۲۹ جنوری ۱۹۷۵ء کو کراچی لوٹ آیا۔ آنے کے بعد جوش صاحب سے اسلام آباد فون پر بات کی اور اپنے کراچی لوٹ آنے کی اطلاع کے ساتھ ساتھ رالف رسل صاحب سے ملاقات کا ذکر کر کے ان کو رسل صاحب کا سلام بھی پہنچا دیا۔ سن کر بہت خوش ہوئے فرمایا میں آج کل بہت مصروف ہوں تم اسلام آباد آ جاؤ مگر میں خود یہاں اپنے کاموں میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ کہیں آنا جانا میرے لیے ناممکن تھا۔ اسی طرح کئی مہینے گزر گئے۔ اپریل کے شروع دنوں میں راغب صاحب مرادآبادی نے مجھے بتایا کہ اس ماہ کے وسط میں سکھر میں کل پاکستان مشاعرہ ہونے والا ہے جس میں جوش صاحب بھی شرکت کریں گے۔ میں نے نویں اپریل کو جوش صاحب سے ٹیلی فون پر بات کی وہ لاہور میں ہاشمی صاحب کے گھر مقیم تھے۔ انھوں نے کہا ارے میاں تمھاری صورت دیکھے صدیاں بیت گئی ہیں۔ تم سکھر کے مشاعرے میں جو اس ماہ کی بارھویں کو منعقد ہو رہا ہے، ضرور آ جاؤ اگر نہیں آئے تو مار ڈالوں گا۔ میں نے کہا مشاعرہ سکھر کے ڈپٹی کمشنر یوسف جمال صاحب کروا رہے ہیں اور وہ مجھ سے واقف نہیں ہیں۔ میں بن بلائے اور بغیر تعارف کے کیسے آ جاؤں؟ جوش صاحب نے کہا میں خود یوسف جمال سے کہہ دوں گا وہ اپنا بچہ ہے۔ تم ضرور آنا۔ تم ان سے مل کر بہت خوش ہو گے۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ بارھویں اپریل بروز ہفتہ ۱۹۷۵ء میں سکھر کے لیے روانہ ہوا تو اسی جہاز سے فیض صاحب اور ظفر الحسن صاحب (غالب لائبریری والے) بھی سکھر جا رہے تھے

موہن جو ڈرو کے ہوائی اڈے پر یوسف جمال صاحب نے سب کا استقبال کیا۔ جب میں نے اپنا تعارف کروایا تو فوراً گلے لگا لیا کہنے لگے کل جوش صاحب نے ٹیلی فون پر آپ کا تعارف کروایا اور حکم دیا ہے کہ آپ کے قیام کا انتظام بھی جوش صاحب کے ساتھ کیا جائے۔ اس لیے آپ جوش صاحب کے ساتھ ٹھہریں گے۔ میں سرکٹ ہاؤس پہنچا دیا گیا جہاں فیض صاحب اور جوش صاحب کے ٹھہرنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں جب تک ہم لوگ چائے وغیرہ سے فارغ ہوئے، جوش صاحب بھی بذریعہ ریل گاڑی لاہور سے سکھر آ گئے۔ جوش صاحب مجھ سے بہت محبت سے گلے ملے اور دیر تک لاہور کے قصے سناتے اور مجھ سے انگلینڈ کے واقعات سنتے رہے۔

سکھر میں کل پاکستان مشاعرہ ۱۲۔۲۔۷۵ء:

رات کو مشاعرہ تھا۔ جس کو راغب صاحب مرادآبادی نے کنڈکٹ کیا۔ اس میں پاکستان کے تمام بڑے بڑے شعرا شریک تھے۔ حضرت جوش ملیح آبادی اور جناب فیض احمد فیض تو تھے ہی ان کے علاوہ جناب احمد فراز، حمایت علی شاعر، محسن بھوپالی، سرور بارہ بنکوی، صہبا اختر، سحر انصاری۔ غرض تمام شعرا اور شاعرات نے شرکت کی تھی۔ راغب صاحب ہر ایک کا تعارف فی البدیہہ اشعار سے کروا رہے تھے۔ چلیے آپ کو اس مشاعرے میں لیے چلتے ہیں۔

سب سے پہلے جن صاحب کو زحمت کلام دی گئی وہ تھے غلام غوث غازی صاحب۔ راغب صاحب نے ان کا تعارف اس طرح کروایا۔

دولت ہے یہ شان امتیازی صاحب | فضل ربی ہے سرفرازی صاحب
سنتا ہوں کہ اک شاعر خوش فکر بھی ہیں | اللہ! غلام غوث غازی صاحب

غلام غوث صاحب اپنا کلام سنا چکے تو راغب صاحب نے فراست رضوی صاحب کو بلایا۔

کہتے ہیں بہت خوب فراست رضوی | راغب کو ہیں مرغوب فراست رضوی
اسٹیج پہ آئیں اور سنائیں اشعار | محفل کو ہیں مطلوب فراست رضوی

فراست رضوی نے اس شعر پر اپنی غزل ختم کی۔

کیسے نازک کنائے رکھتی ہیں
ان کی آنکھیں مرے سخن کی طرح

تو راغب صاحب نے زہرہ اشتیاق صاحب کو دعوت کلام دی۔

آئیں اب زہرہ اشتیاق آئیں
ان کے اشعار ہیں چمن کی طرح

ان کے بعد جناب جاذب قریشی کو دعوت کلام دی گئی۔

اک صاحب جوہر ہیں جناب جاذب — صد رشک گل تر ہیں جناب جاذب
راغب نہ ہو کیوں جاذب شوق ان کا کلام — خوش فکر سخنور ہیں جناب جاذب

جاذب صاحب کے بعد دلاور فگار صاحب تشریف لائے تو راغب صاحب نے کہا۔

یہ فرض ادا ہو گا نہ مجھ سے زنہار — مانا کہ ہے احباب کا پیہم اص
ان کے اشعار ہیں کہ تیر و نشتر — راغب کہتے تو ہیں دلاور کو

دلاور فگار صاحب کے بعد منظر ایوبی صاحب کو دعوت دی گئی۔

اشعار میں دل کشی بھی ہے خوبی بھی — پڑھنے میں ہے ایک شان محبوبی
تائید کریں گے اہل محفل میری — جان محفل ہیں منظر ایوبی

منظر بدلا تو سحر انصاری صاحب تشریف لائے۔

سر تا بقدم ہیں معتبر انصاری — میرا ذمہ اگر نہ ہوں انصاری
دنیائے ادب کی تیرگی کے حق میں — خورشید بہ داماں ہیں سحر انصاری

سحر انصاری صاحب کے بعد راغب صاحب نے اعلان کیا۔

اب بزم میں اک نکتہ داں آتے ہیں
استاد احمد سعید خاں آتے ہیں

ان کے بعد جناب محسن بھوپالی تشریف لائے تو راغب صاحب نے فرمایا۔

بھوپال کی ہیں بہار محسن صاحب — ہیں نازش روزگار محسن صاحب
یہ ہیچ مداں بھی قدرداں ہے جن کا — شاعر ہیں وہ باوقار محسن صاحب

محسن صاحب کے بعد محترمہ رابعہ نہاں صاحبہ جلوہ افروز ہوئیں تو راغب صاحب نے استقبال کیا۔

نازاں ہوں کہ ایک نکتہ داں آئی ہے — اک شاعرہ نغز بیاں آئی ہیں
اہل سکھر کو ہو مبارک راغب — اس شہر میں رابعہ نہاں آئی ہیں

ان کے بعد جناب سرور بارہ بنکوی تشریف لائے۔

لیلائے غزل پہ اب شباب آتا ہے — آنکھوں میں سرورے ناب آتا ہے
دنیائے ادب میں جسے کہتے ہیں سرور — وہ خالق سنگ آفتاب آتا ہے

سرور اترا تو صہبا نے زور باندھا۔ راغب صاحب نے کہا۔

کیوں ان کی کسی صنف سے ہو ناچاقی — ہے ان کی سرشت ہی میں خوش اخلاقی
ہر ذرہ کونین ہے ان کا موضوع — صہبا اختر ہیں شاعر آفاقی

صہبا اختر کے بعد جناب حمایت علی شاعر کو یوں دعوت سخن دی گئی۔

فطرت نے کیا ہے انتخاب شاعر — ہو گا نہ غروب آفتاب شاعر
حاصل ہے حمایت علی بھی ان کو — خوش بخت سخن ور ہیں جناب شاعر

جناب حمایت علی شاعر عام طور پر ترنم سے پڑھتے ہیں۔ آواز میں نغمگی کا رچاؤ کلام کا لطف دوبالا کر دیتا ہے مگر اس دفعہ جب انھوں نے اپنا کلام تحت اللفظ سنانا شروع کیا تو سامعین نے شور مچا دیا کہ ترنم سے سنائیے۔ حمایت علی صاحب نے کہا کہ وہ ترنم سے پڑھنا چاہتے تھے مگر آواز ساتھ نہیں دے رہی ہے تو راغب صاحب نے فوراً کہا۔

ہے شوق ترنم سے سنانے کا مجھے
آواز مگر ساتھ نہیں دیتی ہے

حمایت علی شاعر کے بعد جناب احمد فراز تشریف لائے تو راغب صاحب نے کہا۔

سلمائے غزل کا راز آیا لب پر — باصد عجز و نیاز آیا لب پر
اللہ رے اعجاز تغزل راغب — نام احمد فراز آیا لب پر

احمد فراز کی غزل کا مقطع تھا۔



فیض احمد فیض

maablib.org

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فراز
وہ تو قاتل کو بھی الزام مسیحائی دے

سامعین نے دل کھول کر داد دی اور مزید غزل سنانے کی فرمائش کی تو فراز صاحب نے ایک غزل اور سنائی جس کا آخری مصرع تھا۔

روشنی کیسی کہ یادیں بھی مٹا دی جائیں گی

اس کے بعد راغب صاحب نے عباسی صاحب کو دعوت کلام دی۔

رونق محفل ہیں عباسی بھی اپنی بزم میں
اب مزاح و طنز کی شمعیں جلا دی جائیں گی

عباسی صاحب مزاح کی شمعیں جلا چکے تو خود راغب صاحب کی باری آئی۔ راغب صاحب نے ازراہ انکسار فرمایا کہ حضرات اب میری باری ہے مگر میں آپ کی اس قدر سمع خراشی کر چکا ہوں کہ شاید اب آپ مجھے مزید برداشت کرنا پسند نہ فرمائیں مگر لوگوں نے شور مچا دیا اور راغب صاحب کو اپنا کلام سنانا پڑا۔

راغب صاحب کے بعد جب جناب فیض احمد فیض کو دعوت کلام دی گئی تو لوگوں نے اس قدر زور شور سے ان کا استقبال کیا کہ راغب صاحب کی آواز اس شور میں دب کر رہ گئی اور میں ان کے استقبالی اشعار نہ سن سکا۔ فیض صاحب اس وقت اردو ادب کے نہایت پختہ مغز اور عوام کے محبوب ترین شاعر ہیں۔ یہ ترقی پسند فکر کی آبرو، محبت اور انسانیت کا پیکر۔ تمام دنیا کے مظلوم انسان ان کے خاندان کے افراد ہیں اور ظلم، بے انصافی خواہ کسی جانب سے ہو فیض صاحب تیغ بکف درپے جاں ہو جاتے ہیں۔

فیض میں میر کی زبان اور غالب کی فکر ایک جگہ جمع ہو گئی ہے۔ آج فیض صاحب نے کئی تازہ غزلیں سنائیں۔ آپ بھی سنیے۔

فیض صاحب نے کہا۔ پہلے دو شعر سن لیجیے۔

ہزار درد شب آرزو کی راہ میں ہیں — کوئی ٹھکانا بتاؤ کہ قافلہ اترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوق دید مٹے — شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اترے

ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے اس میں مطلع نہیں ہے۔ فیض صاحب کے پڑھنے

کا ایک خاص انداز ہے۔ آہستہ آہستہ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ کو ہلکے سے جھٹکے سے ادا کرتے ہوئے پڑھتے ہیں۔ شروع شروع میں یہ انداز زیادہ متاثر نہیں کرتا مگر جب سنتے سنتے کان عادی ہو جائیں اور اس پیار بھرے لہجے میں فیض صاحب کی شخصیت کی حلاوت گھلنے لگے تو پھر فیض صاحب کے اسٹائل کا سحر پوری طرح سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ فیض صاحب نے اپنے خاص اسٹائل میں غزل شروع کی۔

نہ اب رقیب نہ ناصح نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا

پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیاز مندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا

ستم پہ خوش، کبھی لطف و کرم سے رنجیدہ
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا

فیض صاحب غزل سنا رہے تھے اور سامعین نے داد کے شور سے تمام پنڈال سر پر اٹھا رکھا تھا۔ غزل ختم کر کے جب وہ رخصت ہونے لگے تو لوگوں نے اور کلام سنانے کی فرمائش کی تو راغب صاحب نے ان کی تائید میں فرمایا۔

غزل ایک اور سنائی جو آپ نے نہ یہاں
یہ سامعین ہیں دیں گے دہائیاں کیا کیا

فیض صاحب نے لوگوں کی فرمائش پر بنگلہ دیش کی علیحدگی پر کہی ہوئی غزل سنائی۔ اس کا عنوان ہے:

"ڈھاکے سے واپسی پر"

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی ملاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختم دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دل تو چاہا پر شکست دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد

ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

اس کے بعد سامعین کے اصرار پر راغب صاحب نے ایک اور غزل سنانے کی فرمائش کی۔

اک غزل ہم اور سن لیں گے جناب فیض سے
آرزو ہو جائے گی پوری مناجاتوں کے بعد

فیض صاحب نے ایک نظم شروع کی۔

"ہم تو مجبور تھے اس دل سے"

ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس میں ہر دم
گردشِ خوں سے وہ کہرام بپا رہتا ہے
جس طرح رندِ بلانوش جو مل بیٹھیں بہم[1]
میکدے میں سفرِ جام بپا رہتا ہے
سوزِ خاطر کو ملا جب بھی سہارا کوئی
داغِ حرمان کوئی دردِ تمنا کوئی
مرہمِ یاس سے مائل بہ شفا ہونے لگا
زخمِ امید کوئی پھر سے ہرا ہونے لگا
ہم تو مجبور تھے اس دل سے کہ جس کی ضد پر
ہم نے اس رات کے ماتھے پہ سحر کی تحریر
جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
ہم نے اس دشت کو ٹھہرا لیا فردوس نظیر
جس میں جز صنعتِ خونِ سر و پا کچھ بھی نہ تھا[2]
دل کو تعبیر کوئی اور گوارا ہی نہ تھی
کلفتِ زیست تو منظور تھی ہر طور مگر
راحتِ مرگ کسی طور گوارا ہی نہ تھی

اس نظم کے بعد جب فیض صاحب رخصت ہونے لگے تو لوگوں نے "ایک اور ۔۔ ایک اور" کا شور مچا دیا تو فیض صاحب کو مجبوراً ایک اور غزل سنانا پڑی۔ اس کا عنوان ہے۔

---

[1] نسخہ ہائے وفا میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ "جیسے رندان بلانوش جو مل بیٹھیں بہم"
[2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فیض صاحب پاکستان کے مستقبل کے متعلق پیشین گوئی کر رہے ہیں۔

"غبار خاطر محفل ٹھہر جائے"

کہیں تو کاروان درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آ لگے عمر رواں یا دل ٹھہر جائے
اماں کیسی کہ موج خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے[1]
کوئی دم بادبان کشتی صہبا کو تہہ رکھو
ذرا ٹھہرو غبار خاطر محفل ٹھہر جائے[2]
خم ساقی میں جز زہر ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے
ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ وہ طوفاں ہے جو پل بھر لب ساحل ٹھہر جائے[3]
نگاہ منتظر کب تک کرے گی آئینہ بندی
کہیں تو دشت غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

سامعین کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا مگر رات بھی زیادہ ہو چکی تھی۔ آخر فیض صاحب نے یہ کہہ کر کہ اب ہم جوش صاحب کو سنیں گے۔ سامعین سے اجازت لی اور اپنی نشست پر تشریف لے آئے اور راغب صاحب نے حضرت جوش ملیح آبادی کا استقبال ان اشعار سے کیا۔

افساؤ کائنات کہتے ہیں جوش — انسان کے دل کی بات کہتے ہیں جوش
فطرت ہمہ تن گوش نظر آتی ہے — جس وقت رباعیات کہتے ہیں جوش

---

1. ہے قلزم خوں سامنے اسے کاش یہی ہو
آتا ہے ابھی دیکھیے کیا کیا مرے آگے (غالب)

2. ذرا آہستہ لے چل کاروان کیف و مستی کو
کہ سطح ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی (جوش)

3. کتاب میں یہ مصرع اس طرح ہے۔ "یہ طوفاں ہے جو پل بھر لب ساحل ٹھہر جائے"

جوش صاحب جب مائیک پر تشریف لائے تو بڑے اچھے موڈ میں تھے۔ آواز میں جوش و جوانی کی گھن گرج نعرہ مستانہ لگا رہی تھی کہ "انبوہِ مہ و سال کی ایسی تیسی"۔

آتے ہی فرمایا۔ جناب ایک فارسی شعر یاد آ رہا ہے۔

یک نعرۂ مستانہ ز جائے نہ شنیدم
ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ نہ دارد

پھر فرمایا۔ کہیں سے ایک نعرہ مستانہ نہیں آ رہا ہے سامعین میں سے۔ وہ شہر ویران ہو جائے گا جہاں مے خانہ نہیں ہے۔

ویراں شود آں شہر کہ مے خانہ نہ دارد

لوگوں نے شور سے پنڈال سر پہ اٹھا لیا۔ اسی شور میں جوش صاحب کی آواز پھر ابھری۔

نے ذوقِ نگاہیست نہ ہنگامۂ عشقے
اے وائے بہ شہرے کہ دراں فتنہ گرے نیست

اس پر سرور بارہ بنکوی بولے۔ جوش صاحب اب فارسی ہی سنائیے حضور!

جب سامعین کا شور کچھ کم ہوا تو جوش صاحب نے رباعیات سنانا شروع کیں۔

اس وقت سبک بات نہیں ہو سکتی — توہینِ خرابات نہیں ہو سکتی
مجرے کے لیے آئے ہیں جبریل امیں — کہہ دو کہ ملاقات نہیں ہو سکتی

اب بزمِ نگاراں ہے مجھے نارِ جحیم — لے کے آئی یہاں تک اے عمرِ لئیم
یہ بھی کہنا پڑا کہ جیتے توشش باشش — یہ بھی سننا پڑا کہ بابا تسلیم

مرضی ہو تو سولی پہ چڑھانا یارب — سو بار جہنم میں جلانا یارب
مشفق کہیں آپ ہمارے ہیں بزرگ — ناچیز کو یہ دن نہ دکھانا یارب

ہم دونوں ہیں فقیہہ دیوانے سے — مطلب ہے قلندروں کے جل جانے سے
ہر شام و سحر کرتے ہیں عیاشی ہم — تو صرف وضو سے اور میں پیمانے سے



حضرت جوشؔ ملیح آبادی کلام سُنا رہے ہیں

maablib.org

لوگوں نے اس قدر زور شور سے داد دی کہ پنڈال سر پر اٹھا لیا۔ جوش صاحب نے فرمایا۔

ہم پر بھی حسینوں کا کرم تھا اک روز
اس قوم میں اپنا بھی بھرم تھا اک روز
بیزار نگاہوں کی گزرگاہ ہے اب
یہ چہرہ جو آنکھوں کا حرم تھا اک روز

دنیا کا عجب طور نظر آتا ہے
بدلا ہوا ہر دور نظر آتا ہے
حیرت ہے کہ جب آئینہ میں دیکھتا ہوں
بوڑھا سا کوئی اور نظر آتا ہے

پیری سے ہمیشہ کی لڑائی ہم نے
ہر آن جوانی ہی منائی ہم نے
ہم سا بھی کوئی دزد مہ و سال نہیں
عمر اپنی ہمیشہ کم بتائی ہم نے

اے دوست دل میں گرد کدورت نہ چاہیے
اچھے تو کیا بروں سے بھی نفرت نہ چاہیے
کہتا ہے کون پھول سے رغبت نہ چاہیے
کانٹوں سے بھی مگر تجھے وحشت نہ چاہیے

کانٹے کی رگ میں بھی ہے لہو سبزہ زار کا
پالا ہوا ہے وہ بھی نسیم بہار کا

اف عرق شراب ناب راتیں نہ کرو
جو پٹ نہیں پڑتی ہیں وہ گھاتیں نہ کرو
یہ سانس کی خوشبو ہے کہ برچھی کی انی
اف اتنے قریب آکے باتیں نہ کرو

اس کے بعد جوش صاحب کہہ رہے تھے کہ اب رات بہت ہو چکی ہے مگر سامعین میں سے کسی نے کہا وہ رباعی سنائے "کل رات گئے عین طرب کے ہنگام" جوش صاحب نے بات کاٹتے ہوئے فرمایا۔ نہیں صاحب اب تو۔

سو بات کی ہے یہ بات آؤ سو جائیں
بدمست ہے خود حیات آؤ سو جائیں
شبنم سے ہے چاندنی کا دامن نمناک
اب بھیگ چکی ہے رات آؤ سو جائیں

مگر لوگوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا کہ نظم سنایئے تو جوش صاحب نے مجبور ہو کر سنانا شروع کیا۔ ایک مطلع سن لیجیے۔

گاہ دل اتنی لطافت میں ڈبوتا ہے مجھے
چاندنی کا وزن بھی محسوس ہوتا ہے مجھے

سحر انصاری صاحب نے کہا۔ محسوس ہوا نظام شمسی کا دباؤ "۔ جوش صاحب نے تائید کی۔ جی ہاں، جی ہاں یہی بات ہے۔

لوگوں نے شور مچایا گل بدنی سنایئے۔ راغب صاحب نے مجھ سے کہا۔ خورشید صاحب بیاض میں سے گل بدنی نکال کر دیجیے"۔

سرور صاحب نے کہا۔ کیا گل بدنی ہے ؟؟ اگر وہ ہے تو سبحان اللہ واللہ مزا آجائے گا۔

جوش صاحب اس بات پر مصر تھے کہ۔ اب بھیگ چلی ہے رات آؤ سو جائیں۔ مگر لوگوں کا اصرار بڑھتا جا رہا تھا۔ آخر جوش صاحب کو مجبوراً ایک نظم سنانا پڑی۔

"یادش بخیر ہم بھی اک روز مہ چکاں تھے"

یادش بخیر ہم بھی اک روز مہ چکاں تھے — نوخیز و نو ادا تھے نو تیر و نو کماں تھے
آنکھیں فسانہ گو تھیں انداز نغمہ خواں تھے — کشمیر کی کہانی کنعاں کی داستاں تھے

گیرو تھے گل نفس تھے گل رخ تھے گل فشاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

آنگن میں ناچتے تھے برسات کے مہینے — آغوش میں صنم تھے ترشے ہوئے نگینے
ہاتھوں میں تھے دوپٹے زیر و زبر تھے سینے — تن ڈولتے تھے جیسے گرداب میں سفینے

وہ بھی رواں دواں تھے ہم بھی رواں دواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

ہر سانس تھی ہماری اک کشتیٔ دخانی دکی ہوئی ترنگیں بہکی ہوئی روانی
کھلا ہوا تکلّف کھلتی ہوئی کہانی اڑتی ہوئی حکایت مڑتی ہوئی کہانی
بھڑکی ہوئی دھنک تھے کڑکی ہوئی کماں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

آپانے گل رخاں میں بھرتے تھے روپ کیا کیا بابا کا دل لبھانے جاتے تھے روز گرجا
پنڈت کو رام کرنے پہنچے تھے شب کو ملا مسلم کی انجمن میں پڑھتے تھے نور نامہ
مومن کے دائرے میں پکے حدیث خواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

محلوں میں کودتے تھے راتوں کو جب یکایک ہوتی تھی ڈر سے چھاتی شہزادیوں کی دھک دھک
مکھڑوں کی لو جگاتیں جھٹ سے بجھا کے دیپک ہم صبح کو یہ باتیں لاتے نہ تھے زباں تک
اس درجہ پاسبانِ ناموسِ گل رخاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

کرتا تھا عقدِ ثالث جس وقت کوئی کھوسٹ ہم اس کی دوستی کا پیتے تھے جام غٹ غٹ
ہوتا تھا جب دولہن سے دولہا میاں کا جھنجھٹ راہِ مصالحت پر ہم دوڑتے تھے جھٹ پٹ
اپنے پہ بھی کرم تھا اس پر بھی مہرباں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

کہ دور آ گیا تھا ایسا بھی زندگی میں رہنا پڑا تھا ہم کو ملاؤں کی گلی میں
مکھڑوں کی جھلکیاں تھیں مکھڑوں کی چاندنی میں سمٹے ہوئے تھے سرگرم گلگشت تھی گنگری میں
کانٹوں میں آشیاں تھا پھولوں کے درمیاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

ملتی تھیں جب نگاہیں ترکانِ شعلہ تن سے اٹھتی تھیں ولولوں کی آنچیں اسے بدن سے
اور کم سنوں کی پایل جب بولتی تھی چھن سے محرابِ زندگی میں چلتی تھی توپ دن سے
وہ دولت قمر تھے ہم دامن کشاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

گردن میں ڈالتے تھے باہیں جو ماہ پیکر
سینوں میں گونجتی تھی مستی کی آگ بھر بھر
اور رات بھیگتے ہی جب نشے میں وہ دل بر
تکیوں پہ اینٹھتے تھے تکیے گرا گرا کر
ہم بھی دھواں دھواں تھے وہ بھی دھواں دھواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

ایوان تھا ہمارا متوالیوں سے جھل جھل
آنا کسی کا جھومر ترچھی کسی کی ہیکل
انگڑائیوں کا میلہ گدرائیوں کا دنگل
آنکھیں بیاہیوں کی رقصاں لٹوں کی پلپل
پنڈے کنواریوں کے دربستہ کہکشاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

ملبوث ہم پہ یادہ ہر شوخ نازنیں تھی
کندن کے خال و خط تھے یاقوت کی جبیں تھی
آنکھوں میں بت کدے تھے لہجے میں بھیرویں تھی
ہم میں وہ کون ایسی انوٹ ہے جو نہیں تھی
تل تھے پنکھڑی تھے سوسن تھے ارغواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

بندی عبیر ابٹن کاجل گلال افشاں
سلما ستارہ پکا مہندی اگر چراغاں
چھاگل چھناکہ چھم چھم رم جھم رباب ریحاں
شب ہائے بادہ یاراں لب ہائے بوسہ خواہاں
یہ طرفہ کارواں تھا ہم میر کارواں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

راتیں گزارتے تھے ہم جوش گھر سے باہر
رہتے تھے مہ وشوں کے انفاس سے معطر
اور گھر میں جب پہنچتے تھے ہوتے سراسر
تو پوچھتی تھیں بیگم یہ صبح کو بگڑ کر
کیوں جی قسم تو کھاؤ کل رات کو کہاں تھے
یہ داستاں ہے جب کی جس وقت ہم جواں تھے

اور اس طرح جب جوش صاحب تمام رات بزم گل رخاں میں گزارنے کے بعد صبح کو بیگم کے احتساب سے سہم کر ہر شریف آدمی کی طرح جھوٹی قسمیں کھا رہے تھے تو مشاعرے کے پنڈال کے قریب کی مسجد سے موذن کی فجر کی اذان گونج رہی تھی۔ "الصلوٰۃ خیر من النوم" تو

جوش صاحب نے بے ساختہ کہا۔

موذن مرحبا! بروقت بولا۔ تری آواز مکے اور مدینے۔

یوسف جمال صاحب نے تمام شعرا اور سامعین کا شکریہ ادا کیا اور اس طرح یہ محفل شعر و سخن اپنے اختتام کو پہنچی۔

دوسرے دن سندھی شعرا کا مشاعرہ ہوا جس کی پیر حسام الدین صاحب راشدی نے صدارت کی۔ شیخ ایاز اور دوسرے شعرا نے شرکت کی۔ میں اور جوشس صاحب شریک نہ ہوسکے۔

چودھویں اپریل کو یوسف جمال صاحب نے اپنی قیام گاہ پر سندھی شعرا کو ناشتے پر مدعو کیا تھا۔ میں اور جوشس صاحب بھی گئے مگر جیسے ہی مکان کے صدر دروازے پر یہ تحریر دیکھی "رہائش گاہ ڈپٹی کمشنر سکھر" تو جوش صاحب نے کہا کہ جو شخص اس قدر غلط مکان میں رہتا ہے میں اس کی کسی دعوت میں شریک نہیں ہو سکتا۔ لہذا یہاں سے بھاگ چلو۔ میں نے عرض کیا کہ جوش صاحب اس طرح پسپائی آپ کے شایان شان نہیں ہے۔ آپ ضرور اس پارٹی میں شرکت فرمایئے اور یوسف جمال صاحب کی توجہ اس اصطلاح کی غلطی کی طرف مبذول کروایئے تاکہ غلطی کی اصلاح ہو۔ اس طرح تو یہ غلطی جوں کی توں برقرار رہے گی تو جوش صاحب شرکت پر راضی ہوگئے اور یوسف جمال صاحب سے مل کر پہلی بات یہی کی کہ "جناب آپ کے مکان پر "رہائش گاہ" جیسی غلط اصطلاح لکھی ہوئی ہے اور آپ ابھی تک اس غلطی کو برداشت کیے ہوئے ہیں؟ یوسف جمال صاحب نے نہایت محبت اور انکسار سے جوشس صاحب کو یقین دلایا کہ وہ اولین فرصت میں اس غلطی کی اصلاح کریں گے۔ اس کے بعد جوش صاحب کو ناشتے کی میز پر لے جایا گیا جہاں تلی ہوئی مچھلی، پوریاں، دہی، آلو کا بھرتا اور پھلوں سے مہمانوں کی خاطر کی گئی تھی۔

ناشتہ ختم ہوا تو مہمان رخصت ہونے لگے۔ شیخ ایاز پیر حسام الدین صاحب سے مل کر رخصت ہوگئے۔ انھوں نے جوش صاحب سے نہ تعارف حاصل کیا نہ انھیں خدا حافظ کہا اور چلے گئے۔ سب نے یہ بات محسوس کی کہ "اس قدر دشمن ارباب وفا ہو جانا"۔ جب سب لوگ چلے گئے تو میں، جوشس صاحب، سرور بارہ بنکوی، راغب صاحب اور چند احباب

یوسف جمال صاحب کے گھر ٹھہر گئے اور ان کی نہایت دلچسپ باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ جناب یوسف جمال فیض صاحب کے انداز میں ان کا کلام اس طرح سناتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے خود فیض صاحب اپنا کلام سنا رہے ہیں۔ ابھی یہ دلچسپ محفل جاری تھی کہ یوسف جمال صاحب کے پی اے نے آ کر بتایا کہ کچھ حضرات کی سیٹیں دو بجے کی فلائٹ سے کراچی کے لیے مختص ہو چکی ہیں جس میں میرا اور جوش صاحب کے علاوہ پیر حسام الدین صاحب کا بھی نام تھا۔ چنانچہ ہم لوگ بادل ناخواستہ وہاں سے رخصت ہو کر گیسٹ ہاؤس آئے اور اپنا سامان لے کر ایرپورٹ روانہ ہو گئے۔

کراچی واپسی:

یوسف جمال صاحب نے ہم لوگوں کو ہوائی جہاز پر سوار کروایا اور اس طرح ۱۳ اپریل ۷۵ء کو ہم لوگ کراچی واپس آ گئے۔ کراچی میں ایرپورٹ پر میرا بیٹا گاڑی لے کر آ گیا تھا۔ ہم لوگوں نے پہلے جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچایا اور پھر میں اپنے گھر آ گیا۔

دوسرے دن شام کو جوش صاحب کے گھر تمام دوست جمع ہوئے۔ ڈاکٹر عالیہ امام، سلامت علی خان اور راغب صاحب بھی تھے۔ جوش صاحب نے کچھ رباعیات سنائیں جو لاہور کے قیام کے دوران میں ہوئی تھیں۔

اے شام فراق اے بلائے خوں خوار
شاہد رہنا کہ میں ہوں یوں زار و نزار
اس وقت ہے چاندنی بھی اتنی بھاری
گویا لادے ہوئے ہوں اربوں کہسار

آغوش میں دور شک سمن ہے اے جوش
اور ہونک رہا ہے در پہ دستک کا خروش
ڈر کر وہ چھڑا رہی ہے خود کو مجھ سے
یہ ساعت جنت ہے جہنم بردوش

اک بوند ہوں دریا سے بگڑ جاتا ہوں
بیمار ہوں عیسیٰ سے بگڑ جاتا ہوں
اے نازکی طبع ترا خانہ خراب
اس جان تمنا سے بگڑ جاتا ہوں

اک طائر بے پر کی صدا آتی ہے   اک دشمن اختر کی صدا آتی ہے
دھلکاتی ہے جب اجل تو میرے دل سے   بر چشم قلندر کی صدا آتی ہے

انگشت بہ دنداں ہے مری عمر دراز   انجام کے چہرے پہ ہے رنگ آغاز
رگ رگ میں گرجتا ہے جوانی کا خروش   رم جھم رم جھم کی آرہی ہے آواز

جب یہ محفل ختم ہوئی تو جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ کل صبح نو بجے تک آجائیے، بابا صاحب کے گھر چلیں گے۔ ڈاکٹر عالیہ امام نے بھی کہا کہ ہم بھی ساتھ چلیں گے۔

بابا صاحب کی باتیں۔ لاالٰہ الا اللہ :

دوسرے دن سولھویں اپریل ۷۰ء، بروز بدھ میں صبح ساڑھے آٹھ بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب ناشتہ کر چکے تھے۔ میرے جانے کے بعد شیروانی پہنی، ڈبیہ بٹوا لیا کہ اتنے میں عالیہ امام بھی آ گئیں اور ہم تینوں بابا صاحب کے مکان واقع بنارس کالونی مینسری روڈ پہنچے۔ بابا صاحب نے نہایت محبت اور مسرت سے ہمارا استقبال کیا۔ جوش صاحب کو اپنے قریب صوفے پر بٹھا لیا۔ پہلے مٹھائی پیش کی گئی۔ پھر پھلوں کی باری آئی۔ اس کے بعد چائے نوش کی گئی۔ آج ہم لوگ تمام دن بابا صاحب کی فیاضی اور نہایت دلچسپ عالمانہ گفتگو سے مستفید ہوتے رہے۔ جب ہم چائے پی رہے تھے تو بابا صاحب نے فرمایا۔ یہ تمام کائنات حادث ہے اور قوانین الٰہی کے تابع۔ اس کا ایک ذرہ بھی احکام الٰہی کے خلاف حرکت نہیں کر سکتا۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے خلافت الٰہی کے منصب پر فائز فرما کر یہ تمام کائنات اس کے لیے مسخر فرما دی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دے دیا کہ دیکھو، اللہ کے علاوہ کسی اور کے حکم کے آگے مت جھکنا"۔ "لا الٰہ الا اللہ" اللہ کے علاوہ کسی کو اپنا معبود مت تسلیم کرنا۔ اس لیے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو تم اس منصب جلیلہ سے گر جاؤ گے جس پر تمھیں اللہ تعالیٰ نے فائز فرمایا ہے۔ اس لیے اب تم اس کائنات کے خزانوں سے استفادہ کرتے رہو اور یہ تم صرف ان قوانین کی دریافت اور ان پر عمل کر کے ہی کر سکتے ہو جن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے اس

کائنات کو تخلیق کیا ہے۔

جوش صاحب نے کہا۔ بابا صاحب آج تو آپ میری فکر کی نمائندگی فرما رہے ہیں۔ میں بھی تو یہی کہتا ہوں کہ انسان کی فلاح صرف اس میں ہے کہ وہ قوانین الٰہی دریافت کرتا رہے اور ان ہی کے مطابق اپنی زندگی بسر کرے۔

بابا صاحب نے کہا۔ جی ہاں اسی لیے تو آپ ہم کو محبوب ہیں اور اب یہ حکم ہے کہ آپ کو قیامت کے دن کوئی ہاتھ نہ لگائے نہ اللہ نہ پیغمبر نہ کوئی فرشتہ۔ آپ اپنی تمام خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ محبوب ہیں۔

میں نے کہا جوش صاحب مبارک ہو اب تک تو آپ صرف ذہین آدمی تھے اب سے "محبوب ذہین" بھی ہو گئے۔

اس طرح یہ محفل جو گمبھیر ہوتی جا رہی تھی کچھ ہلکی پھلکی گفتگو کی طرف مڑی۔

جوش صاحب نے کہا ان ہی باتوں سے تو میں بابا صاحب کا عاشق ہوں۔

اب گفتگو کا رخ جو ہنسی مذاق کی طرف مڑا تو جوش صاحب نے لطیفے سنانے شروع کیے۔ ایک دن وہ اپنے ایک دوست کے گھر گئے جن کو وہ نواب صاحب کہا کرتے تھے ان کے والد ایک عبادت گزار بزرگ تھے۔ جس کمرے میں جوش صاحب کو بٹھایا گیا تھا اس کے ساتھ والے کمرے سے کچھ غٹرغوں غٹرغوں کی سی آوازیں آ رہی تھیں۔ جوش صاحب نے اپنے دوست سے پوچھا نواب صاحب کیا آپ نے ساتھ والے کمرے میں کبوتر پال رکھے ہیں۔

نواب صاحب نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا جی نہیں والد صاحب وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ جوش صاحب نے اس لطیفے کو ایک رباعی میں بھی بیان کر دیا۔

حضرت یہ گلشن ہے کیوں خلاف معمول
رفتار نسیم کیوں ہے اتنی مجہول
پیہم یہ غٹرغوں کی ہے کیسی آواز ؟
اوراد میں ہیں والد ماجد مشغول

بابا صاحب نے ایک لطیفہ سنایا۔ ایک صاحب میرے پاس بیٹھے تھے۔ گفتگو کے دوران کہنے لگے کہ بابا صاحب میرے پاس دو سو سال پرانا اچار ہے۔ میں نے تعجب سے کہا اتنا پرانا

اچار درست حالت میں کیسے رہ سکتا ہے؟ ذرا ہم کو بھی چکھاؤ دیکھیں تو کہ اس کا مزہ کیسا ہے؟
وہ صاحب فرمانے لگے کہ بابا صاحب اگر اسی طرح میرے بزرگ چکھاتے رہتے تو اب تک وہ
اچار باقی کیسے رہ سکتا تھا۔

بابا تاج الدین ناگپور والے:

بابا صاحب نے ایک دلچسپ واقعہ ناگپور کے بابا تاج الدین صاحب کا سنایا کہ ایک
مریدان کے پاس اپنے بیٹے کو لے کر آیا اور عرض کی کہ حضور اس لڑکے نے کچھ پڑھ لکھ لیا ہے۔
آپ راجہ صاحب سے سفارش فرما کر اس کو کوئی اچھی سی ملازمت دلوا دیجیے۔ بابا صاحب نے
اس لڑکے کو مخاطب کر کے فرمایا۔ تم لکھے پڑھے ہو"؟

لڑکا۔ جی ہاں

بابا صاحب۔ کہاں تک؟

لڑکا۔ بی اے کر چکا ہوں۔

بابا صاحب۔ اچھا تو یہ بتاؤ اپنی پیشانی کی تحریر پڑھ سکتے ہو؟ اگر تم نوشتہ تقدیر پڑھ سکتے ہو تو میں
سمجھوں گا کہ پڑھنا جانتے ہو مگر یہ کوئی قابل تعریف بات نہیں لیکن اگر تم وہاں خود کچھ لکھ سکو تو
میں سمجھوں گا کہ لکھنا بھی جانتے ہو۔ اور یہی انسان کا کمال ہے۔ غرض اس طرح دلچسپ گفتگو
ہوتی رہی کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔

جوش صاحب دوپہر میں کھانا نہیں کھاتے۔ اس لیے وہ ایک کمرے میں جا کر سو گئے۔
میں نے اور عالیہ امام نے بابا صاحب کے ساتھ نہایت لذیذ کباب، بریانی، پراٹھے، قورما اور
کئی اقسام کے سالن، اچار چٹنی اس کے بعد میٹھا کھایا۔ اور اس کے بعد بابا صاحب کی دلچسپ
باتیں سنتے رہے۔ جوش صاحب تین بجے بیدار ہوتے۔ غسل ثانی فرمایا اور عالیہ کی فرمائش پر
بابا صاحب نے قوال کو حکم دیا کہ وہ بابا صاحب کا کلام سنائیں۔

قافیے کی غلطی:

اب محفل موسیقی سجائی گئی۔۔ پھر کو اور بہت سے احباب اور بابا صاحب کے

معتقدین بھی تشریف لے آئے۔ قوال نے ہارمونیم اور طبلہ لا کر رکھا۔ ہارمونیم خود سنبھالا اور ایک نوجوان طبلچی کو آواز دے کر بلالیا۔ پہلے چند غزلیں سنائیں۔ پھر ایک منقبت شروع کی۔ قوال کی آواز نہایت دلکش تھی۔ منقبت کے الفاظ بھی بے حد متاثر کرنے والے تھے۔ ہر شخص ہمہ تن گوش تھا اور بعض لوگ عالم وجد میں جھوم رہے تھے۔ جوش صاحب بھی دلچسپی سے سن رہے تھے کہ اتنے میں قوال نے ٹیپ کا بند سنایا۔

زبان کے ساتھ دل بولا علی مولا علی مولا

ایک دم جوش صاحب ایسے چونکے جیسے بجلی کا کرنٹ چھو گیا ہو اور زور زور سے کہنا شروع کر دیا " بابا صاحب "بولا" کا قافیہ "مولا" نہیں ہوتا"۔ جیسے ہی جوش صاحب کی آواز گونجی ہر شخص استغراق کے عالم سے چونکا۔ جوش صاحب کہہ رہے تھے " کلام اچھا ہے مگر قافیہ غلط ہے"۔ یہ سن کر بابا صاحب کچھ متاثر ہوئے۔ مگر فوراً ہی فرمایا۔ جی ہاں اس میں قوافی کا زیادہ خیال نہیں رکھا گیا۔ یہ عالم جذب میں کہی گئی ہے۔ مگر اس مداخلت کے بعد محفل کا وہ رنگ دوبارہ نہ جم سکا اور ہم لوگ اس محفل سے رخصت ہو کر اپنے گھر آ گئے۔

بہ خانہ سلامت:

ایک شام جوش صاحب کے مکان پر سب احباب جمع تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور جوش صاحب طلوع ہو چکے تھے کہ اتنے میں سلامت علی خاں صاحب اپنی موٹر میں وہاں آ پہنچے اور جوش صاحب سے درخواست کی کہ باقی شغل سے نوشی وہ ان کے مکان پر مکمل کریں۔ سلامت علی خاں صاحب کی بیگم سلیمہ صاحبہ بہاری کباب بہت عمدہ بناتی ہیں۔ جوش صاحب ان کے ہاتھ کے بنائے ہوئے کباب بہت پسند کرتے تھے۔ جوش صاحب نے دریافت کیا کہ کیا بہاری کباب کھلاؤ گے؟ تو خاں صاحب نے کہا جی ہاں اسی لیے تو حاضر ہوا ہوں۔ یہ سنتے ہی جوش صاحب فوراً پیمانہ بہ کف خان صاحب کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ خان صاحب نے مجھے راغب صاحب اور عالیہ امام کو بھی بہ اصرار ساتھ لے لیا۔ راستے میں راغب صاحب نے فی البدیہہ یہ رباعی کہی۔

از راہ محبت و شرافت آئے
حیرت ہے کہ ہنگام عبادت آئے
پیسا نہ بکف کار میں جوش اے راغب
اک پل میں بکانڈ سلامت آئے

سلیمہ بھابی اور سلامت علی خاں کے تمام بچے جوش صاحب کے بے حد گرویدہ تھے۔ ان کا بڑا لڑکا ٹیپو تو بچپن سے جوش صاحب کا چہیتا تھا۔ جب یہ خاندان ڈھاکے میں رہتا تھا اور سلامت علی خاں جوٹ کا کاروبار کرتے تھے تو جوش صاحب ان کے گھر ہفتوں قیام کیا کرتے تھے۔ ٹیپو میاں جب چھوٹے سے تھے تو جوش صاحب کے کمرے کی کنجی لیے لیے پھرتے تھے اور جوش صاحب جب باہر سے گھر آتے تو ٹیپو میاں کو آواز دیتے "اے میاں کنجی والے ہمارے کمرے کی کنجی لا دیجیے گا" اور ٹیپو میاں فوراً اپنی جیب سے کنجی نکال کر جوش صاحب کے حوالے کر دیتے۔ اس دفعہ جب جوش صاحب سلامت علی خاں کے گھر بیٹھے ہوئے تھے تو سلیمہ بھابی نے جوش صاحب کو ایک تصویر دکھائی جس میں ننھے ٹیپو میاں جوش صاحب کی گود میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ جوش صاحب نے تصویر دیکھ کر بے ساختہ کہا "اے یہ کنجی والا ہماری گود میں بیٹھا ہوا ہے"۔ راغب صاحب نے فوراً ایک رباعی کہی۔

یہ حضرت جوش کا ہے اک متوالا
بیٹھا ہے آغوش جو بھولا بھالا
کہتے تھے جناب جوش اسی کو راغب
ڈھاکے میں بڑے پیار سے کنجی والا

جوش صاحب نے چوتھا پیگ ختم کیا تو سلیمہ بھابی نے کھانا چن دیا۔ جوش صاحب نے کبابوں کی تعریف کی اور سب نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو احباب نے جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش کی۔ جوش صاحب نے کہا "ابھی تک وہ لونڈا نہیں آیا ہے جو کلام سناتا ہے"۔ پھر عالیہ امام سے فرمائش کی کہ وہ کوئی اچھی سی غزل گا کر سنائیں۔ سلامت علی خاں نے ہارمونیم لا کر رکھ دیا۔ عالیہ نے جوش صاحب ہی کی غزل سنانا شروع کی۔

آنکھیں ہتھیلیوں سے مل نیند ہے چشم ناز میں
بھر دے حنا کا رنگ بھی نرگس نیم باز میں
چھیڑوں کبھی جو رات کو تاروں سے خوں ٹپک پڑے
درد بھرا ہوا ہے وہ دل کے شکستہ ساز میں
میرے گداز عشق کا تم پہ اثر ہوا ضرور
ناز کا رنگ آ چلا میرے دل نیاز میں
دیکھنا ٹوٹنے پہ ہے جوش کا دل بھی عنقریب
ذکر تھا کل یہ حسن کے خلوتیان راز میں

عالیہ کی دل کش آواز اور فن موسیقی سے ان کی مہارت اور غزل کے تاثر نے ہر شخص کو بے خود کر دیا تھا۔ جب غزل ختم ہوئی تو راغب صاحب نے یوں داد دی۔

محفل جوشس میں کھلا ہم پر	ہائے کیا چیز ہے یہ پریت کی ریت
نقش ہیں پردۂ سماعت پر	ڈاکٹر عالیہ امام کے گیت

یہ محفل دس بجے تک چلتی رہی اس کے بعد سب احباب اپنے اپنے گھر روانہ ہو گئے۔ میں نے جوش صاحب کو ان کے گھر پہنچایا۔ راستے میں جوشس صاحب نے مجھ سے کہا کہ بائیسویں تاریخ کو ڈیرہ غازی خاں میں مشاعرہ ہے۔ تم بھی میرے ساتھ چلو۔ اس وقت تو میں نے کہہ دیا کہ میں سوچ کر جواب دوں گا اور انھیں گھر پہنچا کر اپنے گھر آ گیا۔ دوسرے دن میں نے اپنی بیوی سے مشورہ کیا تو میری بیوی نے کہا کہ وہ بھی ساتھ چلیں گی۔ ان دنوں ملتان میں میرے چچا زاد بھائی حمایت علی خاں حبیب بنک کے ایریا منیجر تھے۔ ان کے بیوی بچے بہت دنوں سے ہم میاں بیوی کو ملتان بلا رہے تھے مگر کسی طرح جانے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ اب یہ موقع فراہم ہوا تو میری بیوی نے کہا کہ وہ ملتان اتر جائیں گی اور ہم لوگ مشاعرے سے فارغ ہو کر واپس ملتان آ جائیں۔

ڈیرہ غازی خاں کا مشاعرہ:

ہم تینوں بائیسویں اپریل کو کراچی سے ملتان روانہ ہو گئے۔ ایرپورٹ پر حمایت علی خاں

اور ان کی بیگم موجود تھیں ۔ میری بیوی ان کے ساتھ چلی گئیں۔ میں اور جوش صاحب ڈیرہ غازی خاں روانہ ہو گئے ۔ وہاں کے نوجوان خوبصورت A.D.M مسٹر زیدی نے ہمارا استقبال کیا اور ہم لوگوں کو اپنے گھر میں ٹھہرایا۔ زیدی صاحب مرحوم مصطفےٰ زیدی کے چچا زاد بھائی اور استاد قمر جلالوی کے نواسے ہیں۔ نہایت گورے چٹے، بھورے گھونگریالے بال وجیہہ نوجوان ہیں۔ جوش صاحب کے حد درجہ معتقد۔

وہاں پہنچ کر جوش صاحب نے غسل کیا لباس تبدیل کر کے غروب آفتاب پر اپنا شغل کیا اور کھانا کھا کر سو گئے۔ مشاعرے میں اور بہت سے شعرا مدعو تھے۔ حمایت علی شاعر، راغب مرادآبادی، منیر نیازی، محسن بھوپالی، سرود بارہ بنکوی، عبدالحمید عدم، احمد فراز۔ یہ سب حضرات بھی زیدی صاحب کے مکان میں جمع تھے۔ سب لوگ کھانے سے فارغ ہو کر نو بجے کے قریب مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔ بارہ بجے زیدی صاحب جوش صاحب کے کمرے میں آئے اور ان کے پیر دبانے لگے اس سے جوش صاحب کی آنکھ کھل گئی۔ جوش صاحب کو بیدار کرنے کا جو طریقہ زیدی صاحب نے اختیار کیا میں اس نوجوان کی حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت کی عظمت کا بھی قائل ہو گیا۔ اتنا بڑا افسر اور بزرگوں کے سامنے یہ انکسار۔ اس مشاعرے کے بعد میری ملاقات زیدی صاحب سے کبھی نہیں ہوئی مگر ان کے کردار کی خوبصورتی اور دلکشی کا نقش میرے ذہن پر ہمیشہ کی طرح آج بھی تروتازہ ہے۔ آج وہ یقیناً بہت بڑے افسر بن گئے ہوں گے۔ میں نے بعد میں جوش صاحب سے زیدی صاحب کی سعادت مندی کی تعریف کی اور کہا کہ ایسے ہی نوجوان ہماری تہذیب کی عظمت کے امین ہیں۔ مشاعرے کے دوران اور اس کے بعد جس طرح زیدی صاحب نے تمام شعرا کی ضرورتوں کی جزیات کا خیال رکھا وہ ان کے کردار کی خوبی کا آئینہ دار تھی۔

جوش صاحب نصف شب کے بعد بیدار ہوتے تھے۔ نہا دھو کر مشاعرہ گاہ میں پہنچ گئے۔ اس وقت تک تمام شعرا اپنا اپنا کلام سنا چکے تھے۔ جوش صاحب نے کچھ رباعیات اور چند نظمیں سنائیں اور مشاعرے کے اختتام کے بعد اپنی قیام گاہ پر آ کر دوبارہ سو گئے۔ صبح اٹھ کر ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد روانگی کی تیاری شروع ہو گئی۔ میں جوش

صاحب اور منیر نیازی صاحب ایک موٹر میں ملتان روانہ ہو گئے ۔ راستے میں منیر نیازی صاحب سے دلچسپ گفتگو ہوتی رہی ۔ دوران گفتگو انھوں نے کہا کہ ان کی شاعری میں شہر خود انسانی سماج اور انسانی حیات کی بوقلمونی کا استعارہ ہے ۔ ملتان پہنچ کر جوش صاحب ہوائی جہاز سے لاہور روانہ ہو گئے اور منیر نیازی صاحب کو میں نے ریلوے اسٹیشن پہنچایا جہاں وہ ڈیڑھ بجے کی گاڑی سے لاہور روانہ ہو گئے ۔ ان دونوں حضرات کو روانہ کر کے میں اپنے بھائی حمایت علی خاں کے گھر آ گیا جہاں میری بیوی مقیم تھیں ۔

لاہور کا سفر:

ملتان میں تین چار دن قیام کر کے میں اپنی بیوی کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا ۔ اور وہاں اپنے ایک اور چچا زاد بھائی اختر علی خاں کے گھر سمن آباد میں قیام کیا ۔ جوش صاحب قریب ہی ہاشمی صاحب کے گھر میں مقیم تھے ۔ میں دوسرے دن صبح سویرے ان سے ملنے چلا گیا ۔ مل کر بہت خوش ہوئے ۔ دس بجے تک کچھ اور احباب بھی آ گئے ۔ بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں ۔ دوپہر میں جب جوش صاحب آرام کی غرض سے لیٹ گئے تو میں گھر آ گیا ۔ شام کو جب میں جوش صاحب سے ملنے گیا تو وہاں فلمی دنیا کی مشہور شخصیت جناب سید شوکت حسین رضوی بھی موجود تھے ۔ وہ جوش صاحب کو اپنے گھر لے جا رہے تھے ۔ میں وہاں پہنچا تو مجھے بھی اصرار کر کے ساتھ لے لیا ۔ ان کا گھر اور اسٹوڈیو ایک ہی عمارت میں واقع ہیں ۔ وہاں ان کی حالیہ بیگم یاسمین صاحبہ نے ہمارا استقبال کیا ۔ شوکت صاحب جوش صاحب کے عاشقوں میں سے ہیں ۔ جوش صاحب کی بے حد خاطر تواضع کی گئی ۔ یاسمین صاحبہ کی فرمائش پر جوش صاحب نے اپنا کلام بھی سنایا ۔ شوکت صاحب شعر فہمی کا بہت اچھا ذوق رکھتے ہیں اور جو شعر اچھا ہوتا ہے اس کی دل کھول کر داد دیتے ہیں ۔ کھانے سے فارغ ہو کر کوئی دس بجے کے قریب شوکت صاحب نے ہمیں اپنے اپنے گھر پہنچایا ۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے ملاقات:

دوسرے دن جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ چلو آج مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے

لے چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں مولانا کے مکان اچھرہ پہنچے۔ ان دنوں مولانا کی طبیعت کچھ ناساز رہتی تھی۔ اس لیے زیادہ تر آرام فرماتے رہتے تھے مگر جیسے ہی ان کو جوشش صاحب کی آمد کی اطلاع ملی، باہر تشریف لے آئے اور ہم لوگوں کے لیے چائے وغیرہ کا بندوبست فرمایا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں پھر گفتگو کا رخ مسئلہ جبر و قدر کی طرف مڑ گیا۔ مولانا نے فرمایا کہ ہم انسان کو نہ تو بالکل مجبور مان سکتے ہیں اور نہ بالکل آزاد۔ اسس کی آزادی اور مجبوری دونوں ہی کی حدود متعین ہیں اسی لیے ہر انسان اپنی آزادی کی حد تک اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے اور اسی پر اس کی جزا و سزا کا انحصار ہے مگر جوشش صاحب نے فرمایا کہ ہم سو فی صدی مقدور ہیں اور ایک فی صد بھی اپنے اعمال پر قادر نہیں۔ بے شک ہم جو جی چاہے کر سکتے ہیں مگر خود جی چاہنا ہی سرے سے ہمارے بس میں نہیں۔ ہمارے تمام اعمال داخلی اور خارجی جبر کے تحت سرزد ہوتے ہیں۔ ہمارا ہر عمل دراصل کسی خارجی یا داخلی ہیج کا ردعمل ہوتا ہے۔ اب ایک اسی بات کو دیکھ لیجیے کہ آپ اسس وقت آرام فرما رہے تھے۔ اس لیے کہ داخلی طور پر آپ کا مزاج ناساز ہے مگر جیسے ہی آپ کو میرے آنے کی اطلاع ملی میرے اور آپ کے برسوں کے تعلقات اور دوستی کے جذبات نے آپ کو آرام ترک کرنے اور مجھ سے ملنے کے لیے یہاں آنے پر مجبور کیا اس طرح آپ کا آرام اور یہاں آنا دونوں داخلی اور خارجی ہیجات کے ردعمل کے طور پر عمل پذیر ہوئے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں کام یعنی آپ کا آرام اور مجھ سے ملنے کے لیے آرام ترک کرنا، آپ نے اپنی آزاد مرضی سے انجام دیے مگر جس کو آپ اپنی آزاد مرضی سمجھ رہے ہیں وہ دراصل ردعمل ہے ان ہیجات کا جو میں نے ابھی بیان کیے ہیں۔

مودودی صاحب نے فرمایا۔ جوشش صاحب آپ کی بات بہت حد تک درست ہے مگر مشکل یہ ہے کہ اسس قسم کا عقیدہ جس میں انسان کو اس قدر مجبور سمجھ لیا جائے کہ اس کو اپنے اعمال کی ذمہ داری سے بری کر دیا جائے ہمارے "ایمان" کے خلاف ہے۔ جوشش صاحب نے کچھ اسس انداز سے جس میں کچھ التجا، کچھ طنز اور کچھ تمسخر کے جذبات ملے ہوئے تھے فرمایا۔ "مودودی "ایمان" کی خاطر بے ایمانی" نہ کرو۔

مولانا نے ہنس کر فرمایا کہ آپ سے بحث کرنا بے سود ہے۔ پھر انھوں نے جوش صاحب

کو جبر و قدر کے مسئلے پر اپنی ایک کتاب دے کر کہا کہ پہلے آپ اس کتاب کا غور سے مطالعہ فرمائیں اور پھر دل کھول کر اس پر تنقید کریں اور جب آپ اگلی مرتبہ تشریف لائیں تو اس موضوع پر گفتگو ہوگی۔

اس کے بعد ہم دونوں وہاں سے رخصت ہو کر مولانا کے بڑے بھائی ابوالخیر مودودی صاحب کے گھر گئے جو جوش صاحب کے بہت بے تکلف دوستوں میں سے تھے مگر وہاں معلوم ہوا کہ وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔

وہاں سے رخصت ہو کر ہم گھر آ گئے۔ جوش صاحب نے ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی کتاب مجھے دے کر فرمایا کہ میں اسے غور سے پڑھ کر جو اعتراضات میرے ذہن میں آئیں وہ لکھ لوں تاکہ مولانا سے ان پر گفتگو کی جا سکے مگر اس کے بعد مولانا سے ملاقات نہ ہو سکی۔

لاہور میں جوش صاحب عام طور سے بہت خوش رہتے تھے۔ وہاں ان کے قریبی دوستوں میں ایک تو شوکت حسین رضوی صاحب تھے دوسرے ذیشان صاحب جو اردو فارسی شاعری کا بہت اچھا ذوق رکھتے تھے مگر ان تمام دوستوں کے علاوہ جوش صاحب کے لیے سب سے زیادہ محبوب اور پرکشش شخصیت وہ تھی جس کو وہ فتنۂ آخرالزماں کے لقب سے یاد کرتے تھے اور جو اپنی سہیلیوں سے ملنے کے بہانے ہر وقت جوش صاحب کے قریب رہنے کے بہانے ڈھونڈھتی تھی۔ اور پھر ہاشمی صاحب جو اپنے ماموں سسر یعنی جوش صاحب کی خاطر تواضع میں لگے رہتے تھے۔ وہ بہاری کباب اور بالائی کی مٹھائی بنانے میں مہارت رکھتے ہیں اور یہ دونوں چیزیں غذا میں جوش صاحب کی کمزوری تھیں۔ اس کے علاوہ ہاشمی صاحب کے پاس پان کے لیے چونا اور کتھا بنانے کا بھی ایک خاص نسخہ تھا۔ چونے کو اس طرح دودھ میں پکاتے اور اس میں کچھ ایسی چیزیں ملاتے کہ روکھا کھانے سے بھی مفخونہ کٹتا۔ ہاشمی صاحب خود اپنے ہاتھوں سے پان بنا کر جوش صاحب کے لیے ان کے پانوں کی ڈبیا بھر دیتے تھے جو تمام دن کے لیے ان کو کافی ہوتی اور پھر زندہ دلانِ لاہور روز شام کو کہیں نہ کہیں ایک شعری نشست کا اہتمام کرتے جس میں جوش صاحب کی شرکت ضروری ہوتی۔ غرض جب تک جوش صاحب لاہور میں رہتے ہر روز، روزِ عید اور شب، شبِ برات کا سماں رہتا ہے۔ جوش صاحب جیسا شاعر اور موضوعِ شعر سامنے ہو تو پھر انداز

گل افشانیٔ گفتار قابل دید ہوتا ہے۔ بقول ان کے:

تا شاعری کی مانگ کو صندل سے بھر سکوں
بار دگر جوان بنایا گیا ہوں میں

ایک دن ہاشمی صاحب کے مکان میں ذیشان صاحب شوکت صاحب ان کی بیگم یاسمین صاحبہ اور جوشؔ صاحب کی محبوب فتنۂ آخر الزماں، میں اور میرے بھائی اختر علی خاں سب جمع تھے۔ جوشؔ صاحب نے فرمایا۔ صاحبو میں آج آپ سب حضرات کو اپنی ایک تازہ ترین نظم سناؤں گا مگر شرط یہ ہے کہ اگر کوئی شعر پسند آئے تو کھڑے ہو کر داد دیجیے گا۔ اس کے بعد جوشؔ صاحب نے اپنی تین دن پہلے کہی ہوئی نظم سنائی جس کا عنوان ہے۔

فردوسِ دوزخ نصیب

بتاؤں کہ ہے کیا وہ گلشن جبیں | وہ غارت گرِ نظمِ دنیا و دیں
بہ گفتار طوطی بہ وحشت غزال | بہ خمیازہ قوس و بہ ابرو ہلال
تجلی بہ سیما و ظلمت بہ دوش | خمستاں خریدار و مستی فروش
مہکتے شلوکے میں گردابِ ناز | دوپٹے کا قاتل نشیب و فراز
ابھرتی جوانی بھکتی پھبن | دھواں دار جوبن گھمن گھمن
شبِ قدر کاکل کی زد پر فگار | مژہ سے غلافِ حرم تار تار
پسِ جلد رخسارۂ بے عدیل | رواں دجلۂ بادہ و سلسبیل
تکلم کی رو میں بہ موجِ حیا | سبو کے دھڑکنے کی مدھم صدا
نگاہوں کی گردش میں صد دورِ جام | لٹوں کے تلے حوریوں کے خیام
نکیلی ترنگوں کی رخ پر چبھن | کھنکتے نفس سے جھنکتا بدن
جبیں پر دھندلکے کی زد میں شفق | ہواؤں پہ سونے کا جھیا ورق
صباحت کی موجوں کا چہرے پہ نور | چراغوں کے حلقے میں جیسے بلور
سیہ پتلیوں میں غزالوں کے غول | ولائی میں بلبل دوپٹے میں جھول

جھما جھم جھلکتی جھلی انکھڑیاں   جھلاجھل جواہر کی جیسے دوکاں
نظر ٹوٹتی اور جڑتی ہوئی   ندی بن میں جس طرح مڑتی ہوئی
نگاہوں میں کھنکان باہوں میں تان   تبسم میں برکھا کی آڑی کمان
وہ ابرو کہ سجدے کریں شہریار   ترش جائے ہیرا وہ کھڑے کی دھار
رخ نو پہ یوں سرخیوں کی شلنگ   شعاعوں میں جس طرح اطلس کا رنگ
پھبن دولت وادی کاشمیر   بدن نازشِ پرنیاں و حریر
سرود شبستاں بہ موج سخن   دو صد یوسفستاں بہ چاہ ذقن
عروس گل و بنت سرد رواں   نگار مہ و دختر کہکشاں
رخ ناز و آواز افسوں بدوش   بنائے الوہیت چشم و گوش
رگ و پے گزرگاہ سیلاب مل   سیہ زلف بالیدۂ بوئے گل
دہن بستۂ بے چناں و چنیں   نمو بخش و نوکار و نیم آستیں
صباح بہاراں و ماہ تمام   ذرا اندام ، خوش چشم ، انگور فام
سراپا شبستاں مجسم بہار   حنا رود بار و عنا آبشار
لب لعل پروردۂ انگبیں   سبک چہرہ افشردۂ یاسمیں
ترنم خمیر و تبسم نہاد   غزال آل ، خم زاد ، مینا مزاج
بہ جلوت شمیم و بہ خلوت زجاج   چمن خو ، گہر وضع ، مینا مزاج
سمن رو ، صبا نسل ، سنبل وطن   گل انفاس نے لوچ شبنم بدن
نکھر حرف سے طبع کوثر خرام   گلابی سرشت و صراحی قوام

۲

maablib.org

مگر اس کے باوصف وہ تازہ سال   محبت کے آزار سے ہے نڈھال

جوش صاحب کی شاعری کا مقابلہ ان کی محبوبہ سے:

یہاں سے نظم کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ جوش صاحب نے وہ حصہ نہیں سنایا

اور یہ کہہ کر ٹال گئے کہ فی الوقت یہ غیر متعلق ہے مگر جتنا حصہ جوش صاحب نے سنایا اس کے متعلق وہاں حاضرین کا یہ عالم تھا کہ مسلسل کھڑے رہے اور جوش صاحب کے حکم کے مطابق کھڑے ہو کر ہر شعر کی داد دیتے رہے۔ میں اس تمام نظم خوانی کے دوران میں کلام کی مخاطب بلبہ کو غور سے دیکھتا رہا اور باوجود انتہائی غور کے مجھے اس کے سراپا میں ایک مصرع کی بھی ترجمانی نظر نہیں آئی۔ جب سب لوگ رخصت ہو گئے تو جوش صاحب نے مجھ سے کہا۔ خورشید علی خاں ابھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ تم نے میری اس نظم کی اس طرح داد نہیں دی جیسی میں تم سے توقع کر رہا تھا۔ میں نے کہا جوش صاحب اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں۔ فرمایا۔ کہو ارے میاں اب تم بھی بات کرتے ہوئے شرمانے لگے۔ میں نے کہا کہ جب میں آپ کے کلام کا مقابلہ مشارُالیہ سے کر رہا تھا تو حضرت مرزا محمد رفیع سودا چپکے چپکے میرے کان میں کہہ رہے تھے۔

سودا جو تیرا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

جوش صاحب برا مان گئے۔ کہنے لگے میاں پہلے حسن کو پرکھنے والی آنکھ پیدا کرو۔ میں نے کہا حضور یہ آنکھ آپ کو مبارک ہو۔ ہم کو تو آپ کا کلام کافی ہے۔ اس نظم کا ہر شعر، ہر مصرع بلکہ ہر لفظ آپ کے عظیم شاعر ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔ اسس پوری نظم میں آپ نے جس حسن کا سراپا بیان فرمایا ہے وہ خود اپنا موضوع آپ ہے مگر میں نہایت ادب سے یہ عرض کرنے کی گستاخی کروں گا کہ آپ کی حقیقی محبوبہ میں اس حسن کی مجھے کوئی جھلک دکھائی نہیں دی ہے۔ اب اس مصرع کو لے لیجیے۔ "دھواں دھار جوبن گھنن گھن گھنن"۔ اس سے میرا ذہن ایلورہ کے غاروں میں بنائے ہوئے دیویوں کے ان مجسموں کی طرف منتقل ہو گیا جہاں سنگ تراشوں نے سنگ خارا کی چٹانوں کو کاٹ کر ایسے ایسے نسوانی پیکر تراشے اور ان کے جسمانی نقوش ابھارے ہیں کہ انھیں دیکھ کر بے ساختہ انسان پکار اٹھتا ہے کہ واقعی جوبن نرالا اسی کو کہتے ہیں۔ اسس نظم میں آپ نے جتنی مثالیں دی ہیں وہ صرف آپ کے تخلیقی شاداب ذہن کی آئینہ دار تو ہو سکتی ہیں مگر حقیقت سے ان کا کوئی تعلق کم از کم مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ نہ تو ان۔۔ کے تکلم میں وہ نزاکت ہے کہ اس کو سبو کے درکنے سے تشبیہ

دی جا سکے نہ ان کی تھوڑی میں چاہ ذقن ہے جہاں آپ نے دو صد یوسفستاں آباد کر دیے ہیں اور نہ قد سرو رواں ہے۔ چہرے اور آواز کو افسوں بدوش کہہ کر بنائے الوہیت چشم و گوش قرار دینا یہ بالکل آپ کی داخلی حسیت کی مبالغہ آرائی ہی ہو سکتی ہے جس سے دوسروں کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ اس کے بعد جتنی علامتیں اور استعارے آپ نے حسن کے متعلق استعمال فرمائے ہیں۔ گلابی سرشت و صراحی قوام تک یہ سب آپ کی قوت متخیلہ کی جادوگری ہے۔ یہ اردو ادب میں نہایت دلکش اضافہ ہے اور اس سے اردو کا دامن جواہر نایاب سے مالامال ہو گیا ہے مگر آپ کی "موصوف" میں اس کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ اس سے مجھے فردوسی کا وہ شعر یاد آرہا ہے جہاں اس نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

منم کردہ ام رستم پہلواں
وگرنہ یلے بود در سیستاں

آپ جیسا قادرالکلام شاعر ذرہ کو آفتاب اور ایک گیاہ بے مایہ کو گلستان پر بہار بنا سکتا ہے۔ آپ کی یہ نظم اردو ادب کا شہ پارہ ہے یہ اپنی ذات میں ادب عالیہ ہے مگر اس میں آپ کا محبوب کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اب یہ آپ کی مرضی ہے کہ اس ادب پارے کو آپ جس سے چاہیں منسوب فرما دیں۔ کیونکہ آپ:

ہر خسار کو زرتار بنا دیتے ہیں	ہر خس کو چمن زار بنا دیتے ہیں
ہر ذرۂ جادہ کو بہ فیض رفتار	ہم مصر کا بازار بنا دیتے ہیں

اور آپ میں یہ قدرت بھی ہے کہ:

تلوار کو چمکاؤں تو مرہم ٹپکے	مرمر کو فشار دوں تو زمزم ٹپکے
بخشا ہے تخیل نے وہ اعجاز مجھے	شعلے کو نچوڑ دوں تو شبنم ٹپکے

اور آپ فکر و فن کی اس بلندی پر بھی فائز ہیں جہاں سے آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ:

قاموس خیالات کے دھارے ہم ہیں
گردون محاکات کے تارے ہم ہیں
دیکھے جو ہمیں عرش تو گر جائے کلاہ
ایوان سخن کے وہ منارے ہم ہیں

جوش صاحب بہت خاموشی سے میری باتیں سنتے رہے پھر فرمایا جناب آپ میرے ہی ہتھیاروں سے مجھ پر حملہ فرمارہے ہیں مگر اتنی بات آپ کیوں نہیں پاتے کہ شاعر کا کلام اس کی صلاحیتوں کا آئینہ دار تو بے شک ہوتا ہے مگر اس کی شاعری کے محرک کو آپ کیسے نظرانداز کر سکتے ہیں۔ اس محرک شاعری کا عکس آپ کو شاعر کے جذبات کے اظہار ہی میں دکھائی دے سکتا ہے اور شعر کی تخلیق میں صرف بصارت ہی ایک عامل نہیں ہوتی بصیرت بھی اہم ہوتی ہے۔ اصل چیز شاعر کے وہ جذبات ہیں جو کسی خارجی شے سے اتنے متاثر ہوتے ہیں کہ اس کو تخلیق عمل پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ایک عام آدمی کے احساسات میں اور شاعر کے احساسات میں تو فرق ہوتا ہے نا؟ اور ہر شاعر کو اپنے جذبات کے اظہار پر ایک سی قدرت بھی حاصل نہیں ہوتی اور ہر چہرہ شاعر کے جذبات میں وہ طوفان بھی بپا نہیں کر سکتا جو اس کے شعر کی تخلیق کا باعث بنے اور میں تو بلا کسی قسم کے انکسار کے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں اس حسن کی کیفیت کو پوری طرح ادا ہی نہیں کر سکا۔ میں باوجود اتنی جگر سوزی اور بقول آپ کے اتنی قادر الکلامی کے اپنے کلام سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں جو کچھ کہنا چاہتا تھا اس کا صرف تیس فی صد کہہ سکا ہوں۔ الفاظ جذبات کا بہت کمزور اظہار ہیں۔ وہ صرف علامات یا اشارے ہو سکتے ہیں جن سے آپ شاعر کے احساسات کا کچھ تھوڑا بہت اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہ کلی حقیقت نہیں بن سکتے۔

کون سمجھے۔ شعر۔ یہ کیسے ہیں اور کیسے نہیں
دل سمجھتا ہے کہ جیسے دل میں تھے ویسے نہیں

اسی لیے میں کہتا ہوں۔

لیلائے سخن کو آنکھ بھر کر دیکھو قاموس و لغات سے گزر کر دیکھو
الفاظ کے سر پر نہیں اڑتے معنی الفاظ کے سینے میں اتر کر دیکھو

میں نے کہا جوش صاحب آپ برا نہ مانیے۔ میں آپ کو چھیڑ چھیڑ کر جو اتنی باتیں کرتا ہوں اور آپ کی بے تکلفی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہوں تو اس سے میرا مقصد دراصل یہ ہوتا ہے کہ:

میں نے اس شوق میں پوچھی ہیں ہزاروں باتیں
کہ ترا حسن۔ ترے حسن بیاں تک دیکھوں

ورنہ آپ مجھ سے یہ بھی فرما سکتے ہیں اور بجا طور پر فرما سکتے ہیں کہ:

ثابت نہ کر اپنے کو یکے از جہال   بستے کو بغل میں داب پوتھی کو سنبھال
سمجھا نہ مجھے شعر و ادب کے نکتے   نافہم نہ بن نمک سمندر میں نہ ڈال

جوش صاحب نے ازراہ انکسار فرمایا۔ ارے آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ آپ کی شرافت ہے مگر آیندہ سے میری محبوبہ کا میرے کلام سے مقابلہ کرنے نہ بیٹھ جایئے گا۔

ہم لوگ یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ وہ سمن چیکر تشریف لے آئیں اور جوش صاحب کے قریب بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ میں جوش صاحب کی غیر مطبوعہ بیاض "محراب و مضراب" کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اتنے میں میری نظر ایک غزل پر پڑی جو مجھے ان کی محبوبہ کا ایک حقیقت پسندانہ تجزیہ معلوم ہوئی۔ میں نے جوش صاحب سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اس بیاض سے ایک بہت حد تک حقیقت پسندانہ غزل سناؤں۔ پہلے اس کے کہ جوش صاحب کچھ فرماتے سمن فوراً بول پڑیں۔ ضرور ضرور سنایئے۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔

تجھے ناداں ہنوز آنکھیں لڑانا بھی نہیں آتا
نظر باتیں کرے یوں مسکرانا بھی نہیں آتا
تیری بچپن کی سرحد سے ملی الھڑ جوانی کو
کھنچی انگڑائیوں میں جھنجھنانا بھی نہیں آتا
ہوائیں جب اڑاتی ہیں ترے سینے کے پلو کو
تو اس پلو کو چٹکی میں دبانا بھی نہیں آتا
اچانک میرے آ جانے سے وقت زینت گیسو
چھپا کر چہرہ جھٹ سے بیٹھ جانا بھی نہیں آتا
ترے مکھڑے پہ ہے کرب تمنائے ہم آغوشی
ابھی دل کے تقاضوں کا چھپانا بھی نہیں آتا
تجھے اب تک نشیلی انکھڑیوں کی موج رنگیں میں
لگاوٹ کے سفینوں کا ترانا بھی نہیں آتا

غرورِ حسن سے غافل ہے اتنی کم سنی تیری
کہ میری چھیڑ پر تیوری چڑھانا بھی نہیں آتا

بیوٹوں کے کناروں پر سیاہی کے گھروندے ہیں
ٹھکانے سے تجھے کاجل لگانا بھی نہیں آتا

مرے حرفِ تمنا و طلب گاری سے شرما کر
کلائی میں تجھے کنگن گھمانا بھی نہیں آتا

جو سوتی ہے تو ساری رات اک کروٹ پہ سوتی ہے
ابھی تکیے گرا کر رسمانا بھی نہیں آتا

کمر کے لوچ سے پلکوں کی طوفاں خیز لرزش سے
نگاہِ جوشؔ کو جھولا جھلانا بھی نہیں آتا

میں نے غزل ختم کر کے سمن سے پوچھا۔ کیوں جناب خاتون موصوفہ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟

سمن بلا جھجک کہنے لگیں کہ موصوفہ ماہرِ نفسیات معلوم ہوتی ہیں جس کی سادگی میں پرکاری ہے اور بے خودی میں ہشیاری اور جس کا حسن۔ تغافل میں جرات آزما ہے۔

جوشؔ صاحب نے سمن کے اظہارِ خیال کی خوب داد دی اور فرمایا۔ دیکھیا جناب سخن فہمی اس کو کہتے ہیں۔ میں نے کہا جوشؔ صاحب یہ تشریح صرف سمن ہی کر سکتی تھیں۔ ہم لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ ہاشمی صاحب بھی آ گئے۔ مجھ سے کہنے لگے کہ جوشؔ صاحب کل صبح اپنی گاڑی میں اسلام آباد روانہ ہونے والے ہیں۔ آپ کا کیا پروگرام ہے۔ میں نے جوشؔ صاحب سے کہا کہ میرا ارادہ بھی اسلام آباد جانے کا ہے اگر آپ کی گاڑی میں اور کوئی نہ ہو تو میں اور میری بیوی بھی آپ ہی کے ساتھ چلیں۔ جوشؔ صاحب نے کہا اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کل صبح نو بجے تیار رہیے گا میں آپ کو اختر میاں کے گھر سے لے لوں گا۔ اس کے بعد میں جوشؔ صاحب سے رخصت ہو کر گھر آ گیا۔

جوش صاحب کے ساتھ اسلام آباد کا سفر:

دوسرے دن پانچویں مئی ۱۹۷۰ء میں اور میری بیوی صبح ساڑھے آٹھ بجے ہاشمی صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جوش صاحب سامان گاڑی میں رکھ چکے تھے۔ کہنے لگے ارے بھائی آپ نے کیوں تکلیف کی میں خود آپ کو لینے آرہا تھا۔ میں نے کہا چلیے اس بہانے ہاشمی صاحب کو بھی خدا حافظ کہہ لیں گے۔ غرض نو بجے ہم لوگ لاہور سے روانہ ہوئے۔ راستے میں گوجرانوالے میں چائے پی۔ جہلم میں دوپہر کا کھانا کھایا۔ جوش صاحب نے اصرار کر کے بل خود ادا کیا۔ شام پانچ بجے ہم لوگ اسلام آباد پہنچے۔ میں اور میری بیوی، میری بہن اقبال خانم کے گھر اتر گئے اور جوش صاحب اپنے گھر تشریف لے گئے۔ اس زمانے میں میری بہن کا گھر ۶۹ اسٹریٹ پر تھا جہاں سے جوش صاحب کا مکان قریب ہی واقع تھا۔ میں نے نہا دھو کے کپڑے بدلے اور بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ جوش صاحب نے گاڑی بھیج دی اور میں ان کے گھر چلا گیا۔ رات کا کھانا جوش صاحب ہی کے ساتھ کھایا اور رات کو گھر آکر سو گیا۔

دوسرے دن صبح دس بجے پھر جوش صاحب کی گاڑی آگئی اور میں ان کے گھر چلا گیا۔ جوش صاحب کی میز پر دو بہت ضخیم رجسٹر رکھے ہوئے تھے۔ یہ دراصل ان کی ڈائریاں تھیں، جن میں وہ روزمرہ کے واقعات لکھتے رہتے تھے۔ بہت سے واقعات اور شخصیات پر اپنی رائے تحریر کرتے رہتے اور اگر کوئی انوکھا واقعہ دیکھتے تو وہ بھی اس میں لکھ دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ غور و فکر کے لیے کچھ باتیں بھی لکھ دیتے تھے۔ اس روز میں نے اتفاقاً جو ایک ڈائری کھولی تو اس پر یہ جملہ لکھا ہوا تھا۔

"جب عقل چکراتی ہے تو وہ بت خانہ توہمات کا طواف کرنے لگتی ہے"۔ دن میں عام طور پر جوش صاحب لوگوں سے ملنے کے لیے ان کے گھر یا دفتر چلے جاتے تھے۔ بقول ان کے۔

اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی کوئے سبزۂ شہر ادیباں میں ملے گا

یہ ملاقاتیں نو دس بجے سے لے کر ایک دو بجے دن تک چلتی تھیں۔ پھر گھر آکر آرام کرتے تھے۔ اس روز ہم لوگ سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے دفتر گئے۔ وہاں جوش صاحب سیکرٹری فنانس ارتضیٰ زیدی سے ملنا چاہتے تھے۔ ان کے دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ کسی میٹنگ میں

مصروف ہیں۔ جوش صاحب اختلافی سیماب صفت انسان ہیں وہ کسی کا ایک لمحہ بھی انتظار نہیں کر سکتے۔ چنانچہ وہ فوراً واپس چلے گئے۔ البتہ شام کو زیدی صاحب خود دفتر سے سیدھے جوش صاحب کے گھر آئے اور دفتر میں نہ مل سکنے کی معافی چاہی۔ باتوں باتوں میں زیدی صاحب نے پوچھا " جوش صاحب اردو میں Over Writing کے لیے کیا کہیں گے؟ " جوش صاحب نے کہا میں تو اسے " بالا نویسی " کہوں گا۔ پھر زیدی صاحب نے دریافت کیا اور Writing Pad کا کیا ترجمہ ہو گا۔ جوش صاحب نے کہا " بیاضِ مراسلت "۔ زیدی صاحب نے کہا واقعی یہ اصطلاحات اچھی ہیں۔ انھیں سرکاری دفاتر میں استعمال کرنا چاہیے۔

اسلام آباد میں جوش صاحب کے احباب:

اسلام آباد میں بھی جوش صاحب کے دوستوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ ان میں حسن ابدال سے اختر اور منظور تو تقریباً روز ہی شام کی محفل میں شریک رہتے تھے۔ واہ کینٹ سے کرنل رمضان اور اظہار حیدر زیدی بھی اکثر آ جایا کرتے تھے۔ اس شام بھی اختر صاحب آئے اور مجھے اور جوش صاحب کو اگلے بدھ کی شام ان کے گھر حسن ابدال آنے کی دعوت دے گئے۔

چنانچہ حسب وعدہ میں اور جوش صاحب چودھویں مئی کو اختر علی خاں صاحب کے گھر حسن ابدال پہنچے۔ انھوں نے ہمارے لیے بہت پرتکلف ناو نوش کا انتظام کر رکھا تھا۔ واہ کینٹ سے کرنل رمضان اور اظہار حیدر زیدی بھی مدعو تھے۔

کرنل صاحب نہایت مرنجاں مرنج آدمی ہیں۔ ان کو اس قدر لطیفے یاد ہیں کہ وہ گھنٹوں نہایت دلچسپ لطیفے سناتے اور سب کو ہنساتے رہتے ہیں۔ اس دن بھی انھوں نے بہت سے لطیفے سنائے۔ جوش صاحب بھی بہت اچھے موڈ میں تھے۔ رات گیارہ بجے کے بعد تک کلام سناتے رہے۔ جب رات زیادہ ہو گئی تو جوش صاحب نے کہا۔

سو بات کی ہے یہ بات آؤ سو جائیں
اب بھیگ چکی ہے رات آؤ سو جائیں

چنانچہ یہ دلچسپ محفل اپنے اختتام کو پہنچی۔

دوسرے دن صبح کو ناشتے سے فارغ ہو کر میں، جوش صاحب اور اختر صاحب بازار گئے اور بہت سے لوکاٹ خرید لائے۔ حسن ابدال کے اطراف لوکاٹ کے بہت بڑے بڑے باغ ہیں۔ یہاں بہت اچھے لوکاٹ دو روپے میں ایک سیر ملتے ہیں۔ جوش صاحب لوکاٹ کو کک وٹ کہا کرتے تھے۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا اگر لوکاٹ کو کئی دفعہ دہراؤ تو ضم کا پہلو نکلتا ہے ویسے وہ بہت شوق سے یہ پھل کھاتے ہیں۔ خرید و فروخت سے فارغ ہو کر ہم لوگ اپنے میزبانوں سے رخصت ہو کر واہ کینٹ پہنچے۔ وہاں اظہار حیدر زیدی نے جوش صاحب اور مجھے روک لیا۔ گرمی زیادہ تھی۔ ان کے گھر میں ایک تہہ خانہ ہے جو گرمیوں میں بہت ٹھنڈا رہتا ہے۔ انھوں نے دوپہر میں جوش صاحب کے لیے آرام کا بندوبست کر رکھا تھا۔ زیدی صاحب کی واہ کینٹ کے بازار میں کپڑے کی بہت بڑی دوکان ہے۔ ہم لوگوں نے بھی ان کی دوکان سے کچھ قمیصوں اور کرتوں کا کپڑا خریدا۔ پھر دوپہر میں گھر آ کر کھانا کھانے کے بعد جوش صاحب تو سو گئے مگر میں اور زیدی صاحب بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ ان سے اسلام، خدا اور عام انسانی قدروں پر گفتگو ہوتی رہی۔

کیا جوش صاحب خدا کے قائل نہیں ہیں؟

زیدی صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا جوش صاحب کے عقاید کے بارے میں کیا خیال ہے؟ لوگ کہتے ہیں کہ جوش صاحب خدا کے قائل نہیں ہیں۔ آپ تو جوش صاحب کے بہت قریب ہیں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

میں نے کہا کہ میں نے آج تک جوش صاحب سے زیادہ اللہ تعالیٰ کے متعلق حقیقت پسندانہ نقطہ نظر رکھنے والا مفکر نہیں دیکھا۔ فرمایا۔ کیا آپ اپنے اس خیال کی وضاحت فرمائیں گے؟ میں نے کہا۔ آپ کو یہ بات تو معلوم ہے کہ اللہ اسم ذات ہے اور یہ مرکب ہے ال اور الہ کا۔ عربی میں الہ کے معنی تحیر و درماندگی کے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں لکھا ہے کہ جس ذات کے تعلق سے ہم الہ کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس کا ادراک ذہن انسانی کے لیے محال ہے اور انسانی عقل اس کے متعلق جس قدر غور و فکر کرے گی اس کو سوائے تحیر و درماندگی کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ عرفان ذات الٰہی کا منتہیٰ یہ ہے کہ انسان کو

اپنی نارسائی کا یقین ہو جائے۔ بقول حضرت جوش:

جب علم کے سب کھنگال ڈالے قلزم   تب دولت عرفانِ جہالت پائی

بات یہ ہے کہ انسانی فہم کی ساخت ہی کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ وہ صرف مثالوں کے توسط سے ہی کسی شے کا ادراک کر سکتی ہے۔ اس لیے علمائے سائنس کا یہ مقولہ بہت درست ہے کہ "علم کا سفر" معلوم "سے" نامعلوم "کی طرف ہوتا ہے" اور اللہ تعالیٰ تو وحدہ لاشریک ہے جب اس کی کوئی مثال ہی نہیں ہے تو یہ بات انسانی عقل کے لیے ناممکن ہے کہ وہ ذات "کا ادراک کر سکے اور جب ہم ذات کا ادراک کر ہی نہیں سکتے تو اس کے متعلق جو تصور بھی قائم ہو گا وہ انسانی ذہن کا آفریدہ ہو گا، جس کے متعلق جوش صاحب کہتے ہیں کہ:

صاحبو ایسا خدا خالق نہیں مخلوق ہے
یہ خدا تو آدمی کے ذہن کی ایجاد ہے

دراصل بات یہ ہے کہ انسان نے جب شعور کی آنکھ سے اس خارجی کائنات کو دیکھا تو اس نے اس میں جگہ جگہ توانائی کے ایسے مظاہر محسوس کیے جن کے آگے خود کو بے بس پایا۔ زلزلے، طوفان، بیماریاں، موت۔ انسان ان طاقتوں کو راضی کرنے کے لیے قربانیاں دینے لگا اور رفتہ رفتہ یہ مظاہر پرستی اصنام پرستی میں تبدیل ہو گئی۔ اسی دوران مفاد یافتہ طبقات کے کچھ عقلمند لوگ ان دیوتاؤں کے اوتار بن گئے اور مادی مفادات کے ساتھ ساتھ عام انسانوں کے ذہن پر بھی نفسیاتی تسلط قائم کر لیا اور اس طرح اللہ کا تصور انسانی ذات سے وابستہ ہو کر ایک مطلق العنان شہنشاہ کا روپ اختیار کر گیا۔ یہاں تک کہ جب اللہ کا تصور خارجی بتوں کے تصور سے الگ بھی ہو گیا تو بھی اس میں تشخص کا عنصر شامل رہا اور انسان نے ایک مطلق العنان شہنشاہ کی ذات میں جو خصوصیات ہوتی ہیں جیسے کہ وہ ہر قانون سے بالاتر ہوتا ہے۔ خوشامد سے خوش ہو جاتا ہے۔ جس کو چاہتا ہے نواز دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے برباد کر دیتا ہے تو یہ تمام صفات اللہ تعالیٰ کی ذات سے منسوب کر کے اللہ کو بھی ایک مطلق العنان شہنشاہ کا تشخص دے دیا تو جوش صاحب کہتے ہیں:

خدا بصورتِ سلطاں نشستہ بر سرِ عرش
یہی جو بت شکنی ہے تو آذری کیا ہے؟

اور علامہ اقبال نے کہا کہ :

تراشیدم صنم بر صورت خویش
بہ شکل خود خدا را نقش بستم
مرا از خود بروں رفتن محال است
بہر رنگے کہ ہستم خود پرستم

اس لیے جوش صاحب خدا کے تعلق سے ہر قسم کے تشخص کے خلاف ہیں مگر وہ اس کائنات میں ایک توانائی مطلق کو محسوس کرتے ہیں اور یہ توانائی اپنے استثنیٰ ناآشنا قوانین کے ذریعہ سے اس کائنات کے ذرے ذرے کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور صرف یہی وہ ادراک حقیقت ہے جس میں کوئی جھول یا منطقی نقص نہیں ہے ۔ جوش صاحب کا کہنا یہ ہے کہ ہم خدا کی ذات کا ادراک نہیں کر سکتے مگر خدا کے قوانین اور اس کے احکامات کا علم حاصل کر سکتے ہیں اور بہ حیثیت عبد یہی ہماری ذمہ داری بھی ہے اور ضرورت بھی ۔ وہ تمام قومیں جو ذات کی تلاش میں سرگرداں ہیں وہ تاریکی کی وادیوں میں بھٹک رہی ہیں ۔ اسی لیے نامراد و خستہ حال ہیں مگر وہ تمام قومیں جو قوانین الٰہی کی دریافت میں لگی ہوئی ہیں بقدر علم کامیاب و کامران ہیں اور نتیجۃً خوش حال ہیں ۔ اس لیے ہمیں بھی چاہیے کہ تلاش ذات کے صنم خانۂ لات و ھبل سے نکل آئیں اور قوانین فطرت کی دریافت کا سائنٹفک نقطہ نظر پیدا کریں ۔ جوش صاحب کی رباعی ہے ۔

علت کا نہ معلول و قضا کا منکر
حاشا ۔ نہ خبر نہ مبتدا کا منکر
یاروں نے تشخص کا تراشا ہے جو بت
الحاد ہے صرف اس خدا کا منکر

جوش صاحب کا ذہنی سفر تلاش حقیقت کا سفر ہے وہ روایات کے انکار سے حقیقت کے اثبات کی طرف جا رہے ہیں یعنی لا سے الا کی طرف ۔

وہ اک نگاہ تجسس ہے سوئے ذات و صفات
سمجھ رہے ہیں جسے متقیان دیں الحاد

ایک جگہ کہتے ہیں ۔

آیات صفات کی تلاوت نہ کرو
جو یندگی ذات میں غفلت نہ کرو
لفظ اللہ پردہ ہے جلوہ نہیں
اس حرف غلافی پہ قناعت نہ کرو

یہاں صفات سے مراد وہی انسانی صفات ہیں جن کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں اور جو یندگی ذات

سے مراد توانائی مطلق تک رسائی ہے جس کی کوشش میں ماہرین طبعیات لگے ہوئے ہیں
یہ توانائی جب صفاتی پیکر اختیار کرتی ہے تو ریاضیاتی قوانین میں ظاہر ہوتی ہے اور جو قومیں
ان قوانین سے واقف ہوتی ہیں وہ اپنے مقاصد میں کبھی ناکام نہیں ہوتیں۔
زیدی صاحب جو بہت غور سے میری باتیں سن رہے تھے فرمانے لگے کہ آج آپ نے
میری فکر کے لیے بہت اہم مواد فراہم فرمایا ہے۔ میں آپ کی باتوں پر ضرور غور کروں گا۔
ہماری باتوں میں پانچ بج گئے۔ جوش صاحب بھی بیدار ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب وہ غسل سے
فارغ ہو کر آئے تو ہم لوگوں نے چائے پی اور واہ کینٹ سے رخصت ہو کر اسلام آباد آ گئے۔
میں اپنے گھر چلا گیا اور جوش صاحب اپنے گھر۔

دیکھو تو کوئی جوش پہ کیا بانکپن ہے آج:

دوسرے دن جب میں گیارہ بجے کے قریب جوش صاحب کے گھر گیا تو جوش صاحب
بہت خوش تھے۔ ان کے گھر لاہور سے ہاشمی صاحب ان کی بیگم اور بیٹیوں کے ساتھ ان کی
سیل فشاں آفرانساں بھی آئی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ایسے موقع پر مجھے اپنے گھر واپس چلے
جانا چاہیے مگر جیسے ہی میں نے اجازت چاہی تو جوش صاحب نے کہا کہ اگر سمن آپ کو اجازت
دے دیں تو آپ ضرور چلے جائیے۔ جب میں نے سمن سے اجازت چاہی تو وہ کہنے لگیں کہ
آپ فرزانہ اور رخسانہ سے پوچھ لیں اگر وہ ہاں کہہ دیں تو ضرور چلے جائیے۔ رخسانہ جو وہیں بیٹھی
ہوئی تھیں کہنے لگیں ارے دیکھیے نا خورشید صاحب موسم کس قدر خوبصورت ہو رہا ہے۔ کیسی
گھٹائیں چھا رہی ہیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہے۔ ہمارا ارادہ شکر پڑیاں اور راول ڈیم دیکھنے کا
ہے۔ کیا آپ ہمارے ساتھ نہیں چلیں گے؟ اجی حضرت کیا آپ معتقد میر نہیں ہیں جو کہتے
ہیں کہ:

میر اب بہار آئی صحرا میں چل جنوں کر
نادان فصل گل میں کوئی بھی گھر رہے ہے

میں نے کہا جناب میں تو معتقد جوش ہوں جن کا حکم ہے کہ:

آ دیکھ تو ساون کے برستے ہوئے لمحات — ہو جائے گا کل خاک یہ مجموعۂ ذرات
کرتا نہیں کیوں عشق و جوانی کی مُدارات — اس رت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات

برسات ہے، برسات ہے اے رندِ خرابات

تو خواتین و حضرات فوراً اٹھ جائیے اور گاڑی میں بیٹھ جائیے اور نعرہ زن ہو جائیے کہ:

آ مست گھٹاؤں کی طرح دشت میں جھومیں
چھلکائیں سے ہوش ربا جام کو چومیں
کیا دہر دو عالم کو کریں غرق سبو میں
ہستی سے گزر جائیں مچلتے ہوئے دھومیں

جوش صاحب نے کہا کہ چلو آج ہم سب کھانا بھی باہر کسی اچھے سے ہوٹل میں کھائیں گے۔ چنانچہ ہم سب جوش صاحب کی گاڑی میں روانہ ہو گئے۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ گاڑی تم چلاؤ۔ پہلے ہم لوگ شکر پڑیاں گئے۔ اسلام آباد ویسے ہی بہت خوبصورت شہر ہے اگر اس کو عروس البلاد کہا جائے تو ہرگز مبالغہ نہ ہو گا اور پھر جب بادل چھائے ہوئے ہوں، ہر طرف سبزہ ہو، چنبیلی اور گلاب کے پھول ہر سو حسن اور خوشبو ارزانی کیے ہوئے ہوں تو ہر انسان جولانیوں پر ہوتا ہے۔ میں نے حسن سے کہا۔ ذرا دیکھیے۔

سبزے کا فرش، ابر کا خیمہ، گلوں کا عطر — گلشن میں اہتمام ہے کیا کیا ترے لیے

جوش صاحب کہنے لگے ارے یہ اتنا پرانا مال تم کہاں سے لے آئے۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ شعلہ و شبنم کی غزل کا شعر ہے مگر دیکھیے شاعری کبھی پرانی نہیں ہوتی۔ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آپ نے یہ شعر ابھی اسی موقع کے لیے کہا ہے اور یہ اشعار بھی تو آپ نے اسی موقع کے لیے کہے تھے۔

لرزاں تھی جس کے وعدہ فردا سے زندگی
پہلو میں پھر وہ شاہد پیماں شکن ہے آج

اس لیے میری دلی دعا ہے کہ:

زخم نگاہ بد سے بچاتے رہے خدا — دیکھو تو کوئی جوش پہ کیا بانکپن ہے آج

حسن کہنے لگیں، سچ کہیے جوش صاحب یہ اشعار آپ نے اس موقع کے لیے کہے تھے اگر اس موقع

کے لیے کہے تھے تو خورشید صاحب کو کیسے یاد ہو گئے؟

جوش صاحب نے انتہائی معصوم صورت بنا کر کہا کہ تعجب ہے خورشید علی خاں نے یہ کہاں سے سن لیے۔

سرِ خدا کہ عارفِ دانا بہ کس نہ گفت

در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

رخسانہ کہنے لگیں خورشید صاحب اگر آپ کو جوش صاحب کی نظم برسات ہے برسات ہے اے رندِ خرابات مکمل یاد ہو تو سنائیے۔ میں نے جوش صاحب سے دریافت کیا کہ اگر اجازت ہو تو عرض کروں۔ جوش صاحب نے کہا ضرور ضرور۔ میں نے وہ نظم سنائی۔

برسات ہے برسات

آ دیکھ تو ساون کے برستے ہوئے لمحات ہو جائے گا کل خاک یہ مجموعۂ ذرات
کرتا نہیں کیوں عشق و جوانی کی مدارات اس رت میں عبادت ہے حسینوں کی ملاقات

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رندِ خرابات

ساحل پہ نئی آن ہے ہر ماہ لقا کی ہر گام پہ کھلتی ہے گرہ زلفِ رسا کی
اللہ ری کرامت اثرِ لغزشِ پا کی رہ رہ کے چھلکتی ہے کمر ارض و سما کی

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رندِ خرابات

گرداب میں بادل کے ہے خورشید کا بیڑا کھاتا ہوا پھرتا ہے تھپیڑے پہ تھپیڑا
کس فصل میں چھیڑے گا جواب راگ نہ چھیڑا نوخیز امنگیں ہیں کہ پانی کا دڑیڑا

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رندِ خرابات

ہر ذرۂ ناچیز ہے اِس وقت شرابی ہر رندِ خوش اوقات کا چہرہ ہے شہابی
اربابِ شریعت کو مبارک ہو خرابی پیمانہ جھلکتا ہے دہکتی ہے گلابی

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

میدان میں رقصاں ہے برستا ہوا پانی
یاروں کی طبیعت میں ہے دریا کی روانی
پہنے ہے کوئی سرخ لباس اور کوئی دھانی
ہر چہرۂ رنگیں سے ابلتی ہے جوانی

برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

گلزار میں کوئل کی صدا گونج رہی ہے
کہسار میں پُرشور ہوا گونج رہی ہے
قلقل سے جنوں خیز فضا گونج رہی ہے
میدان میں گھنگھور گھٹا گونج رہی ہے

برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

کافر ہوں اگر لاؤں نہ تقوے پہ تباہی
بوتل کی یہ سرخی یہ گھٹاؤں کی سیاہی
اور اس پہ کسی شوخ کی دزدیدہ نگاہی
بھر جام کے آتی ہے جماہی یہ جماہی

برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

انبوہ حسینوں کا ہے دریا کے کنارے
طوفاں ہے تلاطم ہے ترانے ہیں ترارے
پھرتے ہیں نظر باز بھی سینوں کو ابھارے
جھولے ہیں، چھما چھم ہے، چھما چھم ہیں اشارے

برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

آ مست گھٹاؤں کی طرح دشت میں جھومیں
چھلکائیں سے ہوش ربا جام کو چومیں
کیا دہر، دو عالم کو کریں غرق سبو میں
ہستی سے گزر جائیں مچاتے ہوئے دھومیں

برسات ہے برسات ہے برسات
برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

رنگین فضاؤں میں گھٹا جھوم رہی ہے
دریا میں تلاطم ہے ہوا جھوم رہی ہے
لہروں پہ ملہاروں کی صدا جھوم رہی ہے
ساغر میں مے ہوش ربا جھوم رہی ہے

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

ستا بھی ہے موسم کے خنک راگ شرابی | ہاں موڑ سوئے ساغر و مل باگ شرابی

پیمانے سے پانی میں لگا آگ شرابی | ہاں کاگ اڑا کاگ اڑا کاگ شرابی

برسات ہے برسات ہے برسات ہے برسات

برسات ہے برسات ہے اے رند خرابات

ب نے بے ساختہ کہا واہ واہ جناب آپ کا حافظہ تو کمال کا ہے۔ میں نے کہا اس میں حافظے کا کمال نہیں اس وقت کے ماحول کا کمال ہے۔ اپنا حال تو یہ ہے کہ:

پھر دیکھیے انداز گل افشانی گفتار

رکھ دے کوئی پیمانہ و صہبا مرے آگے

غرض یہ کہ شعر و شاعری اور دلچسپ گفتگو کے دوران میں جب ہم لوگ شکر پڑیاں کی سیر سے فارغ ہوئے تو دو بج چکے تھے۔ جوش صاحب نے کہا کہ پہلے چل کر کسی چائینز ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ پھر راول ڈیم چلیں گے۔ چنانچہ ہم لوگ آب پارہ کے ایک چائینز ہوٹل میں گئے۔ وہاں کھانا کھایا اور پھر راول ڈیم گئے۔ تمام راستے ویسی ہی دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ غرض خوب گھوم گھام کر شام کو پانچ بجے گھر پہنچے۔ میں نے جوش صاحب سے اجازت لی اور اپنے گھر آ گیا۔

حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد:

دوسرے دن شام کو جب میں جوش صاحب کے گھر گیا تو دیکھا کہ وہ بہت اداس اور افسردہ اکیلے بیٹھے ہوئے ہیں۔ میں نے سلام کیا تو میری طرف اس طرح آنکھیں اٹھا کر دیکھا کہ جیسے کوئی نہایت تاریک غار سے جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔ میں فوراً ان کے قریب بیٹھ گیا۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبانے لگا۔ میں نے پوچھا، حضور والا! مزاج دشمناں ناساز تو نہیں ہے؟ یہ آپ اس وقت تنہا کیوں ہیں؟ اور آپ کے مہماں کہاں ہیں؟

ہونٹ ہیں خشک اور آنکھیں نم | خیریت تو ہے قبلۂ عالم؟

جوش صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لی جیسے کہ رہے ہوں۔

کیوں کر تمھیں بتائیں ہم اے خستگانِ غم
کیا کربِ جاں گداز ہے عشرت گزیدگی

جب میں نے بہت مجبور کیا تو کہنے لگے کہ کل جب تم گھر چلے گئے تو "اس" کے والدین لاہور سے آ گئے۔ اس کی والدہ نے "اس" سے کہا کہ میں نے تو تم کو اپنی خالہ کے گھر رہنے کے لیے کہا تھا تم یہاں کیوں چلی آئیں؟ پھر وہ "اس" کو اپنے ساتھ لے گئے۔ حالانکہ رخسانہ اور فرزانہ نے ان کو بہت سمجھانے کی کوشش کی کہ کچھ دنوں کے لیے اس کو ان کے ساتھ رہنے کی اجازت دے دیں مگر وہ ظالم عورت اس کو اپنی چونچ میں دبا کر لے گئی۔ آج صبح سے بیٹھا اس کا انتظار کر رہا ہوں مگر نہ وہ آئی اور نہ اس کا ٹیلی فون ہی آیا۔ انتظار کے اس کرب میں کچھ اشعار ہو گئے ہیں، تم بھی سن لو۔

مجھ تک آنے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
منہ دکھانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
اے مری بلبلِ شیریں سخن و خوش آواز
چہچہانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
بسترِ خواب پر اے ناز بھری گل بدنی
دسمسانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
اے مرے باغِ تمنا کی نسیمِ سحری
سنسنانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
اپنے آنگن میں مرے پاؤں کی آہٹ سن کر
آنکھ اٹھانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
اے دہن بستہ گلِ جانِ سخن بنتِ صبا
مسکرانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے

اپنے شدت سے دھڑکتے ہوئے دل کی روداد
لب پہ لانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے
بے تکلف مرے پہلو میں بطرز پیشیں
بیٹھ جانے سے تجھے روک دیا ہے کس نے

میں نے کہا جوش صاحب میں آپ کو صبر کی تلقین کرنے کی جرات تو نہیں کر سکتا مگر مجھے رہ رہ کر اس غریب لڑکی کا خیال آ رہا ہے۔ نہ معلوم وہ کس حالت میں ہوگی اور اس کے ماں باپ کا اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ جوش صاحب نے کہا۔ ارے خورشید علی خاں کل کا دن کس قدر پر مسرت تھا اور آج دیکھو کہ صبح قیامت ہے۔

انھیں سے کھائی ہیں کانٹوں کی لاکھوں برچھیاں میں نے
وہ دو سانسیں جو لی تھیں بوئے گل کے درمیاں میں نے

میں نے رخسانہ اور فرزانہ کو آواز دے کر بلایا اور جب وہ آ گئیں تو میں نے ان سے کہا کہ وہ جوش صاحب کے پاس بیٹھی رہیں اور ان سے علمی اور ادبی گفتگو کریں تاکہ ان کا دل بہلتا رہے۔ تھوڑی دیر میں ہاشمی صاحب بھی آ گئے۔ اور مجھ سے کہنے لگے کہ خورشید صاحب ہم لوگ کل مری جا رہے ہیں۔ ہمارے ساتھ بابا (جوش صاحب) بھی جائیں گے۔ آپ بھی چلیے۔ میں نے کہا مجھے ضروری کام سے کراچی پہنچنا ہے اس لیے مجبور ہوں ورنہ میں بھی ضرور چلتا۔

جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ اگر چل سکو تو ضرور چلو مگر میں آپ کو مجبور نہیں کروں گا۔ مگر میں نے معافی مانگ لی۔

دوسرے دن جوش صاحب اور ہاشمی صاحب اور ان کے بیوی بچے سب صبح ہی صبح مری روانہ ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں اور میری بیوی ریل کار سے لاہور آ گئے۔ لاہور آنے کے تیسرے دن حسن کا ٹیلی فون آیا کہ "کیا آپ کو معلوم ہے کہ جوش صاحب بھی لاہور آئے ہوئے ہیں اور ذیشان صاحب کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں"۔ میں نے کہا مجھے نہیں معلوم مگر میں معلوم کر کے بتاؤں گا۔

اس کے بعد میں نے ذیشان صاحب کے گھر ٹیلی فون کیا تو کسی نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا ٹیلی فون نمبر بدل گیا ہے۔ اور جب بدلے ہوئے نمبر پر



کُل پاکستان مشاعرہ بسلسلہ محمد خان ۱۹۶۵ء

(فرش پر بیٹھے ہوئے) فرید جاوید، وحید چغتائی اور دوسرے (ڈائس پر بیٹھے ہوئے) دائیں سے
الیاس عشقی، راغب مراد آبادی، جوش ملیح آبادی، علمدار رضا، فیض احمد فیض، یوسف جمال
اور احمد فراز (کھڑے ہوئے) وسط میں اقبال صفی پوری، سراج الدین ظفر، آفاق صدیقی، حسن حمیدی
محسن بھوپالی اور دوسرے

ٹے لی فون کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نمبر خراب ہے۔ ایک دن اختر میاں نے بتایا کہ ذیشان صاحب ان کو کہیں بازار میں ملے تھے اور ان سے پوچھ رہے تھے کہ جوش صاحب کیا ان کے گھر مقیم ہیں؟ اختر علی خاں نے کہا کہ وہ تو شاید آپ کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں؟ تو ذیشان صاحب نے کہا کہ وہ آئے تو ان کے گھر ضرور تھے مگر یہ کہہ کر کہ وہ خورشید علی خاں سے ملنے اختر علی خاں کے گھر جا رہے ہیں، چلے گئے اور اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہیں۔ میں نے اختر میاں سے کہا کہ کسی طرح جوش صاحب کا پتا چلاؤ کہ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں مگر ان کا کوئی پتا نہ چل سکا۔

دوسرے دن شام کے وقت حسن کا دوبارہ ٹیلی فون آیا۔ وہ رو رہی تھی۔ مجھ سے کہنے لگی خورشید صاحب میرے والدین کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہے کہ میں جوش صاحب سے محبت کرتی ہوں۔ انھوں نے مجھے کمرے میں بند کر دیا ہے۔ کل جوش صاحب ہمارے گھر آئے تھے میرے امی ابا ان سے نہیں ملے اور نہ مجھے ملنے دیا۔ ملازم سے کہلوا دیا کہ وہ یہاں نہ آیا کریں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں اب کے وہ ہاشمی صاحب کے گھر بھی نہیں ہیں۔ اس وقت امی ابا باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں بڑی مشکل سے آپ کو ٹیلی فون کر رہی ہوں۔ خورشید صاحب میں بہت پریشان ہوں۔ خدارا بتائیے کہ میں کیا کروں۔ میں نے کہا کہ آپ تو بہت بہادر خاتون ہیں اور ماہر نفسیات بھی۔ اگر آپ نے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار کیا تو پابندی اور سخت ہو جائے گی۔ آپ اپنی روزمرہ کی زندگی کے معمولات اسی طرح ادا کرتی رہیے جیسے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش ہی نہیں آیا۔ ابھی آپ کے والدین کو صرف شبہ ہے۔ اس شبہ کو یقین میں تبدیل مت ہونے دیجیے۔ چند دنوں میں جب والدین مطمئن ہو جائیں گے تو یہ پابندیاں خود بخود ختم ہو جائیں گی۔ میں جوش صاحب کو تلاش کر رہا ہوں مگر مجھے ان کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ اگر میری ملاقات ہو گئی تو میں انھیں سمجھا کر اسلام آباد روانہ کر دوں گا۔ اگر آپ کو موقع ملے تو آپ کچھ دنوں کے لیے اپنے عزیز کے گھر کراچی آ جائیے گا۔ اس کا جواب دوسری طرف سے کچھ نہیں آیا اور ٹیلی فون رکھ دیا گیا۔ دوسرے دن اتفاق سے میری ملاقات ذیشان صاحب سے ہو گئی تو معلوم ہوا کہ جوش صاحب واپس اسلام آباد چلے گئے۔

میں اور میری بیوی لاہور سے ملتان چلے گئے جہاں میرے بھائی حمایت علی خاں رہتے تھے اور وہاں چند دن قیام کر کے دوسری جون کو ہم دونوں کراچی آ گئے۔ کراچی آنے کے بعد میں

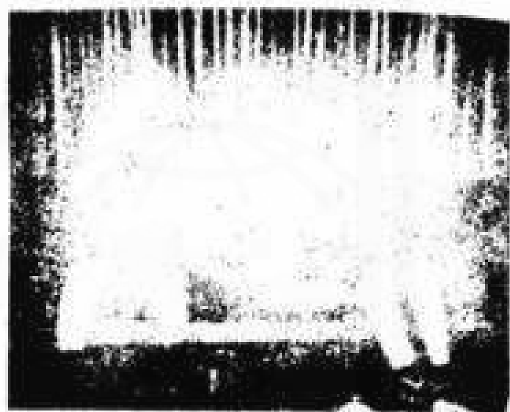
اپنے کاموں میں اس قدر مشغول ہو گیا کہ جوش صاحب کو کوئی خط بھی نہ لکھ سکا البتہ کبھی کبھی ٹیلی فون پر آپس کی خیریت کا تبادلہ ضرور ہو جاتا تھا۔

سمن اور جوش صاحب کی کراچی آمد:

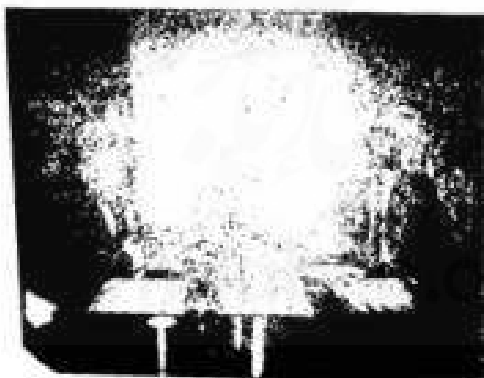
اس واقعہ کے کوئی سوا مہینے کے بعد ساتویں جولائی ۱۹۷۰ کو سمن کا ٹیلی فون لاہور سے آیا کہ وہ دوسرے دن تیز گام سے کراچی پہنچ رہی ہیں۔ میں انھیں کینٹ اسٹیشن پر ملوں۔ چنانچہ آٹھویں جولائی کو میں کینٹ اسٹیشن پہنچ گیا۔ جب گاڑی آئی تو میں ٹکٹ چیکر کے قریب گیٹ پر کھڑا ہوا تھا۔ گاڑی رکنے کے تھوڑی دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ ایک خاتون سیاہ برقعے میں ملبوس میرے قریب آئیں اور میرے سامنے آ کر اپنا نقاب الٹ کر کہا "آداب" میں نے دیکھا کہ سمن ہیں۔ ہم دونوں اسٹیشن سے باہر آئے اور وہ میری گاڑی میں بیٹھ کر کہنے لگیں خورشید صاحب آپ کو میں نے بہت زحمت دی ہے جس کی میں بے حد معافی چاہتی ہوں مگر مجھے آپ کے علاوہ یہاں کراچی میں اور کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جس کو اس بے تکلفی سے اتنی زحمت دیتی۔ میں نے کہا ارے آپ یہ کیا فرما رہی ہیں یہ تو میری خوش نصیبی ہے کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ اب والدین کا کیا حال ہے تو کہنے لگیں کہ ہاشمی صاحب کی بچیوں نے بڑی حد تک میرے والدین کے شک کو دور کر دیا ہے۔ میرے ساتھ رخسانہ اور فرزانہ بھی آنے والی تھیں مگر شاید وہ دو چار دن کے بعد کراچی آ جائیں البتہ جوش صاحب کل یعنی نویں تاریخ کو اسی تیز گام سے کراچی پہنچ رہے ہیں اور اس مرتبہ وہ آپ کے مکان پر قیام کریں گے۔ آپ ان کی مہمان نوازی کے لیے تیار ہو جائیے۔ ان کی ہی نہیں بلکہ ہم دونوں کی۔ میں نے کہا اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہوگی۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے

میں نے پوچھا تو اب آپ میرے ساتھ میرے غریب خانے پر چلیں گی؟ تو انھوں نے کہا جی نہیں یہاں میرے چچا رہتے ہیں۔ میں ان کے گھر قیام کروں گی البتہ آپ میرے چچا کا گھر دیکھ لیجیے تاکہ جب جوش صاحب آپ کے گھر آ جائیں تو آپ آ کر مجھے لے جائیں۔ میں نے کہا اب آپ بالکل فکر نہ کریں اور اپنے کراچی کے قیام کو زیادہ سے زیادہ پر مسرت بنائیں۔ چلیے



خورشید علی خاں، جوگش صاحب، سلامت علی خان
بی - ۱۵، بلاک "این" والے مکان میں





(کھانے کی میز پر) خورشید علی خاں، حضرت جوشؔ، سلامت علی خاں "بی۔۱۵ بلاک "این" والے مکان میں



خورشید علی خاں اور حضرت جوشؔ، بی۔۱۵ بلاک "این" والے مکان میں

چلیے جوش صاحب کی ایک سنت پر عمل کرتے ہوئے آپ کو برنس روڈ کی دلبسار لسی پلائیں پھر آپ کو آپ کے چچا صاحب کے گھر پہنچا دیں گے۔ چنانچہ ہم دونوں برنس روڈ آئے وہاں سے لسی پی اور پھر فیڈرل بی ایریا میں سمن کو ان کے چچا کے گھر پہنچا کر میں اپنے گھر آ گیا۔

گھر آنے کے بعد میں نے راغب صاحب کو ٹیلی فون کیا کہ کیا ان کو معلوم ہے کہ جوش صاحب کل یعنی نویں جولائی کو تیز گام سے کراچی پہنچ رہے ہیں؟ راغب صاحب نے کہا کہ جی ہاں۔ جوش صاحب نے ٹیلی فون پر ان کو بتایا تھا کہ وہ بدھ کے دن کراچی آ رہے ہیں اور یہ بھی کہا تھا کہ آپ کو اطلاع کر دوں کہ اس دفعہ وہ آپ ہی کے ساتھ قیام کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ وہ رات کو مجھے مطلع کرنے والے تھے۔ خیر دوسرے دن میں، سلامت علی خان، راغب صاحب کینٹ اسٹیشن پہنچ گئے۔ جوش صاحب کو لے کر جب ہم لوگ اسٹیشن سے روانہ ہوئے تو سلامت علی خاں نے کہا کہ جوش صاحب آج آپ میرے گھر قیام فرمایئے، شام کو میں نے چند دوستوں کو مدعو کیا ہے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد اگر آپ چاہیں تو اپنے گھر چلے جایئے۔ میں نے کہا اس دفعہ جوش صاحب غریب خانے کو رونق بخشنے والے ہیں۔ جوش صاحب نے کہا ارے تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہو گئی۔ میں نے کہا کہ آپ کے چاہنے والے کیا آپ کے چہرے سے اتنی بات بھی نہیں سمجھ سکتے کہ آپ کے دل میں کیا ہے؟

جوش صاحب کہنے لگے۔ اب باتیں نہ بناؤ سچ بتاؤ تمھیں کیسے معلوم ہوا۔ میں نے کہا مجھے راغب صاحب نے بتایا ہے مگر ان کے علاوہ بھی مجھے کشف کے ذریعے سے آپ کا ارادہ معلوم ہو گیا تھا۔ مگر اب اس بات کو یہیں رہنے دیجیے تفصیل بعد کو معلوم کر لیجیے گا۔ جوش صاحب کہنے لگے کہ کیا بغیر لسی پلائے ہی گھر پہنچاؤ گے؟ میں نے کہا حضور بھلا ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟ یہ تو آپ کی سنت ہے اور میں تو لاہور سے آنے والے مہمانوں کو بھی یہاں سے لسی پلائے بغیر ان کے گھر نہیں پہنچاتا۔ جوش صاحب میرا اشارہ سمجھ گئے۔ فرمایا کیا واقعی؟ میں نے کہا جی ہاں واقعی۔ راغب صاحب اور سلامت علی خاں پیچھے کی نشست پر بیٹھے باتوں میں مشغول تھے اور جوش صاحب اگلی سیٹ پر میرے ساتھ تھے۔ ہم لوگ برنس روڈ پہنچے اور جب دلبسار لسی کی دوکان کے سامنے میں نے گاڑی کھڑی کی تو لسی والے نے چار گلاس لا کر ہمیں گاڑی میں دیے اور مجھ سے کہنے لگا۔ کل آپ کے ساتھ آپ کی صاحبزادی تھیں؟ میں نے کہا

جی نہیں وہ میری بہن تھیں۔ خیر لسی پی، دام دیے اور سلامت علی خاں کے گھر آ گئے۔ اس دن جوش صاحب ان ہی کے گھر ٹھہرے۔ شام کو اور احباب بھی آ گئے۔ ہمارے کسٹم کے دوست سلطان خاں صاحب، سرور بارہ بنکوی اور راغب صاحب اور میں۔ ہم نے رات کا کھانا بھی سلامت علی خاں ہی کے گھر کھایا پھر میں جوش صاحب کو اپنے گھر لے آیا۔ گھر آ کر میں نے جوش صاحب کو سمن کے متعلق سب باتیں بتائیں اور یہ بھی بتا دیا کہ ان کے چچا کا گھر بھی دیکھ آیا ہوں۔ دوسرے دن صبح نو بجے سمن کا ٹیلی فون آیا کہ میں آ کر ان کو اپنے گھر لے جاؤں۔ چنانچہ جب میں جانے لگا تو جوش صاحب نے کہا کہ وہ بھی ساتھ جانا چاہتے ہیں مگر میں نے کہا کہ اگر اس کے چچا نے دیکھ لیا تو اس کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ تو جوش صاحب مان گئے اور میں جا کر سمن کو اپنے گھر لے آیا۔ دس بجے سلامت علی خاں بھی آ گئے۔ جوش صاحب یہ نہیں چاہتے تھے کہ سلامت علی خاں کو سمن کے متعلق کچھ معلوم ہو اس لیے میں ان کو لے کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گیا۔ خان صاحب نے پوچھا جوش صاحب کہاں ہیں۔ میں نے کہا ان کی طبیعت کچھ خراب ہے اس لیے سو رہے ہیں۔ دروازہ بند ہے اس لیے میں نے ان کو آواز نہیں دی۔ سلامت علی خاں یہ کہہ کر کہ وہ شام کو آئیں گے، چلے گئے۔ تقریباً ایک بجے سمن بھی اپنے گھر چلی گئیں۔

سہ پہر کو جوش صاحب اور میں سجاد صاحب کے گھر گئے۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور بیمار تھے۔ جوش صاحب نے انھیں کچھ رقم دی اور ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر عبدالخالق صاحب سگریٹ والے کی دوکان واقع بولٹن مارکیٹ گئے۔ وہاں کچھ دیر بیٹھ کر شام کے قریب گھر آ گئے۔ یہاں تمام احباب جمع تھے۔ سورج غروب ہوا تو جوش صاحب پیمانہ بکف طلوع ہوئے۔ تھوڑی دیر میں شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ جوش صاحب نے کچھ نئی رباعیات سنائیں۔ اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔

عبدالخالق صاحب کے گھر دعوت اور تخلیق کائنات پر گفتگو:

چودھویں مئی بروز پیر ۱۹۷۵ء جوش صاحب کی دعوت جناب عبدالخالق صاحب سگریٹ والے کے گھر تھی۔ جوش صاحب کے ساتھ راغب صاحب مرادآبادی، سلامت علی خاں صاحب

اور میں مدعو تھا۔ عبدالخالق صاحب نے رئیس صاحب امروہوی اور ان کے بھائی سید محمد تقی صاحب کو بھی مدعو کیا تھا۔ ان کے علاوہ کئی شعرا اور دانشور بھی مہمانوں میں شریک تھے۔ ہم لوگ شام سے کچھ پہلے ہی پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں رئیس صاحب اور تقی صاحب بھی آ گئے۔ سورج کے غروب ہوتے ہی دعوت شروع ہو گئی۔ عبدالخالق صاحب نے گفتگو کا آغاز ایک سوال سے کیا۔ انھوں نے فرمایا۔ یہ کائنات ایک سربستہ راز ہے۔ ہم کو نہ اس کی ابتدا کی خبر ہے اور نہ انتہا کی۔ یہ سب کیا ہے، کہاں سے آیا ہے، اس کا انجام کیا ہو گا؟ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔

جوش صاحب نے کہا۔ جی ہاں:

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

میں نے عرض کیا کہ جوش صاحب کا تو تمام کلام اور ان کی ساری فکر ہی انھی سوالات اور ان کے جوابات پر مبنی ہے لیکن اگر اجازت ہو تو میں مختصراً کچھ عرض کروں۔

سب نے کہا۔ ہاں ہاں، آپ فرمائیں۔

میں نے کہا۔ یہ تمام سوالات اس وقت سے انسانی فکر کا مرکز رہے ہیں جس وقت سے اس نے شعور کی آنکھ سے خارجی دنیا کو دیکھنا شروع کیا۔ رفتہ رفتہ اس کے تجربات، توہمات اور فکری صلاحیتوں کے مطابق اس نے ان سوالات کے جوابات دیے۔ اس میں صاحبانِ اقتدار کی اپنی مصلحتیں بھی شامل رہیں۔ آہستہ آہستہ انسانی شعور نے اس کائنات میں اپنے سے زیادہ طاقتور قوتوں کو محسوس کرنا شروع کیا۔ پھر جب فلسفے نے جنم لیا تو اس نے بھی ان سوالات کے جوابات اپنے اپنے تجربوں کے مطابق دینے شروع کر دیے مگر فلسفہ عام طور پر ٹھوس سائنٹیفک تجربات پر مبنی نہیں ہوتا ہے اس لیے اس کی تاویلیں زمانے کے ساتھ بدلتی چلی گئیں۔ چینی، آریائی، ہندی، سومیری، مصری مفکروں نے اپنے اپنے نظریات پیش کیے مگر یونانی فلاسفہ حقیقت کی تلاش میں حقیقتوں سے زیادہ قریب رہے اور اسی فکر نے مشرقِ وسطیٰ کے مذاہب کی فکر کو بھی متاثر کیا جس نے یورپی فکر میں انقلاب پیدا کیا مگر یونانی فلسفہ بھی کلی حقیقت تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔ مذاہب نے اس مسئلے کا حل یہ پیش کیا کہ اس

کائنات میں ایک طاقت کو مشخص کر کے اس کا ایک نام رکھ دیا اور پھر یہ کہہ دیا کہ یہ سب کائنات اسی خالق کے حکم کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے اور اس وقت تک باقی رہے گی جب تک خالق اس کو باقی رکھنا چاہے گا۔ اس سے عام ذہن تو مطمئن ہو گیا مگر دور حاضر کا سائنٹفک ذہن مذاہب کی تاویلات سے مطمئن نہیں ہے وہ اس کائنات کی ماہیت معلوم کرنا چاہتا ہے چنانچہ سائنسی تحقیقات کے ذریعے سے انسان اس تجسس میں لگا ہوا ہے کہ ٹھوس حقائق معلوم کیے جائیں اور اب آہستہ آہستہ حقائق پر سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے اب سائنس اس کائنات میں ایک توانائی مطلق کے ناقابل تردید وجود کے یقین تک تو پہنچ گئی ہے اور یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ یہ تمام کائنات اسی توانائی مطلق کی صفاتی جلوہ گری ہے لیکن ابھی تک انسانی ذہن کی رسائی اس توانائی مطلق کے جس ابتدائی صفاتی یا مادی وجود تک ہو سکی ہے وہ جوہر (ایٹم) اور اس کے اجزائے ترکیبی یعنی Particles ہیں مگر سائنس ابھی تک یہ نہیں معلوم کر سکی کہ توانائی جوہر میں کیسے تبدیل ہو جاتی ہے چنانچہ وہ جوہر کو انتہائی ابتدائی وجود ماننے کے لیے تیار نہیں ہے کیونکہ جوہر میں توانائی کی وحدت اپنے چار مظاہر میں ظاہر ہوتی ہے اور سائنس کی منزل وحدت کی تلاش ہے۔ اس لیے جوہر توانائی کا اولین مظہر نہیں ہو سکتا۔ بہرحال سائنس کی تحقیق کا طریقہ کار تو یہ ہے کہ وہ ناقابل تردید شہادتوں کے ذریعہ سے آہستہ آہستہ آگے بڑھتی ہے اور جو علم توانائی اور جوہر کی تحقیق میں لگا ہوا ہے وہ ہے طبعیات Physics ۔ اس علم نے اب تک جتنی معلومات حاصل کی ہیں اس سے اس کائنات کی ماہیت کا سراغ مل جاتا ہے۔ طبعیات کے بعد جو علم ہماری رہبری کرتا ہے وہ ہے کیمیا Chemistery ۔ جب ایک سے زیادہ جوہر ملتے ہیں تو وہ مالی کیول بناتے ہیں اور یہیں سے علم کیمیا کی ابتدا ہوتی ہے اور انہی مالی کیول سے یہ تمام کائنات عالم وجود میں آئی ہے۔

یہ کائنات انتہائی منظم قوانین کے تحت مختلف ارتقائی منازل سے گزرتی رہتی ہے اس کی محبوب صفت تغیر ہے یعنی توانائی مطلق ہر لحہ نئی شان میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہے مگر یہ سب تغیر صرف صفاتی پیکر میں واقع ہوتا رہتا ہے۔ توانائی میں کسی قسم کی کمی یا زیادتی ممکن نہیں۔ بہرحال مالی کیولر سطح پر جو تبدیلیاں واقع ہوتی رہتی ہیں ان کے متعلق قوانین علم کیمیا اور اس کی ہزاروں شاخیں دریافت کر رہی ہیں اور یہی مالی کیول جب ایک خلیہ Cell بناتے ہیں جس کو

DNA کہا جاتا ہے وہاں سے BioChemistery شروع ہو جاتی ہے یہ خود کار حیاتیاتی اکائی ہے جہاں سے حیات کا آغاز ہوتا ہے اور یہی خلیے مل کر اجسام بناتے ہیں جہاں سے حیاتیات Biology کا علم شروع ہوتا ہے جو آگے چل کر دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک حیوانیات Zoology دوسرا نباتیات Botany پھر حیوانیات کی ارتقائی شکل انسان ہے اور اس کے رویوں کا علم نفسیات کہلاتا ہے اور پھر انسان کے انفرادی اور اجتماعی اعمال سے تمام عمرانی علوم پیدا ہوتے ہیں۔ ان ہی کے ساتھ ساتھ زمین چاند سورج ستاروں اور کہکشاؤں کی تحقیق ہو رہی ہے اور ان کی ماہیت دریافت کی جا رہی ہے اور یہ علوم اس قدر ذیلی شاخوں میں تقسیم ہو گئے ہیں کہ ان کا شمار کرنا بھی نہایت مشکل کام ہے کیونکہ جوش صاحب کے بقول:

گرہ یوں کھل رہی ہے ہر نفس ذوق نظارہ کی
کہ اک ادنیٰ سی شے اب ایک عالم ہوتی جاتی ہے

اور

ہر ذرۂ مختصر کے اتنے رخ ہیں   گننے بیٹھو تو ڈوب جائیں اعداد

اگر آج تحقیق اور جستجو کا یہ عالم ہو تو ہم آج سے ہزاروں سال قبل کے فلسفہ کے ذریعہ اس کائنات کی پیچیدگیوں کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ آج ہم کو ہمارے بیشتر سوالات کے جوابات صرف سائنس ہی کے ذریعے سے ملنے ممکن ہیں اور جیسے جیسے سائنسی علوم ترقی کر رہے ہیں ہماری معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس لیے ہم کو چاہیے کہ اپنا ذہن کھلا رکھیں اور نئے علوم کی روشنی میں اپنے خیالات کو منظم کرتے رہیں۔ اگر ہم اپنے دماغ کے دروازے بند کر کے قدیم عقائد ہی میں الجھے رہے تو اس پیچیدہ کائنات کے اسرار تک نہیں پہنچ پائیں گے۔

جوش صاحب کے اشعار سنیے:

متاع کفر ملے یا سعادت ایماں
جلال مشعل تحقیق ہرچہ بادا باد

غرض ہے علم سے اے جوش بت ملے کہ خدا
انخلاق پردہ اسرار ہرچہ بادا باد

علامہ اقبال کہتے ہیں۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل
یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہب مردان خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہب ملا و جمادات و نباتات

اس لیے ضروری ہے کہ ذہن کو عقائد کے طلسم کدے سے نکال کر سائنسی تحقیق و تجربات کی روشنی میں لایا جائے۔ پھر کائنات کے تمام سربستہ راز آہستہ آہستہ ہم پر منکشف ہوتے جائیں گے۔

عبدالخالق صاحب نے دریافت کیا تو کیا ہم اس توانائی مطلق کو خدا کہہ سکتے ہیں؟

میں نے کہا۔ ابھی یہ بات کہنا مشکل ہے کیونکہ ابھی ہم کو یہ نہیں معلوم کہ توانائی مطلق میں تبدیلی کیسے پیدا ہوتی ہے یعنی توانائی کس طاقت کے اثر سے جوہر میں تبدیل ہوتی ہے۔ کیا وہ کوئی خارجی طاقت ہے جو توانائی کو جوہر میں تبدیل کرتی ہے یا وہ داخلی طاقت کے ذریعہ سے خود بخود تبدیل ہو جاتی ہے۔ آئن سٹائن اس عمل کو ایک واقعہ (Event) کہتا ہے مگر اس کے متعلق خاموش ہے کہ یہ واقعہ کیسے وجود پذیر ہوتا ہے۔ بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ کوئی دوسری طاقت ہے جس نے اس کائناتی طاقت کو ذرات میں تبدیل کر دیا۔ اب دیکھیے غالب کیا کہتا ہے۔

ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

اسی تصور کو بیدل نے ایک سوال کے انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

کے کشید ہوا س فطرت کہ بہ قید باد من آمدی؟
تو بہار عالم دیگری ز کجا بہ ایں چمن آمدی؟

لیکن سائنس ابھی اس مسئلہ پر یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ ممکن ہے مستقبل میں سائنس اس راز پر سے پردہ اٹھانے کے قابل ہو جائے یا شاید یہ راز راز ہی رہے لیکن جہاں تک اس موجودہ کائنات کا تعلق ہے ہم کو یہ معلوم ہے کہ یہ انتہائی منظم اور ناقابل تغیر قوانین میں جکڑی ہوئی ہے۔ یہاں ہر عمل ایک نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ اگر ہم کو اپنی مرضی کے مطابق نتائج حاصل کرنا ہیں تو ہم کو وہ قوانین معلوم کرنا پڑیں گے جن سے ہمارے مطلوبہ نتائج حاصل ہو

سکیں۔ اور یہ قوانین معلوم کرنا ہمارے لیے ممکن ہے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے آج مختلف سائنسی علوم ہر شعبہ حیات میں علت اور معلول کے ان قوانین کی دریافت میں لگے ہوئے ہیں جن سے انسان انفرادی اور اجتماعی طور پر پرمسرت زندگی بسر کر سکے گا۔
جوش صاحب ہی کا ایک شعر ہے۔

مبارک باد ہاں اے ذوق تحقیق کہ ہر معلول ہے علت بداماں

عبدالخالق صاحب نے فرمایا۔ اب ایک سوال اور؟ یہ بتلایئے کہ کیا یہ توانائی مطلق قوت شاعرہ ہے۔ میرا مطلب ہے کیا اس میں شعور بھی ہے؟

میں نے عرض کیا۔ شعور کی پہچان کیا ہے؟ یہ انتہائی منظم کارخانہ حیات و کائنات جس کا ہر ذرہ ناقابل تغیر قوانین میں جکڑا ہوا ہے جن قوانین کی دریافت میں انتہائی ترقی یافتہ انسانی شعور سرگرداں ہے تو شعور کی اس سے بڑی شہادت اور کیا ہوگی۔ اس کائنات کی تشکیل و تغیر و ارتقا میں انتہائی عظیم الشان ذہن کارفرما ہے کہ دنیا کے تمام انسان اپنی بہترین ذہنی صلاحیتوں کو استعمال کر کے اس عظیم ذہن کی کارفرمائی کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے لیکن ابھی سائنس کی عمر ہی کتنی ہے؟ مجھے یقین ہے کہ جب انسانی ذہن اس عظیم ذہن کو پوری طرح سمجھ لے گا اس کی سمجھ میں خدا بھی آ جائے گا۔ پھر خدا اعتقاد کا مسئلہ نہیں رہے گا بلکہ عین الیقین ہو جائے گا۔ اس وقت جب انسان اللہ اکبر کہے گا تو اس کو "اکبر" کے معنی کی بے نہایت وسعت کا شعور ہو گا۔ اور اس وقت جب وہ "لا الٰہ الا اللہ" کہے گا تو اس کلمے کی عظمت اور حقیقت اس کے ذہن پر پوری طرح منکشف ہو گی۔ وہ ماسوا اللہ کے علاوہ کسی خداوند کو تسلیم نہیں کرے گا۔ انسان پھر کسی طاقت کے آگے سر جھکائے گا۔ وہ اللہ کے ناقابل تغیر قوانین کو تسلیم کرے گا۔ وہ مقام ہو گا جب انسان عبدیت کے حقیقی مفہوم کو سمجھے گا اور اسی وقت وہ خلافت الٰہی کے منصب پر فائز ہو گا۔ یہ تمام کائنات اس کے لیے مسخر ہو گی اور وہ جہاں سے جتنا چاہے گا استفادہ کر سکے گا اور یہی جنت کی زندگی ہو گی۔

مجھے یقین ہے وہ وقت ضرور آئے گا۔ اب آپ جوش صاحب کی ایک رباعی سنیے۔

جس وقت بہ فیضِ فکر و عقلِ جولاں انسان بنے گا تاجدار دوراں
مجھ کو نہ ملا تو اے نگارِ آفاق بچ کر مری اولاد سے جائے گا کہاں؟

عبدالخالق صاحب بہت غور سے میری باتیں سن رہے تھے۔ آخر میں کہنے لگے۔ خورشید صاحب! آج آپ نے میرے ذہن کے بہت سے جالے صاف کر دیے۔ سید محمد تقی صاحب نے فرمایا۔ خورشید صاحب آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ ملتے رہا کیجیے۔ اتنے میں کسی نے آکر بتایا کہ کھانا میز پر چن دیا گیا ہے۔ عبدالخالق صاحب نے جوش صاحب کو ان کی نشست ہی پر کھانا کھلا دیا۔ اس کے بعد شاعری کا دور شروع ہوا۔ جوش صاحب نے جتنی رباعیات سنائیں وہ انسانی عظمت، علم اور شعور کی برتری سے متعلق تھیں۔ تقریباً رات گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی اور ہم لوگ اپنے اپنے گھر لوٹے۔

دوسرے دن جوش صاحب کی دعوت ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر تھی۔ ڈاکٹر صاحبہ جوش صاحب کی دعوت کا بہت خاص اہتمام کرتی ہیں۔ کراچی کے شعرا اعلیٰ حکام اور موسیقی سے واقفیت رکھنے والے حضرات و خواتین اس دعوت میں مدعو ہوتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت بھی میرے اور راغب صاحب کے علاوہ پناہ علی شاہ سیکرٹری تعلیمات حکومت سندھ جناب جعفری صاحب (ICS) کمال اظفر صاحب کے سسر) جناب مشتاق احمد صاحب یوسفی پریسیڈنٹ یونائٹیڈ بنک، نواب چھتاری، آفتاب صاحب (سیکرٹری سہروردی صاحب) جناب محسن بھوپالی، سرور بارہ بنکوی سحر انصاری اور دیگر شعرا شریک محفل تھے۔ یہ محفل بھی نہایت دلچسپ رہی۔ شعرا نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ پھر جوش صاحب کو زحمت کلام دی گئی اور تقریباً ۱۱ بجے محفل برخاست ہوئی۔

مشتاق احمد صاحب یوسفی کے گھر دعوت:

دوسرے دن جوش صاحب کی دعوت مشتاق احمد صاحب یوسفی کے مکان پر تھی۔ یوسفی صاحب جوش صاحب کا بڑا احترام کرتے تھے۔ مجھے اکثر جوش صاحب کے ساتھ یوسفی صاحب کے دفتر جانے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت بھی جب وہ یونائٹیڈ بینک کے پریسیڈنٹ تھے اور اس وقت بھی جب وہ بینکنگ کونسل کے صدر تھے جب بھی جوش صاحب ان کے دفتر جاتے۔ یوسفی صاحب اپنے تمام کام ملتوی کر کے جوش صاحب کی خاطر تواضع میں لگ جاتے۔

جس دن یوسفی صاحب نے جوش صاحب کو اپنے گھر مدعو کیا تھا اس دن چند دوسرے

شرا عزیز و اقارب اور اہل دانش خواتین و حضرات کو بھی دعوت دی تھی ۔ ان کو جوش صاحب کی یہ عادت بھی معلوم تھی کہ جوش صاحب غروب آفتاب کے ساتھ طلوع ہو جاتے ہیں اور غالباً اس بات کا اہتمام وہ اپنے مکان پر نہ کر سکتے ہوں گے اس لیے شام چار بجے اپنے ایک آدمی کے ہاتھ ایک بوتل بھجوا دی ۔ وہ صاحب یہ تحفہ لے کر میرے گھر تشریف لائے اور مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں وہ تحفہ جوش صاحب تک پہنچا دوں ۔ میں نے وہ بوتل جوش صاحب کو دے کر ان حضرت کا پیغام بھی پہنچا دیا ۔ جوش صاحب برا مان گئے اور بوتل لوٹا دی ۔ جب شام ہوئی تو جوش صاحب مجھ سے کہنے لگے آج یوسفی کی دعوت ٹال جاؤ ۔ تم ان کو ٹیلی فون کر کے کہہ دو کہ جوش صاحب کی طبیعت خراب ہے وہ آج ان کے گھر نہ آ سکیں گے ۔ چنانچہ میں نے ٹیلی فون کر کے یوسفی صاحب کو جوش صاحب کا پیغام پہنچا دیا مگر ۸ بجے برنی صاحب کا ٹیلی فون آیا اور انھوں نے مجھ سے یہ خواہش ظاہر کی کہ میں کسی طرح جوش صاحب کو لے کر کم از کم آدھے گھنٹے کے لیے یوسفی صاحب کے مکان پر آ جاؤں ۔ برنی صاحب نے فرمایا کہ یوسفی صاحب نے جوش صاحب کی دعوت کا بہت پرتکلف اہتمام کر رکھا ہے اور بہت سے مہمانوں کو مدعو کر لیا ہے اب اگر جوش صاحب نہ آئے تو بہت برا ہو گا ۔ برنی صاحب نے کچھ اس طرح مجھ سے خواہش کی کہ میں نے اور سلامت علی خاں نے جوش صاحب کو مجبور کیا کہ وہ تھوڑی دیر کے لیے سہی یوسفی صاحب کی محفل میں شریک ہو جائیں ۔ بڑی مشکل سے جوش صاحب تیار ہوئے اور ہم تینوں بغیر لباس تبدیل کیے جیسے بیٹھے تھے اسی حالت میں یوسفی صاحب کے گھر پہنچ گئے ۔ وہاں یوسفی صاحب نے واقعی بڑا اہتمام کر رکھا تھا ۔ باہر لان پر بہت سے مہمان جمع تھے اور سب جوش صاحب کے منتظر تھے ۔ یوسفی صاحب نے بہت محبت اور اخلاق سے ہم لوگوں کا استقبال کیا اور جوش صاحب کے بیٹھنے کے لیے جو خاص صوفہ متعین کیا گیا تھا وہاں ہم تینوں کو بٹھایا گیا ۔ تھوڑی دیر میں جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش ہونے لگی ۔ جوش صاحب نے مجھ سے کہا خورشید علی خاں کوئی موزوں مال نکالو ۔ میں جوش صاحب کی بیاض کے صفحے الٹنے لگا ۔ ایک دم میری نظر ایک عنوان پر پڑی ۔ لکھا تھا ۔ " ماتمِ عقل " ۔ جوش صاحب پوچھنے لگے ارے میاں کچھ ملا ۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ نظم نکلی ہے ۔ " ماتمِ عقل " ۔ جوش صاحب نے مسکرا کر کہا واہ کیا خوب موقع



راغب مراد آبادی اور جوش ملیح آبادی

کے مطابق نظم نکال ہے۔ پھر اس کے بعد انھوں نے وہ نظم سنائی۔ مگر پڑھنے کا انداز کہہ رہا تھا کہ بے کیف ہو رہے ہیں۔ چنانچہ نظم ختم کر کے مجھ سے کہنے لگے۔ بھاگ چلو۔ اور باوجود اس کے کہ لوگ کچھ اور کچھ اور کی فرمائش کرتے رہے جوش صاحب کھڑے ہو گئے اور ہم لوگ وہاں سے رخصت ہو کر لیاقت آباد آئے۔ وہاں کی چورنگی سے کباب اور روٹی لی اور اپنے گھر آ گئے۔ وہاں جوش صاحب نے اپنے چار پیگ مکمل کیے۔ کباب اور روٹی کھائی اور سو گئے۔

جوش صاحب جب تک کراچی میں رہے روز کسی نہ کسی کے گھر دعوت رہتی تھی۔ ایک دن سرور اقبال کے گھر ناشتے کی دعوت تھی۔ دوسرے دن یونین انڈسٹری (بسکٹ اینڈ سویٹس) کے مالک حبیب صاحب کے گھر دعوت تھی۔ ایک دن اقبال جعفری صاحب کے گھر جن کا بنگلہ گلشن میں تھا اور جو بلدیہ عظمیٰ میں آفسر تعلقات عامہ تھے، دعوت تھی۔ ہر جگہ نہایت پر تکلف کھانے پینے کا اہتمام کیا گیا تھا۔

نبض کی رفتار:

یہ دعوتیں تو شام کو ہوتی تھیں مگر دن میں جوش صاحب گھر پر ہی رہتے کیونکہ تو دس بجے کسی ان سے ملنے آ جایا کرتی تھیں۔ ایک روز حسن نے فرمائش کی کہ ہاشمی صاحب کی بچیاں بھی کراچی آئی ہوئی ہیں اور وہ سب مل کر بھنبھور جانا چاہتی ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ جوش صاحب بھی ان کے ہمراہ ہوں۔ جوش صاحب نے کہا اگر خورشید علی خاں آپ لوگوں کو لے جائیں تو میں بھی گاڑی میں بیٹھ جاؤں گا۔ چنانچہ دوسرے دن صبح سویرے ہم سب مل کر بھنبھور روانہ ہو گئے۔ وہاں تمام دن کھنڈرات کی سیر کرتے رہے اور جب واپس لوٹے تو شام ہو چکی تھی۔ ادھر میرے مکان میں عصر کے وقت ہی سے احباب جمع ہونا شروع ہو گئے تھے۔ راغب صاحب، سرور بارہ بنکوی، سلامت علی خاں اور فراست رضوی سخت حیرت زدہ تھے کہ میں اور جوش صاحب کہاں چلے گئے۔ ہم نے بچیوں کو ان کے گھر پہنچایا اور مغرب کے بعد گھر پہنچے۔ جوش صاحب نے منھ ہاتھ دھویا اور احباب میں آ کر بیٹھ گئے۔ سب لوگ متجسس نگاہوں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ آخر راغب صاحب نے پوچھ ہی لیا کہ ہم لوگ کہاں گئے تھے؟ جوش صاحب تو خاموش رہے مگر میں نے بات ٹالنے کے لیے کہہ دیا کہ میرے ایک

دوست کے گھر چلے گئے تھے وہاں ایسا موضوع گفتگو چھڑ گیا کہ دیر ہو گئی۔ راغب صاحب حکیموں کے سے انداز سے جوش صاحب کی نبض دیکھنا شروع کر دی اور فوراً یہ شعر پڑھا۔

یہ راز کھلا نبض کی رفتار سے سرکار گویا ابھی پہلوئے حسن سے اٹھے ہیں

میں نے کہا راغب صاحب اس وقت تو آپ کو مغالطہ ہوا ہے مگر یہ شعر آپ میری ڈائری لکھ دیجیے۔ راغب صاحب نے لکھا۔ "الہامی شعر"۔ پھر شعر لکھ کر اس کے نیچے اپنا نام اور تاریخ ۲۶۔۷۔۷۵، لکھ کر یہ الفاظ بھی لکھ دیے "حضرت جوشش کی نبض دیکھنے کے بعد ٹھیک، (شام کے وقت)"۔ جوشش صاحب شعر سن کر مسکرانے لگے مگر میں نے کہا راغب صاحب اس وقت آپ پر غلط الہام ہوا ہے ہم لوگ واقعی اپنے ایک دوست کے گھر بیٹھ گئے تھے راغب صاحب نے فی البدیہہ ایک اور رباعی فرما دی۔

افشا ہو جائے راز امکان نہیں جو محرم راز ہے وہ نادان نہیں
ہر شخص کے مداح نہیں حضرت جوش ہر شخص تو خورشید علی خان نہیں

اسی وقت جوش صاحب نے بات ٹالتے ہوئے اپنا گلاس بھرا اور بیاد فلاں بنت فلاں کر شغل سے گل فام میں مشغول ہو گئے اور فرمایا۔

اس وقت سبک بات نہیں ہو سکتی توہین خرابات نہیں ہو سکتی

اور اس طرح موضوع بدل دیا۔

بابا صاحب اور تصور خدا:

دوسرے دن جوش صاحب نے کہا چلو آج ذہین شاہ صاحب کے گھر چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ کوئی دس بجے بابا صاحب کے مکان واقع بنارس کالونی پہنچ گئے۔ بابا صاحب چند معتقدین کے ساتھ تشریف فرما تھے۔ ہم کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے بہت محبت اور احترام سے جوش صاحب کو اپنے قریب تخت پر بٹھا لیا۔ میں بھی قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

بابا صاحب نے جوش صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا آپ دونوں بہت اچھے موقع سے تشریف لائے۔ میں ان لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ خدا کا تصور ہر شخص کے علم، تجربے، ذہنی اور فکری صلاحیت کے مطابق جدا جدا ہوتا ہے۔ خدا کوئی پیکر محسوس تو ہے نہیں کہ آنکھوں سے

دکھائی دے سکے اور تصور کی صلاحیت ہر شخص کی الگ الگ ہوتی ہے اس لیے ہر انسان خدا کا اپنا الگ تصور رکھتا ہے۔ اسی خیال کو میں نے ایک رباعی میں یوں بیان کیا ہے۔

باقی سے ہے اک ربط یہاں فانی کا
ہے دارومدار اس پہ حق دانی کا
جیسا بندہ خدا بھی اس کا ویسا
جو رنگ ہے شیشے کا وہی پانی کا

جوش صاحب نے فرمایا جی ہاں۔ حافظ نے بھی کچھ ایسی ہی بات کی ہے۔

ہر کسے برحسب فہم گمانے دارد — در رہ عشق نہ شد کس بہ یقیں محرم راز

میں نے عرض کیا بابا صاحب کیا خدا کا حقیقی اور معروضی تصور انسان کے لیے ناممکن ہے؟ بابا صاحب نے فرمایا جی ہاں۔ اس لیے کہ انسانی حواس محدود ہیں اور خدا لامحدود۔ اور کوئی محدود، لامحدود کا تصور نہیں کر سکتا۔ وہ جب بھی اس کا تصور کرے گا لامحدود کو محدود کر دے گا اور خدا محدود نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے قرآن نے خدا کی "ذات" کا کوئی تصور نہیں دیا بلکہ دور جاہلیت میں ذات کے تعلق سے جتنے تصورات تھے ان کی نفی کی ہے۔ مثلاً زمانہ جاہلیت میں انسان ایک سے زیادہ طاقتوں کو کائنات میں کارفرما سمجھتا تھا اور ہر طاقت کا ایک بت تراش کر اس کی پرستش کرتا تھا۔ قرآن نے فرمایا ہو اللہ ایک ہے۔ اس طرح وحدانیت کے تصور سے تمام معبودان باطل کی نفی ہو جاتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس تمام کائنات کا خالق، پروردگار اور رب صرف ایک اللہ ہے۔ نہ اس کا کوئی ثانی ہے اور نہ کوئی اس کی طرح طاقتور، اس لیے وہ "الصمد" ہے یعنی وہ اعلیٰ ترین قوت ہے جس سے ہر حاجت مند رجوع کرے اور اس سے بڑی کوئی طاقت تصور میں نہ آ سکتی ہو۔ اس طرح قرآن نے انسانی ذہن کو انسانوں کے بنائے ہوئے بتوں کے چنگل سے نکال کر قادر مطلق کی طرف رجوع کیا۔ پھر اس زمانے میں ایک یہ تصور بھی تھا کہ بتوں کی بیویاں اور اولادیں بھی ہوتی ہیں۔ قرآن نے اللہ کے تصور کو اس باطل تصور سے بھی پاک کیا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کی اولاد ہے اور نہ رتبے میں کوئی اس کا ہمسر۔ اس طرح اللہ کی "ذات" کو تمام شخصی تعینات سے جدا کر کے اس کی صفات کے متعلق بھی جتنے باطل

تصورات تھے ان کی نفی کی۔ اس طرح ایک قادر مطلق وحدہٗ لاشریک الٰہ کا تصور پیش کیا۔ اگر غور کیا جائے تو اللہ تعالیٰ کا ایسا ہی تصور انسانیت کامل کی نشوونما میں ممد و معاون ہو سکتا ہے جو اپنے احکامات اور قوانین کے ذریعے سے اس کائنات کا خالق بھی ہے اور قادر مطلق بھی۔

ایک صاحب نے دریافت فرمایا۔ بابا صاحب وہ کس طرح؟

بابا صاحب نے فرمایا۔ وہ اس طرح کہ جب انسان کے ذہن میں ایک قادر مطلق کا تصور استوار ہو جائے گا تو وہ کسی دوسری طاقت کے سامنے نہیں جھکے گا۔ بقول اقبال:

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اور جب انسان خداوندان باطل کے طلسم سے آزاد ہو جائے گا تو اس کا ایمان اللہ تعالیٰ پر مستحکم ہو جائے گا اور ہر معاملے میں کسی دوسرے کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے اللہ تعالیٰ کے احکام معلوم کرنے کی کوشش کرے گا اور چونکہ اللہ کا قانون کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیتا اس لیے قوانین الٰہی پر عمل کرنے سے اسے جو اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوگی اس سے انسان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی اور اس طرح اس کی اپنی ذات کی نشوونما ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا ہے اور یہ کائنات اس کے لیے مسخر فرما دی ہے اور یہ ہدایت بھی فرما دی کہ دیکھو اللہ کے علاوہ کسی اور کو اپنا الٰہ مت قرار دینا۔ اس مقصد کے لیے اس کو کلمہ "لا الٰہ الا اللہ" کا سبق بھی سکھا دیا مگر انسان قوانین الٰہی معلوم کر کے ان پر عمل کرنے کے بجائے معبودان باطل کے سامنے جھکنے لگا اس طرح اس بلند مقام سے گر گیا جس پر اللہ تعالیٰ نے اسے بحیثیت خلیفہ فائز فرمایا تھا۔ تمام پیغمبر اور اولیا انسان کو اس کا یہی کھویا ہوا مقام دلوانے کے لیے بھیجے گئے اور آج بھی اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے انسان کو سیدھا راستہ دکھانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے میں مشغول ہیں۔

میں نے عرض کیا کہ بابا صاحب یہاں میں ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ جو پیری مریدی کے ادارے قائم ہیں جن میں پیر صاحب انسانوں سے خود کو سجدے تک کرواتے ہیں۔ ان اداروں کے ذریعہ سے کون سی عظمت انسانی کی تبلیغ ہوتی ہے؟

بابا صاحب نے فرمایا۔ یہ لوگوں کی جہالت ہے۔ دراصل ابھی عام آدمی کا ذہن پیکر

محسوس کا سہارا ڈھونڈھتا ہے جو ان کو پیروں کی شکل میں مل جاتا ہے۔ اس ادارے میں بھی بہت سے جاہل اور دھوکے باز لوگ پیری اور روحانیت کا لبادہ اوڑھ کر داخل ہو گئے ہیں جو لوگوں کو طرح طرح سے فریب دے کر ان کا استحصال کرتے ہیں مگر جو سچے اللہ والے ہیں وہ کبھی کسی انسان کو انسان کے سامنے جھکنے کی ترغیب نہیں دیتے۔ وہ تو ان کو اللہ تعالیٰ کے احکام ہی سمجھاتے رہتے ہیں اور جس حد تک ان سے ممکن ہے لوگوں کی مدد بھی کرتے رہتے ہیں۔

غرض ان باتوں میں بارہ بج گئے۔ بابا صاحب نے دسترخوان بچھوا دیا مگر جوش صاحب نے معذرت کر لی اور فرمایا کہ کچھ لوگ ان سے ملنے کے لیے گھر پر آنے والے ہیں اس لیے وہاں سے اجازت لے کر رخصت ہوئے۔ جب ہم گھر پہنچے تو محسن اور ہاشمی صاحب کی صاحبزادیاں وہاں بیٹھی ہوئی جوش صاحب کا انتظار کر رہی تھیں۔ جوش صاحب نے دریافت کیا ارے تم کب سے بیٹھی ہوئی ہو؟ تو سب نے کہا کہ بس یہی کوئی دس پندرہ منٹ سے۔ جوش صاحب نے کہا چلو پہلے چل کر کسی چائنیز ہوٹل میں کھانا کھاتے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ صدر میں ABC چائنیز ہوٹل آئے وہاں کھانا کھانے کے بعد جوش صاحب نے کہا کہ اب چلو ملیر کے ہوٹل چلتے ہیں۔ پھر ہم لوگ گرینڈ ہوٹل ملیر چلے گئے۔ وہاں شام تک بیٹھے باتیں کرتے رہے مگر اس دفعہ سورج غروب ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ گئے اور شام کو حسب معمول تمام احباب جمع ہو گئے۔ آج جوش صاحب کا موڈ بہت اچھا تھا اور گو دن میں آرام نہیں کیا تھا مگر وہ دور دور تک کسی قسم کی تھکن کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

مجرے کا تقویٰ:

جوش صاحب کے ایک دور کے عزیز ہیں حمدی خاں صاحب۔ کراچی میں بل پارک پر ان کا "بلو سوان ریسٹورنٹ" ہے۔ وہ اکثر جوش صاحب کی دعوت اپنی ہوٹل میں کرتے رہتے تھے۔ دوسرے دن صبح کوئی دس بجے حمدی خاں صاحب دو خواتین کے ساتھ جوش صاحب سے ملنے کے لیے ہمارے گھر تشریف لائے۔ میں نے انھیں دیوان خانے میں بٹھا کر جوش صاحب کو ان کی آمد کی اطلاع دی۔ وہ اس وقت کسی "اور" کی آمد کے منتظر تھے مگر جیسے ہی میں نے کہا حمدی خاں صاحب کے ہمراہ دو خوبصورت خواتین بھی ہیں تو جوش صاحب نے نہایت معنی

خیز مسکراہٹ کے ساتھ یہ رباعی پڑھی۔

قدموں پہ مرے عرشِ معلّیٰ بھی سہی ۔۔۔ خورشید کی انجمن میں ذرہ بھی سہی
حوریں حاضر ہوئی ہیں مجرے کے لیے؟ ۔۔۔ اچھا حاضر کرو یہ تقویٰ بھی سہی

یہ کہتے ہوئے جوش صاحب اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔ سلام دعا کے بعد حمدی خاں صاحب نے ان خواتین کا تعارف کروایا۔ جوش صاحب یہ دونوں بہنیں آپ کی فین ہیں۔ یہ بڑی ہیں ان کا نام رخسانہ ہے ان کے شوہر نیوی میں لفٹنٹ کمانڈر تھے مگر ان کا انتقال ہو چکا ہے اور یہ چھوٹی بہن ہیں ان کا نام ریحانہ ہے انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے جرنلزم (صحافت) میں ام اے کیا ہے۔ یہ دونوں شعر و ادب کی دلدادہ ہیں۔ سخن فہم بھی ہیں اور آپ کی طرفدار بھی۔ انھیں جب یہ معلوم ہوا کہ آج کل آپ کراچی میں ہیں تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ جوش صاحب سے ہمیں ملواؤ۔ اس لیے آج میں انھیں لے آیا۔ جوش صاحب نے کہا یہ تو آپ نے بہت اچھا کیا لیکن اگر پہلے سے ٹیلی فون کر دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔ ہم کوئی ایسا وقت مقرر کرتے جس میں زیادہ دیر بیٹھ کر گفتگو کر سکتے۔ اس وقت تو چند ایسے لوگ آنے والے ہیں جن کو پہلے سے وقت دے رکھا ہے۔ رخسانہ نے کہا جوش صاحب ہم بلا اطلاع حاضر ہونے کی معافی چاہتے ہیں مگر میں اس وقت صرف آپ کو اپنے گھر مدعو کرنے کے لیے حاضر ہوئی ہوں۔ اگر ایک شام ہمارے نام بھی ہو جائے تو ذرہ نوازی ہوگی۔ جوش صاحب نے میری طرف دیکھا۔ میں نے کہا کل شام کوئی خاص پروگرام نہیں ہے اگر آپ مناسب خیال فرمائیں تو کل کا وقت ان لوگوں کو دے دیں۔ جوش صاحب نے اجازت دے دی۔ حمدی خاں صاحب نے جوش صاحب کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ راغب صاحب کو بھی ضرور ساتھ لائیے گا اور وہ کل شام پانچ بجے ہم لوگوں کو لینے کے لیے ہمارے گھر آ جائیں گے۔ غرض یہ پروگرام طے کر کے وہ لوگ رخصت ہوئے اور تھوڑی ہی دیر میں جوش صاحب کے "مہمانانِ خاص" تشریف لے آئے۔ اس دن مجھے کچھ ضروری کام تھا اس لیے میں نے جوش صاحب سے اجازت لی اور چلا گیا مگر ملازم کو یہ تاکید کر دی کہ مہمانوں کا ہر طرح خیال رکھے۔

اس شام جوش صاحب کی دعوت راغب صاحب کے ایک دوست چودھری رحمت علی صاحب کے گھر تھی۔ چنانچہ غروب سے پہلے جوش صاحب، راغب صاحب، سلامت علی خاں

اور ہم چودھری صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ دیکھا تو چودھری صاحب کچھ افسردہ سے دکھائی دیے۔ ان کی باتوں سے اضطراب نمایاں تھا۔ غالباً کسی محکمے میں انھیں شدید نقصان ہوا تھا۔ راغب صاحب نے ان کی حالت دیکھ کر اسی وقت یہ رباعی کہی۔

لو شمع سحر کی تھرتھرائے جیسے
برق ابر میں پیچ و تاب کھائے جیسے
میں شدت غم سے جاں بہ لب ہوں اس طرح
طوفان میں ناؤ ڈگمگائے جیسے

پھر جوش صاحب نے اپنا کلام سنایا اور جیسے ہی آفتاب غروب ہوا میخانہ سجا دیا گیا جوش صاحب نے جام لے کر کہا "بنام فلاں بنت فلاں" اور محفل کا موڈ بدل گیا۔ جوش صاحب نے یہ رباعی سنائی۔

سینے میں جوانی ہو تو پیری کیسی | ہر رات ہے لیلائی تو ہر دن قیسی
پائل کی جھنک ہو اور ساغر کی کھنک | انیس سو دس سال کی ایسی تیسی

اس کے بعد ایک اور رباعی سنائی۔

اک طائر بے پر کی صدا آتی ہے | اک دشمن اختر کی صدا آتی ہے
دھمکاتی ہے جب اجل تو میرے دل سے | بر چشم قلندر کی صدا آتی ہے

غرض جب محفل برخاست ہوئی تو چودھری صاحب کا غم مسکراہٹوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔

دوسرے دن حسب وعدہ حمدی صاحب خاں صاحب عصر کے بعد تشریف لے آئے۔ تھوڑی دیر میں راغب صاحب بھی آ گئے اور ہم سب رخسانہ صاحبہ کے گھر غروب آفتاب سے تھوڑی دیر پہلے پہنچ گئے۔ وہاں دونوں بہنیں رخسانہ اور ریحانہ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ جوڑے میں گلاب، ہاتھوں میں چنبیلی کی کلیوں کی پہنچیاں، خوشبو سے تمام خانۂ چمن شاد معطر استقبال کے لیے بیرون در منتظر کھڑی تھیں۔ جیسے ہی ہم لوگ پہنچے ریحانہ نے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور جوش صاحب کو سہارا دے کر اتارا اور ہم لوگ ان کے خوبصورت ڈرائنگ روم میں بٹھا دیے گئے۔ ریحانہ نے جوش صاحب کو مخاطب کر کے کہا "تکلف برطرف جوش صاحب یہ ہم نے جلدی میں آپ کے لیے دعوت شیراز کا اہتمام کیا ہے امید ہے آپ

کچھ خیال نہ فرمائیں گے۔ راغب صاحب نے فوراً کہا۔

جناب جوش ہی کے دل کا یہ افسانہ کہتی ہیں
"تکلف برطرف" کس ناز سے ریحانہ کہتی ہیں

اتنے میں جوش صاحب کی نظر ریحانہ کی تصویر پر پڑی۔ نکھرا ہوا شباب اور جوڑے میں گلاب کا پھول۔ جوش صاحب نے تصویر ہاتھوں میں لے کر ایک شعر پڑھا۔

یہ کم سنی کا ناز یہ عالم شباب کا — بالوں میں تم تو پھول لیے ہو گلاب کا

راغب صاحب نے فی البدیہہ یہ رباعی پڑھی:

آغوش میں کشمیر لیے بیٹھے ہیں — یا خلد کی جاگیر لیے بیٹھے ہیں
اس وقت جناب جوش تو اے راغب — ریحانہ کی تصویر لیے بیٹھے ہیں

ریحانہ بی بی شرمانے لگیں تو راغب صاحب نے ایک اور رباعی فی البدیہہ سنا دی۔

راغب دیکھے کوئی بچشم بیدار — ریحانہ ہے یا ساز طرب کی جھنکار
لہجے میں ہے ساغر کی کھنک بار الٰہ — چہرے پہ ہے کھلتے ہوئے پھولوں کی بہار

ریحانہ نے ستار اٹھایا اور جوش صاحب کی ایک غزل گانی شروع کی۔ واقعی لہجے میں ساغر کی کھنک تھی۔ جوش صاحب نے اپنا شعر پڑھا۔

بساط نغمہ پہ گویا کنول کھلاتے ہوئے
کھڑی ہوئی ہے جوانی نقاب اٹھائے ہوئے

غرض حسن اور شاعر جہاں جمع ہو جائیں وہاں صرف ایک بات کی کمی محسوس ہوتی ہے وہ مہدی خاں صاحب نے پوری کر دی۔ انھوں نے بلیک لیبل کی بوتل نکالی اور میخانہ سجا دیا۔ میں نے کہا واہ خاں صاحب بس یہاں یہی ایک کمی تھی جس کو آپ کو پورا کر دیا۔

ہوش اڑتے ہیں مرے جلوہ گل دیکھ اسد
پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موج شراب

اس تمام مدت میں رخسانہ دور بیٹھی ہوئی تھیں۔ راغب صاحب نے انھیں مخاطب کر کے فرمایا۔

کیا ہو مشتاق دل جلانے میں — اس قدر بخل پاس آنے میں

جب جوش صاحب کے چار پیگ ختم ہو گئے تو کھانا چن دیا گیا۔ ہر چیز نہایت لذیذ تھی۔ غرض یہ محفلِ حسن و نشاط تقریباً نصف شب پر ختم ہوئی۔ اور جب ہم لوگ رخصت ہونے لگے تو راغب صاحب نے فرمایا۔

بنتے ہیں تمام گھر بگڑنے کے لیے　　بستے ہیں تمام شہر اجڑنے کے لیے
کیا جبرِ مشیت ہے کہ راغب ہم بھی　　احباب سے ملتے ہیں بچھڑنے کے لیے

جوش صاحب نے فرمایا۔

انسان سے کیا ربط بڑھائے انسان　　ہر آن بپا ہے اک نرالا طوفان
محرومی و انس و حب و عشق و سودا　　پھر فصل و فراق، موت، غفلت، نسیان

ماحول بوجھل ہونے لگا تو میں نے جلدی جلدی جوش صاحب اور راغب صاحب کو گاڑی میں بٹھایا اور گھر روانہ ہو گیا۔ گو رات دیر سے پہنچے مگر یہ محفل اس قدر دلچسپ تھی کہ بقول اختر حسن:

کچھ اتنی دلنواز تھی کل اس کی بزمِ ناز
ہر شخص رات دیر گئے اپنے گھر گیا

جوش صاحب کی کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی:

جوش صاحب کو کراچی کلکٹر آف کسٹم کی طرف سے ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کو کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ کا اجازت نامہ دیا گیا تھا۔ (Clearing and Forwarding Licence) اور جوش صاحب نے ان کے دور کے ایک عزیز محمد عابد صاحب کی شراکت میں "جوش کلیرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی" کے نام سے ایک فرم قائم کر رکھی تھی۔ اس کے دفتر کا پتا ۱۴۔ شیخ چیمبرس۔ ایم اے جناح روڈ۔ کراچی پاکستان۔ ٹیلی فون نمبر 23850 اور ٹیلی گرام کا پتا DANYEXPO تھا اور لائسنس نمبر ۳۲۱ تھا۔

جوش صاحب اس میں خود تو کیا کام کرتے، اس کمپنی کا تمام کاروبار عابد صاحب ہی سنبھالتے تھے۔ البتہ جوش صاحب اپنے تعلقات کی بنا پر بڑے بڑے بینکوں اور کمپنیوں کا درآمدی اور برآمدی کام اس کمپنی کو دلواتے رہتے تھے۔ اب جب سے وہ اسلام آباد منتقل ہو

گئے تو ان کو اس فرم سے کوئی آمدنی نہیں ہو رہی تھی اور عابد صاحب جوش صاحب کے حصے کی رقم بھی ادا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ کراچی کے اس قیام کے دوران میں جوش صاحب نے تین ہزار پانچ سو روپے کے عوض یہ تمام کاروبار مستقل طور پر عابد صاحب کے حوالے کر دیا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۷۰ء کو عابد صاحب حسب معاہدہ رقم لے کر آ گئے اور اس سلسلے میں لکھا پڑھی ہو گئی۔ جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ تین دستاویزات انگریزی میں تیار کروں۔ ایک کلکٹر کسٹم کے نام کہ آئندہ سے "جوش کلیئرنگ اینڈ فارورڈنگ ایجنسی" کا کاروبار ان کے بجائے ان کے شریک کار محمد عابد صاحب انجام دیں گے۔ دوسرا عابد صاحب کے ساتھ معاہدے سے متعلق کہ اگر وہ ساڑھے تین ہزار روپے ادا کر دیں تو ان کی حیثیت جو ۲۸ ستمبر ۱۹۶۱ء کے معاہدے کی رو سے شریک کار کی تھی اب وہ معاہدہ ختم ہو جائے گا اور عابد صاحب اس کمپنی کے تمام کاروبار کے بلا شرکت غیرے مالک ہو جائیں گے اور تیسری دستاویز کے ذریعہ تین ہزار پانچ سو روپے کی رسید لکھ دی گئی۔ یہ تمام امور ۲۵ جولائی ۱۹۷۰ء کو انجام پائے اور جوش صاحب نے ان تینوں دستاویزات پر دستخط کر دیے۔ اس کے بعد عابد صاحب نے دوسری اگست کو جوش صاحب اور ہم سب احباب کی اپنے گھر ناشتے کی دعوت کی اور نہایت لذیذ نہاری پائے نان اور مٹھائی کھلائی۔

اسی قیام کے دوران میں جوش صاحب نے ایک نظم بھی کہی جس کا عنوان ہے "رندانہ عبادت" جس دن یہ نظم مکمل ہوئی اسی دن مجھے سنائی اور میں نے نقل کر لی۔

رندانہ عبادت

اے شیخ کہاں تک یہ تشنیع و دل آزاری
میری تو عبادت ہے لب نوشی و مے خواری
فیضان مشیت سے حاصل ہے مجھے اب تک
بانہوں کی گہر ریزی بوسوں کی شکر باری
اقلیم نگاراں میں ہاں آج بھی قائم ہے
بیداری قسمت سے بندے کی عمل داری

گل ریز بہاروں میں رم جھم کے ملہاروں میں
مے بار پھواروں میں سرمستی و سرشاری
بکھری ہوئی زلفوں کی گھنگھور گھٹاؤں میں
سبزے پہ ہم آغوشی ساحل پہ گہر باری
مکھڑوں کی صباحت سے زلفوں کی سیاہی سے
صبحوں کی بھی سلطانی شاموں کی بھی سرداری
اسرار اناالحق تک پہنچی ہے نظر اب تو
اس دولت پہلو کی اللہ ری دل داری
وہ وصل میسر ہے جو فصل سے خالی ہے
معراج ہے اور کرب قوسین نہیں طاری
اللہ کی رحمت نے بخشی ہے مجھے اے جوش
راتوں کے اندھیروں میں توفیق سیہ کاری
وہ جنت سمن میرے پہلو میں نہ آ سکتی
خورشید علی خاں کی ہوتی جو نہ غم خواری

(* نوٹ۔ میرے محبوب و منکسر دوست جو نارتھ ناظم آباد کراچی میں رہتے ہیں اور جن کو فتنہ آخرالزماں نے دلبر جانی کا خطاب عطا فرمایا ہے)

دوسری اگست کو سمن اور ہاشمی صاحب کی بچیاں جوش صاحب سے ملنے آئیں اور سمن نے یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کو یوسفی صاحب سے کہہ کر بینک کی ملازمت دلوا دی جائے۔ جوش صاحب نے وعدہ کر لیا اور فرمایا کہ وہ ایک درخواست لکھ کر یوسفی صاحب کے پتے پر ارسال کر دیں اور جب درخواست ان کے پاس پہنچ جائے گی تو جوش صاحب یوسفی صاحب سے سفارش کر دیں گے۔ ہاشمی صاحب کی بچیاں عابد صاحب کے گھر مقیم تھیں اور سمن اپنے چچا کے گھر۔

جوش صاحب کی اسلام آباد روانگی:

جوش صاحب کو اسلام آباد کچھ اہم کام تھا اس لیے وہ تیسری اگست (۳۔۸۔۱۹۷۵) کو بذریعہ ہوائی جہاز اسلام آباد پرواز کر گئے مگر مجھ سے فرما گئے کہ اگر ان بچیوں کو گاڑی کی ضرورت پڑے تو میں ان کا خیال رکھوں۔

اسلام آباد پہنچنے کے دوسرے دن جوش صاحب نے مجھ سے ٹے لی فون پر بات کی۔ پہلے تو اپنے متعلق انھوں نے کہا کہ ان کا کراچی سے اسلام آباد کا سفر ویسے تو خوش گوار گزرا مگر چونکہ ان کا دل کراچی ہی میں رہ گیا ہے اس لیے بہت بے چین ہیں۔ پھر فرمایا کہ میں عابد صاحب کو ٹے لی فون کر کے ہاشمی صاحب کی بچیوں سے یہ معلوم کرواؤں کہ سمن لاہور کب پہنچ رہی ہیں۔ چنانچہ میں نے اسی وقت ٹے لی فون کیا تو عابد صاحب تو باہر گئے ہوئے تھے مگر رخسانہ سے بات ہو گئی۔ انھوں نے بتایا کہ وہ لوگ آٹھویں اگست بروز جمعہ لاہور روانہ ہوں گے اور سمن بھی ان کے ساتھ ہوں گی۔ میں نے اسی وقت جوشس صاحب کا نمبر ملایا مگر اسلام آباد کی لائن نہیں ملی۔ اس کے بعد میں اپنے کاموں میں ایسا مصروف ہو گیا کہ جوشس صاحب کو مطلع کرنا بھول گیا۔

گیارھویں اگست کو جوش صاحب کا چھٹی اگست کا لکھا ہوا خط وصول ہوا۔ لکھا تھا:

وا رے بس! میں نے بڑی لجاجت سے فون کیا کہ عابد سے یہ دریافت کر کے مجھے فون کر دیجیے کہ میری فتنۂ آخرالزماں کس تاریخ کو روانہ ہو رہی ہے لیکن آپ اس خیال سے ٹال گئے کہ آپ کے فون کا بل بڑھ جائے گا۔ اسی کا نام ہے دوستی؟ دس بارہ روپے بچائے اور میرا دل توڑ دیا۔

جی چاہتا ہے آپ کی اس بخل آلودہ بے مہری پر اس قدر لکھوں کہ آپ کے ماتھے سے پسینے کی بوندیں ٹپکنے لگیں مگر پھر یہ سوچتا ہوں کہ آپ کہیں گے یہ جوشس کس قدر احسان فراموشس ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو یہ ناشکرا دل پکڑے پکڑے پھرتا۔ اس کو تخلیہ میسر نہ آتا اور اس کے لب دوآغوشس اس پیکر ناز کے لعل نگاریں اور اس کے نرم جسم سے لطف اندوز نہ ہو سکتے۔

احسان فراموشی سب سے زیادہ ذلیل عیب ہے۔ اس لیے آپ کی شکایت کے تمام

تیز و ترش الفاظ نکل لیے اور میں نے شرافت اسی میں دیکھی کہ آپ پر لعن و طعن نہ کروں۔
جا چھوڑ دیا حافظ قرآن سمجھ کر

آپ کا شکر گزار

احسان مند

جوش

کھنے دیتی نہیں کچھ منھ سے محبت تیری
لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری
ارے اپنے محسن سے یہ گفتگو تفو بر تو اے جوش کج بیں تفو

خط ملتے ہی میں نے جوش صاحب کو ٹیلی فون کیا بے حد عاجزی سے معافی مانگی اور وعدہ کیا کہ آئندہ ایسی فروگزاشت نہیں ہوگی اور اسی مضمون کا خط بھی لکھ دیا۔ جوش صاحب اس قدر معصوم آدمی تھے کہ فوراً خوش ہو گئے اور خود مجھ سے اپنے سخت خط کی معافی مانگنے لگے۔ پھر خود مجھے بتایا کہ حسن کا ٹیلی فون لاہور سے آ چکا ہے۔ غرض اس طرح جوش صاحب کی خفگی ختم ہوئی۔

اس کے بعد جوش صاحب کا اکیسویں اگست کا لکھا ہوا خط مجھے تیسویں کو ملا۔ لکھا تھا:

"منیے صاحب، سرکار الوہیت اقتدار نے فون پر ارشاد فرمایا ہے کہ ان کی درخواست کراچی جا چکی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ حکم بھی دیا ہے کہ میں سفارش کے واسطے کراچی چلا جاؤں۔ میں نے یوسفی صاحب کو خط لکھا ہے ان کا جواب آ جاتے تو کراچی روانہ ہو جاؤں۔ کیا رائے ہے آپ کی اس باب میں؟ فوراً جواب دیجیے یا فون پر بات کر لیجیے۔

میں تو بڑے لفڑے میں پڑا ہوا ہوں خورشید صاحب۔ خوب جانتا ہوں یہ موسم ان لغویات کا نہیں ہے لیکن کیا کروں میری عقل گدھوں کی کھائی ہوئی جھوٹی گھانس چر رہی ہے اور میرے سینے کا لونڈا عقل کو ٹھینگا دکھا دکھا کر سیٹیاں بجا اور "ہپ ہپ ہرا" کر رہا ہے۔

تھوک میری اوقات پر لعنت میری ذات پر

"بڑا مفکر بنا پھرتا ہے سالا اور اندر اتنا گز بڑ جھالا"۔

اگر غیرت ہوتی تو ڈوب مرتا چلو بھر پانی میں لیکن میں تو منھ پر پھیری لوی تو کیا کرے گا کوئی کس حد تک بے حیا ہو چکا ہوں۔

قابلِ صد ہزار نفریں
جوش ناعاقبت بیں

اسلام آباد ۲۱-۸-۱۹۷۵، سہ پہر

اس خط کے جواب میں، میں نے جوش صاحب کو لکھا کہ ابھی ابھی آپ کا اکیسویں اگست کا لکھا ہوا خط ملا۔ اس خط کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ تو جوش صاحب کی تحریر ہے مگر درمیان میں ایک لکیر کے بعد جو دوسرا حصہ ہے وہ شبیر حسن خاں صاحب کا لکھا ہوا ہے۔ ارے یہ بزرگ آپ پر کس طرح قابض ہو گئے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت نے ہاتھ ملاتے ہی ایسا دھوبی پاٹ مارا کہ آپ چاروں شانے چت ہو گئے۔ یہ بتلائیے وہ بزرگ کب تک آپ پر اسی طرح مسلط رہے اور کب آپ کی جان چھوڑی؟ اور اب آپ کا کیا حال ہے۔ جوش صاحب آج کل آپ پر دو جنوں کا قبضہ ہے۔ اللہ رحم فرمائے آپ کی حالت پر۔

جہاں تک آپ کے خط کے پہلے حصے کا تعلق ہے تو آپ نے یوسفی صاحب کو خط تو لکھ ہی دیا ہے اب یا تو ان کے جواب کا انتظار فرمائیے یا ٹیلی فون پر ان سے بات کر لیجیے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر سمن بینک کی ملازمت کے معیار پر پوری اتریں تو یوسفی صاحب آپ کو ناامید نہیں کریں گے۔ ویسے اگر آپ کراچی آنا چاہیں تو ہمارے لیے اس سے زیادہ خوشی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد معلوم ہوا کہ سمن کو بینک کی ملازمت مل گئی اور ان کی پوسٹنگ بھی لاہور ہی میں ہو گئی۔ مگر ان سے وہ ملازمت زیادہ دن نہ چل سکی اور شاعرانہ مزاج کی خاتون حساب کتاب کے پرخار صحرا سے بہت جلد اپنا دامن چھڑا کر نکل آئیں۔

اس کے بعد تقریباً دو مہینے تک جوش صاحب سے کوئی خط و کتابت نہ ہو سکی تو میں نے بالآخر پانچویں اکتوبر کو انھیں خط لکھ کر ان کی خیریت دریافت کی اور میں نے لکھا کہ میرا ارادہ ہندوستان جانے کا ہو رہا ہے اگر وہ بھی ساتھ چل سکیں تو بہت لطف آئے گا۔ اس کے جواب میں بارھویں اکتوبر کا لکھا ہوا خط مجھے چودھویں اکتوبر کو ملا۔ انھوں نے لکھا تھا۔

• بار بار جی چاہا کہ آپ کو خط لکھوں لیکن جب یہ سوچا کہ آپ بربنائے بخل جب مجھے کبھی فون ہی نہیں کرتے تو پھر میں خط کیوں لکھوں۔
کل دوپہر کو آپ کا خط آیا۔ اس لیے مجبوراً خط لکھ رہا ہوں۔ جی ہاں مجبوراً۔ دل اس وقت بھی یہی کہہ رہا ہے کہ جواب ٹال جاؤ۔ بخیلوں سے کیسی رسم و راہ۔

بخیل ار بود زاہد بحر و بر بہشتی نہ باشد بحکم خبر

اس وقت تین منٹ ہیں دو بجنے میں۔ رات اندھیری ہے محلے کے کسی مکان سے ابھی شور کی آوازیں بلند ہوئی تھیں۔ اب سناٹا طاری ہے۔ سامنے کی کھڑکی سے کوئی مجھے گولی مار دے گا۔ بار بار یہ خیال آ رہا ہے۔ اچھا ہے کوئی اللہ کا بندہ گولی مار دے اور اس بے ہر آن دھڑکنے والے دل کو سکون بخش دے۔ جی ہاں۔ بہت جی چاہ رہا ہے ہندوستان جانے کا۔ آپ کا سا بخیل ساتھ ہو گا تو کروٹ کروٹ حوریں ہوں گی۔ لیجیے پھر آ گیا پیار آپ پر۔ ہو نہ ہو میں بھی اندر سے تھوڑا بہت بخیل ضرور ہوں گا......

لاہور۔ مکمل خاموشی ہے نہ پیام ہے نہ سلام۔ دل کم بخت رندھا گھٹتا جا رہا ہے۔ سانس اٹک اٹک کر آ رہی ہے۔ یہ خموشی جان لے کر چھوڑے گی۔ دونوں پاؤں پر ورم آ گیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں علاج کیجیے یہ بڑی خطرناک علامت ہے۔ میں کہتا ہوں جوتی کی نوک سے کل آنے والی موت آج ہی آ جائے۔ کون سے لڈو بٹ رہے ہیں اس حرام زادی زندگی میں؟ لڈو بٹتا تو در کنار یہاں تو بر چھے لگ رہے ہیں دن رات کچا کچ۔

کاش میں سنگ دل خورشید علی خاں ہوتا جو اپنی چاہنے والی کو ایک پھریری لے کر بھلا دیتے ہیں۔ ہائے شقی ہونا کتنی بڑی نعمت ہے۔ اے اللہ مجھ پر کرم فرما اور میرے سینے میں شمر کا دل عطا فرما دے۔

ہوا میں خنکی تیر رہی ہے اور میرے دل میں الاؤ جل رہا ہے۔ سناٹا فضا کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور میرے سینے میں قیامت کا شور برپا ہے اور اس قدر کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ کروڑوں ایٹم بم پھٹ رہے ہیں اور تمام گلی میں کتے بھونک رہے ہیں مجھ پر۔ میں حسین ہوں اور تمام کرۂ ارض کربلا ہے۔

پھر بھی داد دیجیے میری سخت جانی یا بہادری کی کہ دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر قہقہے مارتا

ہوں۔ انفس اور آفاق کے اسرار پر غور کرتا ہوں اور ملازمت کے دفترچے بھی سیتا ہوں۔ ہر چند زندگی تین عدد موذی میموں یعنی مسائل، معاشقے اور معاش میں گھری ہوئی ہے۔ پھر بھی خوش دلی سے باز نہیں آتا اور "پاپوش قلندر" کے نعرے لگاتا رہتا ہوں۔

خورشید ہے "ابخل الناس" کا چاہنے والا
جوشش جس کا دین دنیا دونوں میں کالا

۱۲-۱۰-۷۵، پونے تین بجے
از کفرستان اسلام آباد

اب رباعیات لکھنے کے بعد چار بج گئے۔

نیند کا پیمانہ پیا ہے تو نے
جھپان سے پلکوں کو سیا ہے تو نے
مل مل کے ہتھیلیوں سے پیہم آنکھیں
آنچل نظروں کا چھن دیا ہے تو نے

اللہ اللہ یہ کراہیں تیری
ہر آن یہ سسکیاں یہ آہیں تیری
اے رشکِ سحر کہیں نہ کٹ کر رہ جائیں
پلکوں کے جھپکنے سے نگاہیں تیری

گھمرا ہے دھواں دھواں نظر غرقِ گداز
للہ نہ رو، نہ رو میری پیکرِ ناز
میرے دل پر چلا رہی ہے چھریاں
تیری یہ ہچکیوں سے کٹتی آواز

نیندیں کیا کیا دھواں بنائی ہم نے
آنکھوں کے الاؤ میں جلائی ہم نے
جھیلی ہیں جدائی میں وہ راتیں بھی کہ جب
آنچیں اوڑھیں لویں بچھائیں ہم نے

العظمتُ للہ یہ آنچوں کا خروش
رگ رگ ہے شرارہ خرمن و شعلہ فروش
اف دل میں وہ آگ ہے کہ میرے نزدیک
دوزخ آتا ہے تاپنے کو اسے جوش

جھنجھل جو ہوا جاگ اٹھے ہنگامے — بجنے لمحات نے کلیجے تھامے
چھیڑی گئی راگنی سرِ بزمِ طرب — بھیجے گئے ہچکیوں کے دعوت نامے

خود حسن جب آشفتہ نوا ہوتا ہے — آفاق میں اک حشر بپا ہوتا ہے
کانٹوں سے جو زخمی ہیں وہ یہ کیا جانیں — ڈس لیتا ہے جب پھول تو کیا ہوتا ہے

اس خط کے لفافے پر یہ پتہ تحریر ہے:

خورشید علی خاں ۱۰ بخل الناس
۱۵۔ بی۔ این۔ نارتھ ناظم آباد۔ کراچی

اس خط کے جواب میں، میں نے صرف اتنا لکھ کر خط بھیج دیا کہ:

گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

یہ فرمایئے آپ کراچی کب تشریف لا رہے ہیں؟
باقی وقتِ ملاقات۔

آپ کا ۱۰ بخل الناس"
خورشید کا ستیاناس
جمعرات ۱۹۔۱۰۔۷۵ء

جوش صاحب کی کراچی آمد:

چوبیس کو جوش صاحب نے مجھے ٹیلی فون کیا۔ دلبرا میں چھبیس کو ہوائی جہاز سے کراچی پہنچ رہا ہوں تم مجھے ایرپورٹ پر لینے آ جانا۔ اس دفعہ میں اپنے ہی گھر پر قیام کروں گا"۔

چنانچہ میں اور سلامت علی خاں چھبیس اکتوبر کو ایرپورٹ سے جوش صاحب کو لے آئے اور ان کے گھر پہنچا دیا۔ اس دفعہ جوش صاحب کا کراچی میں قیام بہت کم مدت کے لیے

تھا۔ ان کے ملنے والوں میں ایک صاحب ریلوے میں ملازم تھے جوش صاحب نے انھیں دام دے کر فرمایا کہ اسلام آباد کے لیے کوپے کی ایک سیٹ ان کے لیے ریزرو کروا دیں اور اگر یہ ریزرویشن ایک ہفتے کے اندر ہو جائے تو بہت بہتر ہے۔ دوسرے دن سے جوش صاحب کی دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تیسرے یا چوتھے دن جوش صاحب کی دعوت اقبال حیدر زیدی صاحب کے گھر تھی۔ اقبال میاں خوبصورت اور خوب سیرت نوجوان ہیں۔ کینیڈا میں رہتے اور کاروبار کرتے ہیں۔ خود بھی شعر کہتے ہیں اور جوش صاحب کے پرستاروں میں سے ہیں۔ ان کے والد صاحب بھی شاعر ہیں اور پیشہ وکالت سے وابستہ ہیں۔ ان کا مکان جوش صاحب کے مکان کے قریب ہی فیڈرل بی ایریا میں ہے۔ جوش صاحب جب بھی کراچی آتے ہیں، اقبال میاں ان کی نہایت پرتکلف دعوت ضرور کرتے ہیں۔ اقبال صاحب کے مکان پر محفل شعر و سخن جاری تھی۔ میں، راغب صاحب اور سلامت علی خاں بھی مدعو تھے۔ اتنے میں ریلوے والے صاحب آئے اور جوش صاحب کو ریل کا ٹکٹ دے کر کہا "جوش صاحب آپ کے لیے اگلے پیر کو کوپے ریزرو ہو گیا ہے"۔ جوش صاحب نے تو ان کا شکریہ ادا کر کے ٹکٹ رکھ لیا لیکن راغب صاحب نے فرمایا۔

راغب صاحب کی پیشین گوئی:

لمحات پرانوار چلے جائیں گے؟	اوقات گہربار چلے جائیں گے
رہ جائیں گے ہم لوگ ملول و مغموم	کیا پیر کو سرکار چلے جائیں گے

اس وقت تو سب نے اس فی البدیہہ رباعی کی خوب داد دی مگر یہ بھی عجیب و غریب اتفاق ہے کہ اس واقعے کے تقریباً سوا چھ سال بعد جب جوش صاحب اس دنیا سے رخصت ہوئے تو وہ بھی پیر کا دن تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ راغب صاحب نے یہ رباعی اسی دن کے لیے کہی تھی۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ اس محفل میں انسانی فطرت کی پیچیدگیوں پر گفتگو چھڑ گئی سب نے اپنا اپنا خیال ظاہر کیا۔ آخر میں میں نے اپنے خیالات بیان کر دیے۔ جوش صاحب میرے خیالات سے بہت متاثر ہوئے اور فرمایا "خورشید علی خاں! خیالات کے اعتبار سے

اونچے اور کنوارے خیالات رکھتے ہیں"۔

راغب صاحب نے فوراً ایک رباعی کہہ دی۔

باقی نہیں آگ اور ہیں شرارے اب تک
آنکھوں کے کسی کی ہیں یہ تارے اب تک
اللہ رے جوش کی نظر میں راغب
خورشید علی خاں ہیں کنوارے اب تک

اس محفل میں جوش صاحب نے رباعیات سنائیں۔

جو دل کی ہے وہ بات نہیں ہوتی ہے
جو دن نہ ہو وہ رات نہیں ہوتی ہے
ہستی ہے وہ طوفان کہ اکثر اے جوش
اپنے سے ملاقات نہیں ہوتی ہے

ذرے سر اٹھا مہر درخشاں ہو جا
اے مور ہمک اور سلیماں ہو جا
اس تنگ انا کے خول سے اے حیواں
خود کو باہر نکال انساں ہو جا

ذرات پہ ہے لعل و گہر کا دھوکا
ہر جلوہ ہے اک رقص شرر کا دھوکا
جب سطح مشاہدے کی بدلی تو کھلا
آفاق تمام ہے نظر کا دھوکا

چلتا نہیں کچھ زور تماشائی کا
حافظ ہے بس اللہ ہی بینائی کا
ہر برف کی سل میں برق ہے پرافشاں
ہر مادہ مرکب ہے توانائی کا

اٹھے تن کی گھٹان دیکھے تو کوئی
ہر پل اک تازہ آن دیکھے تو کوئی
سینے پہ شکار اہل دل کی خاطر
چھوٹے چھوٹے مچان دیکھے تو کوئی

رات تقریباً دس گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔

دوسرے دن جوش صاحب کی ناشتے کی دعوت ان کے بہت عزیز دوست منور عباس

صاحب ایڈوکیٹ کے گھر تھی۔ وہاں اور دوسرے شعرا کے علاوہ راغب صاحب، علامہ رشید ترابی اور حضرت بابا ذہین شاہ صاحب تاجی مدظلہ بھی مدعو تھے۔ بابا صاحب نے جوش صاحب کے متعلق فرمایا کہ بھئی ہم تو جوش صاحب کو اپنا پیر مانتے ہیں کیونکہ ان میں تمام صفات درگاہی ہیں۔ یہ بہت عظیم انسان ہیں۔ یہ کسی بادشاہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتے مگر جستجوئے حق میں اشک سحر گاہی سے وضو کرتے ہیں۔ میں ان کے مقام بلند کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہوں مگر یہ میری پہنچ سے بہت ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔ راغب صاحب نے کہا۔ بابا صاحب یہ فرما رہے ہیں کہ جوش صاحب۔

بے گانۂ دستور شہنشاہی ہیں　　　　منزل پہ نظر جس کی ہو وہ راہی ہیں

کیوں حضرت جوش کو نہ ہم پیر کہیں　　　　اوصاف تو آپ میں بھی درگاہی ہیں

بابا صاحب نے فرمایا۔ راغب صاحب تو سوتے بھی شعر ہی میں ہیں۔ اس محفل میں بابا صاحب نے بھی اپنا کلام سنایا۔ ایک شعر یہ تھا۔

دوران محبت کہ ازل سے ہے ابد تک　　　　وہ مرکب یک لمحۂ عمر گزراں تھا

اس کے بعد چوتھی نومبر کو جوش صاحب اسلام آباد تشریف لے گئے۔

انسانی "ذات" اور شخصیت:

اس کے بعد جوش صاحب دسمبر کے وسط میں کراچی تشریف لائے اور اپنے مکان پر قیام کیا اور کراچی کی رونقیں دوبارہ لوٹ آئیں اور پھر وہی شام کی دعوتیں۔ کبھی کہیں کبھی کہیں۔ شام کو احباب جوش صاحب کے مکان پر جمع ہو جاتے اور غروب تک علمی و ادبی گفتگو ہوتی اور غروب آفتاب کے بعد محفل رنداں کا رنگ اور ہو جاتا۔

ایک دن میں اور راغب صاحب شام سے بہت پہلے جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ جوش صاحب بھی غسل ثانی کے بعد تخت پر جلوہ افروز ہو چکے تھے۔ گفتگو کا رخ خود انسانی "ذات" کی طرف مڑ گیا۔ راغب صاحب نے سوال کیا کہ انسانی "ذات" کی حقیقت کیا ہے؟ جوش صاحب نے فرمایا کہ ذات کے بجائے اگر آپ شخصیت کہیں تو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ ہر شے جس میں خود انسان بھی شامل ہے اس کائنات کے مختلف اجزا کے ایک خاص

تناسب میں ترتیب پانے کے نتیجے میں عالم وجود میں آئی ہے اور چونکہ یہ پوری کائنات تغیر پذیر ہے اس لیے انسانی وجود بھی ہر لحہ تغیر کی زد میں ہے ہم جو کچھ ہیں وہ ہمارے اطراف کے عناصر، ہمارے جغرافیائی، معاشرتی تانے بانے اور ہماری میراث کے اثرات کا نتیجہ ہیں اور اسی جبر کے تابع ہماری شخصیت تشکیل پاتی ہے۔ میں نے کہا۔ جوش صاحب آپ کی ایک رباعی کا بھی غالباً یہی مفہوم ہے۔

کہنے کو تو ایک بات کہتا ہوں میں
پر فلسفۂ حیات کہتا ہوں میں
جب میری زبان سے "میں" نکلتا ہے ندیم
اس پردے میں "کائنات" کہتا ہوں میں

راغب صاحب نے کہا کہ یہ ساری باتیں میری شخصیت کے تعلق سے تو درست ہو سکتی ہیں مگر خود میری ذات کا ادراک پھر بھی محال ہے اور اس کے بعد ایک رباعی کہہ دی۔

"میں" کون ہوں، میں کیا ہوں، کہاں جان سکا
اور "غیر" بھی اپنے کو نہ گردان سکا
چہرے پہ ہے اس قدر مہ و سال کی گرد
اپنے ہی خدوخال نہ پہچان سکا

۱۹-۱۲-۰۰۵

جوش صاحب نے کہا جی ہاں انسان اتنا حیرت ناک اور پیچیدہ حیوان ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی طباع و فطین کیوں نہ ہو ثبات عقل و فکر کی موجودگی میں یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا ہے کہ اسے اپنی ذات کی معرفت تام حاصل ہو چکی ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہمیں اپنی ذات سے چونکہ انتہائی قرب حاصل ہوتا ہے اس لیے یہ انتہائی قرب ہمارے واسطے اس بات کو بے حد دشوار بنا دیتے ہیں کہ ہم خود کو کچھنے کی طرح سمجھ سکیں۔

ہے سب سے بڑا فاصلہ قرب کامل　　　اپنی خلوت سرا میں جاؤں کیونکر

لیکن یہاں دو باتیں غور طلب ہیں۔ ایک ہے ہماری "ذات" دوسری ہماری "شخصیت"۔ جہاں تک ذات کا تعلق ہے اس کا ادراک مشکل ہے لیکن جہاں تک شخصیت کا تعلق ہے

اس کا معروضی تجزیہ کیا جا سکتا ہے اور یہ کام ہر باشعور انسان کو کرنا چاہیے۔ ہم کو چاہیے کہ اس بنیادی امر کے متعلق اپنے عادات، ماحول، مزاج اور جذبات سے تھوڑی دیر کے واسطے دست بردار و عاری ہو کر اس بات پر ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ہماری یہ تمام شخصیت اور ہماری شخصیت کے تمام مسلمات کی یہ سربفلک عمارت جس کی چھت کے نیچے ہم آج بڑی فراغت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جسے اس کرۂ ارض کی تمام عمارتوں کے مقابلے میں ہم سب سے زیادہ پائدار اور سب سے زیادہ خوبصورت سمجھ رہے ہیں دراصل "مکسوب" ہے کہ موروثی؟ یعنی اس عمارت کو ہماری فکر نے تعمیر کیا ہے یا پیدائشی حادثہ کی بنا پر ہمیں ترکہ میں بنی بنائی مل گئی ہے اور اگر غور و فکر کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچیں کہ یہ شخصیت موروثی ترکہ ہے تو پھر ہمیں اپنی شخصیت کے نقائص کو معلوم کر کے ان کو دور کرنے اور ان کی جگہ بہتر کردار کو اپنانے کی قدرت بھی ہونا چاہیے۔ اسی کو ہم شعور کی پختگی کہتے ہیں اور یہیں سے کردار کی تخلیق اور تہذیب کا عمل شروع ہوتا ہے۔ یہ دلچسپ گفتگو جاری تھی کہ قریب کی مسجد سے موذن نے سورج کے غروب ہونے کا مژدہ جانفزا سنایا اور جوش صاحب نے جلدی جلدی گلاس بھرا اور "بیاد فلاں بنت فلاں" کے الفاظ کو جام میں انڈیل دیا۔ تھوڑی دیر میں دوسرے احباب بھی آگئے اور محفل کا رنگ بدل گیا۔

عقیدہ پرستی:

اس کے بعد ۲۰ دسمبر کو میں صبح دس بجے جوش صاحب کے گھر گیا۔ وہ بیٹھے ہوئے کچھ لکھ رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے۔ آؤ آؤ۔ ابھی ابھی ایک رباعی ہوئی ہے تم کو سب سے پہلے سنا رہا ہوں۔ میں نے کہا ارشاد ارشاد۔

اب تک گھڑ گھڑ گھرڑ گھرڑ ہیں ادیان — سن سن سن سن ہیں اب بھی اقوال کے بان
تک تک تک تک ہے مرشدوں کی تال — تھر تھر تھر تھر تھرک رہا ہے انسان

میں نے عرض کیا۔ سبحان اللہ۔ جوش صاحب اس وقت اردو ادب میں آپ سے بڑا قادر الکلام شاعر کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اس رباعی کے الفاظ کا صوتی تاثر ہی ان خیالات اور جذبات کا سچا آئینہ دار ہے جو آپ بیان کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی خوبی یہ ہے کہ جہاں لفظ

اپنی تہی دامنی کا اعلان کر دیتی ہے وہاں آپ الفاظ کے صوتی اثر سے خیالات کے ابلاغ کا کام نہایت کامیابی سے انجام دینے پر قادر ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا بعض دفعہ صوتی اثرات خود الفاظ سے زیادہ اثر آفرینی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد جوش صاحب نے کہا چلو ذرا روشن علی بھیم جی سے مل کر آتے ہیں چنانچہ ہم دونوں بھیم جی صاحب کے گھر چلے گئے۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر واپسی میں راغب صاحب کے دفتر میں ان سے ملنے چلے گئے۔ وہاں کچھ اور احباب بھی موجود تھے۔ ایک صاحب نے جوش صاحب سے سوال کیا کہ ہم بہ حیثیت قوم علم کے اعتبار سے مغربی ممالک کے مقابلے میں اس قدر پیچھے کیوں ہیں۔

جوش صاحب نے فرمایا کہ اس کی سب سے بڑی وجہ ہماری عقائد پرستی ہے۔ ہم ابھی تک حقائق حیات کو معروضی انداز میں دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ایک سازش کے تحت ہمارے عوام کو جدید تعلیم سے محروم رکھا جاتا ہے تاکہ مفاد یافتہ طبقات کے مفادات کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ میں نے کہا جوش صاحب آج سے چند یوم بیشتر میں نے عقائد کے متعلق چند نکات نوٹ کیے ہیں۔ اب کے آؤں گا تو آپ کو ضرور سناؤں گا۔ جوش صاحب نے فرمایا ضرور سنائیے گا۔ چنانچہ دوسرے دن جب میں جوش صاحب کے گھر گیا تو اپنی وہ تحریر بھی ساتھ لیتا گیا۔ آپ بھی سن لیجیے۔

۱۔ ہر عقیدہ ایک ایسی چھل پیری ہے جو مسافر راہ حقیقت کو اپنے دام فریب میں الجھا کر اسے ہمیشہ کے لیے گم کردہ راہ کر دیتی ہے۔ اس کی نظر میں حقائق مسخ ہو جاتے ہیں۔ تمیز اپنے معنی بدل دیتی ہے۔

۲۔ معتقد کی آنکھوں پر ایسی عینک چڑھ جاتی ہے جس سے حقائق کبھی اپنا اصلی رنگ نہیں دکھا سکتے۔ اس لیے ہمیشہ رہرو راہ حقیقت کو چاہیے کہ وہ تمام عقائد کے پھندوں سے آزاد رہے۔ جو جس قدر زیادہ کھلا ذہن رکھے گا وہ اسی قدر آسانی اور سرعت کے ساتھ علم کی دشوار گزرگاہ پر صحیح سمت میں گامزن ہو سکے گا۔ مشرق کا المیہ یہ ہے کہ یہاں بڑے بڑے دیو پیکر مفکر بھی خارزار عقائد میں اپنا دامن الجھائے بغیر نہ گزر سکے۔ جوش صاحب نے یہ سن کر کہا "ہائے ہائے ارے اس بدبختی پر ماتم کرنے کو جی چاہتا ہے"۔

۳۔ عقیدہ دوسروں کے ذہن کی اترن ہے۔

۴۔ عقیدہ ذہنی افلاس ہے۔ عقیدہ اضمحلال شوق ہے۔ سفر عشق میں ذوق راحت طلبی ہے۔

۵۔ عقیدہ کاسۂ دریوزہ گری ہے۔

۶۔ عقیدہ توہین عزم وہمت ہے۔ فکر کا جمود ہے۔ ارتقا اور تغیر کا دشمن ہے۔

۷۔ عقیدہ ایسی شراب ہے جو فکر کے تمام اعصاب کو معطل کر دیتی ہے۔

۸۔ عقیدہ عقل کے شہ پر نوچ لیتا ہے۔

۹۔ عقیدہ دوسروں کی تال پر رقص کرنے کا نام ہے۔

۱۰۔ عقیدہ تحقیق کے ہاتھوں کی ہتھکڑی ہے۔

۱۱۔ عقیدہ وہ زہر ہے جو پیدائش کے بعد سے ماں باپ اور ماحول اپنی اولاد کے خون میں گھولتے رہتے ہیں۔

۱۲۔ عقیدہ نوع انسانی کو مختلف متحارب گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

۱۳۔ عقیدہ شہادتوں کو جھٹلانے کا نام ہے۔

۱۴۔ عقیدہ آزادی ذہن کے پیر کی بیڑی ہے۔

جوش صاحب نے بہت غور سے سنا اور پھر فرمایا۔ بالکل سچ کہتے ہو۔

مرے نزدیک تو عقل و عقائد کی ہم آغوشی
نکاح بے قبول و عقد بے ایجاب ہے ساقی

اتنے میں سلامت علی صاحب آ گئے۔ انھوں نے کہا جوش صاحب پہلی جنوری ۷۰ء کو میرے گھر پر آپ کے ناشتے کی دعوت ہے۔ آپ سب احباب ضرور تشریف لائیں۔ تھوڑی دیر میں عالیہ امام بھی آ گئیں۔ انھوں نے یکم جنوری کی شام کی دعوت کا اعلان کر دیا۔ جوش صاحب کسی کو مایوس نہ کر سکے۔

۳۰ دسمبر کو جوش صاحب حبیب پبلک اسکول میں ایک تقریب میں مہمان خصوصی تھے۔ میں ان کو لے کر ساڑھے تین بجے وہاں پہنچ گیا۔ وہاں جوش صاحب نے بچوں سے خطاب کیا اور علم کی اہمیت اور وقت کی قدر پر تقریر کی۔ شام کو گھر آ گئے۔

دوسرے دن جوش صاحب نے مجھ سے کہا کہ وہ عباس مرزا صاحب کے گھر جو کے ڈی اے میں آفسر تھے، جانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم دونوں دس بجے صبح ان کے گھر ناظم آباد

پہنچ گئے۔ وہاں ڈاکٹر احسن فاروقی جو کوئٹہ یونیورسٹی میں پروفیسر تھے مل گئے۔ جوش صاحب نے ڈاکٹر صاحب کا مجھ سے تعارف کرواتے ہوئے فرمایا کہ یہ اپنے نام کے ساتھ فاروقی لگاتے ہی مگر ہیں شیعہ۔ پھر جوش صاحب نے ڈاکٹر صاحب ہی سے دریافت کیا کہ آپ اپنے نام کے ساتھ فاروقی کیوں لگاتے ہو؟ تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ لکھنؤ میں شیخوں کا محلہ تھا جس میں تمام کے تمام فاروقی رہتے تھے مگر وہ شیعہ ہوگئے تھے۔ انھوں نے شیعہ ہونے کے باوجود فاروقی کا لاحقہ ترک نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب بہت عالم اور اچھے مفکر تھے۔ ان سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔

۱۹۷۶ء کے واقعات

سلیمہ سلامت:

یکم جنوری ۱۹۷۶ء کو میں اور راغب صاحب صبح آٹھ بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گئے۔ اور ان کو لے کر سلامت علی خاں کے مکان گئے۔ وہاں خاں صاحب اور ان کی بیگم نے چند اور احباب کو بھی مدعو کر رکھا تھا اور ناشتے کا بہت پر تکلف اہتمام کیا تھا۔

تقریباً ساڑھے دس بجے ناشتہ ملا۔ اس میں بٹیریں بھی بھنی ہوئی۔ کباب، پراٹھے، حلوہ، پوریاں، کلیجی گردے تلے ہوئے سب نے خوب سیر ہو کر ناشتہ کیا مگر راغب صاحب نے رباعی کے ذریعہ تاخیر سے طعام ملنے پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کر دیا۔

یہ تو سچ ہے بدیر کھائے ہم نے	بایں ہمہ ہو کے سیر کھائے ہم نے
اللہ سلامت کو سلامت رکھے	حلوہ پوری بٹیر کھائے ہم نے

جوش صاحب نے تیسرے مصرع میں ترمیم کی۔ "اللہ سلیمہ کو سلامت رکھے"۔ سب نے اس ترمیم کی داد دی۔ سلامت علی خاں نے اپنی بیگم کے متعلق فرمایا کہ یہ شعر بھی کہتی ہیں۔ جوش صاحب نے سنانے کی فرمائش کی۔ سلیمہ بھابی نے شرماتے ہوئے کہا شروع شروع میں شعر کہنے کی کوشش کی تھی مگر اب تو برس ہو گئے۔ طبیعت موزوں نہیں ہوتی ہے۔ سب نے اصرار کیا کہ ابتدائی دنوں کا ہی کلام سنائیں۔

بھابی نے کہا ایک غزل شادی کے فوراً بعد کہی تھی اس کے دو شعر یاد ہیں۔

مبارک مبارک نیا دور ہستی نشاط آفریں ہو نشیمن ہمارا
شباب آگیا ہے رباب آگیا ہے ہو مدہوش ساقی ہے یہ بھی گوارا

اتنا کہہ کر وہ شرما کر کہنے لگیں اس کے آگے یاد نہیں ہے۔

راغب صاحب نے کہا۔

سلیمہ تو کہتی رہیں شعر راغب سلامت علی خاں نے کیا تیر مارا

جوش صاحب نے ارشاد فرمایا۔

بڑی خاکساری سے بیٹھا ہوا ہے سلیمہ کے آگے سلامت بچارا

اس کے بعد جوش صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش ہوئی۔ جوش صاحب نے چند اشعار اور چند رباعیات سنائیں۔

یارب ادھر وہ نازشں دوراں کب آئے گا
رحل نگاہ شوق پہ قرآں کب آئے گا

رنگین تمناؤں کی ہولی دیکھی طاعت کی مسکتی ہوئی چولی دیکھی
کھولا جو در ضمیر خاصان خدا چھم چھم کرتی بتوں کی ٹولی دیکھی

دوران گفتگو شراب کے متعلق جوش صاحب نے کہا۔

"یہ تو ہم نے مظالم آسمانی کے خلاف ایک دوا ایجاد کی ہے"۔

غرض ان باتوں اور شاعری میں ایک بج گیا اور محفل برخاست ہو گئی۔

اسی دن شام کو ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر جوش صاحب اور ہم سب احباب کی دعوت تھی۔ عالیہ ہمیشہ جوش صاحب کی دعوت کا بہت خاص اہتمام کرتی ہیں۔ ان کو عام طور پر علم اور اہل علم سے تو لگاؤ ہے ہی مگر جوشں صاحب سے ان کے بزرگوں سے بہت قریبی تعلقات چلے آرہے ہیں۔ ان کے والد سید محمد عسکری صاحب جو بھوپال میں ایک کامیاب ایڈووکیٹ تھے۔ جوش صاحب کے جوانی کے دوستوں میں سے تھے۔ عالیہ کے بڑے بھائی سید محمد مہدی ترقی پسند مصنفین کے قافلہ سالاروں میں شمار ہوتے ہیں۔ بمبئی میں جوشں صاحب کے حلقۂ ارادت کے سربر آوردہ نوجوانوں میں تھے اور کراچی میں ڈاکٹر عالیہ امام اس خاندانی



آغا اسماعیل قزلباش، بیگم لیلیٰ قزلباش، اشرف جہاں بیگم جوش، جوش ملیح آبادی، رئیس احمد خاں (برادرِ جوش)

روایت کی نہایت وفاداری بشرط استواری کے ساتھ امین ہیں۔

چنانچہ اس دفعہ انھوں نے پر تکلف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ لذت کام و دہن کے ساتھ فردوس گوش کا بھی بندوبست تھا۔ خود عالیہ بہت اچھا گاتی ہیں اور ان کی بڑی بہن کی بیٹی زینت بی اچھا گاتی ہیں۔ جوش صاحب اس محفل میں بہت خوش رہتے ہیں۔ لطیفے بھی خوب سناتے ہیں اور کلام بھی۔ یہ انجمن مہرو ماہ نصف شب کو پہنچ کر اختتام پذیر ہوئی۔

بیگم جوش کا انتقال:

دوسری جنوری ۱۹۷۶ء کو جوشش صاحب تیز گام سے اسلام آباد روانہ ہوگئے۔ ان کی روانگی کے ایک ہی ہفتے کے اندر جمعہ کے دن ۹ جنوری ۱۹۷۶ء کو ایک انتہائی خوفناک المیہ وقع ہوگیا۔ رات تقریباً ساڑھے آٹھ بجے جوشش صاحب کے گھر اسلام آباد سے میرے پاس ٹیلی فون آیا ان کی پوتی بول رہی تھیں۔ جوش صاحب کی بیگم اشرف جہاں آگ سے جل کر انتقال کر گئیں۔ بچی نے بتایا کہ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بی بی (بچے اپنی دادی کو بی بی کہتے تھے) اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئیں اور کمرہ اندر سے بند کر لیا۔ چونکہ سردی زیادہ تھی اس لیے ہیٹر جلا کر پیروں کے قریب رکھ لیا اور لحاف اوڑھ کر سو گئیں۔ نیند کی حالت میں لحاف کا سرا ہیٹر پر گر گیا اور آگ پکڑ لی۔ وہ بیچاری دھان پان تو پہلے ہی سے تھیں۔ دھوئیں کے اثر سے بے ہوش ہو گئیں اور لحاف کے شعلوں میں جل کر راکھ ہو گئیں۔ جب پوتا پوتی نے ان کے کمرے سے دھواں نکلتے دیکھا تو دروازہ کھولنے کی کوشش کی مگر وہ چونکہ اندر سے بند تھا اسس لیے انھوں نے فائر بریگیڈ کو ٹیلی فون کیا مگر اس کے آنے تک سب کچھ جل کر خاک ہو چکا تھا۔ جوشش صاحب کا صدمے سے برا حال تھا۔ میں نے ٹیلی فون پر ان سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ میں ان کی رندھی ہوئی آواز کے علاوہ اور کچھ نہ سن سکا۔

ہائے بیگم جوش۔ تمام عمر جوش صاحب کے معاشقوں کے سبب رقابت کی آگ میں جلتی رہیں اور آخر اس زندگی سے نجات بھی پائی تو آگ ہی کے توسط سے۔ ہائے افسوس۔ میں نے جوش صاحب کو پرسے کا خط لکھا۔ پہلے کئی خطوط لکھ کر چاک کیے نہ اظہار جذبات کے

لیے مناسب الفاظ مل رہے تھے۔ نہ اتنی ہمت تھی کہ ان کو صبر کی تلقین کر سکوں۔ صرف اتنا لکھ سکا کہ ۔۔۔ "جوش صاحب! اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر غم انفرادی ہوتا ہے مگر میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ کاش آپ یہاں ہوتے تو ہم سب آپ کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض غم ایسے ہوتے ہیں جو زندگی کے ساتھ رہتے ہیں اور صرف وقت ہی ان کی دھار کو کند کر سکتا ہے"۔ اس کے بعد اکثر ٹیلی فون پر جوش صاحب سے بات ہوتی رہتی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ چند ہفتوں ہی میں انھوں نے بڑی حد تک اس غم پر قابو پا لیا۔ پھر تیسری مارچ کو جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ وہ پانچویں کو کراچی پہنچ رہے ہیں اور میں ان کو لینے کے لیے ایرپورٹ ضرور آؤں۔ میں نے وعدہ کر لیا۔

پانچویں مارچ ۱۹۷۰ء بروز جمعہ حسب وعدہ جوش صاحب اسلام آباد سے بذریعہ ہوائی جہاز کراچی تشریف لائے۔ میں ان کو لینے کے لیے ایرپورٹ گیا تھا۔ وہاں مرزا عالمگیر قدر اور ان کے ساتھ ایک صاحب محمود نانجیانی بھی جوش صاحب کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ واپسی میں وہ بھی جوش صاحب کے ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ گئے۔ راستے میں جوش صاحب نے دریافت کیا کہ نانجیانی تو ہندو نام معلوم ہوتا ہے تو مرزا صاحب نے فرمایا کہ ان کے آباو اجداد ہندو ہی تھے مگر جب یہ مسلمان ہو گئے تب بھی اپنی قدیم شناخت کو باقی رکھنے کے لیے اپنے مسلمان ناموں کے ساتھ نانجیانی کا لاحقہ قائم رکھا۔ گھر پہنچنے کے بعد مرزا صاحب نے کہا کہ نانجیانی ایک مجلس عزا منعقد کرنا چاہتے ہیں اور ان کی یہ خواہش ہے کہ جوش صاحب اس مجلس میں کوئی مرثیہ پڑھیں۔ جوش صاحب نے فرمایا مرزا تم کہتے ہو تو میں شریک ہو جاؤں گا اور جو مسدس تم کہو گے وہ پڑھ بھی دوں گا مگر تم خوب جانتے ہو کہ میں نے یہ مسدس اس لیے نہیں کہے ہیں کہ لوگ صرف ثواب حاصل کرنے کے لیے انھیں مجالس عزا میں پڑھوائیں۔

مرزا صاحب نے فرمایا۔ قبلہ جوش صاحب آپ اس بات پر بھی تو غور فرمایئے کہ آخر میں کیوں آپ سے ان محفلوں میں مسدس سنانے کی فرمائش کرتا ہوں۔ ارے میاں یہی تو وہ مقامات ہیں جہاں تمھارے انقلابی پیغام کی سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ ان مجالس میں

تھیں ایسے عقیدت مند سامعین مل جاتے ہیں جو کم از کم ثواب سمجھ کر ہی تمہاری بات غور سے سنتے تو ہیں اور مجھے یقین ہے کہ تمہارا پیغام ضرور ایک نہ ایک دن اپنا اثر دکھائے گا اور صدیوں سے ذہنوں پر جمی ہوئی برف آج نہیں تو کل ضرور پگھلے گی اور بقول تمہارے یہی تو وہ پاک ہیں جو تم جیسے بختیہ گردں کی کارگاہیں ہونا چاہیں۔

جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا مرزا تم سے بحث میں کون جیت سکتا ہے۔ بہرحال جس دن تم چاہو مجھے آکر لے جاؤ، میں چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد مرزا صاحب نے فرمایا۔ اچھا اب مجھے اجازت دو۔ یہ کہہ کر وہ اور تانجیانی صاحب رخصت ہو گئے اور میں بھی تھوڑی دیر کے بعد اپنے گھر آ گیا۔

اس کے تیسرے دن جوش صاحب صبح ۹ بجے اپنے ایک عزیز فاروق احمد خاں صاحب کے ساتھ میرے گھر تشریف لائے اور فرمایا آؤ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور ان کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ راستے میں فاروق احمد خاں صاحب نے اپنا تعارف کروانا شروع کیا۔ "میں جوش صاحب کا حنفی المذہب عزیز ہوں۔

میں نے کہا وہ تو آپ کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ مذہب کی تشریح، میرے خیال میں ضروری نہیں تھی۔ خان صاحب نے فرمایا ارے صاحب آپ کو شاید نہیں معلوم جوش صاحب بھی اپنی ددھیال کی طرف سے کٹر سنی ہیں۔ میں نے کہا میاں بھی آپ نے کٹر کی صفت زائد استعمال فرمائی ہے۔ جوش صاحب جو کچھ ہیں وہ میں بھی جانتا ہوں۔ اس وقت تو آپ صرف اپنے کاروبار کے تعلق سے فرمائیے کہ آپ کا کیا شغل ہے۔

فرمایا میری موٹر کے پرزوں کی ایک دوکان پلازہ سنیما کے قریب بندر روڈ پر واقع ہے۔ جوش صاحب نے فرمایا ان کی کچھ زمینیں اور باغات بھی ہیں سندھ میں، جہاں سے ان کے گھر نہایت عمدہ آم آتے ہیں اور یہ گنے کی رس کی کھیر بھی بہت لذیذ کھلاتے ہیں۔

میں نے محسوس کیا فاروق صاحب دلچسپ آدمی ہیں۔ ہم لوگ پہلے عبدالخالق صاحب سگریٹ والے کی دوکان واقع بولٹن مارکیٹ گئے وہاں کچھ دیر بیٹھ کر پھر ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر چلے گئے جو کینٹ اسٹیشن کے عقب میں واقع تھا۔ وہاں ہم لوگوں نے دوپہر کا کھانا کھایا اور جوش صاحب نے وہیں آرام کیا۔ عالیہ کے گھر سے ہم لوگ شام پانچ بجے لوٹے۔ جوش صاحب

کو ان کے گھر اور مجھے میرے گھر پہنچا کر فاروق خان صاحب اپنے گھر چلے گئے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے فرمایا کہ کل بابا ذہین شاہ صاحب کے گھر جانا ہے۔ صبح نو بجے تک آجائیے۔ چنانچہ میں دوسرے دن صبح نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں فاروق خاں صاحب بھی آگئے اور ہم لوگ بابا صاحب کے گھر چلے گئے۔ بابا صاحب بہت خوش ہوئے اور بہت محبت سے جوش صاحب کو اپنے قریب صوفے پر بٹھا لیا۔ بیگم جوش کے انتقال کے بعد یہ بابا صاحب کی جوش صاحب سے پہلی ملاقات تھی۔ اس لیے پہلے تو انھوں نے افسوس کا اظہار کیا پھر فرمایا کہ ایک روز میں بیٹھا ہوا اس سانحے کے متعلق افسوس کر رہا تھا تو دفعتاً ایک خیال ذہن میں آیا۔ بعد میں غور کیا تو وہ تاریخ نکل گئی۔

رفع عین عذاب کردہ بگفت   وقنا ربنا عذاب النار

جوش صاحب اداس ہونے لگے تو بابا صاحب نے گفتگو کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ پہلے تو انھوں نے چند اشعار سنائے۔ پھر ادھر ادھر کی گفتگو ہونے لگی۔ دوران گفتگو کسی صاحب نے فاروق صاحب سے دریافت کر لیا کہ سندھ میں ان کے کتنے باغات ہیں۔ انھوں نے فرمایا صرف ایک آم کا باغ ہے۔

میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ کیا باغ کی جمع باغات درست ہے۔ جوش صاحب نے فرمایا باغات اور مکانات غلط العام ہیں جو جائز ہے۔ زبان میں دو قسم کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ ایک کو ہم غلط العوام کہتے ہیں یعنی وہ غلطیاں جو غیر تعلیم یافتہ اور جاہل طبقے سے سرزد ہوتی ہیں ان کو ہم جائز نہیں سمجھتے۔ اس کے برعکس اگر ہر شخص جس میں تعلیم یافتہ طبقہ بھی شریک ہے کوئی غلطی کرے تو وہ غلط العام کہلائے گی جو جائز ہے۔ باغات اور مکانات بھی غلط العام ہیں جو جائز ہیں۔

maablib.org

احدیت ۔ واحدیت اور محمدؐ:

بابا صاحب نے فرمایا کہ عوام اپنی کم علمی کی وجہ سے لغت کو محدود کر دیتے ہیں۔ مثلاً آل محمدؐ کے معنی صرف محمد صلعم کی اولاد کے لیے جاتے ہیں حالانکہ آل کے معنی پس روندہ یعنی بعد میں آنے والے کے ہیں۔ اس اعتبار سے تمام مسلمان آل محمدؐ ہیں۔ اس کے علاوہ ایک

اور دلچسپ بات آپ کو بتلاؤں کہ یہ تمام کائنات بھی چونکہ تخلیق کے اعتبار سے قابل تعریف ہے اس لیے محمدؐ ہے اس اجمال کی شرح یہ ہے۔ کائنات جمع ہے کائنہ کی اور کائنہ کے معنی ایسی چیز کا وجود میں لانا ہے جس کا پہلے سے کوئی نمونہ موجود نہ ہو۔ یہ خالق کے ارادے کے مطابق تخلیق پاتی اور ہر لمحہ نئے نئے سانچوں میں ڈھلتی رہتی ہے۔ دراصل یہ تمام کائنات ذات مطلق کی صفاتی جلوہ گری ہے۔ مقام "احدیت" میں ذات مطلق بلاصفات ہوتی ہے یعنی ہر قسم کی صفت سے مبرا۔ احد کے معنی ہی ذات بلاصفات کے ہیں۔ انسان کے لیے اس مجرد ذات بلاصفات کا ادراک محال ہے۔ لیکن جب ذات احدیت مادی صفات سے متصف ہو جاتی ہے تو وہ "واحدیت" میں تبدیل ہو جاتی ہے یعنی ذات اور صفات واحد ہو جاتے ہیں اس مقام پر وہ قابل ادراک ہو جاتی ہے اور تمام عالم بن جاتی ہے اور چونکہ یہ کل عالم مظہر ذات احدیت ہے اس لیے قابل تعریف ہے یعنی محمد ہے۔ میں نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ جیسے غالب کہتا ہے۔

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی

چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

بابا صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں اور یہی چمن قابل تعریف بھی ہے یعنی محمد ہے اور مسلمانوں کے عقائد کی رو سے تمام عالم کی صفات سمٹ کر جس ایک انسانی ذات کے پیکر میں جمع ہو گئی ہیں وہ حضرت محمد صلعم کی ذات اقدس و اعلیٰ ہے۔ اس طرح ذات محمدی جامع صفات عالم ہے۔ ایسی جامع صفات شخصیت ہمیں اور کوئی دوسری دکھائی نہیں دیتی۔ جیسے ایک آم کی گٹھلی میں تمام درخت اور آموں کی صفات پوشیدہ ہوتی ہیں اسی طرح اگر تمام قابل تعریف صفات کسی ایک انسانی ذات میں جمع ہو سکتی ہیں تو وہ حضرت محمد صلعم کی ذات مبارک ہو گی۔

اس تمام گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ مقام احدیت میں ذات مطلق ناقابل ادراک ہے لیکن جب احدیت صفات سے متصف ہو جائے تو وہ واحد بن جاتی ہے اور یہیں سے قابل ادراک بھی ہو جاتی ہے اور قابل تعریف بھی یعنی محمد بھی اور چونکہ تمام مسلمانوں کو اپنے کردار اور اعمال کی رو سے قابل تعریف شخصیت یعنی محمدؐ کی پیروی کر کے خود کو بھی قابل تعریف شخصیت کا

حامل بنانا چاہیے اس لیے تمام مسلمان آلِ محمدؐ ہیں۔

غرض بہت دیر تک بابا صاحب کی یہ نہایت دلچسپ گفتگو ہوتی رہی اور جب ایک بج گیا تو بابا صاحب نے ہم لوگوں کو کھانے کے لیے مجبور کرنا شروع کر دیا مگر دوران گفتگو اتنے پھل، مٹھائیاں اور چائے پی چکے تھے کہ اب کوئی گنجائش مزید کھانے کی نہیں رہی تھی اس لیے ہم سب نے معذرت کر لی اور گھر آ گئے۔

شام کو تمام احباب جوش صاحب کے مکان پر جمع ہو گئے۔ راغب صاحب بھی اپنے ساتھ ایک سوالنامہ لے آئے۔

راغب صاحب کا ایک سوال یہ تھا کہ "گذشتہ دو ماہ کی مدت میں آپ ذہنی طور پر بے حد پریشان رہے کیا اس پریشانی میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے۔ جوش صاحب نے جواب دیا کہ اب کچھ کمی کی ابتدا ہوئی ہے۔

راغب صاحب نے سوال کیا کہ "آپ اکثر کہا کرتے ہیں کہ میں غم کو زیادہ دیر اپنے دل میں قیام کی اجازت نہیں دیتا لیکن رفیقۂ حیات کی رحلت کا غم کئی ماہ گزر جانے کے بعد بھی علی حالہٖ ہے۔ جوش صاحب نے فرمایا "یہاں میں نے سپر ڈال دی ہے جب بھی ذرا تنہا ہوتا ہوں یہ غم تازہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد راغب صاحب نے فوراً ایک ادبی سوال کر دیا اور موضوع بدل گیا۔ تھوڑی دیر میں آفتاب غروب اور مے خانہ طلوع ہو گیا اور شاعری و لطائف نے ماحول کا رنگ بدل دیا۔ چار پیگ کے بعد جب جوش صاحب کھانے سے فارغ ہو گئے تو دریافت کیا کہ کیا وقت ہوا ہے۔ میں نے عرض کیا "آٹھ میں بیس باقی ہیں"۔ جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا "پھر بھی اتنے خبیث باقی ہیں"؟ اس کے فوراً بعد محفل برخاست ہو گئی۔

دوسرے دن تقریباً دس بجے صبح جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا انھوں نے فرمایا کہ وہ راغب صاحب کے دفتر میں ہیں۔ میں وہیں پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں تھوڑی دیر میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں راغب صاحب کے علاوہ فراست رضوی، فاروق خاں اور نسیم صاحب اس محکمے کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی موجود تھے۔ نسیم صاحب ترقی پسند فکر رکھتے ہیں، سخن فہم بھی ہیں اور شعر بھی اچھا کہتے ہیں۔ جوشؔ صاحب کے مداح ہیں۔ میں جب پہنچا تو زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔

جوشس صاحب فرما رہے تھے - یہاں کے بعد - پر - نہیں لگے گا - یہاں پر یا وہاں پر کہنا غلط ہے - زیادتی کی دال نہیں بولی جائے گی زیاتی کہیں گے - Little folks کا ترجمہ چھٹن پوٹے کریں گے - Dead slow کے لیے مرجھنگی چال بولیں گے - غرض ادھر ادھر کی باتوں میں ایک گھنٹہ گزر گیا تو جوش صاحب نے کہا چلو ہل پارک چلتے ہیں - چنانچہ میں فاروق خاں صاحب اور جوش صاحب حمدی صاحب کے ہوٹل بلومون جو ہل پارک پر ہے، پہنچے - وہاں خاں صاحب نے ایک کمرے میں ہم لوگوں کے بیٹھنے کا بہت اچھا انتظام کر رکھا تھا - دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تو چکن تکہ، نان، سلاد اور رہڑی پیش کی گئی - اس کے بعد کافی پلائی گئی - جوشس صاحب دوپہر میں وہیں سو گئے - تین بجے بیدار ہو کر ہمارے گھر آگئے - وہاں جوش صاحب نے غسل ثانی فرمایا پھر چائے پینے کے بعد ہم لوگ سلامت علی خاں صاحب کے گھر گئے اور ان کو ساتھ لے کر غروب سے کچھ دیر پہلے جوش صاحب کے مکان پر پہنچے - وہاں سے میں تقریباً سات بجے شام گھر لوٹا -

منور عباس صاحب کے گھر دعوت:

دوسرے دن جوشس صاحب کی دعوت ان کے دوست منور عباس صاحب کے گھر تھی - میں صبح ساڑھے نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا - وہاں سلامت علی خاں بھی آگئے - جوشس صاحب نے فرمایا کہ ابھی منور عباس کے گھر کوئی نہیں آیا ہو گا اس لیے ساڑھے دس بجے تک چلیں گے - چنانچہ ہم لوگ ساڑھے دس بجے ان کے گھر کے لیے روانہ ہوئے - جب ہم لوگ وہاں پہنچے تو راغب صاحب اور بابا ذہین شاہ صاحب تاجی پہلے سے موجود تھے - ان کے علاوہ اور بہت سے اصحاب مدعو تھے - جوش صاحب کے پہنچنے کے بعد شعر و شاعری شروع ہو گئی - جناب راغب صاحب نے اسعد شاہ جہاں پوری مرحوم کی غزل سنائی - ایک شعر یہ تھا:

ترک دنیا کی کئی بار قسم کھائی ہے　　　پھر یہ سوچا کہ تری انجمن آرائی ہے

کسی صاحب کی غزل کا ایک شعر یہ بھی تھا:

مجال ترک محبت نہ ایک بار ہوئی　　　خیال ترک محبت تو لاکھ بار آیا

شاہد نقوی صاحب نے رباعی سنائی:

ظالم کے لیے حد شریعت کیا ہے
عادل ہے تو قانون کی حاجت کیا ہے
ناداں ہے تو مذہب کا اسے ہوش ہی کیا
دانا ہے تو مذہب کی ضرورت کیا ہے

راغب صاحب اور بابا صاحب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ آخر میں جوش صاحب نے رباعیات سنائیں۔

ہم آگ میں کھیلتے ہیں خیالات کی ناؤ ۔۔۔ الجھاؤ کی تہہ سے کھینچتے ہیں سلجھاؤ
ہم مزرع برق میں اگاتے ہیں چمن ۔۔۔ ہم قطرۂ شبنم کو بناتے ہیں الاؤ

بڑھتے ہوئے حوصلے سے ڈرتا ہوں میں ۔۔۔ بے وقعت ولولے سے ڈرتا ہوں میں
پیدا ہوتے ہیں خود گلے سے خنجر ۔۔۔ خنجر سے نہیں گلے سے ڈرتا ہوں میں

رباعیات کے بعد جوش صاحب نے مسدس "عظمت انسانی" سنایا۔ اس کے آخری بند مرثیے کے تھے چنانچہ تھوڑی دیر میں یہ ہنستی کھیلتی محفل بزم ماتم بن گئی تو میں اور سلامت علی خاں اپنے گھر چلے آئے۔ جوش صاحب کو بعد میں کسی نے گھر پہنچایا۔ شام کو جب میں اور سلامت علی خاں جوش صاحب کے گھر گئے تو انھوں نے کہا "ارے تم دونوں مردود کہاں غائب ہو گئے تھے؟" میں نے کہا جوش صاحب ہم تو خوشی کے ساتھی ہیں۔ غم سے دور رہتے ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا۔ جی ہاں۔ جی ہاں سچ ہے جس نے معاویہ کا نمک کھایا اس نے دوستوں پر ظلم ڈھایا۔

حق و باطل کے استعارے کربلا اور قرآن کی روشنی میں:

میں نے کہا حضور والا آپ جیسا عظیم مفکر اور انسانی عظمت کا علمبردار، جب ایک ہی سانس میں دو متضاد جذبات کا اظہار کرے اور عقیدت مندوں کی محفل میں اجتماع ضدین پر داد و تحسین کے ڈونگرے سمیٹ کر ذہن میں کوئی خلش محسوس نہ کرے تو ہم جیسے آپ کی

عظمت فکر کے شیدائی آپ کے عقیدے کی اس کرشمہ سازی پر اپنا گریبان چاک کر کے گھر نہ آ جاتے تو وہاں آپ کے عقیدت مندوں کی نفرت انگیز نگاہوں کا نشانہ بنے بیٹھے رہتے؟

ایک طرف تو آپ فرماتے ہیں۔

دوزخ دہر میں گلزار جناں ہے انساں — حلقۂ زلف و خم آب رواں ہے انساں
جنبش نبض مکاں روح زماں ہے انساں — خاک ہے تاج گل شاہ جہاں ہے انساں

حاکم کون و مکاں ناظم دوراں انساں
خاک اک رحل سبک سیر ہے قرآں انساں

اور اس کے ساتھ ساتھ جب انسانیت کی یہ لافانی تلقین بھی فرماتے ہیں:

بات تو جب ہے کسی فرد سے وحشت نہ رہے — دوست تو دوست ہے دشمن سے بھی نفرت نہ رہے
دل ہوں یوں صاف کہ امکان کدورت نہ رہے — عقل کی ہے یہ نجابت کہ عداوت نہ رہے

شہر وحدت میں نبرد حرم و دیر نہیں
صحت فکر اگر ہے تو کوئی غیر نہیں

اور جب انسانی کے جذبات عروج پا کر یہاں تک پہنچ جاتے ہیں کہ:

کفر بھی راہ محبت میں ہے عین اسلام — عنصر بغض ہو دل میں تو عبادت بھی حرام
جو کسی قلب پہ جڑتا ہے نگین اکرام — کندہ ہوتا ہے در عرش پہ اس شخص کا نام

جب کوئی غیر کو پیغام اماں دیتا ہے
اٹھ کے ہر ذرۂ آفاق اذاں دیتا ہے

انسان کو بہ حیثیت انسان اس مقام الوہیت پر فائز فرمانے کے بعد جب آپ معرکہ حق و باطل کی مثال بیان فرماتے ہیں تو آپ کے ذہن میں نہ ہلاکو اور چنگیز کی بربریت آتی ہے جنھوں نے انسانی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کروا دیے تھے اور نہ نیرو کی سفاکی جس نے ایک جلتے کھیلتے شہر کو آگ کے شعلوں کے حوالے کر کے بانسری سے موسیقی کی دھنیں تخلیق کیں اور نہ ہٹلر و مسولینی کی حیوانیت جس نے تمام دنیا کو جنگ کی آگ میں جھونک کر کروڑوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا بلکہ آپ حق و باطل کی علامتوں کے طور پر تاریخ اسلام کے ایک انتہائی مابہ النزاع مسئلے کو پیش فرماتے ہیں جس نے اسلام کو دو ایسے متحارب گروہوں

میں تقسیم کر دیا کہ قیامت تک اب وہ متحد ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتے اور جب آپ اسی اختلافی مسئلہ کی طرف اشارہ فرما کر ایک فرقے کو تلوار اٹھانے کی تلقین فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

کربلا آج بھی ہے ایک لگاتار پکار ہے کوئی پیروی ابن علی پر طیار
عصر حاضر میں یزیدوں کا نہیں کوئی شمار تم مصلوں پہ دو زانو ہو مسخ اشرار

شور ماتم میں کہیں تیغ کی جھنکار نہیں
لب پہ نالے ہیں مگر ہاتھ میں تلوار نہیں

تو وہاں مجلس میں کچھ جیالے ہماری طرف اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے یزیدوں میں ہمارا بھی شمار ہو۔ جوش صاحب میں یہ مانتا ہوں کہ آپ کربلا کو ایک انقلاب کی علامت کے طور پر استعمال فرماتے ہیں مگر ہم آپ سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ آپ کسی اختلافی واقعہ کو اس طرح پیش نہ فرمائیں جس سے آپ کی فکر جانبدار معلوم ہو اس سے اصلاح تو کیا ہوگی البتہ فرقہ وارانہ جذبات ضرور مشتعل ہو سکتے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے آپ کے مسدس وہ نتائج پیدا نہیں کر سکے جو آپ ان کے ذریعے سے پیدا کرنا چاہتے تھے۔ المیہ یہ ہے کہ جہاں ایک فرقہ آپ کے مسدسوں میں بکا کے عنصر کا فقدان محسوس کر کے ان سے جذباتی وابستگی محسوس نہیں کر سکا تو دوسرے فرقے نے آپ کو فرقہ وارانہ خیالات کا نمائندہ سمجھ لیا اور جب کسی فکر کی طرف سے نفسیاتی کراہت پیدا ہو جاتی ہے تو ذہن اس خیال کو جذب کرنے کی صلاحیت کھو دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ اس اختلافی فضا کو ان مراعات یافتہ طبقات نے جن کے مفادات پر آپ کے خیالات سے ضرب پڑ رہی تھی آپ کے خلاف استعمال کیا اور انھوں نے کہیں تو ریاستی طاقت کے ذریعے سے اور اکثر اپنے پروپگنڈے کے ذریعے سے آپ کے خلاف ایسا محاذ تعمیر کر دیا جس سے آپ کی فکر کو جو پذیرائی ملنا چاہیے تھی وہ نہ مل سکی۔ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کیا انسانی تاریخ میں حق و باطل کے ٹکراؤ کی مثالیں کم ہیں کہ آپ اختلافی واقعہ کو اس مقصد کے لیے استعمال فرمائیں۔ قرآن نے ابلیس اور آدم کو حق و باطل کی طاقتوں کی علامات کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ قرآن نے تین علامتیں اور بھی اس مقصد کے اظہار کے لیے استعمال کی ہیں۔

فرعون، قارون اور شداد:

ایک فرعون ۔ جو سیاسی طاقت کے استحقاقی تباہ کن ادارے کی علامت ہے جس نے تمام انسانوں کو اپنا غلام بنا رکھا تھا اور جو مطلق العنان شہنشاہوں اور جابر آمروں کی شکل میں آج بھی انسانیت کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم کیے ہوئے ہے۔

دوسرا قارون ۔ جو معاشی استحصال کی علامت ہے جس نے تمام معاشی مفادات اپنی ذات کے لیے وقف کر لیے تھے اور تمام انسانیت کو ان سے محروم کر رکھا تھا اور جو آج بھی جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے روپ میں انسانیت کا خون چوس رہے ہیں۔

تیسرا شداد ۔ جو مذہبی پیشوائیت کی تخریبی قدروں کا حامل ادارہ ہے جس نے دنیا میں اپنے لیے تو جنت تعمیر کر لی مگر تمام انسانیت کو دوزخ میں جھونک دیا اور جن کا شیوا ہر دور میں پہلے دو طبقوں کی روحانی تائید رہا ہے۔ بقول فیض احمد فیض:

ایجاد ستم حکمت خاصان زمیں ہے   تائید ستم مصلحت مفتی دیں ہے

قرآن نے ان منفی طاقتوں کے مقابلے میں پیغمبروں کو تعمیری انقلاب کی علامت کے طور پر پیش کیا ہے جنھوں نے انسانیت کو اپنے اپنے زمانوں میں ظلم و ستم کی طاقتوں سے نجات دلوائی۔ علامہ اقبال نے اسی تصور کو یوں پیش کیا ہے کہ:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز   چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

غرض یہ کہ اگر حق و باطل کی کشمکش کے اظہار کے لیے تاریخی استعارے اور مثالیں حاصل کرنا ہیں تو تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جو غیر جانبدار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت موثر ذریعہ ابلاغ ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس کے برعکس یہ مسلمانوں کی بڑی بدقسمتی رہی ہے کہ ہادی برحق رحمت اللعالمین جنھوں نے دنیائے انسانیت کو سلامتی اور امن کا درس دیا۔ جب آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا تو خلافت کے سوال پر خود امت مسلمہ میں ایسے اختلافات پیدا کر دیے گئے جو بالآخر واقعہ کربلا کا سبب بنے اور اس کے بعد خود مسلمانوں نے مسلمانوں کے ساتھ جو ظلم و بربریت کا سلوک روا رکھا اس کے تصور ہی سے شرافت انسانیت کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے اور جس کی وجہ سے اسلامی تحریک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ اگر آج ہم انہی اختلافی واقعات کو ایک فرقے کے نقطۂ نظر سے انقلاب کی علامت

کے طور پر پیش کر کے یہ سمجھیں کہ ہم کوئی تعمیری کام کر رہے ہیں تو اس کو فرقہ وارانہ خوش فہمی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ اور یہ فکر کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتی جو آپ چاہتے ہیں کیونکہ اس کی تعمیر میں ایک صورت خرابی کی مضمر ہے۔ اس کی زمین ہی میں شور ہے اس میں زرخیزی آ ہی نہیں سکتی۔

غرض میں جوش میں کہتا چلا گیا اور جوش صاحب جو ابتدا میں سنجیدہ موڈ میں نہیں تھے رفتہ رفتہ نہایت سنجیدہ ہو گئے اور بہت محبت سے میری باتیں برداشت کرتے رہے اور جب میں خاموش ہو گیا تو انھوں نے اتنا فرمایا کہ یہ تم سچ کہہ رہے ہو اب مجھے اپنی کوششیں بارآور ہوتی دکھائی نہیں دیتیں۔

اتنے میں سورج غروب ہو گیا اور تمام سنجیدگی غرق بے تاب ہو گئی۔ دوسرے دن شام کو جوش صاحب سلامت علی خاں کے ہمراہ میرے گھر تشریف لے آئے۔ خان صاحب اپنے ساتھ ایک وہسکی کی بوتل بھی لے آئے تھے۔ چنانچہ شام کی ڈرنک جوش صاحب اور سلامت علی خاں صاحب نے میرے ہی گھر پر کی۔ میں نے جوش صاحب کو اس بات پر بھی راضی کر لیا کہ وہ ہمارے ہی گھر کھانا کھالیں۔ جب وہ مان گئے تو جلدی سے جا کر ان کی پسند کے کباب بھی لے آیا۔ کھانا کھانے کے بعد دیر تک ہم باتیں کرتے رہے اور جب رات زیادہ ہو گئی تو میں نے جوش صاحب کے لیے اپنے گھر میں سونے کا بندوبست بھی کر دیا۔ سلامت علی خاں تو اپنے مکان چلے گئے مگر جوش صاحب یہیں سو گئے۔

فتنۂ خانقاہ سے ملاقات:

صبح سویرے ہم دونوں بیدار ہو کر چہل قدمی کے لیے نکل گئے راستے میں جوش صاحب کی ملاقات ایک ایسے صاحب سے ہو گئی جو ان کے بہت قدیم جاننے والوں میں سے تھے۔ جوش صاحب ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے اور ان سے ان کے مکان کا پتا دریافت کیا۔ انھوں نے کہا میرا مکان یہاں سے بہت قریب ہے اگر زحمت نہ ہو تو گھر چلیے میری بیگم آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گی۔ جوش صاحب فوراً راضی ہو گئے اور ان کے ساتھ ان کے گھر روانہ ہو گئے۔ ان کا گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ انھوں نے ہم دونوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا

اور اپنی بیگم کو مطلع کرنے کے لیے اندر چلے گئے تھوڑی ہی دیر میں ایک نہایت سرخ و سفید خوبصورت خاتون بڑی بڑی غلافی آنکھیں گول چہرہ بھرا بھرا بدن عمر تقریباً ساٹھ، پینسٹھ سال باہر تشریف لائیں اور نہایت بے تکلفی سے جوش صاحب کے قریب بیٹھ گئیں۔ جوش صاحب نہایت حیرت آمیز مسرت سے ان کی خیریت دریافت کرتے رہے اور یہی حال ان خاتون کا بھی تھا۔ دونوں نے ہندوستان سے ہجرت کے واقعات اور اس کے بعد کراچی میں قیام کے حالات مختصر طور پر ایک دوسرے کو سنائے۔ جوش صاحب نے میرا تعارف کراتے ہوئے فرمایا کہ وہ آج کل میرے مکان ہی میں مقیم ہیں جو ان کے مکان سے قریب ہے۔ ان خاتون نے جوش صاحب کو دوسرے دن ناشتے پر مدعو کر لیا اور مجھ سے بھی حاضری کا وعدہ لے لیا۔ ان کے شوہر نے جوش صاحب کی ایک بہت پرانی نظم سنائی جس کے متعلق جوش صاحب نے فرمایا کہ وہ ۲۰ء سے قبل کی تحریک خلافت کے زمانے کی ہے۔ میں نے وہ نظم لکھ لی جو حسب ذیل ہے۔

ابر کرم سے خطاب

کس مقدس میکدے سے جھوم کر نکلا ہے تو
کون سی گنگا کی چوکھٹ چوم کر نکلا ہے تو

آ رہا ہے کس ادا سے کیف برساتا ہوا
ایک پرچم کی طرح بے تاب لہراتا ہوا

ڈھونڈ کوئی پاک دنیا اپنی الفت کے لیے
منتخب کر وہ زمیں باران رحمت کے لیے

جس جگہ بھٹکی ہوئی انسانیت آباد ہو
جس جگہ انسان کا ٹوٹا ہوا دل شاد ہو

یہ جہنم زار اس الطاف کے قابل نہیں
رحمتوں کی جس پہ بارش ہو یہ وہ محفل نہیں

جس جگہ سرمایہ داری کا لقب تہذیب ہے
جس جگہ کتوں کی عف عف خطبہ تہذیب ہے

بے محابا دیو باطل ہے جہاں خنجر بدست
جس جگہ تعزیر کے قابل ہے مرد حق پرست

رات بے تابی سے کٹتی ہے جہاں انسان کی
نگ رہی ہیں بڑیاں انصاف کی ایمان کی

اس زمیں پر سانپ اور اژدر برسنا چاہیے
برق گرنی چاہیے پتھر برسنا چاہیے

اس کے بعد انھوں نے جوش صاحب کی ایک رباعی بھی سنائی:

پہلو میں مرے دیدۂ پرنم ہے کہ دل　　معبود یہ مقیاس حب غم ہے کہ دل
ہو ذرہ بھی کج تو بال پڑ جاتا ہے　　یہ شیشۂ ناموس دوعالم ہے کہ دل

اس کے بعد بیگم صاحب نے پھل، بسکٹ اور چائے سے ہم لوگوں کی تواضع فرمائی اور دوسرے دن ناشتے پر آنے کا وعدہ لے کر رخصت کیا۔

جب ہم گھر لوٹ رہے تھے تو جوش صاحب بہت خوش تھے میں نے دریافت کیا کہ وہ خاتون کون ہیں؟ تو جوش صاحب نے فرمایا یہی فتنہ خانقاہ ہیں۔ میں نے کہا آج بھی یہ اس قدر حسین ہیں تو جوانی میں وہ جس قدر خوبصورت ہوں گی اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ جوش صاحب نے ان کے تعلق سے بہت کچھ تفصیل بتائی مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ ان باتوں کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ اس دن جوش صاحب بہت خوش رہے اور بے چینی سے دوسرے دن کا انتظار کرتے رہے۔ شام کو میں نے جوش صاحب سے دریافت کیا کہ کیا انھوں نے ان کا ذکر یادوں کی برات میں کیا ہے؟ جوش صاحب نے فرمایا ارے خورشید علی خاں ان زخموں کو ہرا نہ کرو آج کس آفت زمانہ کے دیدار ہو گئے۔ اس پری جمال کے حسن بے مثال کے آگے میرے غرور شباب کی پنڈلیاں کانپ جاتی تھیں۔ یہی ایک چہرہ تھا جو آج تک ذہن کے افق سے غروب نہیں ہوا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ یہ خاندان ہندوستان سے کراچی آچکا ہے مگر مجھے ان کا پتا مطلق معلوم نہ تھا۔ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ راغب صاحب اور سلامت علی خان بھی آگئے اور گفتگو کا موضوع بدل گیا۔ دوسرے دن میں اور جوش صاحب آٹھ بجے فتنہ خانقاہ کے گھر پہنچ گئے۔ دونوں میاں بیوی ڈرائنگ روم میں بیٹھے انتظار کر رہے تھے۔ ڈرائنگ روم کو تو خاص طور پر آراستہ کیا ہی گیا تھا مگر خود بیگم صاحبہ رشک صد گلستاں بنی ہوئی تھیں۔ اللہ اللہ اس عمر میں بھی چہرہ پر کیا بہار تھی۔ مجھ میں تو ان کو نظر جما کر دیکھنے کی بھی ہمت نہیں تھی اور دل ہی دل میں جوش صاحب کی خوش قسمتی پر رشک کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں میز پر کھانا چن دیا گیا۔ شوہر صاحب نے فرمایا، جوش صاحب انھوں نے آدھی رات تک جاگ کر یہ سب اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہے۔ میں تو ناشتے کا اہتمام دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کئی قسم کے تو کباب ہی تھے۔ سیخ کباب، بہاری کباب، شامی کباب، پھر کلیجی گردے بھنے ہوئے۔ مرغ کا نہایت لذیذ سالن، بریانی، پراٹھے، انڈوں کا سالن، ایک پلیٹ میں نہایت عمدہ بالائی۔ اسی

طرح میٹھے میں شاہی ٹکڑے، فیرنی، انڈوں کا حلوہ۔ اتنا تکلف اور کھانے والے صرف ہم دو آدمی اور پھر ان دونوں میاں بیوی کی مہمان نوازی۔ اصرار کر کے جوش صاحب کو ہر چیز چکھنے پر مجبور کر رہے تھے۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو چائے کا دور چلا۔ نہایت لذیذ کشمیری چائے پیش کی گئی۔ اس کے بعد گفتگو کا دور شروع ہوا۔ انھوں نے اپنی ہجرت کی تفصیل اور کراچی میں قیام کے متعلق بتایا۔ تھوڑی دیر میں شوہر صاحب کسی کام سے اٹھ کر باہر چلے گئے اور بیگم صاحبہ جوش صاحب کے قریب آ کر بیٹھ گئیں۔ باتوں باتوں میں جوش صاحب کی آنکھیں نم ہونے لگیں تو میں نے کہا جوش صاحب مجھے ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے اگر اجازت ہو تو میں چلا جاؤں؟ جوش صاحب نے کہا نہیں میں بھی ساتھ ہی چلوں گا چنانچہ ہم لوگ تقریباً بارہ بجے کے قریب وہاں سے رخصت ہو کر گھر آ گئے۔ بیگم صاحبہ نے بہ اصرار دوبارہ ملنے کا وعدہ لیا اور جوش صاحب نے حسب عادت فرمایا ضرور ضرور حاضر ہوں گا۔ مگر اسی شام وہ اپنے گھر منتقل ہو گئے اور پھر غالباً میری موجودگی میں دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی۔ ہائے اب تو نہ وہ رہیں نہ حضرت جوش۔ باقی رہے نام اللہ کا۔

اکیسویں مارچ ۱۹۷۶ء کو بابا ذہین شاہ صاحب تاجی کے مکان پر مشاعرہ تھا جس کا اعلان بابا صاحب نے اخبارات میں بھی کر دیا تھا۔ بابا صاحب نے صبح آٹھ بجے مجھے ٹیلی فون کیا کہ میں جوش صاحب کو لے کر ان کے گھر دس بجے تک پہنچ جاؤں۔ چنانچہ میں فوراً جوش صاحب کے گھر گیا اور ان کو بابا صاحب کا پیغام پہنچا دیا۔ اس وقت وہاں سالک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جن کے گھر میں بھی ایک شعری نشست کا اہتمام تھا۔ سالک صاحب اس بات پر تیار نہ تھے کہ جوش صاحب ان کے گھر کے علاوہ کہیں اور جائیں۔ بے چارے جوش صاحب مروت کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے کہا تھوڑی تھوڑی دیر دونوں جگہ چلے چلیے۔ جوش صاحب تیار ہو گئے تو سالک صاحب نے کہا پہلے میرے گھر چلیے۔ چنانچہ ہم لوگ سالک صاحب کے گھر چلے گئے مگر وہاں اس وقت تک اور کوئی نہیں آیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد پروفیسر منظور حسین شور علیگ تشریف لے آئے۔ ان کے بعد آل رضا صاحب اور تقریباً ساڑھے دس بجے تک شاہد نقوی صاحب منور عباس صاحب اور بہت سے شعرا صاحبان تشریف لے آئے اور نجی مشاعرہ ہو گیا۔ پھر وہاں اتنی دیر ہو گئی کہ ہم لوگ بابا صاحب کے

مشاعرے میں شریک نہ ہو سکے۔ گھر آ کر جوش صاحب نے ٹیلی فون پر بابا صاحب سے ان کے مشاعرے میں شریک نہ ہو سکنے کی معافی مانگ لی اور دوسرے دن حاضر ہونے کا وعدہ کر لیا۔ دوسرے دن صبح ہم لوگ بابا صاحب کے آستانے پر پہنچے۔ بابا صاحب نے اسی محبت اور گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا اور صرف اتنا فرمایا کہ جوش صاحب کل ہم لوگ آپ کے کلام سے محروم رہے۔ جوش صاحب نے اپنی مجبوری بیان کی اور بات ختم ہو گئی۔

ہل پارک کی ایک شام:

اسی شام کو جوش صاحب کی دعوت حمدی خاں صاحب کے ہوٹل میں تھی۔ میں اور راغب صاحب بھی مدعو تھے۔ چنانچہ ہم تینوں وقت مقررہ پر ہل پارک میں واقع بلوچون ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ حمدی خاں صاحب نے ہوٹل کی چھت پر ہمارے بیٹھنے کا انتظام کر رکھا تھا۔ ہم لوگ وہاں بیٹھے اطراف کے خوبصورت مناظر سے لطف اندوز اور غروب آفتاب کا نظارہ کر رہے تھے کہ ہوٹل کے قریب ایک بڑے گول دائرے میں گھومنے والا جھولا چلنے لگا۔ لوگ جوق جوق اس کی طرف جا رہے تھے اور جھولے میں بیٹھ کر اس کی گردش سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ جوش صاحب نے فرمایا چلو ہم بھی جھولے میں بیٹھ کر گردش روزگار کا لطف اٹھاتے ہیں مگر راغب صاحب اس وقت کسی اور جگہ جانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ فرمانے لگے کہ ابھی سورج غروب ہوا چاہتا ہے ایسے میں آپ کہاں جائیے گا اور پھر فرمایا۔

انسان ظلوماً و جھولا نکلا جو پینگ نہ دے سکے وہ جھولا نکلا

باوصف مساعی مشیت راغب حیرت ہے خلیفہ بے اصولا نکلا

اتنے میں سورج غروب ہو گیا مگر کہیں سے مغرب کی اذان کی آواز نہیں آئی۔ جوش صاحب نے حیرت سے دریافت کیا ارے کیا یہاں کوئی مسجد نہیں ہے؟ راغب صاحب نے فرمایا:

آیا نہیں انساں کو خدا یاد اب تک فریاد بہ لب ہے دل ناشاد اب تک

ہل پارک پہ مے خانہ ہے موجود مگر مسجد کی پڑی نہیں ہے بنیاد اب تک

جوش صاحب نے مجھے حکم دیا کہ ان کے لیے پیگ بناؤں۔ میں نے ایک جام بنا کر

جوش صاحب کے سامنے رکھ دیا اور انھوں نے "بیاد فلاں بنت فلاں" کہہ کر ایک گھونٹ پیا اور گلاس میز پر رکھ دیا۔

راغب صاحب نے فرمایا۔

بل پارک کی یہ صحبت ہے اور یہ شام
فردوس نظر آتش سیال بہ جام
خورشید علی خان ہیں ساقی راغب
اور حضرت جوش بادہ خواروں کے امام

اس روز معلوم ہوتا ہے کہ حمدی خاں صاحب اپنے گاہکوں میں اتنے مشغول ہو گئے کہ ہم لوگوں کی طرف توجہ نہ کر سکے اور ہماری سربراہی کے لیے انھوں نے جس بیرے کو متعین فرمایا تھا وہ شاید اس وجہ سے کہ ہم سے اس کو ٹپ ملنے کی امید نہ تھی، اس نے بھی کچھ لاپروائی برتی۔ کباب کچے تھے اور مرغ کے تکوں پر گوشت کم تھا۔ جوش صاحب بے کیف ہو کر اٹھ گئے اور گھر آ کر باقی پیگ مکمل کر کے کھانا کھایا۔

راغب صاحب نے اس دعوت کے متعلق فرمایا۔

سو سال جئیں جناب حمدی معبود	ہم لوگ ہیں طالب فلاح و بہبود
حمدی کا یہ اعجاز نہ بھولے گا کبھی	بوٹی غائب ہے اور تکے موجود

علامہ رضی جے پوری:

چوبیسویں مارچ بدھ کے دن صبح نو بجے میں جوش صاحب کے گھر پہنچا تو وہاں راغب صاحب مراد آبادی، میاں فراست رضوی بھی موجود تھے۔ جوش صاحب نے کہا۔ واہ واہ خوب وقت پہ آئے چلو بابا صاحب کے گھر چلتے ہیں۔ چنانچہ ہم تینوں بابا صاحب کے آستانے پر پہنچے وہاں ایک صاحب بابا صاحب کے مہمان تھے اور حیدر آباد سندھ سے تشریف لائے تھے۔ یہ صاحب جوش صاحب کے بھی دوستوں میں سے نکلے۔ گورے چٹے، قد لانبا، دبلے پتلے ناک ستواں اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں۔ حیدر آباد کے اسکول میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اب وظیفہ پر سبکدوش ہو چکے ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا یہ رضی جے پوری

ہیں نہ صرف یہ کہ قابل آدمی ہیں بلکہ کھلے ذہن کے مالک ہیں۔ پھر مسکراتے ہوئے آہستہ سے کہا کہ ان کو مستقلی حلوہ بہت پسند ہے۔ یہ سنتے ہی رضی صاحب کا رنگ اور موڈ ایک دم بدل گیا۔ فرمایا جوش یہ کیا حرکت کی۔ اب تم بھی چھیڑ خانی کرنے لگے۔ اتنے میں ایک نیا نیا شادی شدہ جوڑا بابا صاحب کی دعائیں لینے کے لیے کمرے میں داخل ہوا اور بابا صاحب کے قریب بیٹھ گیا۔ بابا صاحب نے محبت اور شفقت سے دونوں کو دعائیں دیں، مٹھائی کھلائی اور جب وہ دونوں رخصت ہوگئے تو رضی صاحب جے پوری نے فرمایا:

جب بھی سنتا ہوں کہ ہوتی ہے کسی کی شادی
حسرت آتی ہے کہ وہ شخص ہمیں کیوں نہ ہوئے

جوش صاحب نے فرمایا میاں مستقط چلے جاؤ یہ حسرت بھی نکل جائے گی۔ بابا صاحب نے فرمایا بھائی جو کراچی آکر کچھ نہ کرسکے وہ مستقط جا کر کیا کرے گا۔ جوش صاحب نے فرمایا کم از کم حلوہ تو کھا سکے گا۔

نظریہ اضافت:

رضی صاحب جب زیادہ برہم ہونے لگے تو جوش صاحب نے فرمایا چلو اب گھر چلتے ہیں رضی کو ہماری صحبت ناگوار گزر رہی ہے مگر بابا صاحب نے مجبوراً بٹھا لیا اور موضوع بدل دیا۔ کسی بات پر رضی صاحب فرمانے لگے کوئی چیز اضافی نہیں ہوتی بلکہ خود اپنی قدر آپ رکھتی ہے۔ جوش صاحب زیر لب مسکرانے لگے تو رضی صاحب نے فرمایا معلوم ہوتا ہے آپ مجھ سے متفق نہیں ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا ارے رضی احمق واضح بات پر تم اس قدر غیر معقول دعویٰ پیش کر رہے ہو تو سوائے ہنسنے کے اور کیا کرسکتا ہوں۔ رضی صاحب نے کہا، آپ اپنی معقول بات کی توضیح فرمایئے۔ تو جوش صاحب کہنے لگے ارے بھائی دنیا کی کوئی قدر لے لیجیے اس کو ناپنے کا کوئی نہ کوئی پیمانہ تو مقرر کرنا ہی پڑے گا اور وہ پیمانہ ظاہر ہے دوسری قدر کی نسبت سے اضافی ہو گا۔ مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ چوری خود اپنے اندر ایک بری قدر ہے اور یہ کسی قدر سے اضافی نہیں مگر غور کیجیے کہ چوری کے معنی کیا ہیں؟ کسی شخص کو اس کی مرضی اور علم کے بغیر اس کی ملکیت سے محروم کر دینا۔ اس میں بنیادی بات ملکیت کا تصور ہے

اور یہ ملکیت کے حقوق کسی قانون کے ذریعے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شے کسی کی ملکیت نہ ہو تو ہر شخص اس سے مستفید ہو سکتا ہے اور اس صورت میں چوری کا تصور بھی نہیں ہو گا۔ مثلاً آپ دریا کے کنارے سے جتنا چاہیں پانی حاصل کر سکتے ہیں لیکن جب وہ پانی کسی کی ملکیت میں چلا جائے تو پھر آپ قابض کی مرضی کے خلاف اس کو حاصل نہیں کر سکتے کیونکہ قانون نے اس کو ملکیت کا حق عطا کر دیا ہے۔ لہذا چوری کی برائی ایک تو حق ملکیت سے اضافی ہے دوسرے اس قانون سے جو اس کو جرم قرار دیتا ہے۔ اسی طرح ہر قدر کسی دوسری قدر کی نسبت سے اضافی ہے۔ یہ صرف حقوق کی بات نہیں بلکہ دنیا کی ہر شے کی قدر کسی دوسری شے کی نسبت سے اضافی ہوگی۔ مگر بظاہر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ رضی صاحب اس استدلال سے مطمئن نہیں ہوئے۔ اس پر میں نے کہا دیکھیے غالب نے کتنے دل نشین انداز میں نظریہ اضافیت کو ایک شعر میں بیان کر دیا۔ سب لوگ میری طرف متوجہ ہوئے تو میں نے غالب کا شعر پڑھا۔

عجز سے اپنے یہ جانا کہ وہ بد خو ہو گا
نبض خس سے تپش شعلۂ سوزاں سمجھا

غالب نے نظریہ اضافیت کی دو مثالیں اس شعر میں دی ہیں۔ محبوب کی فطرت کی کج خلقی ہماری فطرت کے انکسار کی نسبت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور شعلہ کی تپش گھاس کی خشکی کی نسبت سے زیادہ ہوتی ہے۔ یگانہ نے بھی ایک شعر میں اسی نظریہ کو بیان کیا ہے۔

یہ کنارہ چلا کہ ناؤ چلی　　　کہیے کیا بات دھیان میں آئی

ہر حرکت اس کے ماحول کی نسبت سے پہچانی جاتی ہے۔ غالب نے بھی حرکت کی اضافیت کو بیان کیا ہے۔

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اس پر رضی صاحب نے فرمایا یہ ٹھیک ہے بعض باتیں اضافی ہیں اور آپ نے اپنے استدلال کی تائید میں شعر بھی موزوں پیش کیے مگر ان سب کے باوجود میری رائے یہ ہے کہ ہر شے اضافی نہیں ہو سکتی بعض اقدار اپنی قدر آپ ہیں مگر اس مرتبہ رضی صاحب نے کوئی

مثال نہیں دی۔ غرض اس دلچسپ گفتگو کے بعد ہم لوگ وہاں سے رخصت ہو کر گھر گئے۔
میں نے راستے میں جوش صاحب سے عرض کیا کہ حضور آپ کس بنا پر یہ فرما رہے تھے کہ رضی صاحب بہت کھلے ذہن کے آدمی ہیں؟ جوش صاحب مسکرا کر کہنے لگے کہ میں نے ان کے ذہن کا اس گہرائی سے مشاہدہ نہیں کیا تھا۔

شام کو جب سب احباب جوشس صاحب کے مکان پر جمع ہوئے تو راغب صاحب بھی تشریف لے آئے۔ باتوں باتوں میں رضی صاحب بے پوری کا ذکر آ گیا تو میں نے کہا کہ وہ نہ معلوم مستقل حلوے سے اسس قدر کیوں چڑتے ہیں۔ راغب صاحب نے فوراً یہ رباعی کہہ دی۔

اوریب ہے دیدنی جمال مستقل فردوسس نشاط ہے خیال مستقل
حلوے کا اگر ذکر کسی نے چھیڑا یاد آئے رضی اہل کمال مستقل

میں نے کہا اب کے جب بابا صاحب کے گھر جائیں اور وہاں رضی صاحب سے ملاقات ہو تو ان کو یہ رباعی ضرور سنا دیجیے۔ چنانچہ جب ہم لوگ دو تین دن کے بعد بابا صاحب کے مکان گئے تو وہاں فضل احمد کریم فضلی صاحب، راغب صاحب، جوش صاحب اور فراست رضوی سب ہی شعرا موجود تھے اور رضی صاحب بھی تھے۔ تھوڑی دیر میں شعر و شاعری شروع ہو گئی تو راغب صاحب نے وہی رباعی سنا دی۔ رضی صاحب زیادہ برہم ہونے لگے تو راغب صاحب نے ایک اور رباعی سنا دی۔

ہر وقت زباں پر ہے دعائے مستقل جنت بھی نہ میں لوں گا بجائے مستقل
بابا صاحب، رضی، دعا فرمائیں جبریل کہے، رضی بھی جائے مستقل

رضی صاحب اٹھ کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ ہم لوگوں نے ان کو منانے کی بہت کوشش کی مگر بے سود۔ اس سے محفل بے کیف ہو گئی تو سب لوگ رخصت ہو گئے۔

اسی شام کو ڈاکٹر عالیہ امام بڑے خوبصورت کپڑے زیب تن کیے، بالوں میں پھولوں کا گجرا لگا کر اور عطر کی خوشبو میں رچی بسی جوشس صاحب کے گھر تشریف لائیں اور فرمایا کہ ایکشیوی کی شام جوشس صاحب اور ہم سب احباب کی دعوت ان کی بہن کے گھر حسین ڈی سلوا ٹاؤن میں ہے۔ راغب صاحب نے فوراً ایک رباعی انھیں سنا دی:

بن کے خوشبوئے زلف شام آئی ہیں
اور لے کے مسرت کا پیام آئی ہیں
ملنے کو جناب جوش سے اے راغب
کس ناز سے عالیہ امام آئی ہیں

عالیہ جوش صاحب سے گفتگو میں مشغول ہو گئیں اور راغب صاحب کی طرف ان کی پشت ہو گئی۔ تھوڑی دیر تک تو راغب صاحب چپ رہے مگر پھر یہ رباعی سنا دی۔

یہ حسن یہ دل کشی یہ جوڑا دھانی	باایں ہمہ سرد جذبہ ایمانی
کعبے کی طرف پشت عیاذاً باللہ	اک صاحب دل سے اور روگردانی

عالیہ نے جب یہ دیکھا کہ راغب صاحب زیادہ روہانی ہو رہے ہیں تو جوش صاحب سے بدھ کے دن دعوت میں شرکت کا وعدہ لے کر رخصت ہو گئیں۔

انتیسویں مارچ ۱۹۷۹ء۔ آج کل جوش صاحب اپنی نواسی صبوحی خانم عرف بوبی کے گھر مقیم ہیں۔ ان کے شوہر حسن ناصر صاحب اچھے شاعر ہیں۔ جوش صاحب ان دونوں میاں بیوی سے بہت محبت کرتے ہیں۔ ان کا مکان شمالی ناظم آباد بلاک "بے" میں عمران شادی ہال کے عقب میں واقع ہے۔ یہ جگہ میرے مکان واقع بلاک این سے بہت قریب ہے۔

اسرار "خودی" یا "میں" کا تصور:

میں صبح تفریح کے لیے بفرزون کے غیر آباد میدان میں جاتا ہوں جہاں ابھی تک کسی دیہات کے میدان کا سماں باقی ہے۔ جب برسات ہو جاتی ہے تو یہاں چھوٹے چھوٹے تالابوں میں مرغابیاں بھی آ جاتی ہیں اور میدان میں بھٹ تیتروں کے جھنڈ بھی اکثر دکھائی دیتے ہیں۔ ویسے کبھی کبھی کوئی قاتل کسی انسان کو قتل کر کے اس ویرانے میں نعش بھی پھینک جاتے ہیں۔ اس دن مجھے بہت پریشانی اٹھانا پڑتی ہے۔ تفریح چھوڑ کر پولیس اسٹیشن جانا اور پولیس کو ساتھ لا کر نعش کی جگہ دکھانا پڑتی ہے۔ ایسا دو بار ہو چکا ہے مگر اب پولیس نے اس علاقے میں پٹرولنگ شروع کروا دی ہے۔ خیر یہ تو بیچ میں ایک بات نکل آئی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ ۲۹ویں مارچ کو پیر کے دن صبح ہی صبح جب میں گھر سے نکل کر میدان میں آیا تو موسم بہت

ہی خوشگوار تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ میری فکر کا رخ خود اپنی ہی ذات کی جانب مڑ گیا اور میں سوچنے لگا کہ "میں" کیا ہوں؟ ہم جو بار بار "میں" کہتے ہیں وہ ہے کیا شے۔ کیا یہ میرا گوشت پوست کا جسم "میں" ہے۔ یا یہ جسم سے الگ کوئی "شے" ہے۔ اگر بقول علامہ اقبال "میں" احساس خودی ہے جس سے ہم میں احساس نفس یا تعین ذات پیدا ہوتا ہے تو خودی میری ایک صفت ہوئی مگر میں خود کیا ہوں؟ ایک خیال یہ آیا کہ یہ احساس "میں" ہمارے اعصابی نظام کا مقام فکر ہے مگر پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ احساس "میں" ہمارے اعصابی نظام کی مقام فکر کی علت ہے یا معلول۔ یعنی میرا تصور "میں" کیا موجود بالذات کوئی "شے" ہے یا یہ فکری نظام کی ساخت کے نتیجے میں پیدا ہونے والا "احساس" ہے۔ ان ہی الجھنوں میں غلطاں میں نے جوش صاحب کی قیام گاہ کا رخ کیا۔ وہاں پہنچ کر دیکھا کہ جوش صاحب گھر کے سامنے ہی ٹہل رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر خوشی سے فرمایا۔ ارے یہ صبح صبح کہاں سے چلے آرہے ہو؟ میں نے کہا صبح مشی کے لیے نکلا تھا راستے میں ایسے خیالات نے ہجوم کیا کہ قدم خود بہ خود آپ کی طرف اٹھ گئے۔ بقول آپ کے:

جب بھی کانٹوں نے پاؤں برمائے　　　تیری نگری کے پھول یاد آئے

جوشش صاحب نے فرمایا۔ بھلا وہ موضوع فکر کیا تھا؟ میں نے کہا آج میں خود اپنا موضوع فکر بن گیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا میں اپنے اعصابی نظام کا مقام فکر ہوں جس کا مرکز دماغ ہے؟ جوشش صاحب نے فرمایا کہ مقام فکر کے بجائے "مقام شعور" کہہ سکتے ہیں۔ فکر دراصل "شعور" کا نتیجہ ہے۔ میں نے کہا مگر یہ شعور یا احساس ذات کوئی مادی شے ہے یا غیر مادی؟ جوش صاحب نے فرمایا ہم تو توانائی مطلق کو مادی پیکر کے توسط ہی سے سمجھ سکتے ہیں کیونکہ بقول غالب "لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی" توانائی مطلق اپنے اظہار کے لیے انفرادی وجود تراشتی ہے مگر دراصل وہ ایک بحر بے کنار ہے۔ ہر انسان میں اسی توانائی کی جلوہ گری ہے مگر ہر شخص کا انفرادی وجود یا احساس ذات اس کو دوسروں سے الگ ایک شخص عطا کرتا ہے اور اس کو ہر شخص "میں" کہتا ہے۔ میں نے کہا جوش صاحب کیا غالب نے اس شعر میں اسی تصور کو پیش کیا ہے:

بہار در گرہ غنچہ شہر جولاں ہے　　　طلسم ناز بجز تنگی قبا معلوم

جوش صاحب نے فرمایا جی ہاں بہت اچھا شعر آپ کے ذہن میں آیا ہے۔ ہم لوگ دیر تک اس دلچسپ موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ جب نو بج گئے تو جوش صاحب نے فرمایا کہ ان کا ارادہ بابا صاحب کے وہاں جانے کا ہے اس لیے اگر میں بھی جانا چاہوں تو جلدی تیار ہو کر آ جاؤں چنانچہ میں گھر گیا اور تیار ہو کر واپس جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا اور ان کو لے کر بابا صاحب کے گھر چلا گیا۔ جوش صاحب نے بابا صاحب سے فرمایا کہ آج خورشید علی خاں پر معرفت ذات کی کیفیت طاری ہے۔ بابا صاحب نے مسکرا کر فرمایا کہ پھر یہ ہماری جماعت میں شریک ہو جائیں تاکہ معرفت الٰہی کی منزلیں بھی آسانی سے طے کر سکیں۔ میں نے عرض کیا کہ حضور والا مجھے تو ابھی معرفت ذات بھی حاصل نہیں ہو سکی۔ معرفت الٰہی تو بہت دور کی بات ہے۔ بابا صاحب نے فرمایا کہ جب کسی سالک میں اپنی ذات کو پہچاننے کا احساس بیدار ہو جائے تو سمجھ لو کہ وہ معرفت الٰہی کی تلاش میں چل پڑا ہے۔ اس کے بعد شعر و شاعری شروع ہو گئی۔ بابا صاحب نے ایک غزل سنائی جو ہمارے آج کے موضوع سے بہت قریب تھی۔ چند اشعار یہ ہیں۔

میں ہی میں جلوہ گہہ ناز میں تھا جلوہ نما
عشق کو انجمن ناز میں نازاں دیکھا
اپنی منزل سے جو باہر کہیں آیا نہ گیا
میری منزل کی طرف اس کو خراماں دیکھا
قابل دید ہے دنیائے محبت کہ جہاں
کوئی کافر نظر آیا نہ مسلماں دیکھا

اس کے بعد بابا صاحب نے ایک اور غزل سنائی۔ اس کے بھی چند اشعار حسب ذیل ہیں:

کثرت حسن میں بھی عالم یکتائی ہے
بزم کی بزم ہے تنہائی کی تنہائی ہے
بے خودی میں وہ مرے سانس کی خوشبو تھی جسے
میں یہ سمجھا ترے دامن کی ہوا آئی ہے

کفر کامل ہے تو ایمان بھی کامل ہے ذہین
حق شناسوں کی بتوں سے بھی شناسائی ہے

یہ دلچسپ شاعری تقریباً ایک بجے ختم ہوئی اور ہم لوگ گھر لوٹ آئے۔ گھر آ کر میں نے سوچا کہ علامہ اقبال کے خیالات خودی کے متعلق معلوم کرنا چاہیئے تو میں نے اقبال کے مقدمۂ اسرار خودی کا مطالعہ کیا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں "خودی وحدت وجدانی یا شعور کا وہ روشن نقطہ ہے جس میں تمام انسانی تخیلات و جذبات و تمنیات مستنیر ہوتے ہیں۔ یہ پراسرار شے جو فطرت انسانی کی منتشر اور غیر محدود کیفیتوں کی شیرازہ بند ہے اپنے عمل کی رو سے ظاہر اور اپنی حقیقت کی رو سے مضمر ہے۔ وہ تمام مشاہدات کی خالق ہے مگر اس کی لطافت مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی"۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں "خودی کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے گوناگوں تجربوں سے اپنے آپ کو مستحکم کرے۔ وہ تحقیق و تکمیل کے پیہم سفر کو کبھی کسی منزل پر ختم نہیں کرتی"۔ وہ کہتے ہیں:

خودی کیا ہے؟ راز درون حیات ۔۔۔ خودی کیا ہے؟ بیداری کائنات
خودی جلوہ بدست و خلوت پسند ۔۔۔ سمندر ہے ایک بوند پانی میں بند

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

چراغے درمیان سینہ تست ۔۔۔ چہ نور است ایں کہ در آئینہ تست

علامہ اقبال بھی اسے "پراسرار شے" کہتے ہیں جو مشاہدے کی گرم نگاہوں کی تاب نہیں لا سکتی اور اس کو "راز درون حیات" کہتے ہیں مگر کوئی صاحب فکر اپنے وجود کی ماہیت کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ غالب البتہ توانائی مطلق کو سمندر سے اور انفرادی انا کو قطرے سے تشبیہ دے کر اس مضمون کی طرف اشارہ ضرور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر ۔۔۔ یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

مگر اس طرح وہ انفرادی انا کی مکمل نفی کر دیتا ہے۔ یہ مثال قطرہ و موج و حباب کی حد تک تو ٹھیک ہے مگر انسانی انا کا مسئلہ جس میں شعور ذات ہے پھر پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ہم خود توانائی مطلق کا حصہ ہیں جو شعور مطلق بھی ہے تو خود آگاہ کیوں نہیں ہیں؟ ہمارا شعور ذات حواس کی تنگ دری میں کیوں قید ہے۔ اس تصور سے کس قدر گھٹن ہوتی ہے کہ ہم خود اپنے آپ سے

ناواقف ہیں۔ ہم جو کچھ جان سکتے ہیں صرف اپنے حواس کے ذریعے ہی سے جان سکتے ہیں ہماری ذات اور ہمارے شعور کے درمیان ہمارے حواس کا پردہ حائل ہے اور ذات میں داخلی طور پر علم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے ہم جو کچھ جان سکتے ہیں وہ شعور کے توسط سے جان سکتے ہیں اور شعور حواس کے توسط سے علم حاصل کر سکتا ہے مگر حواس کی معلومات فراہم کرنے کی صلاحیت اس قدر محدود اور اتنی شرائط کے تابع ہے کہ کسی علمی دریافت کے متعلق یقین سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کس قدر حقیقت پر مبنی ہے۔ اس میں ہمارے عقاید اور پہلے سے قائم شدہ قدریں جو ہمارے فکری سانچوں کی تشکیل کرتی ہیں۔ حقیقت تک رسائی میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہیں۔ کوئی شخص یقین کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا علم کس قدر حقیقت آشنا ہے۔

یہ کس قدر بڑا المیہ ہے کہ ہم خود اپنے آپ سے ناواقف ہیں اور وہ طاقت جو ہم میں جلوہ گر ہے وہ خود اپنا تعارف ہم سے نہیں کرواتی۔ بیدل کہتا ہے:

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و نہ رفت رنج خمار ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنار ما بہ کنار ما[1]

اقبال بھی اس گھٹن کو محسوس کرتا ہے اور گلہ کرتا ہے کہ:

تیری خدائی سے ہے میرے جنوں کو گلہ
اپنے لیے لامکاں میرے لیے چار سو

غالب اس حقیقت کا اعتراف اس طرح کرتا ہے کہ:

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے

مگر علامہ اقبال نے اس عالم جبر میں بھی ایک تعمیری اور مثبت پہلو اختیار کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ گو ہم اپنی ذات کی ماہیت کو نہیں سمجھ سکتے لیکن ہم اپنی صلاحیتوں کا ادراک ضرور کر سکتے ہیں۔ اقبال کا تصور خودی دراصل انسانی ذات کی صلاحیتوں کی آگہی ہے انسان اگر اپنی صلاحیتوں سے آگاہ ہو جائے تو وہ صرف اس کرہ ارض ہی کو نہیں بلکہ اس کائنات کو مسخر کر سکتا ہے۔

---

[1] تمام عمر میں تیرے ساتھ ہم پیالہ رہا اور میری تشنگی کبھی کم نہ ہوئی۔ کیا قیامت ہے کہ (پھر بھی) تو (میرے وجود کے) کنارے سے میرے (ادراک کے) کنارے تک نہ پہنچ سکا۔

خودی میں ڈوبنے والوں کے عزم و ہمت نے
اس آب جو سے کیے بحرِ بے کراں پیدا

غرض تمام دن ان ہی خیالات میں گم رہا اور شام کو جب جوش صاحب کے مے خانۂ علم و آگہی پر حاضر ہوا تو جوش صاحب نے دریافت فرمایا کہ آج تمام دن کیا مشغولیت رہی تو میں نے عرض کیا کہ آج تمام دن میں خود کو تلاش کرتا رہا۔ جوش صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔ پھر کس نتیجے پر پہنچے؟ تو میں نے عرض کیا کہ اس تلاش کے دوران میں نے ناامیدی سے بچنے کے لیے خود کو یہ کہہ کر مطمئن کر لیا کہ میں جسے ڈھونڈ رہا ہوں وہ میں خود ہی تو ہوں۔ میں نے سوچا کہ بقول غالب:

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

میں اپنا خیر تو ہوں نہیں جو اسے تلاش کروں کیونکہ تلاش ذات میں نکلنے والے بڑے بڑے فلسفی اور صوفیا توانائی مطلق کو اپنا خیر سمجھ کر اس کی تلاش میں نکلتے ہیں اور ان میں اکثر اس تلاش میں خود اپنے ہی کو کھو دیتے ہیں۔ بقول غالب:

ہاں اہلِ طلب کون سنے طعنۂ نایافت
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

تو میں نے سوچا کہ خود کو کھو دینے کے بجائے کیوں نہ اپنی صلاحیتوں کا جائزہ لوں۔ تب میں نے محسوس کیا کہ یہ ساری کائنات میری یلغار کی منتظر ہے۔ پھر مجھے کائنات کے ہر ذرہ سے آوازیں آنے لگیں:

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو   تو کجا بہر تماشا می روی؟

پھر میں نے دیکھا کہ:

جام ہر ذرہ ہے سرشارِ تمنا مجھ سے
کس کا دل ہوں کہ دو عالم سے لگایا ہے مجھے

رموزِ بے خودی:

جوش صاحب نے فرمایا اب آپ فکر کے جادۂ مستقیم پر گامزن ہو چکے ہیں مگر اتنی بات اور یاد رکھیے کہ جب آپ اس کائنات کے حوالے سے "میں" کا لفظ استعمال کریں تو اس میں انائے جزوی کے بجائے تمام نوع انسانی کی انائے کل کو شامل کر لیجیے کیونکہ جب کسی انسان کی انا خود اس کی اپنی ذات کی حد تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے تو وہ دوسروں کے دکھ درد کا احساس کھو دیتا ہے۔ اسی لیے "انا" کا اپنے خول میں بند ہو جانا تمام برائیوں کی جڑ ہے اور انا کا پھیلاؤ ہر نیکی کی بنیاد ہے انائے جزوی اپنی ذات کے خول سے کبھی نہیں نکلتی اور انائے کل اس کرۂ ارض ہی کا نہیں تمام انفس و آفاق کا احاطہ کر لیتی ہے۔ اس مقام پر یہ حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے کہ اسماء، اجسام اور اشکال ایک اضافی چیز ہیں اور ایک ایسا عالم عینیت ہمارا محاصرہ کیے ہوتے ہے جہاں غیریت کا تصور محال ہے اور زمین ہو کہ آسمان ذرات ہوں کہ نجوم نور ہو کہ نار جمادات ہوں کہ نباتات۔ جان ور ہوں کہ انسان یہ سب کے سب ایک ہی جوہر سے معرض وجود میں آتے ہیں اور سب کے سب ایک ہی خاندان کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔

کہتا ہوں پھر کہ دل میں کدورت نہ چاہیے
وحدت کے سر پہ ضربت کثرت نہ چاہیے
مطلق اکائی میں عددیت نہ چاہیے
غیریت و شر و عصبیت نہ چاہیے

آفاق ایک جسم ہے اور ایک ذات ہے
اے دوست وہم غیر جہالت کی بات ہے

اس حلقہ عینیت میں داخل ہو کر یہ بات قطعی طور پر ناممکن ہو جاتی ہے کہ آدمی اس عالم کون و فساد میں کسی ایک آدمی سے بھی نفرت کر سکے بلکہ اس کے برعکس اس کے واسطے یہ بات ناگزیر ہو جاتی ہے کہ وہ تمام موجودات عالم سے بالعموم اور تمام نوع انسانی سے بالخصوص محبت اور خود اپنی ذات کی طرح محبت کرے۔ میں نے کہا غالب اس بات کو اس طرح کہتا ہے۔

اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

جوش صاحب۔ جی ہاں اور جب تک انسان کے کردار کی تربیت اس طرح نہیں ہوتی کہ وہ جزو میں کل اور قطرہ میں دجلہ نہ دیکھ سکے یہ سائنسی ترقی کی بے پناہ طاقت ہر لمحہ خطرات بدوش رہے گی۔

رنگ و مزاج و سیرت و ملک و زبان و دیں
ان سب سے اصل نوع بشر کو غرض نہیں
ہاں محو کر نہ ذہن سے یہ نکتۂ مبیں
یہ "میں" کا لفظ ہے جو ترے لب پہ ہم نشیں

تیرا نہیں ہے صرف یہ دم خم لیے ہوئے
یہ "میں" تو دوش پر ہے دو عالم لیے ہوئے

اور اگر گہری نظر سے غور فرمائیں تو کہنا پڑے گا کہ:

تیرا وجود فخر نظام حیات ہے　　تو محض ایک ذات نہیں کائنات ہے

غرض یہ انتہائی دلچسپ گفتگو جب یہاں تک پہنچی تو قریب کی مسجد سے موذن نے سورج کے غروب ہونے کا مژدہ سنایا اور جوش صاحب نے ساغر معرفت میں اپنی انا کو فنا کر دیا۔

ڈاکٹر عالیہ امام کے گھر دعوت:

اس کے بعد ۳۱ ویں مارچ کو شام ڈاکٹر عالیہ امام کی دعوت میں شرکت کے لیے میں شام چار بجے صاف ستھرے کپڑے پہن کر جوش صاحب کے گھر گیا وہاں راغب صاحب پہلے سے ایک مولانا کے ساتھ موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر جوش صاحب نے فرمایا کہ "آج تو آپ بڑے بن ٹھن کر آئے ہیں"۔ راغب صاحب نے فوراً کہا۔

محفل جوش میں بن ٹھن کے سر شام آئے
چشم بددور کہ شہزادہ گلفام آئے

اسی شام راغب صاحب نے کئی اور سوالات کے ساتھ ایک سوال یہ بھی کیا تھا کہ "جوش صاحب آپ اگلے دن یعنی یکم اپریل ۱۹۶۹ء کو اسلام آباد روانہ ہونے والے ہیں۔ کیا وہاں بھی آپ کو کراچی کے احباب یاد آئیں گے"۔ جوش صاحب نے انتہائی شاعرانہ انداز میں ارشاد فرمایا "ایک ہلکا دل سے غبار اٹھے گا اور وہ میرے وجود کا احاطہ کرلے گا اور اس غبار سے کراچی کے اقارب و احباب کے چہرے دکھیں گے اور میرے دل پر برچھیاں چلائیں گے"۔ میں نے اپنے دل میں کہا، جوش صاحب واقعی اپنے احباب کا دل رکھنا خوب جانتے ہیں۔ غرض سوال و جواب کا سلسلہ ختم ہوا تو ہم لوگ حسین ڈی سلوا ٹاؤن روانہ ہوئے اور عالیہ کی بہن صاحبہ کے گھر پہنچے۔ وہاں عالیہ امام ان کی بہن اور بھانجیوں کے علاوہ اور بہت سے احباب جمع تھے۔ اس روز میری ملاقات مشفق خواجہ صاحب سے ہوئی۔ میں ان کی ادبی حیثیت سے تو واقف تھا مگر ان کو دیکھنے کا اتفاق پہلی دفعہ ہوا تھا۔ خواجہ صاحب ان اہل علم دانشوروں میں سے ہیں جنھوں نے زندگی کا ہر لمحہ تحقیق اور مطالعہ کے لیے وقف کردیا ہے۔ وہ بہت کم آمیز ہیں مگر اردو ادب کا شاید ہی کوئی میدان ہو جہاں خواجہ صاحب کے نقوش قدم منزل کی رہنمائی کے لیے موجود نہ ہوں۔ جوش صاحب بھی خواجہ صاحب کے علمی تبحر کے قائل تھے۔ اس روز ان کا کلام بھی سنا اور بہت لطف آیا۔ میں اور راغب صاحب جوش صاحب کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ اتنے میں مجھے یاد آیا کہ میں اپنی ڈائری گاڑی ہی میں بھول آیا ہوں تو ڈائری لینے کے لیے گاڑی تک گیا۔ جوش صاحب سمجھے کہ میں گھر جا رہا ہوں تو انھوں نے کہا "ارے خورشید علی خاں کہاں غائب ہوگئے انھیں بلاؤ"۔ راغب صاحب نے فرمایا۔

اس دشمن ایماں کو بلاؤ یارو | اس ناز دل و جاں کو بلاؤ یارو
پہلوئے جناب جوش کب سے ہے تہی | خورشید علی خاں کو بلاؤ یارو

جوش صاحب نے فرمایا

جس کے پہلو سے یار اٹھتا ہے | درد بے اختیار اٹھتا ہے

میر تقی میر

خیر میں فوراً آ گیا اور پھر شاعری شروع ہوگئی اور دیر تک جاری رہی۔ راغب صاحب نے بھی رباعیات سنائیں۔ ایک رباعی یاد رہ گئی:

ڈستی ہے کبھی ذہن کو تنہائی بھی
تخلیق ہے کبھی انجمن آرائی بھی
کس درجہ تضادات ہیں میرے اندر
میں خود ہی تماشا ہوں تماشائی بھی

کھانے کے بعد موسیقی کی محفل منعقد ہوئی۔ جوش صاحب بہت خوش ہوئے اور چلتے ہوئے فرمایا۔ "عالیہ آج بقول بمبئی والوں کے، بڑی مجا آئی"۔ وہاں سے ہم لوگ کوئی گیارہ بجے اپنے اپنے گھر لوٹے۔

جوش صاحب کی اسلام آباد روانگی:

دوسرے دن یکم اپریل کو جوش صاحب صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد روانہ ہونے والے تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ صبح ساڑھے چھ بجے تک میں ان کے گھر پہنچ جاؤں مگر جب دوسرے دن صبح میں ان کے گھر پہنچا تو وہ اقبال حیدر زیدی صاحب کے ساتھ مجھ سے پہلے ہی ایرپورٹ روانہ ہو چکے تھے۔

جوش صاحب کی کراچی واپسی:

اس کے بعد جوش صاحب مئی کی انتیسویں تاریخ بروز جمعہ کراچی تشریف لائے۔ اس مرتبہ کراچی میں ان کا قیام تقریباً ڈیڑھ ماہ سے زیادہ رہا۔ اس دوران جوش صاحب کا روزمرہ کا پروگرام معمول کے مطابق رہا۔ دن میں کبھی بابا صاحب کے گھر کبھی سلامت علی خاں کے ہاں کبھی منور عباس صاحب کے مکان پر کبھی عالیہ امام کے وہاں کبھی کہیں کبھی کہیں۔ البتہ شام کی محفلیں زیادہ تر خود جوش صاحب ہی کے مکان پر جمتی تھیں اور سب احباب جمع ہوتے رہتے تھے۔

لاہور سے ٹیلی فون:

ایک دن جون کی چھبیسویں تاریخ کو صبح آٹھ بجے لاہور سے محسن کا ٹیلی فون میرے گھر آیا۔ انھوں نے دریافت کیا کہ کیا جوش صاحب میرے یہاں ہیں؟ میں نے کہا ارے آپ تو مومن خاں سے بھی زیادہ بہادر نکلیں۔ وہ تو اس ڈر سے تصور یار بھی ترک کیے بیٹھے تھے کہ:

رہنے دے اے تصور جاناں نہ کر خیال
ایسا نہ ہو کہ وہ تجھے دشمن کے گھر لے

میں نے کہا ارے خورشید صاحب خدا نہ کرے کہ میں آپ کو دشمن کے زمرے میں شمار کروں۔ میں تو آپ کو اپنا سچا ہمدرد سمجھتی ہوں اب رہی مومن خاں کی بات تو ہم مومن کے بجائے غالب کے طرفدار ہیں جو کہتا ہے کہ

ہم بھی تمھیں بتائیں کہ مجنوں نے کیا کیا
فرصت کشاکش غم پنہاں سے گر ملے

میں نے کہا اگر مجنوں کے بجائے لیلیٰ رکھ دیں تو کیسا رہے۔ فرمایا لیلیٰ ہمارا کیا مقابلہ کرے گی۔ میں نے کہا واقعی آپ نے کام تو وہ کیا ہے کہ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی اور حسن و عشق کی داستانیں اپنی ابدیت کی غذا اردو شاعری سے حاصل کرتی رہیں گی اس وقت تک جوش ملیح آبادی کا نام بھی اردو شاعری سے وابستہ رہے گا اور دنیا فتنہ آخر الزماں کے نام کو بھی فراموش نہیں کر سکے گی۔ بقول حضرت جوش:

کیا طرفہ روش ہے یار جانی تیری	دنیا نہیں بھولے گی کہانی تیری
کانٹے کے لیے خون ہو اور پھول کا دل	مجھ پر مائل ہو اور جوانی تیری

اور

تیرے جلووں نے زندگانی بخشی	یا خشک امنگوں کو روانی بخشی
یوسف نے زلیخا کو بنایا تھا جواں	تو نے یوسف کو نوجوانی بخشی

میں کہتا جا رہا تھا کہ سمن نے کہا۔ اجی حضرت یہ آپ کو کیا ہو گیا ہے من آنم کہ من دانم۔ مجھے اپنے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ کیا جوش صاحب وہاں ہیں؟ مجھے ان سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ میں نے کہا کہ اس وقت تو وہ یہاں موجود نہیں ہیں لیکن میں آدھے گھنٹے کے اندر ان کو یہاں لا سکتا ہوں اور اگر آپ اپنا فون نمبر دے دیں تو ان سے آپ کی بات بھی کروا سکتا ہوں۔ سمن نے مجھے اپنا نمبر دے کر کہا کہ وہ تقریباً ایک گھنٹے تک اس فون پر موجود رہیں گی۔ میں اسی وقت جوش صاحب کے گھر گیا وہ ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی میز پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے

گلے لگا کر آنے کا سبب دریافت کیا۔ میں نے سمن کا پیغام پہنچایا تو فوراً تیار ہو گئے۔ فرمایا کہ آج عابد صاحب نے پایوں کی دعوت کی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ آنے والے ہوں گے مگر جوش صاحب نے گھر والوں کو کہہ دیا کہ اگر عابد آئیں تو ان سے کہہ دینا کہ وہ خود ان کے گھر پہنچ جائیں گے۔ یہ کہہ کر وہ میرے ساتھ میرے گھر آ گئے۔ جب میں نے لاہور کا ٹیلی فون ملایا تو سمن نے فوراً ہی رسیور اٹھا لیا۔ میں نے رسیور جوش صاحب کو دے دیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب میں اندر آیا تو جوش صاحب نے فرمایا کہ سرکار عظمت مدار کا حکم ہوا ہے کہ میں جتوئی[1] سے ملوں اور سمن کی بہن کی نوکری کے لیے ان سے کہوں۔ میں نے کہا کیا وہ کراچی آ رہی ہیں؟ تو انھوں نے کہا کہ نہیں۔ البتہ مجھ سے کہا ہے کہ میں کراچی سے چلوں تو لاہور ضرور قیام کروں۔

اس کے بعد ہم دونوں عابد صاحب کے گھر گئے۔ وہاں ہاشمی صاحب اور ان کی چھوٹی صاحبزادی فرزانہ بھی لاہور سے آئی ہوئی تھیں۔ عابد صاحب نے نہایت پر تکلف دعوت کا اہتمام کر رکھا تھا۔ پائے بہت لذیذ تھے۔ ہم لوگوں نے خوب سیر ہو کر کھائے اور تقریباً ایک بجے اپنے گھر لوٹے۔ آج گرمی بہت زیادہ ہے۔ ٹمپریچر ۱۰۴ ڈگری فارن ہائٹ ہے۔

دوسرے دن صبح دس بجے جناب منور عباس صاحب ایڈووکیٹ کے گھر پر شعری نشست تھی۔ میں، جوش صاحب اور سلامت علی خاں وقت مقررہ پر پہنچ گئے۔ راز مراد آبادی، راغب مراد آبادی، پروفیسر شور علیگ، صبا اکبر آبادی کے علاوہ اور شعرا حضرات بھی مدعو تھے۔ راز مرحوم جوش صاحب کے بہت محبوب دوستوں میں سے تھے۔ انھوں نے ایک غزل سنائی۔ ایک شعر یہ تھا:

یہ اہتمام کہ اک اک نظر ہے افسانہ — یہ احترام کہ ان کو سنا نہیں سکتا

صبا اکبر آبادی کے چند شعر یہ ہیں:

نہیں ہوتے ہیں ریاکاری کے سجدے مجھ سے — میں اگر سر نہ جھکاؤں تو عبادت سمجھو
رفتہ رفتہ مری خودداری سے واقف ہوں گے — ابھی کچھ دن مرا انداز محبت سمجھو

---

[1] غلام مصطفیٰ جتوئی اس وقت سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔

تمھارا ذکر سنا میں نے ہر زباں سے الگ　　نظر میں آؤ تو دیکھوں کہ ماجرا کیا ہے

آخر میں جوش صاحب نے بھی رباعیات سنائیں اور دوپہر کو یہ محفل برخاست ہوئی۔

۳۰ ویں جون کو جوش صاحب تقریباً ایک بجے میرے گھر تشریف لائے۔ میں اس وقت باہر گیا ہوا تھا۔ ایک کاغذ پہ یہ لکھ کر پرچہ چھوڑ گئے۔

"جتوئی کے وہاں سے آپ کے پاس سیدھا چلا آ رہا ہوں کل ۹ بجے تک پہنچ جایئے، ایک نہایت ضروری درخواست لکھنا ہے"۔

جوش

۳۰-۶-۷۹ء

دوسرے دن میں نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں انھوں نے جتوئی صاحب کے نام ایک درخواست لکھوائی جس میں سمن کی بہن کی ملازمت کے لیے درخواست کی گئی تھی۔ پھر یہ درخواست لے کر جوش صاحب تو جتوئی صاحب کے پاس چلے گئے اور میں اپنے گھر آ گیا۔

۱۷ ویں جولائی کو جوش صاحب تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے اور وہاں چند دن قیام کے بعد اسلام آباد تشریف لے گئے۔

اس کے بعد چوبیویں ستمبر جمعہ کے دن جوش صاحب کا ٹیلی فون آیا کہ وہ ستیویں ستمبر جمعرات کے دن تیز گام سے کراچی پہنچ رہے ہیں۔ چنانچہ میں تاریخ اور وقتِ مقررہ پر کینٹ اسٹیشن پہنچا اور جوش صاحب کو لینے کے بعد ان کے گھر پہنچا کر شام کو آنے کا وعدہ کر کے اپنے گھر آ گیا۔ شام کو پھر وہی جوش صاحب کے گھر کی رونقیں لوٹ آئیں۔ راغب صاحب، سلامت علی خاں، ڈاکٹر عالیہ امام اور دوسرے احباب بھی تشریف لے آئے۔

دوسری اکتوبر کو حکومت پاکستان کی طرف سے ٹی وی پر مشاعرہ تھا جس میں شرکت کے لیے جوش صاحب تشریف لائے تھے۔ دراصل حکومت یکم اکتوبر سے ہفتہ محنت کشاں یا ہفتہ مزدور منا رہی تھی۔ اسی سلسلے میں ایک مشاعرہ بھی منعقد کیا جا رہا تھا اور اس میں شرکت کے لیے تمام پاکستان سے شعرا حضرات کو کراچی مدعو کیا گیا تھا۔ جوش صاحب سے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد

ملاقات ہوئی تھی۔ اس لیے بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ بالآخر جب محفل برخاست ہوئی تو جوش صاحب نے فرمایا کہ دوسری تاریخ کو میں نو بجے ان کے گھر پہنچ جاؤں تاکہ ٹی وی اسٹیشن ساتھ چلیں۔ میں نے وعدہ کر لیا اور گھر آ گیا اور دوسری اکتوبر کو حسب وعدہ میں ٹھیک نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں جناب راز مراد آبادی اور فراست رضوی پہلے سے موجود تھے۔ ہم سب احباب ٹھیک دس بجے ٹی وی اسٹیشن پہنچ گئے۔ مشاعرے سے فارغ ہو کر ہم لوگ دو بجے گھر لوٹے۔

اس کے دوسرے دن جوش صاحب اور ہم سب احباب کی دعوت سلامت علی خاں صاحب کے گھر تھی۔ خاں صاحب کے گھر ہمیشہ بے تکلف دوستوں کا اجتماع ہوتا ہے جس میں جوش صاحب بہت خوش رہتے ہیں۔ اس روز بھی جوش صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے اور بہت دیر تک کلام سناتے رہے اور اس طرح تقریباً ساڑھے گیارہ بجے یہ محفل برخاست ہوئی۔ اس کے بعد دوبارہ ۹ اکتوبر کو خاں صاحب نے جوش صاحب کی دعوت کی اور میرے علاوہ راغب صاحب، راز صاحب، سرور صاحب بارہ بنکوی، فراست رضوی بھی شریک محفل تھے۔ کھانا بہت لذیذ تھا اور جوش صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے اور بہت سی تازہ رباعیات اور نظمیں سنائیں۔ جب محفل ختم ہوئی اور مہمان رخصت ہونے لگے تو راغب صاحب نے جوش صاحب کی تعریف میں یہ رباعی سنائی:

یہ حسن بیان جوش اللہ اللہ ۔۔۔ یہ لطف بیان جوش اللہ اللہ
صف بستہ ہیں الفاظ و معانی راغب ۔۔۔ یہ شوکت و شان جوش اللہ اللہ

جوش صاحب کے ساتھ لاہور کا سفر:

دوسرے دن جب میں جوش صاحب کے گھر پہنچا تو جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ وہ گیارھویں اکتوبر یعنی دوسرے دن تیز گام سے لاہور جا رہے تھے اور میں بھی ان کے ساتھ چلوں۔ میں نے عرض کیا کہ آپ مجھے تھوڑا سا وقت دیں میں بیوی سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔ چنانچہ جب میں نے بیوی سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا کہ اگر جوش صاحب تمھیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتے ہیں تو چلے جاؤ۔ چنانچہ میں نے جلدی جلدی تیاری شروع کر دی اور

جوش صاحب کو مطلع بھی کر دیا۔ دوسرے دن ہم دونوں تیز گام سے لاہور روانہ ہو گئے۔ راستے میں میرا زیادہ تر وقت جوش صاحب کی بیاض سے ان کا کلام نقل کرنے میں گزرا۔ اس کے علاوہ مختلف موضوعات پر جوش صاحب سے گفتگو ہوتی رہی۔

پاکستان کی سیاسی قیادت کے متعلق جوش صاحب کے خیالات:

پاکستان کے مستقبل کے تعلق سے جوش صاحب کی یہ رائے تھی کہ جب تک سیاسی قیادت جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ہاتھوں سے نکل کر تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے نوجوانوں کے قبضے میں نہیں آئے گی پاکستان بیرونی سرمایہ دار طاقتوں کے بین الاقوامی مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنتا رہے گا اور ملک داخلی، فرقہ واریت اور صوبہ پرستی کا شکار بن کر کمزور، مقروض اور غیر ترقی یافتہ رہے گا۔ پاکستان کو چاہیے کہ وہ ہندوستان سے خوشگوار تعلقات قائم کرے مگر مجھے اس بات کا امکان کم نظر آتا ہے کیونکہ پاکستان کی تخلیق ہندو سے نفرت کی بنا پر ہوئی ہے اور جب تک ہندوستان اور پاکستان کے دانشور، ادیب، شعرا اور سمجھدار اہل قلم اپنی انجمنیں بنا کر آپس میں محبت کے جذبات کی آبیاری نہیں کریں گے۔ آپس کے اچھے تعلقات کا قیام دشوار دکھائی دیتا ہے۔ غرض اسی قسم کی باتوں میں سفر ختم ہوا۔ جب ہم لوگ لاہور پہنچے تو اسٹیشن پر ہاشمی صاحب کی صاحبزادیوں کے ساتھ فتہ آخرالزماں بھی جوش صاحب کے استقبال کے لیے موجود تھیں۔ ابھی قلی ہمارا سامان ڈبے سے اتار کر اپنے سروں پر رکھ رہے تھے اور ہم لوگ روانہ ہونے والے تھے کہ سامنے سے ذیشان صاحب آ گئے۔ جوش صاحب کے چونکہ گھٹنوں میں تکلیف رہتی ہے ان کے لیے پلیٹ فارم پر چلنا مشکل ہو رہا تھا تو انھوں نے لڑکیوں کے کاندھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا۔ ذیشان صاحب نے جوش صاحب کو اس حالت میں دیکھ کر یہ شعر پڑھا:

دستے بہ دوش غیر نہاد از رہ کرم　　　　ما را چو دید لغزش پا را بہانہ ساخت[1]

لاہور میں جوش صاحب تو ہاشمی صاحب کے گھر چلے گئے اور میں اپنے بھائی اختر میاں

---

[1] وہ از راہ کرم اپنے ہاتھ غیروں کے کاندھوں پر رکھے چل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پیر کی لغزش کا بہانہ کر دیا

کے گھر ٹھہر گیا۔ اس مرتبہ جوش صاحب نے لاہور میں صرف چار دن قیام کیا اور ۱۰ ویں اکتوبر کو میں اور جوش صاحب ساڑھے پانچ بجے ریل کار سے پنڈی روانہ ہو گئے۔ لاہور کے قیام کے دوران میں جوش صاحب کی کیفیت کچھ ان کی اس رباعی کے مطابق رہتی ہے۔

وہ شیخ دلستاں نہ کہیں آجائیں   عظمت کے نگہباں نہ کہیں آجائیں
ایسے میں کہ پہلو میں ہے وہ بت سُن   شبیر حسن خاں نہ کہیں آجائیں

اسلام آباد میں جوش صاحب نے اصرار کر کے مجھے اپنے ہی مکان میں ٹھہرایا۔ وہاں بھی شام کی محفلیں دلچسپ ہوتی ہیں مگر کراچی کی بات کہاں۔

محترمہ عصمت چغتائی کی ملاقات:

آج کل محترمہ عصمت چغتائی صاحبہ اسلام آباد آئی ہوئی ہیں۔ انیسویں اکتوبر کو منگل کی رات تقریباً دس بجے جب جوش صاحب سونے کی تیاری کر رہے تھے عصمت آپا اپنی بھتیجی مدحت سعید صاحبہ جو عظیم بیگ چغتائی مرحوم کی صاحبزادی ہیں اور ان کی بیٹی اور چند دیگر خواتین کے ساتھ جوش صاحب سے ملنے کے لیے تشریف لے آئیں۔ جوش صاحب نے انھیں دیکھ کر فرمایا ارے آپ لوگ اس وقت تشریف لائے ہو جب ہم انتقال فرمانے والے ہیں۔

عصمت آپا نے دیر سے آنے کی معافی چاہی اور کہا کہ جن صاحب کو جوش صاحب کا گھر معلوم ہے ان کو اسی وقت فرصت ملی۔ خیر پھر انھوں نے تمام خواتین کا تعارف کروایا۔ عظیم بیگ چغتائی کی صاحبزادی مدحت سعید کراچی میں ڈیفنس سوسائٹی میں رہتی ہیں۔ جوش صاحب باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔ عصمت آپا کی نظر جوش صاحب کی غیر مطبوعہ بیاض "محراب و مضراب" پر پڑی تو انھوں نے اسے اٹھا کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ ان کی نگہ ایک شعر پر ایک دم رک گئی اور انھوں نے وہ شعر بہ آواز بلند پڑھا۔

دانتوں میں دبائے ہوئے چکنا سا کمربند
اور ہاتھ نہاں خانۂ تطہیر میں ڈالے

اس کے بعد بیاض جوش صاحب کے حوالے کرتے ہوئے فرمائش کی کہ جوش صاحب وہ نظم جس کا عنوان "نیزہ نگاہی" ہے سنائیں۔ جوش صاحب نے بیاض لے کر نظم سنانا شروع

کر دی۔ یہ نظم اب مراب و مضراب میں چھپ چکی ہے مگر ہمارے شرمیلے ناشر حضرات نے یہ دو اشعار قابل اشاعت نہیں سمجھے:

دانتوں میں دبائے ہوئے چکنا سا کمربند
اور ہاتھ نہاں خانۂ تطہیر میں ڈالے
اتنے میں جو وہ فتنۂ دوراں نظر آئی
ڈھیلے کو کیا تو نے دو ادب کے حوالے

عصمت آپا نے دل کھول کر ان اشعار کی داد دی اور کہا جوش صاحب تمام اردو ادب میں اس مکروہ فعل کو اس قدر شریفانہ الفاظ کا لباس پہنا کر آج تک کسی شاعر یا ادیب نے بیان نہیں کیا اور آپ کا کھینچا ہوا نقشہ اس قدر مکمل ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی فلم دیکھ رہے ہیں واقعی آپ کانوں سے منظر دکھا سکتے ہیں۔ عصمت چغتائی اس ملاقات کے متعلق اپنے رپوتاژ میں جو انھوں نے ۱۹۷۶ء میں پاکستان کے سفر کے متعلق تحریر کیا ہے، لکھتی ہیں۔ "جوش صاحب سے ملنے گئی انھیں تندرست اور چاق چوبند دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ ماشاء اللہ بیاسی سال کے ہیں مگر چہرے کی جلد تر و تازہ اور گلابی ہے۔ بالکل نہیں بدلے۔ چاروں طرف شکرے کی طرح نظر گھمائی۔ نگاہیں ایک حسین پھول جیسی لڑکی پر ٹک گئیں۔ "یہ بچی کس کی ہے"۔ انھوں نے شکرے کی سی دھاردار نظریں گھمائیں "میری نواسی ہے جوش صاحب"۔ میں نے پھسلایا۔ بولے "خوب"۔ میں نے ان کی بیاض اٹھائی ایک شوخ سی نظم کا صفحہ کھول کر پڑھنے کی درخواست کی۔ بس چنگاریاں سی چھٹنے لگیں۔ شعلے لپکنے لگے ایسا معلوم ہوتا تھا اپنی دبنگ آواز کے زیر و بم پر سننے والوں کو چٹکیاں دے رہے ہیں"۔ (ماخوذ از عصمت چغتائی فن اور شخصیت مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش)۔ میں نے کہا عصمت آپا آپ کی عقاب نگاہی کی بھی داد دینی پڑتی ہے میں اتنے دنوں سے جوش صاحب کی اس بیاض سے روز نظمیں نقل کر رہا ہوں مگر میری نظر ابھی تک ان اشعار پر نہیں پڑی تھی جن کو آپ نے بیاض کھولتے ہی دیکھ لیا۔ عصمت آپا ہنسنے لگیں فرمایا "جو ئندہ یابندہ"۔ رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد انھوں نے دوبارہ دن میں آنے کا وعدہ کیا اور وہ سب لوگ رخصت ہو گئے۔

جوش صاحب کے گھر میں میری مشغولیت زیادہ تر یہ رہتی تھی کہ میں ان کی بیاض سے ان کا

تازہ کلام نقل کرتا رہتا تھا۔ جوش صاحب اپنی پرانی نظمیں بھی دوبارہ تحریر کیا کرتے تھے مگر ایسا کرتے وقت وہ اکثر بند کے بند بدل دیا کرتے تھے۔ اس لیے میں نے وہ نظمیں بھی اپنی ڈائری میں نقل کرلی تھیں۔ ایک روز میں صبح سے بیٹھا ان کی نظمیں نقل کر رہا تھا اور میں نے "جوانی یاد آتی ہے" کے ۲۰ بند، "یادش بخیر" کے ۱۶ بند، "ہائے جوانی ہائے زمانے" کے ۱۵ بند، "معترض فرشتوں کی یاددہانی" کے ۱۱ بند نقل کرلیے تو جوش صاحب آگئے۔ پوچھا کیا کر رہے ہو۔ میں نے بتایا کہ نقل کر رہا ہوں انھوں نے میری تحریر کی رفتار دیکھ کر ڈائری پر لکھ دیا "اف یہ روانی دلبر جانی"۔ اس کے بعد میں نے "منظر برشگال"، "گل بدنی" نقل کیں پھر میری نگہ "نیزہ نگاہی" پر پڑ گئی۔ میں نے وہ بھی نقل کرلی۔ یہ نظم چونکہ نئی ہے اس لیے یہاں مکمل نقل کر رہا ہوں۔

نیزہ نگاہی

کل روئی دھنکنے کے تماشے میں دم صبح
جنبیدہ تھے اک مہ وش نوخیز کے بالے

دھن دھون تنا دیم تنا دیم دھنا دھوں
لہراتی ہوئی دھن پہ تھرکتے ہوئے گالے

دوشیزگی محو تماشا کے پس پشت
انداز کے لشکر تو اداؤں کے رسالے

باشستہ خدوخال پہ ہلکا سا دھندلکا
مکھڑے پہ اڑی نیند کے بے چین کسالے

اک ہاتھ کی چنچل سی مسلتی ہوئی پلو
اک ہاتھ سے اڑتے ہوئے آنچل کو سنبھالے

نظروں میں سمیٹے ہوئے انوار کی جھلمل
گردن میں لپیٹے ہوئے جھنکار کے ہالے

پلکوں میں شبستاں کی پروئی ہوئی نیندیں
انداز میں چوتھی کی ادا ناز میں چالے

اڑتے ہوئے دھنکی سے سفید ابر کے لکے
مچلے ہوئے ماتھے پہ سیاہ تاب کلالے

بوجھل سے پپوٹوں پہ جھنکتی ہوئی دھنکار
زلفوں کی گھٹاؤں پہ برستے ہوئے گالے

عارض پہ وہ رفتار خیالات کے جیسے
بڑھتے ہیں دبے پاؤں دم صبح اجالے

پلکوں کی گھنی چھاؤں میں وہ نیند کے جھپان
جس طرح خرابات پہ برسات کے جھالے

وہ حسن کہ جھم سے جو بڑھے بھاؤ بتانے
تو مطرب آفاق کلیجے سے لگالے

اعضا کے خم و پیچ میں گندنام کی جنسی
چولی کے گھنے کنج میں کاشی کے شوالے

رقصندگی پنبہ بسر آتش رخسار
حیران کھڑے تھے یہ سماں دیکھنے والے

اتنے میں اک افسردہ جبیں ، زاہد بدرو
ہونٹوں پہ چلاتے ہوئے حوروں کی دعائیں
وہ ریش کہ جو پھیر دے آفاق پہ جھاڑو
توتھن کا وہ لٹکاؤ کہ پل بھر میں سمجھ لو
دانتوں میں دباتے ہوئے چکنا سا کمربند
اتنے میں جو وہ فتنۂ دوراں نظر آئی
منہ ڈال دیا حسن پہ ظالم نے ہمک کر
اور یوں کہ کوئی چھید کے برچھی کی انی سے

تکلو پہ نمودار ہوا دانت نکالے
شلوار میں ٹوٹے ہوئے جنت کے قبالے
وہ رخ کہ نکل جائیں نگاہوں کے دوالے
کل شہر کے لقوں میں یہ حضرت ہیں جیالے
اور ہاتھ نہاں خانۂ تطہیر میں ڈالے
ڈھیلے کو کیا تر سے دوراہے کے حوالے
بکھری ہوئی پلکوں کے اٹھائے ہوئے بھالے
شبنم سے دھلے پھول کو نیزے پہ اٹھا لے

اسی دوران میں مجھے یہ بھی موقع ملا کہ میں جوش صاحب کی غیر مطبوعہ کتاب "حرف آخر" سے بھی بہت سا کلام نقل کر لوں۔ ایک دن جوش صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ مجھے ڈر ہے مرے بعد میرا تمام کلام کیڑے کھا جائیں گے اور کوئی اس کو چھپوانے کی زحمت نہیں کرے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ تمام بیاضیں تم لے جاؤ اور اپنی نگرانی میں اس کو چھپوا دو۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ کام کسی ایک آدمی کے بس کا ہرگز نہیں ہے اس کو تو کوئی اکیڈیمی یا حکومت کا کوئی ادارہ ہی انجام دے سکتا ہے۔ جوش صاحب نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا افسوس میری اولاد میں مجھے کوئی ایسا ذمہ دار شخص دکھائی نہیں دیتا جو یہ کام انجام دے سکے۔

جمعہ کے دن حسن ابدال سے اختر صاحب اور واہ کینٹ سے اظہار حسین زیدی جوش صاحب سے ملاقات کے لیے آ گئے۔ باتوں باتوں میں یہ طے پایا کہ ہم سب ایک دن کے لیے واہ کینٹ جائیں اور رات وہاں گزار کر دوسرے دن لوٹ آئیں۔ چنانچہ ہم لوگ تین بجے واہ روانہ ہو گئے۔ شام کو زیدی صاحب کے گھر بہت سے احباب جمع ہو گئے۔ ان میں کرنل ریٹائرڈ رمضان بھی تھے۔ کرنل صاحب اس قدر دلچسپ آدمی ہیں کہ ان کی صحبت میں وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ ان کو اتنے لطیفے یاد ہیں کہ اگر وہ تمام رات بھی لطیفے سناتے رہیں تو ان کے لطیفوں کا اسٹاک کم نہیں ہوتا۔ اختر صاحب اور ان کے ساتھ منظور صاحب بھی زیدی صاحب کے گھر آ گئے۔ رات دیر گئے تک لطیفے اور شاعری ہوتی رہی اور خوب لطف آیا۔

رسالپور اکیڈمی:

دوسرے دن صبح میں نے جوش صاحب سے کہا کہ رسالپور کی ایئر فورس اکیڈمی میں میرا بیٹا پرویز علی خاں زیر تربیت ہے۔ میں اس سے ملنے جانا چاہتا ہوں وہاں دو ایک دن رہ کر آجاؤں گا۔ جوش صاحب نے دریافت کیا کب واپس آؤ گے۔ میں نے کہا پیر تک لوٹ آؤں گا۔ پھر میں واہ سے بس کے ذریعے سے رسالپور روانہ ہو گیا اور جوش صاحب اپنی کار میں اسلام آباد چلے گئے۔ مجھے غیر متوقع طور پر اپنی اکیڈمی میں دیکھ کر پرویز علی خاں حیران ہو گئے پھر جب میں نے بتایا کہ میں اسلام آباد جوش صاحب کے ساتھ آگیا تھا تو سوچا کہ رسالپور میں تم سے بھی مل لوں۔ وہاں دو دن بہت پرلطف گزرے۔ ایئر فورس اکیڈمی کا ماحول نہایت شاندار تھا۔ اساتذہ کا برتاؤ اپنے شاگردوں سے بالکل اپنے چھوٹے بھائیوں کا سا تھا۔ جب ان کے اساتذہ صاحبان کو معلوم ہوا کہ پرویز کے والد آئے ہوئے ہیں تو انھوں نے میری دعوتیں کرنی شروع کر دیں۔ ان لوگوں کی گفتگو کا انداز بے حد عالمانہ تھا یہاں تک کہ ان کی بیگمات سے گفتگو کر کے محسوس ہوتا تھا کہ ہم علمی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ یہ دو دن بہت پرلطف گزرے اور میں پیر کی صبح کو نوشہرہ سے بس میں سوار ہو کر اسلام آباد جوش صاحب کے مکان پر بارہ بجے پہنچ گیا۔ جوش صاحب مجھے دیکھ کر بہت خوش ہو گئے اور کہا میں تو شام تک آپ کے آنے کی توقع کر رہا تھا۔ شام کو جوش صاحب نے ڈاکٹر آئی ڈی حسن صاحب سے اپنے طبی معائنے کے لیے وقت لے رکھا تھا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ میں چاہتا ہوں آپ کا بھی ڈاکٹر صاحب سے معائنہ کروا کے دوائیں لے لی جائیں۔ مجھے تقریباً دو سال قبل دل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اتفاق سے ان دنوں میری ایک چچا زاد بہن افسر خانم بھی پنڈی آئی ہوئی تھیں اور ان کو بھی لاہور میں چند ماہ قبل شدید دل کی تکلیف ہو چکی تھی۔ میں نے جوش صاحب سے استدعا کی کہ راستے سے افسر خانم کو بھی لے لیں اور ڈاکٹر صاحب سے ان کے متعلق بھی رائے حاصل کر لیں۔ جوش صاحب نے فرمایا ضرور، ضرور۔ چنانچہ ہم لوگ اسی شام افسر خانم کو بھی ان کی قیام گاہ سے لے کر ڈاکٹر صاحب کے مطب پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب نے یکے بعد دیگرے ہم تینوں کا تفصیل سے معائنہ فرمایا۔ مجھ سے تو کہا کہ آپ اب بالکل ٹھیک ہیں۔ جوش صاحب سے کہا کہ ان کا بلڈ پریشر زیادہ ہے اور جب تک وہ ڈرنکس ترک نہیں کریں گے ان کو یہ تکلیف

رہے گی۔ جوش صاحب نے فرمایا۔

تم مجھ سے یہ کہتے ہو کہ زنہار نہ پینا
یہ کیوں نہیں کہتے کہ خبردار نہ جینا

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا عمل کرنا یا نہ کرنا آپ کا مسئلہ ہے۔ آپ کو آگاہ کرنا میرا فرض ہے۔ افسر خانم کا معائنہ کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے تشویش کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ان کے دل کی حالت ٹھیک نہیں ہے ان کو دوا اور غذا میں بہت احتیاط کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کے مرض کی پیچیدگی یہ تھی کہ ان کو ذیابیطس کا مرض بھی لاحق تھا اور افسر خانم ان اہل دل انسانوں میں سے تھیں جن کے دل میں سارے جہان کا درد رہتا تھا۔ جب مجھے دل کا دورا پڑا تھا تو میں لندن میں تھا اور افسر لاہور میں۔ انھوں نے مجھے ٹیلی فون پر تاکید کرنا شروع کر دی کہ دوائیں پابندی سے کھاؤں اور ڈاکٹر کی ہدایات پر سختی سے عمل کروں۔ اب میں نے افسر خانم سے کہا کہ اب آپ کی باری ہے۔ دوائیں پابندی سے استعمال کریں اور کھانے میں سخت احتیاط ضروری ہے مگر افسوس افسر بیگم کا مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی اور بالآخر اس بیماری دل نے ان کا کام تمام کیا۔ افسر اب ہم میں نہیں ہیں مگر۔ جانے والے تجھے روئے گا زمانہ برسوں۔

خیر یہ تو بہت بعد کی بات ہے اس وقت تو ہم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے معائنے کے بعد نسخے لیے اور گھر آ گئے۔ افسر خانم کو ان کے مکان پہنچا کر راستے میں جوش صاحب نے مجھ سے کہا خورشید علی خاں مجھے آپ کی بہن کی طرف سے بہت فکر لاحق ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر نے ان کے متعلق اچھی خبر نہیں دی۔ میں نے کہا نہیں جوش صاحب وہ سمجھدار خاتون ہیں ضرور ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل کریں گی۔ غرض اسی ذہنی کیفیت میں ہم لوگ گھر آ گئے اور جوش صاحب نے ہر قسم کی فکر اور ڈاکٹر کے مشورے کو غرق مے ناب فرما کر اپنا جام صحت نوش کیا۔ میں دو تین دن کے بعد اٹھائیسویں اکتوبر کو شام کی پرواز سے کراچی آ گیا اور اپنے کاموں میں مشغول ہو گیا۔ جوش صاحب مجھے پہنچانے کے لیے ایرپورٹ تشریف لائے اور فرمایا کہ اگر میں ایک ہفتہ اور ٹھہر جاؤں تو اگلے ہفتے وہ بھی میرے ساتھ کراچی چل سکتے ہیں کیونکہ اگلے ہفتے سن بھی کراچی جانے والی ہیں۔ میں نے کہا اس دفعہ جب آپ تشریف لائیں تو میرے گھر

قیام کیجیے گا۔ اس لیے اب میں جا کر آپ کا انتظار کروں گا۔ جوش صاحب نے فرمایا جی ہاں آپ ہی کو میرے قیام و طعام کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ اتنے میں پرواز کا وقت ہو گیا اور میں جہاز پر چلا گیا۔

نومبر کے پہلے ہفتے میں جوش صاحب کراچی تشریف لائے۔ پہلے تو اپنے ہی گھر میں قیام کیا مگر جب سمن بھی کراچی آ گئیں تو وہ میرے گھر اٹھ آئے مگر یہ واقعہ نومبر کے دوسرے ہفتے کا ہے کہ ایک شام سمن کا ٹیلی فون آیا وہ کراچی سے بول رہی تھیں۔ میں نے فوراً ٹیلی فون جوش صاحب کو دے دیا۔ راغب صاحب بھی موجود تھے۔ جب جوش صاحب بات ختم کر چکے تو راغب صاحب نے جوش صاحب سے کہا "مبارک ہو جن کا انتظار تھا وہ تشریف لے آئیں" پھر یہ رباعی فی البدیہہ ارشاد فرمائی۔

جو ذرہ ہے سرچشمۂ انوار ہے آج	پہلو میں لیے دولت بیدار ہے آج
کس کے قدموں کا ہے یہ راغب اعجاز	صحرائے کراچی بھی سمن زار ہے آج

جوش صاحب نے تیسرے مصرع میں اس طرح ترمیم فرمائی۔

کس کے دامن کو چھو کر آئی ہے نسیم

میں نے کہا واہ جوش صاحب محبوب کے قدموں کے بجائے نسیم کا اس کے دامن کو چھو کر آنے میں جو نزاکت جذبات کا اظہار ہے اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف آپ ہی کہہ سکتے ہیں۔ غرض وہ شام بھی بہت دلچسپ رہی۔ رات دیر تک باتیں ہوتی رہیں اور ظاہر ہے موضوع گفتگو صرف ایک ہی ہو سکتا تھا۔

صائمہ قریشی ـــــ تلبیس شخصی:

۲۶ ویں نومبر کو میں اور جوش صاحب صبح دس بجے راغب صاحب کے دفتر جا رہے تھے کہ اتنے میں سمن بھی آ گئیں۔ جوش صاحب نے ان سے کہا کہ ہم لوگ راغب صاحب کے دفتر جا رہے ہیں۔ تم بھی ہمارے ساتھ چلو مگر وہاں کسی کو یہ نہ بتلانا کہ تم کون ہو۔ میں نے کہا آپ اپنا نام صائمہ قریشی بتلائیں۔ میں کہہ دوں گا کہ یہ کراچی یونیورسٹی میں ایم اے اردو ادب کی طالبہ ہیں اور جوش صاحب پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ جوش صاحب کہنے لگے ارے

بھائی یہ تو نفسیات کی طالبہ ہیں۔ یہ اردو ادب کی طالبہ تو نہیں ہیں۔ میں نے کہا جوش صاحب جو ہستی آپ کی شاعری کا موضوع ہو وہ تو خود اردو ادب کا موضوع ہے اس کو ادب کی طالبہ ہونے کی کیا ضرورت ہے اس پر تو ادب کے طالب علم پی ایچ ڈی کریں گے۔

غرض انہی باتوں میں ہم لوگ راغب صاحب کے دفتر بزنس ریکارڈر روڈ پر واقع لیبر ویلفیئر ڈپارٹمنٹ پہنچے۔ وہاں میاں فراست رضوی بھی راغب صاحب کے کمرے میں موجود تھے۔ ان دونوں نے جب ایک لڑکی کو ہمارے ساتھ دیکھا تو متجسس نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں نے تعارف کروایا۔ یہ صائمہ قریشی ہیں کراچی یونیورسٹی میں ایم اے اردو ادب کی طالبہ ہیں جوش صاحب پر مقالہ لکھ رہی ہیں۔ آج جب ہم گھر سے چل رہے تھے تو یہ آگئیں تو میں نے کہا کہ آپ بھی ہمارے ساتھ گاڑی میں بیٹھ جایئے اور راستے میں جوش صاحب سے سوالات کرتی رہیے۔ ہم لوگ راغب صاحب مراد آبادی کے دفتر جا رہے ہیں آپ کی ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔ یہ راضی ہو گئیں اب آپ کے سامنے ہیں"۔

راغب صاحب نے گو آج تک سمن کو نہیں دیکھا تھا مگر فوراً سمجھ گئے کہ صائمہ قریشی کے پردے میں کون شخصیت ہے مگر زبان سے کچھ نہیں کہا۔ جب ہم لوگ بیٹھ گئے تو راغب صاحب نے چائے منگوائی اور چائے کے دوران فراست رضوی اور راغب صاحب میں شاعری کا مقابلہ شروع ہو گیا۔ موضوع تو سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ "صائمہ قریشی"۔ آپ بھی سنیے۔

فراست رضوی نے فرمایا۔

رہا ہوئے ہیں مسائل کی رنج کیشی سے
ملے ہیں آج جو ہم صائمہ قریشی سے

راغب صاحب نے ارشاد فرمایا:

یہ فال نیک ہے میری نظر میں اے راغب
ادب کا ذوق بھی ہے صائمہ قریشی کو

جوش صاحب جو بے انتہا پیار بھری نظروں سے سمن کو دیکھ رہے تھے بے ساختہ بول اٹھے۔

زاں آرزو کہ جلوہ کند شعلہ پیکرے
صدہا چراغ کعبہ و بتخانہ سوختیم

میاں فراست کب خاموش رہنے والے تھے فوراً ایک قطعہ موزوں کر دیا۔

صائمہ سے ملے تو ہم پہ کھلا
ان کا دل ہے وفاؤں کا معبد
الفت جوش حاصل شب و روز
کوئی دیکھا نہ ایسا خوش مقصد
پاکیٔ فکر اور خوشبوئے مہر
یہ سخن جو ہے صائمہ بے حد

راغب صاحب جو سمجھ چکے تھے کہ صائمہ دراصل کون ہیں، کہنے لگے:

آسمان جمال کا راغب
زاویہ کیوں نہ قائمہ کہیے
معترض میں نہیں خدا کی قسم
شوق سے آپ صائمہ کہیے

پھر فرمایا:

خوش لہجہ و بلور بدن صائمہ ہیں
شمع سر اہل بزم فن صائمہ ہیں
ہر شخص ہے مداح جمال اے راغب
لاریب کہ جان انجمن صائمہ ہیں

فراست رضوی فرمانے لگے:

مہکار میں شاخ نسترن صائمہ ہیں
اخلاص کا سرسبز چمن صائمہ ہیں
سرتا بہ قدم بیاض اشعار جمال
نازِ غزل و رشک سخن صائمہ ہیں

جوش صاحب نے دوسرے مصرع میں اس طرح اصلاح فرمائی:

مہکار میں شاخ نسترن صائمہ ہیں
رشک گل و نسرین و سمن صائمہ ہیں

راغب صاحب نے کہا:

حریف حسن سحر صائمہ قریشی ہیں
متاع اہل نظر صائمہ قریشی ہیں
ہر اک نگاہ ہے صد رشک جلوۂ خورشید
یہ جانتا ہے خبر صائمہ قریشی ہیں

آخر یہ دلچسپ محفل دو بجے فراست رضوی کے اس قطعہ پر ختم ہوئی جو انھوں نے صنعت توشیح میں کہا ہے۔

ص — صورت ہے کھلا گلاب جیسے
پیشانی ہے ماہتاب جیسے
ا — آنکھیں ہیں کہ دو چراغ روشن
زلفیں ہیں شب عتاب جیسے
م — مے خانۂ صفت ہے جو نظر ہے
تاثیر کہ ہو شراب جیسے
ہ — ہے ایسا گداز گفتگو میں
ہو میرا دل خراب جیسے

جب کسی لڑکی کے منھ پر اتنی تعریفیں کی جائیں اور وہ بھی اردو ادب کے اس قدر مایہ ناز شعرا کی طرف سے تو اس لڑکی کے چہرے کے تاثرات نفسیات کے ماہرین کے لیے مطالعہ کا بہت دلچسپ موضوع بن سکتے ہیں۔ میں دیکھ رہا تھا کہ سمن کا چہرہ کبھی سرخ ہو جاتا تھا اور کبھی فاتحانہ عظمت کا آئینہ دار۔ غرض یہ محفل بھی بہت دلچسپ رہی گو بعد کو اسکے نتائج اچھے نہیں نکلے کیونکہ اس کے بعد سمن، اکثر راغب صاحب کے دفتر تنہا جانے لگیں گو ان کا کہنا یہی تھا کہ وہ وہاں جوش صاحب ہی سے ملنے جاتی ہیں مگر جب جوش صاحب کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو ان کو بہت تکلیف ہوئی اور انھوں نے اپنی ایک تحریر میں اس کا ذکر بھی کیا ہے مگر جب راغب صاحب کو جوش صاحب کے جذبات کا علم ہوا تو انھوں نے فوراً ایک رباعی لکھ کر جوش صاحب کو دے دی۔ رباعی یہ تھی۔

ہے وہم بھی اک دشمن جانی سچ ہے
مفروضہ بھی ہے دشمن ثانی سچ ہے
راغب کے خلوص پر ہے شک حضرت جوش
عشق است و ہزار بدگمانی سچ ہے

جوشں صاحب نے یہ رباعی پڑھ کر فرمایا "آپ نے غلط نہیں کہا۔ ایں ہم اندر عاشقی بالائے غم ہائے دگر"۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہوا کہ بعض ناگزیر مصروفیت کی بنا پر سمن کراچی میں رہنے کے باوجود تین دن تک جوشں صاحب سے ملنے نہ آسکیں اور نہ ہی کوئی ٹیلی فون کیا۔

تیسرے دن میں نے دیکھا کہ جوش صاحب صبح ہی صبح کچھ لکھ رہے ہیں۔ تھوڑی دیر میں جب وہ لکھنے سے فارغ ہوئے تو میں نے دریافت کیا کہ آج کیا کوئی تازہ کلام کا نزول ہوا ہے۔ فرمانے لگے آپ دیکھ لیجیے یہ کہہ کر کاغذ مجھے دے دیا۔ یہ ایک رباعی تھی اور ایک نظم اس کا عنوان تھا۔

دیوی میری نظر کی جھولی بھر دے

مرا اب نزع کا ہنگام ہے۔ اب تو چلی آؤ
سسکتی زندگی کی شام ہے۔ اب تو چلی آؤ

فضا کی سوگواری جھینگے کی آہ و زاری سے
بپا سینے میں اک کہرام ہے۔ اب تو چلی آؤ
تمہاری دید کو اٹکی ہوئی ہے جان آنکھوں میں
تمہارا ہر نفس میں نام ہے۔ اب تو چلی آؤ
کبھی تم نے لگایا تھا جسے لب ہائے نازک سے
چھلکنے ہی پر اب وہ جام ہے۔ اب تو چلی آؤ
مرے اور قبر کے مابین اے میری سمن پیکر
بس اب تو ز حمت یک گام ہے۔ اب تو چلی آؤ
کبھی پروان جس آغاز کو تم نے چڑھایا تھا
اب اس آغاز کا انجام ہے۔ اب تو چلی آؤ

بلبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم
پس ازاں کہ من نہ مانم بچہ کار خواہی آمد

میری صبحیں رہین ہجراں گزریں   میری شامیں تمام گریاں گزریں
دیکھا جو نہ تین روز تیرا مکھڑا   تو دل کے نگر سے تین صدیاں گزریں

مگر سمن کی کوئی خبر نہ ملی یہاں تک کہ یکم دسمبر ۱۹۶۹ء کو عیدالاضحیٰ واقع ہو گئی مگر جوش صاحب کی عید کا چاند دکھائی نہیں دیا۔ اس دوران جوش صاحب نے سمن کو ایک خط لکھا یہ خط بعد میں سمن نے میرے حوالے کر دیا تھا۔ جوش صاحب نے لکھا تھا۔

۱۰-۱۲-۶۹ء کراچی دس بجے دن

دامن عید پر خون کے آنسو

آج عید کا دن ہے۔ حسن اتفاق سے آج ہم اور تم ایک ہی شہر میں سانس لے رہے ہیں اور خوش قسمتی سے تمہارے ماں باپ بھی یہاں موجود نہیں ہیں۔ تم بڑی آسانی سے مجھے اپنا مکھڑا دکھا اور مجھ سے عید مل سکتی تھیں لیکن تم اوبدا کر روپوش ہو گئیں اور مجھ کو سنت ابراہیم

پر عمل کرتے ہوئے ذبح فرما دیا۔ کس قدر عبرتناک تضاد ہے تمہارے قول و فعل میں۔ تم کو اللہ میری اس قربانی کی جزائے خیر دے اور مجھ فریب خوردہ محبت کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ کاش میرے مر جانے کے بعد تم پیدا ہوتیں۔ دوسروں سے عید کی رنگ رلیاں منانے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کرو۔ اے وائے بدبختی کہ:

بائے دل پر وہ بارش غم ہے عید بھی عشرۂ محرم ہے"

پھر ایک دن خدا کا کرنا کیا ہوا کہ جوش صاحب راغب صاحب کے دفتر میں بیٹھے ٹیلی فون پر کسی خاتون سے گفتگو فرما رہے تھے اور ان کے اس استفسار پر کہ جوش صاحب کراچی میں کب تک قیام کریں گے تو جوش صاحب نے فرمایا "جب تک تم ٹھہراؤ گی اور اس دفعہ تم مجھ سے ملنے بھی نہیں آئیں"۔ عین اس موقع پر سمن آگئیں اور انھوں نے یہ گفتگو بھی سن لی۔ بس پھر کیا تھا وہ اس قدر برہم ہوئیں کہ:

برہمی زلف چلیپا میں کبھی دیکھی نہ تھی برہمی دیکھی تھی ایسی برہمی دیکھی نہ تھی

اور الٹے پاؤں لوٹ کر جانے لگیں تو جوش صاحب نے لپک کر پکڑ لیا۔ سمن کہہ رہی تھیں "آپ کو مجھ سے محبت نہیں ہے ہر شہر میں آپ کی ایک ڈپلی کیٹ رہتی ہے"۔ جوش صاحب نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی مگر جب ان کا غصہ فرو ہوتا نظر نہ آیا تو جوش صاحب نے راغب صاحب کے نجی دفتر کی کنجی لی اور ایک ٹیکسی میں سمن کو لے کر رخصت ہو گئے۔ شام کو جب جوش صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ "جب میں نے اس کے دوپٹے سے گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کرنے کی دھمکی دی تو وہ ڈر گئی اور پھر دوستی ہو گئی"۔ میں نے کہا چلو اچھا ہوا۔ بڑا مزہ اس ملاپ میں ہے کہ صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔

اس کے بعد حالات معمول کے مطابق چلتے رہے۔ شب و روز کی ملاقاتیں شروع ہو گئیں اور جوش صاحب نغمہ زن رہنے لگے۔

خوشا طالع کہ پھر آیا وہ میرا فتنۂ دوراں
بلائے طاعت و آشوب دین و دشمن ایماں
خرابات خراماں و خیابان سمن پیکر
سرود حلقۂ رنداں زبور دین فن کاراں

یہاں تک کہ بالآخر ۱۴ ویں دسمبر کو سمن کی رخصت کی گھڑی آن پہنچی۔ جوش صاحب نے اپنے جذبات ایک پرچے پر لکھ دیے۔ آپ بھی پڑھ لیجیے۔

۱۴-۱۲-۶۹، کراچی۔
بیداری ۲.۳۰ بجے پچھلا پہر

یوم رخصت

اے ڈوبتے ستارو آج میری شاہ زادی لاہور چلی جائے گی۔ ہائے کیسی ویرانی برسنے لگے گی در و دیوار پر۔

اے پچھلے پہر کے اندھیرے، آسمان سے کس کی ہچکیوں کی آواز آرہی ہے۔ یہ کون رو رہا ہے میری بیچارگی پر؟

اے جان ابھی ہونٹوں پر نہ آ کہ وہ وداعی ملاقات کے لیے آنے والی ہے۔ لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ وہ اپنی چچا زاد بہن کو ساتھ لے کر آئے گی۔ کیا چچا زاد بہن کی موجودگی سے میں جھجک جاؤں گا؟ اے جرات رندانہ میری دست گیری کرنا اس فاتح خوبان عالم کو خوب بھینچ بھینچ کر گلے لگانا اور اس کے بوسہ طلب ہونٹوں سے جی بھر کے آب حیات پینا۔ ایسی تیسی چچا زاد بہن کی۔

اے میری شاہ زادی آج تو چلی جائے گی۔ اس خیال سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔ بتاؤ اب خیر سے کب کھڑا جھمکاؤ گی میری جان؟ جس نامراد کو تم نے دیوانہ بنا دیا ہے۔ اسے لاہور بلاؤ گی یا بالکل ہی ٹال جاؤ گی۔ دیکھو یہ ظلم نہ ڈھانا اور ماں باپ کو حیلہ نہ بنانا۔"

اور اس کے بعد سمن لاہور روانہ ہو گئیں اور ادھر جوش صاحب کی جو حالت ہوئی اس کا اظہار انھوں نے اس طرح فرمایا۔

"تمھارے جاتے ہی کراچی کے دل سے دھواں اٹھنے لگا۔ ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ گلیاں ویران ہو گئیں اور گوشے گوشے سے رونے کی صدائیں بلند ہو گئیں۔

تم کیا گئیں کہ روٹھ گئے دن بہار کے

۔۔۔۔ یادش بخیر کبھی میں نعرہ لگایا کرتا تھا۔

ہزار دام سے نکلا ہوں ایک جنبش میں
جسے غرور ہو آئے کرے شکار مجھے

اور اب یہ عالم ہے کہ تم نے اپنی کافر زلفوں میں اس بری طرح جکڑ لیا ہے کہ جنبش کرنا تو درکنار کھل کر سانس بھی نہیں لے سکتا۔ میں جن زہرہ جبینوں کے دام توڑ کر باہر نکل چکا ہوں ان سب کا انتقام لینے کے لیے تم کو مجھ پر مسلط فرما دیا گیا ہے اور ہر طرف سے آوازیں آ رہی ہیں بڑے بہادر ہو تو اب نکلو دام توڑ کر۔ پیاری حسن۔ اب اس بات کو تسلیم کرنے میں کوئی امر حائل نہیں رہا کہ تم کو پیدا کیا گیا ہے صرف اس مقصد کے واسطے کہ تم مجھ کو موت کے گھاٹ اتار دو۔ "سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی"۔

حسن اور شاعر:

یہ ایک طویل خط کا مختصر سا اقتباس ہے جس کو جوش صاحب کی جوشیلی شاعرانہ حسیت کا آئینہ دار کہا جا سکتا ہے ورنہ ان کے افغانی خون کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر کبھی ایک ساحل سے دوامی آشنائی کے جبر کو برداشت کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کے اندر کا شاعر "حسن" کو کسی ایک پیکر میں محدود کر ہی نہیں سکتا تھا۔ جوش صاحب کی شخصیت کا قوام جن اجزاء سے گوندھا گیا تھا ان کے لیے حسن ہر شکل میں مقناطیسی کشش رکھتا تھا۔ وہ اپنی سوانح "یادوں کی برات" میں اعتراف فرماتے ہیں کہ "میں نے بھنورے کی زندگی کو اپنایا ہر گل تو دمیدہ پر منڈلایا اس کا گن گایا اس کی خوشبو پی اس کا رنگ چکھا اس پر کالی گھٹاؤں کے سناٹے میں گایا گونجا اور پھر یہ کہتا ہوا اڑ گیا۔

در ہیچ مقام نہ گزارد بدرنگے از بوے بہ بوے برو از رنگ برنگے

دراصل شاعری اور حسن پرستی لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی شخص اس وقت تک اچھا شاعر ہو ہی نہیں سکتا جب تک حسن پرستی اس کے لیے عبادت کا درجہ نہ رکھے۔ بقول صاحبزادہ رفعت:

مجھ کو تقدیس حسن کی سوگند حسن کو دیکھنا عبادت ہے

اور جوش صاحب تو اس صدی کے حافظ و خیام تھے ان کے لیے حسن ہر شکل میں شدید

کشش رکھتا تھا۔ حسن خواہ چاندنی رات کا ہو یا طلوع سحر کا۔ برکھا کی آڑی پھوار کا ہو یا کسی دوشیزہ کی آڑی مانگ کا۔ ساون کی برستی رت کا ہو یا آبشار سے برستی پھوار کا۔ تتلی کے رنگین پروں کا ہو یا گل کی پنکھڑیوں کا۔ دکن کی سنگلاخ چٹانوں میں پرورش پانے والے برشتہ رنگ سنگین شباب کا ہو یا کسی غنچہ دل کو چٹکانے والی گل پیرہن مالن کا۔ کسی ماہ وش کے زلف سیاہ کے خم ہوں یا خم آب رواں۔ حسن پھولی ہوئی شفق کا ہو یا نکھری ہوئی دھنک کا۔ حسن کسی فتنہ خانقاہ کا ہو یا کسی گلبدن کا یا کسی روئی دھنکنے والی کا۔ نغمہ جوئے بار کا ہو یا سکوت کوہسار کا۔ حسن تاروں بھری رات کا ہو یا محفل ماہ پاراں کا۔ حسن کسی گل کا ہو یا گلعذار کا۔ کوئل کی کوکو ہو یا پپیہے کی پی ہو۔ حسن کسی صورت میں ہو شاعر کے جذبات میں طوفان برپا کر دیتا ہے اور جوش صاحب تو خود فرماتے ہیں:

اف نکل جاتی ہے خطرے ہی کا موقع کیوں نہ ہو
حسن سے بے تاب ہو جانا مری فطرت میں ہے

شاعر دراصل اس کائنات کی صنعت حسن کا جوہر ناطقہ ہے۔ اس لیے اگر کوئی شاعر یہ دعویٰ کرے کہ وہ شاعر ہے اور اس کے ساتھ یہ باور کرانے کی بھی کوشش کرے کہ اس کو کسی ایک شخصیت سے اس طرح محبت ہے کہ وہ کسی دوسرے کے دام حسن میں گرفتار ہو ہی نہیں سکتا تو سمجھ لیجیے کہ وہ کسی بھولی بھالی معصوم شخصیت کو دام ہوس میں گرفتار کرنے کے لیے شاعرانہ دروغ گوئی سے کام لے رہا ہے۔ بہرحال یہ ایک خیال ہے جس سے کوئی شاعر متفق نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بقول حضرت جوش:

مکھڑوں پہ مکرر نظر نامحمود
اور جم کے جو دیکھ لیں تو ٹھہریں مردود
یا حسن سے اس کرہ کو خالی کر دے
یا بھاڑ میں جھونک دے یہ آنکھیں معبود

ان ہی دنوں جوش صاحب نے ایک نظم کہی تھی آپ بھی سن لیجیے۔

کبھی پہلے نہ تھی

زندگی کی یہ شرر باری کبھی پہلے نہ تھی
آج کل ہے جو دل افگاری کبھی پہلے نہ تھی

یوں تو جھیلیں ہیں دل بیمار نے راتیں بہت
آج جیسی رات ہے بھاری کبھی پہلے نہ تھی

چکھ چکا ہوں یوں تو میں کتنے ہی بوسوں کی مٹھاس
لیکن اب ہے جو شکر باری کبھی پہلے نہ تھی

سرخوشوں نے یوں تو اکثر ہوش اڑائے ہیں مرے
پر جو اب ہے بے خودی طاری کبھی پہلے نہ تھی

ہو چکا ہوں یوں تو اکثر بستۂ زلف بتاں
اس قیامت کی گرفتاری کبھی پہلے نہ تھی

پڑ چکا ہوں بارہا بیمار اس سے قبل بھی
لیکن اس شدت کی بیماری کبھی پہلے نہ تھی

جوش نے جب تک نہ دیکھا تھا تجھے بنت حسن
ایسی مکھڑے کی پرستاری کبھی پہلے نہ تھی

۱۳۔۱۲۔۷۶ء

اس مرتبہ جوش صاحب دسمبر کے ختم تک کراچی میں رہے پھر اسلام آباد روانہ ہوگئے۔

maablib.org

۱۹۷۷ء کے واقعات

دوسرے سال یعنی جنوری ۱۹۷۷ء میں ، میں ہندوستان چلا گیا وہاں سے تین مہینے کے بعد لوٹا ۔ اس کے بعد پانچ جولائی کو بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہو گئی اور جنرل ضیاء الحق صاحب نے اقتدار سنبھال لیا مگر اس انقلاب سے جوش صاحب کی ملازمت متاثر نہیں ہوئی ۔ البتہ ان کا کراچی آنا جانا بہت کم ہو گیا ۔ اس مدت میں میری ملازمت کی ذمہ داریاں بھی اس قدر بڑھ گئیں کہ کئی کئی ہفتے جوش صاحب سے فون پر بھی بات نہ ہوتی تھی مگر ان سب باتوں کے باوجود جوش صاحب جب بھی کراچی آتے کراچی کی تمام رونقیں لوٹ آتیں اور اس مدت کے دوران میں جوش صاحب غم جاناں اور غم روزگار بھلا کر تمام دوستوں اور احباب سے ملتے رہتے ۔

مسعود علی خاں کا انتقال:

ایک مرتبہ جب جوش صاحب نومبر ۱۹۷۷ء میں کراچی تشریف لائے تو سیدھے میرے گھر آئے ان دنوں میں اپنی زندگی کے انتہائی المناک سانحہ سے دوچار تھا ۔ میرا نوجوان بیٹا مسعود علی خاں جو پانی کے جہاز پر چیف آفیسر تھا کولمبو میں جہاز پر حادثے کا شکار ہو کر اللہ کو پیارا ہو چکا تھا ۔ اس وقت ان کی بیگم اور دو معصوم چھوٹے چھوٹے بچے (ایک بچہ دو سال کا اور ایک بچی ایک سال کی) ان کے ساتھ جہاز ہی پر تھے ۔ وہ تو اتفاق سے میرے چچا زاد بھائی حمایت علی خاں ان دنوں کولمبو میں حبیب بینک کے وائس پریذیڈنٹ تھے وہ مسعود علی خاں کی

بیوی اور بچوں کو جہاز سے اتار کر اپنے گھر لے گئے اور ان سب کو کراچی پہنچایا۔ یہ تیسری اکتوبر کا واقعہ ہے۔ جوش صاحب جب میرے گھر آئے تو بہت دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔ پھر مجھے گلے لگا کر رونے لگے میں نے اس سے پہلے ان کو اس طرح روتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میرا دل بھی بھرا ہوا تھا میں بھی رونے لگا۔

جوش صاحب مسعود کو بہت چاہتے تھے۔ جوش صاحب جب بھی ہمارے گھر قیام فرماتے مسعود علی خاں ہی کے کمرے میں ٹھہرتے تھے اور مسعود ہمیشہ ان کے آنے پر دوسرے کمرے میں منتقل ہو جاتے تھے۔ غرض بہت دیر تک ہم دونوں اسی حالت میں بیٹھے روتے رہے پھر جوش صاحب نے فرمایا شام کو میرے گھر ضرور آئیے اور یہ کہہ کر رخصت ہو گئے۔

ایک دن جب میں جوش صاحب کے گھر گیا تو اپنے ساتھ ایک سوالنامہ لے گیا اور ہر سوال کے جواب میں جوش صاحب کے ارشادات لکھتا رہا۔

سوالنامہ:

۱۔ آپ کا پسندیدہ وصف؟

جوش صاحب نے فرمایا انسان دوستی۔

۲۔ آپ کی نظر میں امتیازی خصوصیت؟

تفکر۔

۳۔ آپ کا مسرت کا تصور؟

روئے زیبا۔

۴۔ وہ برائی جس سے آپ سب سے زیادہ نفرت کرتے ہیں؟

مردم آزاری اور عبادت۔

۵۔ آپ کا ذلت و پستی کا تصور؟

جو شخص وقتی آسائش پر اپنے اصول کو قربان کر دے۔

۶۔ آپ کا پسندیدہ مشغلہ؟

شعر، شراب، شباب۔

۷۔ آپ کے محبوب شاعر؟

اردو میں نظیر اکبر آبادی۔ فارسی میں حافظ۔ ہندی میں کبیر۔

۸۔ آپ کے محبوب نثر نگار؟

محمد حسین آزاد اور ابوالکلام آزاد۔

۹۔ آپ کے ہیرو؟

یہ بہت مشکل سوال ہے۔

۱۰۔ آپ کا پسندیدہ رنگ؟

سانولا سلونا۔

۱۱۔ آپ کی پسندیدہ غذا؟

کباب

۱۲۔ آپ کے پسندیدہ نام؟

ج ۔۔ پن کا سوال ہے۔

اختر حسن صاحب کی کراچی آمد:

چوتھی دسمبر ۱۹۷۰ء کی بات ہے کہ میری بڑی بہن ریاست خانم اور بہنوئی جناب اختر حسن صاحب حیدرآباد دکن سے کراچی تشریف لائے۔ اس زمانے میں جوش صاحب بھی کراچی میں مقیم تھے جب اختر بھائی کو معلوم ہوا کہ جوش صاحب کراچی میں ہیں تو انھوں نے جوش صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ میں اپنی بہن اور اختر بھائی کو لے کر چھٹی دسمبر کو شام کے وقت جوش صاحب کے مکان پر گیا۔ جوش صاحب اختر حسن صاحب سے خوب واقف تھے مل کر بے حد خوش ہوئے۔ قارئین کی واقفیت کے لیے مناسب ہو گا کہ میں تھوڑا سا اختر حسن صاحب کا تعارف کروا دوں۔

اختر حسن صاحب پاکستان کے ادبی حلقوں میں زیادہ معروف نہیں ہیں مگر ہندوستان میں بالخصوص حیدرآباد دکن اور بمبئی میں ان کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ مولانا حسرت موہانی کے بھائی اکبر حسن کی صاحبزادے ہیں۔ حیدرآباد دکن میں انھوں نے

عثمانیہ یونیورسٹی سے ایم اے کیا پھر کالج میں اردو کے استاد ہوگئے۔ جب قاضی عبدالغفار صاحب حیدرآباد کی حکومت ترک کر کے دلی چلے گئے تو اختر حسن صاحب کو اپنا اخبار روزنامہ "پیام" دے گئے۔

قاضی عبدالغفار صاحب کے زمانے میں اخبار کے سرورق پر یہ شعر لکھا جاتا تھا۔

بہ آں گروہ کہ از ساغر وفا مستند
ثنا "پیام" رسانید ہر کجا ہستند

اختر حسن صاحب نے جب ادارت کے فرائض سنبھالے تو یہ شعر بدل کر دوسرا شعر لکھ دیا۔

عشق کے دردمند کا طرز کلام اور ہے
ان کا پیام اور تھا میرا پیام اور ہے

پھر وہ آندھرا پردیش کی مجلس قانون ساز کے رکن منتخب ہوگئے۔ بعد میں ایک زمانے تک بمبئی میں اردو بلٹز کے ایڈیٹر رہے۔ آج کل آندھرا پردیش اردو اکیڈیمی کے سیکرٹری ہیں۔ حیدرآباد میں ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں سے ہیں اور مخدوم محی الدین کے ساتھی رہے۔

اختر حسن صاحب کے متعلق حیدرآباد دکن کی انتہائی خوبصورت اور معروف ادبی شخصیت محترمہ اندرا دیوی دھن راج گیر لکھتی ہیں۔

"اختر حسن کا شمار ان اولین ترقی پسند دانشوروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ہمارے ملک میں ترقی پسندی کی داغ بیل ڈالی اور اسے پروان چڑھایا اپنے اصول اور نظریوں کی خاطر انھوں نے دنیوی جاہ و مرتبت کو ٹھکرا دیا اور قید و بند کی صعوبتیں بھی بڑی خندہ جبینی کے ساتھ برداشت کیں۔ ترقی پسند نظریہ حیات پر آج بھی ان کا ایمان اٹل ہے اور اس صدی کے چوتھے دہے کے اوائل سے آج تک ان کی تمام نگارشات میں اس کا عکس جھلکتا ہے۔ فیض احمد فیض، مخدوم محی الدین، سردار جعفری اور کرشن چندر، اختر حسن کے ساتھی اور ہم عصر ہیں۔ روزنامہ پیام اور اردو بلٹز (ہفت روزہ) کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اختر حسن نے اردو زبان اور صحافت کی جو خدمات انجام دی ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جاسکتا"۔

اختر حسن صاحب شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ انھوں نے غالب کی مشہور فارسی مثنوی "چراغ دیر" کا منظوم اردو ترجمہ کیا ہے۔

اس روز جب ہم لوگ جوش صاحب سے ملنے گئے تو اختر حسن صاحب نے "چراغ دیر" کے منظوم ترجمے کا ایک نسخہ جوش صاحب کو دیا اور یہ درخواست کی کہ وہ اس پر اپنی رائے بھی تحریر فرما دیں۔ جوش صاحب نے وعدہ کر لیا اور کتاب رکھ لی۔ اس رات ہم لوگ دیر تک جوش صاحب کے ساتھ بیٹھے رہے اور مختلف ادبی اور علمی موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ جوش صاحب حیدر آباد کے متعلق پوچھتے رہے اس طرح تقریباً رات کے گیارہ بجے ہم لوگ اپنے گھر آ گئے۔ دوسرے دن بھی ہم لوگ جوش صاحب کے گھر گئے جوش صاحب نے چراغ دیر کے ترجمے کی بہت تعریف کی اور اس کتاب پر اپنی رائے لکھ کر اختر صاحب کو دے دی۔ انھوں نے لکھا کہ "اختر حسن صاحب نے اس قدر مہارت سے غالب کی مثنوی "چراغ دیر" کا اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے کہ ترجمے پر اصل کا گمان ہوتا ہے"۔

دسویں دسمبر ۱۹۷۷ء کو جناب شبر نقوی صاحب نے جوش صاحب کی دعوت ایر پورٹ پر ہوٹل مڈوے ہاؤس (Midway House) میں کی تھی مجھے اور اختر بھائی کو بھی مدعو کر لیا۔ اس روز ہم لوگ غروب آفتاب سے پہلے "مڈوے ہاؤس" پہنچ گئے۔ وہاں کے جنرل منیجر کرار صاحب نے ناؤ نوش کا بہت اچھا انتظام کر رکھا تھا۔ رات دیر تک بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ جوش صاحب چونکہ صبح ساڑھے آٹھ بجے کی پرواز سے لاہور جانے والے تھے اس لیے وہ تو ہوٹل ہی میں سو گئے مگر میں اور اختر بھائی اپنے گھر آ گئے۔ جوش صاحب نے چلتے وقت تاکید کر دی تھی کہ صبح چھ بجے ضرور آ جانا اس لیے میں اور اختر بھائی صبح چھ بجے دوبارہ مڈوے ہاؤس پہنچ گئے۔ جوش صاحب باہر چمن میں ٹہل رہے تھے۔ ہم سب نے ساتھ ہی ناشتہ کیا پھر جوش صاحب کو جہاز پر پہنچا کر ہم لوگ اپنے گھر آ گئے۔

maablib.org

۱۹۷۸ء کے واقعات

اس کے بعد چھٹی مارچ ۱۹۷۸ء کو جوش صاحب کا ٹیلی فون اسلام آباد سے آیا کہ وہ آٹھویں مارچ کو بدھ کے دن ہوائی جہاز سے کراچی آ رہے ہیں۔ میں وقت مقررہ پر ایرپورٹ پہنچ گیا مگر جہاز کی آمد کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ میں وہاں ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا پھر مجھے معلوم ہوا کہ ابھی جہاز اسلام آباد ہی سے روانہ نہیں ہوا ہے۔ میں مجبور ہو کر گھر چلا آیا۔ دوپہر کا کھانا کھا کر لیٹا ہی تھا کہ جوش صاحب ایرپورٹ سے سیدھے میرے گھر چلے آئے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "بھئی خوب، مجھ سے وعدہ کر لیا مجھے ایرپورٹ پر لینے آئیں گے اور گھر میں پڑے سو رہے ہو۔" میں نے کہا آپ کا جہاز صبح آٹھ بجے کراچی پہنچنے والا تھا میں ساڑھے سات بجے پہنچ گیا اور جب دس بجے مجھے معلوم ہوا کہ ابھی جہاز اسلام آباد ہی سے روانہ نہیں ہوا تو میں کیا کرتا؟

جوش صاحب نے فرمایا۔ "تو پھر بھاگ کھڑے ہوئے؟"

میں نے کہا۔ "جی ہاں۔ پھر میں گھر آ گیا"۔

کہنے لگے۔ "بہت خوب! ڈرنک کا کیا بندوبست کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "اس دفعہ آپ یوسف جمال صاحب کے مہمان ہیں"۔

فرمایا۔ "شام کو کب آؤ گے"۔

میں نے کہا۔ "ساڑھے پانچ بجے"۔

موٹر سے اترے نہیں، یہ کہہ کر۔ "شام کو ضرور آنا" رخصت ہو گئے۔

اسی شام کو میں وقت مقررہ پر جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب غسل خانے میں تھے اور تخت پر ان کی ڈائری والا رجسٹر رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ اتفاق سے میری نظر ایک ورق پر پڑی۔ لکھا تھا ۵۔ ۳۔ ۸۰۔ بیداری ۴ بجے صبح اسلام آباد۔

"رات کو ایک نہایت مہمل اور نادانوں کا خوش کرنے والا خواب دیکھا کہ مجھ کو ہندوستان کا پرائم منسٹر بنا دیا گیا ہے۔ اگر میرے دماغ کے کسی گوشہ پست میں چھٹ بھیا پن دبکا نہ بیٹھا ہوتا تو میں یہ ذلیل خواب کبھی نہ دیکھتا۔ حیرت اور شرم کی بات ہے کہ جو نوع بشر کو منصب الوہیت حاصل ہونے کا خواب دکھا رہا ہو اسے پرائم منسٹری کے غار میں جھونک دیا جائے"۔

"تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو"

اسی رجسٹر میں یہ تحریر بھی لکھی ہوئی ہے۔

"دشمنی" دماغ کا سرطان ہے۔

"دشنام گوئی" نطق کا استفراغ (قے کرنا)

"حملہ آوری" اعصاب کا اسہال۔

"غیبت" عقل کے معدے کی کھٹی ڈکاریں۔

"اس لیے پیغمبران عقل نے بدترین دشمن سے بھی عداوت پالنے کو مطلق حرام ٹھہرایا ہے"۔

اتنے میں جوش صاحب تشریف لے آئے کہنے لگے یہ کیا لکھ رہے ہو؟ میں نے کہا آپ کے مقالات زریں نقل کر رہا ہوں۔

جوش صاحب کی خواہش کہ میں ان پر کتاب لکھوں:

جوش صاحب نے فرمایا "خورشید علی خاں مجھے اس بات سے بے حد خوشی ہوتی ہے کہ آپ میری فکر کے ہر گوشے سے واقفیت حاصل کرنے کی جستجو میں رہتے ہیں۔ میں نے کہا جوش صاحب یہ بتائیے کہ کیا مجھے آپ کی شخصیت اور فکر کے متعلق کوئی کتاب لکھنے کا حق حاصل ہے؟ جوش صاحب نے فرمایا۔ میرے خیال میں اس وقت میرے جاننے والوں میں صرف آپ ہی مجھ پر کچھ لکھنے کا حق رکھتے ہیں اور اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو بہت ظلم ہو گا۔

اس کے بعد راغب صاحب اور سلامت علی خاں صاحب بھی آ گئے اور موضوع بدل گیا۔
رات میں جب میں رخصت ہونے لگا تو جوش صاحب نے فرمایا اگر ہفتے کو فرصت ہو تو صبح نو بجے تک آ جائیے یوسفی صاحب سے ملنے جائیں گے۔

مشتاق احمد یوسفی صاحب سے ملاقات:

میں ۱۱ مارچ ہفتے کے دن نو بجے جوش صاحب کے گھر پہنچ گیا۔ جوش صاحب تیار بیٹھے تھے۔ ہم دونوں مشتاق احمد یوسفی صاحب سے ملنے ان کے دفتر روانہ ہو گئے۔ یوسفی صاحب ان دنوں بینکنگ کونسل کے چیرمین تھے۔ (Chairman Banking Council) اور ان کا آفس حبیب پلازہ میں آٹھویں منزل پر تھا۔ یوسفی صاحب بہت محبت اور احترام سے ہم لوگوں سے ملے۔ جوش صاحب نے کسی کے لیے بینک کی ملازمت کے واسطے سفارش کی۔ یوسفی صاحب خاص ادا سے زیرِ لب مسکراتے رہے اور جوش صاحب سے اس شخصیت کے متعلق معلومات بھی حاصل کرتے رہے۔ پھر فرمایا بینک کی نوکری کے لیے ایک امتحان ہوتا ہے اگر وہ اس میں پاس ہو گئیں تو پھر ان کے لیے تقرر آسان ہو گا۔ اس کے بعد چائے آ گئی ہم لوگ چائے پیتے رہے۔ یوسفی صاحب ان دنوں غالباً "آبِ گم" لکھ رہے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے دریافت فرمایا کہ اردو میں Scare crow کے لیے کیا لفظ ہے۔ جوش صاحب نے فرمایا ہم تو اسے "بیجا" کہتے ہیں۔ اس دن یوسفی صاحب سے مختلف موضوعات پر بہت دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ انھوں نے میرا پتا لکھ لیا اور فرمایا کہ "آپ کو کسی وقت اپنے گھر پر زحمت دوں گا"۔ لیکن اس کے بعد پاکستان میں سیاسی تبدیلیوں کے باعث وہ لندن چلے گئے اور وہاں آغا حسن عابدی صاحب نے ان کو اپنے ساتھ بی سی سی آئی میں شریکِ کار کر لیا۔

یوسفی صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ روشن علی بھیم جی صاحب کے گھر گئے۔ وہاں بھیم جی صاحب کی بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی۔ معلوم ہوا کہ بھیم جی کہیں باہر گئے ہوئے ہیں۔ وہاں تھوڑی دیر بیٹھ کر گھر آ گئے۔

حکیم سید بندگی شاہ صاحب:

دوسرے دن جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ان کے گھٹنوں میں سخت درد رہتا ہے اگر کوئی اچھے ڈاکٹر یا حکیم ہوں تو ان سے مشورہ کیا جائے۔ میں نے کہا ڈاکٹر قاضی سے بڑھ کر اس وقت کون اچھا ڈاکٹر ہو گا۔ ان سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ وہ سجاد صاحب کی بیگم کے قریبی عزیز بھی ہیں۔ غالباً ماموں ہیں۔ جوش صاحب نے فرمایا کہ ان سے مشورہ ہو چکا ہے مگر ڈاکٹر لوگ اس مرض کے متعلق اپنے طریقہ علاج سے کچھ زیادہ پر امید نہیں ہیں۔ میں نے کہا تو چلیے یہاں سے قریب ہی گلبرگ کی چورنگی پر ایک اچھے طبیب کا مطب ہے وہ میرے دوست بھی ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں گو ان کا رجحان زیادہ تر حمد اور نعت گوئی کی طرف ہے۔ ہم لوگ تو ان کو حکیم بندگی شاہ صاحب کہتے ہیں مگر ان کا پورا نام سید بندگی شاہ محمد برہان الدین جا نظامی ہے۔ ہر سال دھوم دھام سے ربیع الاول کا جشن مناتے ہیں اور سیکڑوں لوگوں میں لنگر تقسیم کرتے ہیں۔ میں بھی ایک مرتبہ اپنے محلے کے دوستوں کے ساتھ ان کی محفل نعت میں شریک ہو چکا ہوں۔ جوش صاحب نے یہ تفصیلی تعارف سن کر فرمایا۔ تو چلیے آج آپ کے ساتھ یہ تفنن بھی سہی۔ چنانچہ میں اور جوش صاحب صبح دس بجے حکیم صاحب کے مطب پہنچے۔ حکیم صاحب نے جب دیکھا کہ جوش صاحب ان کے مطب میں آئے ہیں تو ایک مریض کو جلدی سے فارغ کر کے جوش صاحب کا بڑے تپاک سے استقبال کیا اور اپنے قریب کرسی پر بٹھا لیا اور خیریت دریافت فرمائی میں نے آنے کا مدعا بیان کیا۔ حکیم صاحب نے پہلے تو نبض دیکھی پھر گھٹنوں کا معائنہ فرمایا پھر جوش صاحب سے کچھ سوالات کیے۔ آخر میں فرمایا کہ میں دوا تو دے دوں گا جس سے انشاء اللہ تعالیٰ درد میں تو ضرور افاقہ ہو جائے گا مگر گٹھیا کے مرض کا مکمل علاج ابھی تک دریافت نہیں ہوا ہے۔ اس کے بعد حکیم صاحب نے کچھ سفوف اور ایک شیشی میں معجون دے کر فرمایا کہ یہ ایک مہینے کی دوائیں ہیں اگر ان سے افاقہ ہو گیا تو پھر اور دوائیں دوں گا۔ جوش صاحب نے ان کا شکریہ ادا کیا اور جب ہم لوگوں نے رخصت ہونے کے لیے اجازت چاہی تو حکیم صاحب نے چائے اور پان پیش فرمایا۔ پھر وہ جوش صاحب کی شاعری کی تعریف کرنے لگے تو میں نے جوش صاحب سے کہا کہ حکیم صاحب بھی شعر کہتے ہیں تو جوش صاحب نے ازراہ تکلف و دل داری حکیم صاحب سے شعر سنانے کی فرمائش کر دی اور جب حکیم

صاحب نے اپنا عارفانہ کلام پیش کیا تو جوش صاحب نے ایک نعت سننے کے بعد نہایت اخلاق سے فرمایا کہ حکیم صاحب آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی مگر آپ اس وقت مطب میں ہیں اور یہ وقت آپ کی مشغولیت کا ہے۔ ہم کسی وقت آپ کے دولت خانے پر حاضر ہو کر آپ کے کلام سے مستفید ہوں گے۔ پھر جب ہم لوگ چلنے لگے تو حکیم صاحب نے اپنی نعتوں اور حمد کا مجموعہ جوش صاحب کی خدمت میں پیش کر کے ان کی رائے اپنے کلام کے متعلق چاہی۔ جوش صاحب نے فرمایا۔ میں اس کلام کا مطالعہ کر کے ضرور اپنی رائے سے آپ کو مطلع کروں گا۔ اس کے بعد دوائیں لے کر ہم لوگ گھر آ گئے۔ اس کے دوسرے دن جوش صاحب نے حکیم صاحب کے مجموعہ کلام کے متعلق اپنی رائے لکھ کر مجھے دے دی۔ میں نے اس خط کی فوٹو کاپی خود رکھ لی اور اصل خط حکیم صاحب کو دے آیا۔ جوش صاحب نے لکھا تھا۔

جوش ملیح آبادی — فون نمبر ۲۲۲۲

حضرۃ سید بندگی شاہ محمد برہان الدین صاحب بنا نظامی کا "مجموعۂ کلام" پڑھ کر مجھے بے حد خوشی ہوئی۔

حضرۃ ایسے مقدس بزرگ ہیں کہ ان کے حسن خلق کو دیکھ کر اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اس دور میں حضرت بانی اسلام کے "خلق عظیم" کا جیتا جاگتا مجسمہ ہیں۔ اب رہی ان کی شاعری، سو اس کے باب میں اگر میں کچھ عرض کروں تو چھوٹا منہ بڑی بات ہو گی۔ ملائکہ مقربین سے پوچھیے کہ ان کی حمد و نعت کس پائے کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حوران بہشت ان کا کلام رسالت و الوہیت کے بربط پر گائیں گی اور اعیان فردوس کو وجد میں لائیں گے۔

جوش

۱۹-۳-۰۷۸

کراچی

میں نے وہ خط جا کر حکیم صاحب کو دے دیا۔ وہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اب یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ حکیم صاحب اس مکتوب کا بین السطور مفہوم بھی پڑھ سکے یا نہیں۔ مگر خیر بقول غالب؎

نہیں گر سرو برگ ادراک معنی — تماشائے نیرنگ صورت سلامت

یہ خط دے کر میں تو گھر آ گیا مگر اس کے بعد پھر کبھی حکیم صاحب سے ملاقات نہیں ہوئی اور نہ

جوش صاحب ان سے ملے کیونکہ ان کی دوا سے کوئی افاقہ نہیں ہوا۔

کراچی میں مزید چند روز کے قیام کے بعد جوش صاحب واپس اسلام آباد تشریف لے گئے۔

لاہور میں نفسیات پر سیمینار:

مئی ۱۹۸۰ء میں پنجاب یونیورسٹی نے "نفسیات" کے موضوع پر ایک سیمنار منعقد کیا تھا جس میں پاکستان کی تمام جامعات کے شعبہ نفسیات نے اپنے اپنے نمائندے بھیجے۔ جن میں اساتذہ، طلبہ اور طالبات شامل تھیں۔ کراچی یونیورسٹی کے جس گروپ نے حصہ لیا اس میں میرا نام بھی تھا۔ چنانچہ ہم لوگ تیسری مئی کو کراچی ایکسپریس سے لاہور کے لیے روانہ ہوئے۔ ہمارے گروپ کے اساتذہ میں جناب افضل امام، جناب غلام رسول کے علاوہ چند خواتین بھی تھیں۔ طلبہ میں میرے علاوہ جناب سید ساجد علی ساجد اور لیاقت علی خاں تھے۔ ہم لوگ دوسرے دن یعنی چوتھی مئی کو بارہ بجے لاہور کے اسٹیشن پر اترے۔ وہاں پنجاب یونیورسٹی کے نمائندے جناب میاں آفتاب احمد صاحب نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم لوگ جامعہ کے اقامت خانے نمبر ۱۵ میں ٹھہرائے گئے۔

یونیورسٹی اور اس کے اقامت خانوں کی عمارات لاہور شہر سے دور نہر کے قریب بہت خوبصورت اور سرسبز و شاداب مقام پر واقع ہیں۔

جمعہ ۵ مئی کو کانفرنس شروع ہوئی جس کا افتتاح اس وقت کے قائم مقام صدر جناب جسٹس انوارالحق نے کیا۔

جب میں اور ساجد علی ساجد صاحب کانفرنس ہال میں داخل ہو رہے تھے تو ایک نسوانی آواز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا۔ "خورشید صاحب! آداب" میں نے پلٹ کر دیکھا تو سمن مجھ سے مخاطب تھیں۔ میں نے حیرت انگیز مسرت سے ان کے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ اس وقت آپ یہاں کہاں؟ سمن نے کہا جناب آپ ہمارے شہر بلکہ ہماری جامعہ میں آئیں اور ہم آپ کے استقبال کے لیے حاضر نہ ہوں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں نے ساجد صاحب سے ان کا تعارف کروایا۔ "یہ سمن ہیں جن کی شاعرانہ صلاحیت اور عظمت کے حضرت جوش بھی مداح ہیں۔ اسی جامعہ سے نفسیات میں ایم اے کیا ہے۔ پھر ہم تینوں ایک

ہی جگہ بیٹھ گئے۔

جسٹس انوار الحق صاحب نے خطبہ صدارت میں علم نفسیات کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا کہ پاکستان کے نفسیات دانوں کو اسلامی نفسیات پر بھی تحقیق کرنا چاہیے۔ خطبہ صدارت کے اختتام پر جب تمام شرکائے کانفرنس چائے پینے کے لیے ایک ہال میں جمع ہوئے تو وہاں بحث چھڑ گئی کہ کیا نفسیات کا بھی کوئی مذہب ہو سکتا ہے؟ یہ جو جناب صدر نے اسلامی نفسیات پر تحقیق کی طرف توجہ مبذول کروائی ہے اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ سائنسی علوم کب سے کسی مذہب کے تابع ہونے لگے۔ سائنٹفک فکر کی تو خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ حقیقت کی تلاش میں پہلے سے قائم شدہ عقائد کی پابند نہیں ہوتی۔ یہ تو ممکن ہے کہ مذاہب نے اپنی تبلیغ و اشاعت کے لیے نفسیاتی عوامل سے استفادہ کیا ہو لیکن یہ کہنا کہ نفسیات کا کوئی مذہب ہو کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ علم نفسیات دراصل ان تمام عوامل اور محرکات سے بحث کرتا ہے جو انسانی رویوں کا تعین کرتے ہیں۔ اس میں مذہبی عقائد بھی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اس بحث میں حصہ لیتے ہوئے عرض کیا کہ غالباً صدر صاحب کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظریات اور اقدار حیات کو انسانی عمل کی قوت محرکہ بنانے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں۔ ان پر تحقیق نفسیات کے اصولوں کی روشنی میں کی جانی چاہیے۔ یہ کانفرنس تین دن جاری رہی اور نفسیات کے مختلف موضوعات پر بہت اچھے تحقیقی مقالے پڑھے گئے۔ اس کے علاوہ مشاعرہ بھی ہوا اور موسیقی کی محفل بھی منعقد ہوئی۔ دعوتیں بھی ہوئیں اور پنجاب کے لوگوں نے اپنی روایتی مہمان نوازی سے ہر شخص کا دل موہ لیا۔ آخر میں پکنک بھی ہوئی جہانگیر اور نور جہاں کے مقبروں کی سیر بھی۔ اس تمام مدت کے دوران سمن سے مختلف موضوعات پر دلچسپ گفتگو بھی رہی۔ ان میں ایک بہت اہم موضوع خود سمن اور جوش صاحب کی محبت کا بھی تھا۔ جس پر ہم دونوں نے معروضی انداز میں گفتگو کی۔ سمن کا کہنا یہ تھا کہ ان کو جوش صاحب کی شخصیت کا فکری اور ادبی پہلو بہت پسند ہے ورنہ ان کی اور جوش صاحب کی عمروں میں جو فرق ہے اس میں کسی جنسی جذبے کے پیدا ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میں نے کہا دیکھیے جناب آپ نفسیات کی طالبہ ہیں اور میں بھی اس وقت ایک

نفسیات کے طالب علم کی حیثیت سے گفتگو کر رہا ہوں۔ یہ بتلائیے کہ جوش صاحب سے آپ کی دلچسپی میں خود آپ کو اپنی ذات سے دلچسپی کا کتنا حصہ ہے؟ آپ جانتی ہیں کہ جوش صاحب اس وقت اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور اس اعتبار سے تمام برصغیر میں مشہور بھی ہیں۔ اب اگر آپ ان کی شاعری کا موضوع بن جائیں تو آپ کو جو شہرت ملے گی یا مل رہی ہے اور ان کی شاعری میں جو آپ کی تعریفوں کے گیت گائے جا رہے ہیں کیا وہ آپ کی انا کے لیے بے پناہ مسرت کا باعث نہیں ہیں؟

سمن کہنے لگیں کہ یہ آپ بالکل درست فرما رہے ہیں دراصل انا کی پرستش تو ہر انسان میں بقدر پیمانۂ تخیل ضرور ہوتی ہے اور اس لیے ایک عظیم شاعر سے اپنی تعریفیں سن کر جو مسرت حاصل ہوتی ہے اس کا سرور ناقابل بیان ہے اور غالباً قدرت نے یہ جذبہ عورت میں کچھ زیادہ ہی ودیعت کیا ہے کہ وہ اپنی تعریف سن کر خوش ہوتی ہے۔ عورت چاہتی ہے کہ وہ مرد کی توجہ کا مرکز بنی رہے اس کے بناؤ سنگھار کی نفسیات میں بھی یہی جذبہ قوت محرکہ کے طور پر کام کرتا دکھائی دیتا ہے اور اکثر موافق حالات میں یہ جذبہ پسندیدگی محبت میں بھی تبدیل ہو سکتا ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ اس میں جنسی خواہش بھی شریک ہو۔ حالانکہ تحت الشعور میں جنسی جذبے کی موجودگی سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے کہا کہ جن جذبات کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے یعنی پسندیدگی کے وہ جذبات جو کسی کی تعریف سے پیدا ہوتے ہیں ان میں جنس کی بہ نسبت دراصل ہماری مشرقی سوسائٹی میں عورت کی محرومیوں کا زیادہ دخل ہے۔ ہمارے معاشرے میں عورت کسی مرد کی نسبت زیادہ محرومیوں کا شکار ہے اور اس کا معاشرتی درجہ بھی مرد کے مقابلے میں کم ہے جس کی وجہ سے اس میں احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے اور اس لیے جب کوئی شخص اس کی تعریف کرتا ہے تو اس میں ایک برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے اور جو شخص اس میں یہ احساس پیدا کر دے وہ اس کو پسند کرنے لگتی ہے۔ سمن نے کہا کہ آپ نے بہت صحیح بات کہی ہے۔ اس لیے میری جوش صاحب کے ساتھ دلچسپی میں چونکہ کوئی جنسی جذبات کی رنگینی شریک نہیں ہے اس لیے ہماری محبت کو عشق نہیں کہا جا سکتا مگر اس کو آپ بالکلیہ خود غرضی اور انا پرستی بھی نہیں کہہ سکتے گو اس کی ابتدا انا پرستی ہی سے ہو سکتی ہے۔

میں نے کہا کہ پھر اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر آپ کو کوئی لڑکا پسند آ جائے گا تو آپ اس سے شادی کر لیں گی۔ سمن نے کہا کہ جب وہ وقت آئے گا اور کوئی لڑکا میرے معیار پر پورا اترے گا تو شادی بھی کر لوں گی۔ میں نے کہا کہ آپ نے کبھی اس بات پر بھی غور کیا کہ آپ کی شادی سے جوش صاحب پر کیا اثر ہو گا؟ کہنے لگیں کہ میں نے جب اس مسئلے پر جذبات سے ہٹ کر سوچا تو میری عقل نے مجھ سے کہا کہ کیا تم کو حضرت جوش کا یہ قول معلوم نہیں کہ:

در ہیچ مقام نہ گزارد پہ درنگے   از بوئے ہوئے بروا زرنگ برنگے

جب تم نہ ہو گی تو کوئی دوسری لڑکی شاعر جوشؔ کی شاعری کا موضوع بن جائے گی۔ جوش صاحب نے "یادوں کی برات" میں جہاں انیس معاشقوں کا ذکر کیا ہے ایک بیسواں عشق اور شامل ہو جائے گا اور جہاں تک میرا تعلق ہے یہ تو آپ جانتے ہیں کہ شادی ہر شخص کی ایک حیاتیاتی ضرورت بھی ہے اور جیون ساتھی کے انتخاب میں بہت سی باتوں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے جس میں عمر کی ہم آہنگی بھی ایک اہم پہلو ہے اس کے علاوہ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جوش صاحب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت معقول اور انصاف پسند انسان بھی ہیں۔ جو انسانی جذبات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں جب ان کو میری شادی کے متعلق معلوم ہو گا تو چند دن بے چین رہنے کے بعد وہ خود کو اس بات پر قائل کر لیں گے کہ میں نے کوئی نامعقول حرکت نہیں کی اور اگر ان کو مجھ سے سچی محبت ہے تو انھیں میری خوشی سے خوش ہونا چاہیے مگر یہ تمام باتیں ابھی قبل از وقت ہیں کیونکہ ابھی مجھے کوئی ایسا لڑکا نظر نہیں آتا جو میرا جیون ساتھی بن سکے۔ میں نے کہا آپ نے جوش صاحب کی تازہ نظم "شادی مرگ" سنی ہے؟

سمن نے جواب دیا جی نہیں۔ اس میں کیا ہے؟

میں نے کہا جوش صاحب انتہائی حساس انسان ہیں وہ یہ خوب سمجھتے ہیں کہ آپ کا اور ان کا کوئی جوڑ نہیں ہو سکتا۔ آپ عمر کی جس منزل میں ہیں اس میں ایک نہ ایک دن آپ کی شادی بھی ہو جائے گی اور اگر وہ واقعہ جوش صاحب کی زندگی میں ظہور پذیر ہوا تو شاعر جوش پر کیا بیتے گی وہ انھوں نے اس نظم میں بیان کر دیا ہے۔ سمن نے دریافت کیا کہ کیا وہ نظم آپ کو یاد ہے تو میں نے کہا اتفاق سے وہ نظم میں نے اپنی ڈائری میں لکھ لی ہے۔ اگر آپ کہیں تو

آپ کو سناؤں؟ سمن کہنے لگیں ضرور سنائیے بلکہ مجھے لکھ کر دے دیجیے۔ میں نے ایک کاغذ پر لکھ کر وہ نظم سمن کو دے دی۔ نظم یہ ہے:

"شادی مرگ"

راہِ نامعلوم سے اک اجنبی کل آئے گا
اور تجھے اے جان مجھ سے چھین کر لے جائے گا
جب نئی انگنائی میں پازیب جھنکائے گی تو
ہائے کیا کیا اپنے سناٹے پہ رونا آئے گا
جب ترے چہرے پہ رنگ اجنبیت پاؤں گا
تیرا دورِ التفات آنکھوں تلے پھر جائے گا
رس کی بوندیں تجھ پہ ٹپکائے گا جب ابرِ حیات
اس جبیں پر موت کا ٹھنڈا پسینہ آئے گا
جب کسی ناآشنا گوشے میں چھپ جائے گی تو
میری تنہا زندگی کا دل بہت گھبرائے گا
جب نسیمِ صبحِ نو تجھ کو جگانے آئے گی
تیرا دکھیا جوش اندھی قبر میں سو جائے گا

سمن یہ نظم سن کر خاموش ہو گئیں۔ تھوڑی دیر میں، میں نے دیکھا کہ آنکھوں کے ڈورے سرخ ہو گئے اور پلکوں کا ابر موتی برسانے لگا۔ میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ تھوڑی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد جب میں نے محسوس کیا کہ اب ان کی حالت سنبھل گئی ہے تو میں نے کہا اس کانفرنس کے اختتام پر میں اسلام آباد جاؤں گا اور جوش صاحب کے گھر قیام کروں گا اگر آپ کا کوئی پیغام ہو تو ان کو پہنچا دوں۔ سمن بولیں کہ اگر وہ میرے متعلق دریافت فرمائیں تو کہہ دیجیے گا کہ خیریت سے ہے اور بس۔

اس واقعہ کے چند سال بعد ہی سمن کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ خوشحال زندگی گزار رہی ہیں۔ اب تو ہاشمی صاحب کی سب بچیوں کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں اور

وہ اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ مگر افسوس کہ جوش صاحب اس دنیا میں نہیں رہے۔ (خیر: یہ سب تو بعد کی باتیں ہیں۔)

اسلام آباد کا سفر:

لاہور میں نفسیات پر یہ دلچسپ کانفرنس آٹھویں مئی ۱۹۷۸ء کو ختم ہو گئی اور میں نویں مئی کو ریل کار سے پنڈی روانہ ہو گیا۔ چلنے سے پہلے چونکہ میں نے جوش صاحب کو اپنے آنے کی اطلاع کر دی تھی اس لیے وہ اسٹیشن پر تشریف لے آئے اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔

گھر پہنچ کر جب ہم لوگ اطمینان سے بیٹھ گئے تو جوش صاحب نے لاہور کانفرنس کی تفصیل دریافت فرمائی۔ میں نے وہ تمام واقعات جو اس کانفرنس میں پیش آئے ان کو بتائے اور جس قدر مجھ سے ممکن ہو سکا ان مختلف مضامین کا تفصیل کے ساتھ ذکر کیا۔ جن کے متعلق کانفرنس میں مقالے پڑھے گئے تھے جوش صاحب نے فرمایا کہ علم نفسیات پر جس قدر تحقیق ہوگی اور نفس انسانی کی گتھیاں سلجھتی جائیں گی اسی قدر باطل توہمات مٹتے جائیں گے اور انسان جس قدر خود آگاہ ہوتا جائے گا خارجی کائنات پر اس کا تصرف بڑھتا جائے گا۔ میں نے کہا کہ اس کانفرنس کی ایک خاص بات یہ تھی کہ تمام محققین کا نقطہ نظر معروضی اور سائنٹفک تھا۔ جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو جوش صاحب نے دریافت فرمایا کہ لاہور میں کن کن لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ میں سمجھ گیا کہ جوش صاحب کا اشارہ کس کی طرف ہے۔ بقول غالب:

دل و جانم بہ تو مشغول و نظر در چپ و راست
تا نہ دانند رقیباں کہ تو منظور منی

میں نے عرض کیا کہ پنجاب یونیورسٹی کی طالبات میں سمن بھی تھیں ان سے بھی ملاقات ہوئی اور بہت سے نفسیاتی مسائل پر دلچسپ گفتگو بھی ہوئی مگر جوش صاحب سمن کا نام سن کر خاموش ہو گئے اور بات کو وہیں ختم کر دیا پھر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اسلام آباد آنے کی کوئی خاص وجہ تو نہیں؟ میں نے عرض کیا کہ میرے ایک عزیز کا کچھ کام ہے۔ ان کی درخواست سیکرٹری داخلہ جناب روئیداد خاں صاحب کے پاس ہے اگر آپ ان سے سفارش فرما دیں تو شاید کام بن جائے۔ جوش صاحب نے فرمایا کہ کل چل کر ان سے مل لیں گے۔

دوسرے دن جوش صاحب کے ساتھ روئیداد خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے بہت اخلاق اور احترام سے جوش صاحب کا استقبال کیا۔ چائے پیش کی۔ پھر آنے کا سبب دریافت فرمایا۔ جوش صاحب نے مدعا بیان کیا۔ انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ میں جوش صاحب کے ایک تعارفی خط کے ساتھ ایک اور درخواست ان کے دفتر میں دے دوں وہ کوشش کریں گے کہ کام بن جائے۔ ان کا شکریہ ادا کر کے ہم لوگ ان کے جوائنٹ سیکرٹری ضیاء حسین صاحب کے کمرے میں گئے وہاں ایک درخواست لکھ کر جوش صاحب کے خط کے ساتھ ان کو دے دی اور گھر آ گئے۔ میں اسی دن لوٹ جانا چاہتا تھا مگر جوش صاحب نے اصرار سے ایک دن اور روک لیا چنانچہ میں دوسرے دن کے ہوائی جہاز سے واپس لوٹا۔

اس کے بعد مئی ۸۰ ویں کو میں ایک ضروری کام سے دوبارہ اسلام آباد گیا۔ اس مرتبہ میں نے اپنی بہن کے گھر قیام کیا۔ وہاں سے میں نے جوش صاحب کو ٹیلی فون کیا تو ان کی پوتی نے بتایا کہ سو رہے ہیں۔ میں نے اپنی قیام گاہ کا ٹیلی فون نمبر اور پتا لکھوایا۔ شام پانچ بجے جوش صاحب اپنی گاڑی میں خود ہی تشریف لے آئے اور میں ان کے ساتھ ان کے گھر چلا گیا۔ اسلام آباد میں ویسے بھی شام کو بہت کم لوگ جوش صاحب کے گھر آتے تھے اور جب سے بھٹو صاحب کی حکومت ختم ہوئی تھی جوش صاحب کی تنہائیاں زیادہ ہونے لگی تھیں مگر اس شام جوش صاحب کے بھتیجے کلام خاں صاحب آئے تو اپنے ساتھ اپنے دو اور دوستوں کو بھی لے آئے۔ معلوم ہوا کہ وہ کسی کالج میں اردو کے استاد ہیں اور جوش صاحب کو بہت پسند کرتے ہیں۔ وہ صاحبان اپنے ساتھ اردو کے الفاظ اور جملوں کی ایک فہرست لائے تھے تاکہ جوش صاحب سے اصلاح لے سکیں۔ انھوں نے جوش صاحب کی اجازت سے دریافت کرنا شروع کر دیا۔

جوش صاحب یہ بتائیے کہ زبان کی "ز" پر زبر ہے یا پیش؟

جوش صاحب۔ فصیح زبر ہے ہم "زبان" کہیں گے۔

اب مہربانی فرما کر ان الفاظ کا صحیح تلفظ بتائیے۔ ان صاحب نے کہا۔ امر۔ ترس۔ رقم۔ چرس۔ غلط۔ شرف۔ عرق۔ غرض۔ ولد۔

جوش صاحب۔ ان تمام الفاظ میں پہلا اور دوسرا حرف متحرک ہے۔ شائع۔ ضائع۔ لاحق۔ مانع۔ ان الفاظ میں تیسرے حرف کے نیچے زیر ہے۔ افراط۔ اخراج۔ اقدام۔ ممکنات۔ ان

الفاظ میں پہلے حرف کے نیچے زیر ہے ۔ المیہ ۔ طربیہ ۔ نظریہ ۔ پہلے تینوں حروف متحرک ہیں مگر غلطی سے دوسرا حرف ساکن کر دیا جاتا ہے ۔ محبت میں "م" پر زبر ہے، غلطی سے پیش بولتے ہیں ۔ مروت، چہرہ دیکھ کر رعایت کرنا ۔ "م" پر پیش ہے ۔ سارا دن، سارا مہینہ، سارا سال خوش رہا ۔ یہ جملہ غلط ہے اس کے بجائے سارے دن، سارے مہینے، سارے سال خوش رہا، درست ہے ۔ جس حرف کے آخر میں "الف" یا "ہ" ہو اسے جب جملے میں استعمال کریں تو "الف" یا "ہ" کو "ے" سے بدل دیں گے ۔ اس طرح ڈھاکہ کو ڈھاکے گیا تھا ۔ کلکتہ کو کلکتے گیا تھا اور پونا جملے میں پونے ہو جائے گا ۔ "جہاں تک ممکن ہو سکا یا ہو سکے "غلط ہے اسس کے بجائے "جہاں تک ممکن ہو یا ممکن ہوا" درست ہے ۔ "کارخانے کے مالک کو گرفتار کر لیا گیا" کے بجائے "کارخانے کا مالک گرفتار کر لیا گیا" درست ہے ۔ "گھی کی صنعت کو قومیانے کے باوجود" غلط ہے ۔ اس کے بجائے "گھی کی صنعت کے قومی ملکیت میں لیے جانے کے باوجود" درست ہے ۔

تھوڑی دیر تک تو جوش صاحب یہ درس و تدریس برداشت کرتے رہے پھر بے کیف ہو کر بولے ۔ میاں اب کوئی اور موضوع چھیڑو ۔ میں نے کہا جوش صاحب اب آپ ہی کچھ کلام سنائیے ۔ سب نے میری تائید کی تو جوش صاحب نے ارشاد فرمایا کہ اچھا اب کچھ اشعار سنیے ۔ یہ اساتذہ کے لیے ہیں ۔

مبارک باد ہاں اے ذوق تحقیق | کہ ہر معلول ہے علت بداماں
درخشاں ہے الوہیت کا دیہیم | بہ فرق خاندان نوع انساں
رواق مصر کا طاق نگاریں | مبارک اے چراغ ماہ کنعاں
تعالی اللہ کہ جام زرفشاں میں | صفات و ذات کا پرتو ہے غلطاں
کوئی شبنم بدن آہستگی سے | گلوں کی دھاریوں پر ہے خراماں
مری تخئیل میں غلطاں ہے اے جوش | شکن ہائے قبائے نو عروساں

اساتذہ میں سے ایک صاحب نے کہا جوش صاحب ان میں سے بعض اشعار میری سمجھ میں نہیں آئے، مہربانی فرما کر ان کا مفہوم بھی بتا دیجیے ۔

دوسرے شعر میں دیہیم کے معنی کیا ہے؟

جوش صاحب۔ دیہیم کے معنی ہیں تاج شاہی اور الوہیت کا دیہیم کے معنی ہیں خلافت الٰہی کا تاج ان لوگوں کے سروں کی زینت ہوتا ہے جو انسانیت کی خدمت کرتے ہیں۔

استاد۔ تیسرے شعر میں رواق کے کیا معنی ہیں؟

جوش صاحب۔ رواق کے معنی تو مکان کا چھجہ اور خود مکاں یا محل کے ہیں مگر یہاں مراد ہے کائنات سے اور طاق نگاریں سے مراد کائنات کا حسن ہے اور چراغ ماہ کنعاں سے مراد "انسان" ہے۔ اسی طرح چوتھے شعر میں "جام زرفشاں" سے انسان کی عقل کی طرف اشارہ ہے جو صفات و ذات خداوندی کی آئینہ دار ہے۔

ان دونوں حضرات نے جوش صاحب کا بے حد شکریہ ادا کیا اور کہا کہ ہم لوگ اپنی قسمت پر جس قدر ناز کریں کم ہے کہ آپ کے عہد میں زندہ ہیں۔ جوش صاحب آج زبان و بیان کے یہ باریک نکات ہمیں کوئی بتانے والا نہیں ہے اور اگر کوئی کہیں ہے بھی تو ہماری پہنچ اس تک نہیں ہے۔ جوش صاحب اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم دونوں کبھی کبھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے رہیں؟

جوش صاحب نے فرمایا ضرور آتے رہیے مگر پہلے ٹیلی فون سے وقت ضرور متعین کر لیا کیجیے تاکہ آپ اتنی دور آئیں اور میں نہ مل سکوں تو آپ کو پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔ میں نے کہا جناب آپ حضرات خوش قسمت ہیں کہ جوش صاحب اسلام آباد میں موجود ہیں۔ آپ لوگوں کو تو چاہیے کہ بقول فیض احمد فیض:

حلقہ کیے بیٹھے رہو اس شمع کو یارو ۔۔۔ کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

اور بقول خود جوش صاحب:

جوش قرنوں کے اندھیروں سے اماں پانے کو
قرب یک لمحہ صاحب نظراں کافی ہے

اس کے بعد سب لوگ رخصت ہوگئے۔ میں بھی ان کے ساتھ اپنی بہن کے گھر آگیا۔

دوسرے دن اپنے کام سے فارغ ہو کر شام کو جوش صاحب کے گھر چلا گیا۔ وہاں اس شام نظیر صدیقی صاحب جنھوں نے نقش ہائے رنگ رنگ مرتب کی ہے، جو علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں اردو کے اسسٹنٹ پروفیسر ہیں، تشریف لے آئے۔ ان کے ساتھ ایک اور

صاحب بھی تھے ۔ پھر کراچی سے مجیب خیر آبادی بھی آ گئے تھے ۔ اس شام بہت دیر تک شاعری اور ادبی گفتگو ہوتی رہی اور بہت لطف آیا۔

جوش صاحب نے ہم لوگوں کو اپنے ساتھ کھانے میں بھی شریک کر لیا۔ اس رات میں اور مجیب صاحب خیر آبادی جوش صاحب ہی کے گھر ٹھہر گئے۔

دوسری صبح کا آغاز ایک ہنگامے سے ہوا ۔ سجاد صاحب اپنے بیٹے اور بیٹیوں سے تُخ کلامی کر رہے تھے ۔ جوش صاحب بھی بیدار ہو گئے اور جب ان کو اس ہنگامے کا سبب معلوم ہوا تو بے انتہا افسردہ ہوئے ۔ بات یہ تھی کہ بچوں نے سجاد صاحب کی شراب کی بوتل چھپا دی تھی کیونکہ جوش صاحب نے انھیں دن میں شراب پینے سے منع کر رکھا تھا مگر جو شخص نشے کا عادی ہو جائے وہ باپ کی نصیحت کی کہاں پروا کرتا ہے ۔ وہ ہنگامہ اس وقت ختم ہوا جب سجاد صاحب کو بوتل مل گئی جسے لے کر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور پھر شام تک ان کو کسی نے نہیں دیکھا۔ اس دن چونکہ اسلام آباد میں میرا کام مکمل ہو چکا تھا اس لیے میں شام کی پرواز سے کراچی واپس آ گیا۔

جوش صاحب اور ریڈیو پاکستان کا انٹرویو:

۱۹۷۲ء میں جب کہ بھٹو صاحب کی حکومت تھی ۔ ریڈیو پاکستان والوں نے جوش صاحب کا ایک انٹرویو اس معاہدے کے تحت ریکارڈ کیا تھا کہ اس کو ان کی زندگی میں نشر نہیں کیا جائے گا ۔ کیونکہ اس انٹرویو کا موضوع ایسے حساس مسائل پر مشتمل تھا کہ ان پر کوئی دنیا دار شخص مصلحت بینی کا لبادہ اوڑھے بغیر گفتگو کر ہی نہیں سکتا تھا مگر جوش صاحب کی حق گوئی اور دل کی بات بلا کسی مصلحت یا خوف کے صاف صاف بیان کرنے کی عادت نے ان سے اختصار کے ساتھ ایسے جوابات دلوائے جو دراصل تشریح کے بغیر سخت قسم کی غلط فہمی پیدا کر سکتے تھے اور ان کے مخالفین کے ہاتھ میں ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ایک مہلک ہتھیار ثابت ہو سکتے تھے ۔ ویسے بھی جوش صاحب نے کبھی اپنے خیالات کو راز میں نہیں رکھا ۔ انھوں نے انتہائی حساس مسائل کے متعلق جو کچھ سوچا اس کو برملا بیان کیا کیونکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ:

اے ہمت مردانہ تکن ہائے دقیق　　کیوں دہشت ابلہاں سے ناگفتہ رہیں

مگر اس سے پہلے کہ ہم جوش صاحب کی فکر کے اجزائے ترکیبی پر تفصیل سے روشنی ڈالیں اس بدنام زمانہ انٹرویو کا ذکر کرتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ کن حالات میں اور کن شرائط کے تحت یہ انٹرویو ریکارڈ کیا گیا تھا۔

انٹرویو کرنے والی جماعت حسب ذیل تین اصحاب پر مشتمل تھی۔

۱۔ شاہ حسن عطا صاحب۔ جو اس وقت ریڈیو پاکستان کی خارجہ سروس کے سپروائزر تھے مگر خاص طور سے اس جماعت میں اس لیے شریک کیے گئے تھے کہ وہ جوش صاحب سے سوالات کریں۔

۲۔ عبدالحمید صاحب اعظمی۔ کنٹرولر پروگرام پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن راولپنڈی۔

۳۔ سعید صاحب نقشبندی۔ پروگرام منیجر راولپنڈی۔

سب سے پہلے شاہ حسن عطا صاحب نے گفتگو کا آغاز بات کو اس قدر گھما پھرا کر کیا کہ بقول غالب:

در نورد گفتگو از آگہی وا ماندہ ایم　　پیچ و تاب رہ نشان دوری سر منزل است[1]

چنانچہ جب انھوں نے جوش صاحب کی تعریفیں کرنے کے بعد اپنا طویل اور گنجلک سوال ختم کیا تو جوش صاحب نے انتہائی معصومیت سے فرمایا کہ وہ اپنا سوال دہرائیں۔

میں چاہتا ہوں کہ شاہ حسن عطا صاحب کے الفاظ بھی قارئین تک پہنچاؤں تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ اس انٹرویو کے لیے کس قسم کی نفسیاتی فضا پیدا کر دی گئی تھی اور کس قسم کے تحفظات کا وعدہ کیا گیا تھا تاکہ جوش صاحب انتہائی بے تکلفی کے ماحول میں گفتگو کرسکیں۔

شاہ حسن عطا صاحب۔ میں حسن عطا آپ سے ہم کلام ہوں۔ ایک بات مجھے اس وقت محسوس ہوتی ہے کہ آپ سے بات کرنا بڑا مشکل ہے۔ یعنی مشکل ان معنوں میں کہ آپ زبان و بیان کے بہت بڑے پارکھ ہیں اور شاعر کی حیثیت سے آپ اس مقام پر ہیں کہ خود آپ کو تصرف کا حق ہے تو مجھے ڈر محسوس ہوتا ہے کہ خبر نہیں کہ میری زبان سے کون سا ایسا

---

[1] ہم گفتگو کی پیچیدگیوں میں حقیقت کی آگہی سے دور ہوگئے ہیں
جیسے اگر راستہ پیچیدہ اختیار کیا جائے تو منزل دور ہو جاتی ہے۔

لفظ نکل جائے جو زبان و بیان کے آداب کے منافی ہو لیکن بہر صورت وہ جو غالب کا ایک شعر ہے کہ:

در دل ز تمنائے قدم بوسِ تو شوریست[1]

شوقت چہ نمک دادہ مذاقِ ادبم را

میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی شخصیت ایک ایسی جامع، متنوع، ہمہ گیر اور جاندار شخصیت ہے اور اس میں، میں نے کوئی لفظ زائد استعمال نہیں کیا۔ حمید اعظمی صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ نقشبندی صاحب تشریف رکھتے ہیں۔ یہ تمام حضرات ہم سبھی آپ سے واقف ہیں اور ہمیں واقف ہونا چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں وہ پڑھا لکھا آدمی نہیں جو آپ سے واقف نہیں ہے تو ہمارے آنے کا مدعا یہ تھا کہ ویسے تو رسمی انداز سے بہت سی گفتگوئیں ہوتی ہیں لیکن ایک ایسی گفتگو آپ سے ہو جائے اور آپ کا ذہن اس کے لیے آمادہ ہو جائے تو یہ ہماری بڑی خوش بختی ہوگی کہ جس میں آپ اپنی شخصیت کو کھول دیں وہ جیسے کشور کشائی ہوتی ہے یعنی یہ کہ کشور کشا نئی اقلیموں کو کھولتا ہے تو شخصیت کے ایسے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ شخصیت ایسی پرپیچ چیز ہے اور ایک انسان کے لیے کچھ اپنے بارے میں کہنا بڑا دشوار بھی ہوتا ہے تو میں سب سے پہلی بات تو آپ سے یہ گزارش کروں گا یعنی ابتدا یہاں سے کروں گا کہ چونکہ آپ بہت ہی ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک ہیں اور آپ نے زمانے کے بڑے نشیب و فراز بھی دیکھے ہیں اور مدتیں آپ نے گزاری ہیں مختلف شہروں میں تو یہ جو انقلابی تصورات ہیں پاکستانی تحریک سے متعلق اس کے بارے میں خود آپ کی رائے کیا ہے؟

حسن عطا صاحب نے گفتگو کی بھول بھلیوں میں سوال کو اس قدر گم کر دیا تھا کہ جوش صاحب نے طویل تمہید سننے کے بعد نہایت معصومیت سے فرمایا۔

جوش صاحب۔ سوال دہرا دیں۔

حسن عطا صاحب۔ میرا سوال جو ہے وہ یہ ہے کہ جو تصورات انقلاب ہوتے تھے سیاسی جس کے نتیجے میں پاکستان معرض ظہور میں آیا۔ اس سلسلے میں آپ کا ذاتی ردعمل کیا ہے؟ یعنی

---

[1] میرے دل میں تیری قدم بوسی کی تمنا جوش پر ہے
تیرے شوق نے مذاقِ ادب کو کس قدر لذت بخشی۔

آپ نے اس کو ایک مستحسن نگاہ سے دیکھا اور آپ کے نزدیک یہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک بڑا کام ہوا یا نہیں ہوا یا اس کے کیا اثرات ہونے چاہیں تھے جو نہیں ہوئے اور خود آپ کا ردعمل اس سلسلے میں کیا ہے؟

جوش صاحب۔ اگر آپ میری بات کو نشر نہ فرمائیں کیونکہ یہ وہ بات ہے کہ "فاش اگر گویم جہاں برہم زدم"۔ میں قلیل الاحباب اور کثیر الاعداء ہوں۔ میں اگر کھل کر کہوں گا اور آپ نے اس کو نشر کر دیا تو میرے دشمن اور بڑھ جائیں گے۔ آپ اس کا وعدہ فرمائیں کہ میرے انتقال کے بعد میری اس آواز کو سنائیں گے تو میں عرض کروں۔

حسن عطا صاحب۔ ٹھیک ہے جوش صاحب آپ عرصے تک اس دنیا میں تشریف رکھیں آپ کا وجود بڑا غنیمت ہے۔ آپ مغتنمات میں سے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی پوری شاعری میں مجھے جو ایک چیز نظر آئی وہ ہے صداقت۔ آپ کے جذبات میں صداقت ہے۔ آپ میں اس چیز جس کو نفاق یا ریا یا دوروئی کہتے ہیں یا تطلیس کا میں نے دور دور تک کوئی نشان نہیں دیکھا ہے۔ میں آپ کا ایک بہت ہی گہرا طالب علم ہوں آپ کی تمام تصانیف میری نظر میں ہیں اور اسی لیے شاید مجھے منتخب بھی کیا گیا ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوں تو آپ بلاتکلف فرمائیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ایک سچی بات کہنے میں آپ جیسے ایک بڑے شاعر کو کوئی تکلف نہیں ہونا چاہیے اور ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ کہلوایا جا رہا ہے اس کا قطعاً کوئی غلط استعمال نہیں ہو گا۔ یہ قطعاً اس لیے نہیں ہے کہ آپ کی پوزیشن نازک ہو کسی مرحلہ پر بھی۔ لیکن اب یہ کہ ایک واقعہ ہوا ہے۔ پاکستان بنا ہے۔ اتنی بڑی تحریک سامنے آئی ہے۔ اس کے نتیجے میں ایک واقعہ ہوا ہے تو آپ کا ردعمل تو جاننا تاریخ کا ایک بڑا ہی اہم ضروری اور ناگزیر سا فعل ہے اس لیے آپ بلاتکلف فرمائیں۔

جوش صاحب۔ میرے نزدیک پاکستان جو بنا ہے اس سے نقصان پہنچا ہے۔ ہندو کو بھی نقصان پہنچا ہے مسلمان کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ ہم نے جو ایک گنگا جمنی تہذیب بنائی تھی ایک ہزار برس میں، وہ پاش پاش ہو گئی۔ ہم نے جو اقدار بنائے تھے شرافت اور تہذیب کے وضع داری کے وہ سب ختم ہو گئے۔ مذہب کی بنا پر اقوام نہیں بنتی ہیں اگر میں عیسائی ہو جاؤں تو کیا پاکستانی نہیں رہوں گا؟

غرض یہ ایک طویل انٹرویو ہے جس میں خود جوش صاحب کی باتیں کم اور حسن عطا صاحب کی پیچیدہ گفتگو بہت زیادہ ہے۔

جوش صاحب کے انٹرویو کا پس منظر:

اس مقام پر جو بہت اہم سوال ذہن میں ابھرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس طویل انٹرویو کے پیچھے خود حکومت وقت کے کیا مقاصد تھے؟ یہ زمانہ وہ تھا جب مشرقی پاکستان بنگلہ دیش بن چکا تھا یعنی مذہب کی بنا پر دو قومی نظریہ جس کی بنیاد پر پاکستان عالم وجود میں آیا تھا صوبائی عصبیت کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو چکا تھا۔ خود مغربی پاکستان میں جو اب کل پاکستان تھا سندھ، پنجاب، سرحد اور خاص طور سے بلوچستان میں صوبائی علاقائی کلچر کے نام پر علیحدہ تشخص کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ بھٹو صاحب نے جب بلوچستان میں عطاء اللہ صاحب مینگل کی حکومت کو جو اکثریت کے ووٹوں سے منتخب ہو کر برسر اقتدار آئی تھی برخاست کر دیا تو بلوچوں نے پہاڑوں پر مرکزی حکومت کے خلاف مورچے سنبھال لیے اور مرکز کو اپنے ہی ملک کے صوبے پر دوسری بار فوج کشی کرنا پڑی۔ سرحد میں جناب مفتی محمود نے جمہوریت کے تحفظ کے لیے، بلوچستان پر فوج کشی کے خلاف وزارت اعلیٰ سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح کل پاکستان کا اسلامی تشخص، جو بنگلہ دیش کے قیام کی وجہ سے پہلے ہی مجروح ہو چکا تھا، اب مزید صوبائی عصبیتوں کا شکار ہونے لگا۔

ایسے موقع پر حکومت پاکستان کی وزارت اطلاعات، کا جوش جیسے عظیم مفکر اور مشہور شاعر کے ذریعہ سے (جو اس وزارت سے ملازمت کے ذریعہ سے منسلک بھی تھے) ایسے خیالات کو ریڈیو پاکستان کے عملے کے ذریعے سے ریکارڈ کروانا، جن سے حکومت وقت کے ان تمام اعمال کی تائید ہوتی ہو جو تشکیل پاکستان اور دو قومی نظریہ کی ضد ہیں، کسی گہری سازش سے کم نہیں معلوم ہوتا اور جس کا شکار جوش صاحب اپنی معصومیت اور راست گفتاری کی عادت کی وجہ سے بن گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انٹرویو کے پیچھے حکومت وقت کی بدنیتی کارفرما تھی۔

جوش صاحب کی سیاسی بصیرت:

مگر جہاں تک خود جوش صاحب کی فکر کا تعلق ہے ان کی فکر کے اجزائے ترکیبی کو سمجھ لینا بہت ضروری ہے تاکہ جوش صاحب کے تعلق سے کسی قسم کی غلط فہمی کو دور کیا جاسکے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ انسانیت کے تعلق سے جوش صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ تمام نوع انسانی ایک اکائی ہے اس سلسلے میں ان کی چند رباعیات ملاحظہ ہوں۔

انسان کو قوموں میں نہ بانٹو یارو　　تفریق کا للّٰہ نہ کاجل پارو
جس پر ہے رواں کشتی توحید بشر　　اس خون کے دھارے پہ نہ لاٹھی مارو

اقوام کے لفظ میں کوئی جان نہیں　　اک نوع میں ہو دوئی یہ امکان نہیں
جو مشرک یزداں ہے وہ ناداں ہے فقط　　جو مشرک انساں ہے وہ انسان نہیں

حب نوع بشر ہے میرا ایمان　　ہر چہرہ زشت و خوب میرا قرآن
اللہ کو آغوش میں پایا میں نے　　جیسے ہی مری گود میں آیا انسان

جوش صاحب کے ہاں یہ وحدت کی لے اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ اس نے اس تمام کائنات کو اپنی آغوش میں لے لیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

سیارہ و ثوابت و مہ و ارض و سما　　حیوان و طیور و دیو و جن و انساں
خار و گل و ریگ زار و دشت و دریا　　سب ایک ہی کوکھ سے ہوئے ہیں پیدا

مگر چونکہ انسان مختلف جغرافیائی علاقوں میں تقسیم ہے اس لیے اس کی نسلی، تہذیبی اقدار، ثقافت، زبان، جسمانی ساخت، رنگ اور فکری و جسمانی صلاحیتوں میں اس علاقے کی آب و ہوا اور زمینی پیداوار کی نسبت سے فرق ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہر جغرافیائی اکائی کو اپنے معروضی حالات کے پیش نظر اپنا معاشی سماجی اور سیاسی نظام وضع کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ اس لیے یہ اصول کہ ہندوستان کے مسلمان اپنے اکثریتی علاقوں میں اپنی آزاد و خود مختار مملکت قائم کرنا چاہتے تھے جس کا نام پاکستان رکھ دیا گیا۔ بذات خود مسلمانوں کے اس حق کو تسلیم کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے بلکہ یہ ہر اس آبادی کا جس میں سماجی اعتبار سے احساس

یہ ان کا بنیادی حق ہے کہ وہ اپنا سیاسی نظام اپنی مرضی کے مطابق وضع کرے۔

مگر بدقسمتی سے ہوتا یہ ہے کہ طاقتور قومیں اپنے مفادات کے حصول کے لیے کمزور قوموں پر طاقت کے ذریعہ سے سیاسی اقتدار حاصل کر لیتی ہیں اور ان کے معاشی اور انسانی وسائل کا استحصال شروع کر دیتی ہیں اور اپنے مفادات کے تحفظ میں محکوم قوموں کو کمزور سے کمزور تر کرنے کے لیے ایسے حربے استعمال کرتی ہیں کہ وہ اپنے ہی خون اور اہل وطن سے برسر پیکار ہو جاتے ہیں اس طرح ان کی طاقت آپس کے تصادم میں صرف ہو جاتی ہے اور وہ اپنے اصلی دشمن کو شناخت کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ اس طرح یہ انسانی اکائی معاشی مفادات کے حصول کے خاطر طاقتور اقوام کے ہاتھوں چھوٹے چھوٹے متحارب گروہوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اس کی متحدہ طاقت پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ اس لیے اگر بڑی قومیں تقسیم ہو کر چھوٹی اکائیوں میں بٹ جائیں تو وہ کمزور ہونے کی وجہ سے دوسری بڑی حریف طاقتوں کی استحصال حکمت عملیوں کا آسانی سے شکار ہو سکتی ہیں۔ اس نظریے کو اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے ہم کو عالمی سیاست کی حکمت عملی کا گہری نظر سے جائزہ لینا پڑے گا۔

اس نقطہ نظر سے اگر ہم عالمی سیاست پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ اس کرۂ ارض پر سیاست کی تین تہیں (پرتیں یا سطحیں Layers) ہوتی ہیں۔

پہلی سطح۔ بین الاقوامی سیاست یا Global Politics ہے۔ اس سیاست کے تحت سوپر طاقتیں یا اعلیٰ ترین طاقتور قومیں تمام کرۂ ارض کو اپنے ملکی مفادات کے تحت مختلف علاقوں یا Regions میں تقسیم کر لیتی ہیں جیسے تیل کی دولت سے مالا مال مشرق وسطیٰ یا خام مال کی دولت سے لبریز جنوبی ایشیا یا مشرق بعید وغیرہ۔ اس طرح

دوسری سطح۔ علاقائی سیاست Regional Politics ہے۔ ان علاقوں یا Regions میں اپنے اپنے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے یہ طاقتیں

تیسری سطح۔ مقامی سیاست یا Local Politics اختیار کرتی ہیں۔ جیسے مشرق وسطیٰ میں عراق، کویت، سعودی عرب، شام، فلسطین، اردن اور متحدہ عرب امارات کے علاقوں میں اپنی مرضی کی حکومتوں کا قیام۔ اسی طرح جنوبی ایشیا میں ہندوستان، پاکستان، سری لنکا، کشمیر، افغانستان، ایران وغیرہ۔

سوپر طاقتوں کی سیاست کے دو مقاصد ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ ہر سوپر طاقت دوسری سوپر طاقت کے حلقہ اثر کو محدود سے محدود تر کرنے کی کوشش اور اس کے برعکس اپنے حلقہ اثر کو وسیع سے وسیع تر کرنا۔ ان کی سیاسی حکمت عملی کا ترجیحی معاملہ ہوتا ہے۔

دوسرے اپنے زیر اثر ممالک کے ذہنی اور افرادی وسائل کو اپنی قومی مصلحتوں اور مفادات کے مطابق استعمال کرنے کی آزادی۔

اگر مقصد نمبر ا یعنی دوسری سوپر طاقت کر ختم کرنے یا نقصان پہنچانے کے لیے اس سے متصل کسی علاقے کو مختلف جغرافیائی اکائیوں میں تقسیم کرنا ضروری ہو تو پھر وہاں اپنے ایجنٹوں اور زرخرید مقامی باشندوں کے ذریعہ لسانی، مذہبی، علاقائی، تمدنی فرقہ واریت کے اختلافی جذبات بھڑکا کر ایسے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ اس آبادی کے باشندے خود آپس میں ایک دوسرے کے دشمن بن جاتے ہیں۔ معمولی معمولی باتوں کو ان کا جذباتی مسئلہ بنا دیا جاتا ہے اور اس طرح ایک ہنستی کھیلتی آبادی خاک و خون میں نہلادی جاتی ہے اور اس طرح یہ لاشوں کے سوداگر نہ صرف اپنے خون آشام ہتھیاروں کے لیے منڈیاں پیدا کرتے ہیں بلکہ دوسری طرف ان کے جغرافیائی وسائل کا استحصال کرتے ہیں اور اس ایک بڑی جغرافیائی کائی کو تقسیم در تقسیم کر کے کمزور ملک بنا دیتے ہیں اور پھر ان ممالک میں اپنی مرضی کی حکومتیں قائم کر کے ان کو اپنی کرۂ ارضی سیاست (Global Politics) کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ خود جوش صاحب کا شعر ہے:

نچا رہا ہے تمدن کو قتل گاہوں میں
کرشمۂ دفِ امریکہ و ربابِ فرنگ

بد قسمتی سے ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ہندوستان جو جنت نشان کہلاتا تھا جو امن و آشتی کا گہوارہ تھا اور جہاں کی گنگا جمنی تہذیب صرف محبت، حسن، آرٹ، شاعری، رقص و موسیقی سے عبارت تھی۔ انگریزوں کے آنے کے بعد ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، شیعہ، سنی اور سینکڑوں جماعتوں میں تقسیم در تقسیم کر دیا گیا اور ان نفرتوں کو فرقہ وارانہ فسادات کا خون پلا پلا کر خوب طاقتور بنایا گیا اور اپنے زرخرید افراد کے ذریعے سے ان اختلافات کو کہیں مذہبی

رنگ دیا گیا، کہیں لسانی، کہیں طبقاتی تو کہیں علاقائی تعصبات کے ذریعے سے سادہ لوح اور جاہل عوام کی طاقت کو پارہ پارہ کیا گیا اور اس طرح انگریزوں نے ہندوستان میں اپنی سیاسی طاقت کو مستحکم کیا اور لڑاؤ اور حکومت کرو کے اصول پر (Divide & rule) تقریباً دو سو سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ لیکن ۱۹۱۷ء کے بعد جب روس میں کمیونسٹ انقلاب رونما ہوا اور زار روس کا تختہ الٹ کر کمیونسٹ حکومت عالم وجود میں آگئی تو سامراجی طاقتوں نے ایک طویل المدت حکمت عملی کے ذریعہ سے روس کے حلقہ اثر کو محدود سے محدود تر رکھنے کی تدابیر اختیار کرنا شروع کر دیں اور اس کے اطراف ایک فوجی دفاعی حصار تشکیل دینا شروع کر دیا۔

کمیونسٹ فلسفے اور ان کی جماعتوں کے پروپیگنڈے نے کمیونزم کو محروم عوام کا جذباتی مسئلہ بنا دیا تھا۔ اس لیے اگر اس کے لادینی نظریات کے خلاف کوئی موثر تحریک چلائی جا سکتی تھی تو وہ صرف مذہبی تحریک ہی ہو سکتی تھی اس لیے کہ مذہب بھی عام انسانوں کا جذباتی مسئلہ ہوتا ہے۔ سامراجی طاقتوں کی خوش قسمتی سے روسی مملکت کا جنوبی اور جنوب مغربی علاقہ مسلمان ریاستوں سے گھرا ہوا ہے۔ ترکی، ایران، عراق، افغانستان یہ سب مسلمانوں کی ریاستیں ہیں اور ان علاقوں میں اشتراکیت کے لادینی نظریات کے خلاف مذہب پرست عوام کو بہت آسانی سے ابھارا جا سکتا تھا۔

اس تناظر میں جب ہندوستان کا جائزہ لیا گیا تو انگریزوں نے یہ محسوس کیا کہ کانگریسی لیڈر جیسے جواہر لال نہرو وغیرہ (جن کے اثرات کانگریس پارٹی پر بہت گہرے تھے جو ہندوستان کے مستقبل میں حکومت بنانے والی جماعت سمجھی جاتی تھی) سوشلسٹ نظریات رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں جو ترقی پسند تحریک چل رہی تھی وہ بھی عوام کو جاگیرداری اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف انقلاب برپا کرنے کے لیے تیار کر رہی تھی تو اس بات کا خدشہ بے بنیاد نہیں تھا کہ جب ہندوستان کو آزادی مل جائے گی تو وہ برطانیہ اور امریکہ کے بجائے روس سے تعلقات استوار کرے گا۔

سامراجی طاقتوں کی خوش قسمتی یہ تھی کہ ہندوستان کے شمال اور شمال مغربی صوبے جیسے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد تمام مسلم آبادی پر مشتمل ہیں اور ان علاقوں کا سماجی ڈھانچہ انگریزوں کے پیدا کردہ جاگیرداروں، وڈیروں، سرداروں اور چودھریوں پر مشتمل ہے اسی

کے ساتھ ساتھ ان جاگیرداروں کا اقتدار بھی ان علاقوں کے عوام پر بہت سخت ہے اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے ان علاقوں پر وہاں کے سرداروں اور روحانی پیشواؤں کا اقتدار مستحکم رکھا جاسکتا تھا اور ایسے علاقوں میں کمیونزم کے خلاف پروپیگنڈہ آسان بھی تھا اور موثر بھی۔ اس لیے سامراجی طاقتوں نے یہ سوچا کہ اگر ان علاقوں کو ہندوستان سے کاٹ کر ایک الگ ریاست بنا دی جائے تو روس کے خلاف حصار میں بہت طاقتور دیوار کھڑی کی جاسکتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے سامراجی طاقتوں کے یہ ارادے بھانپ لیے تھے اسی لیے انھوں نے بہت پہلے ہندوستانیوں کو متنبہ کر دیا تھا کہ:

وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

اس لیے پاکستان بننے سے یہ قوی احتمال تھا کہ مسلمان جس مقصد کے لیے پاکستان بنانا چاہتے ہیں وہ بین الاقوامی سامراجی سیاست اور پاکستان پر مشتمل علاقوں کے معاشی سماجی Socio Economic حالات کی وجہ سے اسلامی نظام قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوسکیں گے۔ گو پاکستان کی تشکیل اگر واقعی اسلامی نظام کے قیام کے لیے ہوتی تو اس سے بہتر بات ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے ممکن ہی نہیں تھی مگر بین الاقوامی سیاست اور پاکستان پر مشتمل علاقوں کے معروضی حالات کی روشنی میں ہندوستان کے بہت سے دانشور جو بین الاقوامی طاقتوں کے سیاسی عزائم کا شعور رکھتے تھے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھتے تھے کہ یہ طاقتیں پاکستان کو ایک طاقتور اسلامی فلاحی مملکت بننے نہیں دیں گی بلکہ یہاں سیاست کے مختلف ہتھکنڈوں کے ذریعے سے مسلمانوں کو صوبائی، لسانی اور فرقہ وارانہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کرکے ان کی طاقت کو منتشر کر دیا جائے گا اور یہاں کا جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ استعماری طاقتوں کی سرپرستی میں سیاسی اقتدار پر قبضہ کر کے پاکستان کی معیشت کا اس طرح استحصال کرے گا کہ یہ ملک کبھی پنپ نہ سکے گا اور مفلس و کمزور ہو کر سامراجی طاقتوں کی دوامی غلامی میں رہنے پر مجبور اور ان کے عالمی مفادات کے حصول کا ذریعہ بنتا رہے گا۔ اسی لیے جب وہ لوگ یہ کہتے ہیں

کہ پاکستان بننے سے مسلمانوں کو نقصان ہوا تو ان کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ پاکستان بنانا ہی غلط تھا بلکہ ان کا مقصد صرف اور صرف یہ ہوتا ہے کہ جس مقصد کے لیے پاکستان بنا تھا وہ حاصل نہ ہو سکا۔ وہ لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ تقسیم ہند سے پہلے اور تقسیم کے وقت چونکہ ہندو مسلم فسادات کروائے گئے تھے اور آپس میں شدید نفرتیں پیدا کر کے برصغیر کو تقسیم کیا گیا اور اسی نفرت کو تقسیم کا جواز بنایا گیا۔ اس لیے ہندوستان اور پاکستان میں کبھی دوستی قائم نہ ہو سکے گی اور جنوبی ایشیا کے یہ عظیم ممالک اپنے مشترکہ مفادات کے حصول کے لیے کبھی متحدہ طور پر اپنے عوام کی خوشحالی کے لیے کوئی لائحہ عمل تشکیل نہ دے سکیں گے اور اس طرح اپنے اپنے بجٹ کا بیشتر حصہ دفاعی ضرورتوں کی فراہمی میں خرچ کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔ چنانچہ اسی دشمنی کو قائم رکھنے اور اپنے مستقبل کے امکانی تقاضوں کی تکمیل کے لیے کشمیر کے مسئلے کو متنازع رکھا گیا تاکہ یہ دونوں ملک ہمیشہ ایک دوسرے سے برسر پیکار رہیں اور پاکستان اپنی بقا کے لیے سوپر طاقت کا دست نگر رہے اور وہ طاقت یہاں کے وسائل کا اپنی قومی ضرورتوں کے مطابق استحصال کرتی رہے۔ یہ لوگ یہ بھی خوب سمجھتے تھے کہ پاکستان پر مشتمل علاقوں کے افراد میں احساس یگانگی پیدا کرنے والا عامل اسلام سے زیادہ صوبائی عصبیت ہے۔ اس لیے جب ان علاقوں کے لوگوں کو اقتدار مل جائے گا تو پھر ان میں قبائلی اور صوبائی مفادات ابھر کر سامنے آئیں گے اور یہ آپس میں ہی باہم دست و گریباں ہو جائیں گے۔ اس وقت یہ تصور کہ سب مسلمان ہیں، ان کو تصادم سے نہیں بچا سکے گا اور تجربات نے ثابت کر دیا کہ ان کا یہ خوف غلط نہ تھا کیونکہ پاکستان بننے کے بیس سال بعد ہی مشرقی اور مغربی پاکستان کے مفادات کا ٹکراؤ شروع ہو گیا اور مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کی سیاسی اور معاشی حکمت عملیوں کے خلاف جذبات بیدار ہونے شروع ہو گئے تو یہ تصور کہ یہ دونوں علاقے اسلام کے رشتے میں ایک ہیں، ان کو آپس میں متحد نہ رکھ سکا اور بالآخر یہ دونوں الگ الگ ریاستیں بن گئیں اور اس تبدیلی میں جو لاکھوں مسلمان قتل ہوئے، عورتوں کی عصمتیں لٹیں، ہزاروں بے گناہ مسلمانوں نے قید و بند کی تکلیفیں برداشت کیں اور سب سے بڑی بات پاکستان کی عسکری طاقت کو خود اپنی سرزمین پر رسوائی سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ تمام تاریخی حقائق ہیں جن سے کوئی شخص انکار کر ہی نہیں سکتا اور پھر آج سندھ کے شہری اور دیہی علاقوں

کے لوگوں کے دلوں میں آپس میں بے اعتمادی، کراچی جیسے شہر میں امن و امان کی بربادی، کشمیر کے مسلمانوں کا کشت و خون۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے جو جاری کر دیا گیا ہے۔ بقول والی آسی:

ہم خون کی قسطیں تو کئی دے چکے لیکن
اے خاک وطن قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

یہ وہ امکانی معروضی حالات تھے جن کے تحت جب مولانا ابوالکلام آزاد اور جوش ملیح آبادی جیسے دانشوروں نے یہ کہا کہ پاکستان بننے سے مسلمانوں کو نقصان ہوا تو وہ دراصل سامراجی طاقتوں اور ہندوستان کے جاگیرداروں سے غالب کی زبان میں یہ کہہ رہے تھے کہ:

تو اور آرائشِ خمِ کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

انٹرویو کا ردعمل، سیاسی حلقوں میں:

مگر مفاد یافتہ طبقات نے ان کے اس انٹرویو کو اس کے سیاق و سباق سے الگ کر کے ان کے خلاف پروپیگنڈے کا ذریعہ بنایا اور وزارت اطلاعات و نشریات نے جس پر اس زمانے میں ایک اسلام نواز جماعت کا اقتدار تھا جو جوش صاحب کے خیالات سے اختلاف رکھتی تھی، ان کو سرکاری ذرائع ابلاغ سے بلیک لسٹ کر دیا۔ اس کے علاوہ اس جماعت نے ان کی شاعری یا نثر کو ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سرکاری مطبوعات میں اشاعت کے لیے ممنوع قرار دے دیا اور اس عظیم انسان کو پاکستان دشمن قرار دینے کی کوشش کی گئی جو پاکستان کی سرزمین پر جینے اور مرنے کے لیے اپنی کشتیاں جلا کر اترا تھا۔ جس نے ۲۱ جون ۱۹۷۰ء کو ایک تقریب میں یہ اعلان کر دیا تھا کہ "میں یہ خوب سوچ سمجھ کر یہاں آیا تھا کہ ارباب پاکستان میری آزاد خیالی اور عقل پرستی کو ہرگز پسند نہیں کریں گے لیکن اس یقین کے باوجود میں پاکستان میں جینے اور مرنے کے لیے آگیا اور یہیں کی مٹی میں دفن ہو جانا بھی چاہتا ہوں"۔

(اور آج ہم سب جانتے ہیں انھوں نے یہ کر دکھایا کہ وہ پاکستان کی مٹی میں دفن ہیں)۔

صحافتی حلقے کا ردعمل

اس انٹرویو کے نتیجے میں اس وقت کی وزارت اطلاعات کی جوش مخالف کارروائیوں کے خلاف پاکستان کے صحافیوں، ادیبوں، دانشوروں نے ڈٹ کر جوش صاحب کی مدافعت کی۔ ان کے حق میں مضامین لکھے۔

معاصر روزنامہ ڈان نے اپنے اداریے میں لکھا کہ:

"۱۹۸۰ء کے آخری لمحات میں ایک ایسے شاعر کے خلاف یہ اقدام کئی دہائیاں پیشتر جس کی آواز تاج برطانیہ کو للکارتی رہی تھی ایک تاریخی ستم ظریفی قرار دیا جائے گا"۔ آگے چل کر ڈان لکھتا ہے "ہم ان حالات سے بھی ناواقف ہیں جن کے تحت یہ انٹرویو لیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ انٹرویو بعد از رحلت نشر ہونے کے لیے تھا اور جوش صاحب کی زندگی میں اسے منظر عام پر نہیں لایا جانا چاہیے تھا اگر یہ درست ہے تو پھر اس کی اشاعت ایک غیر اخلاقی حرکت ہے"۔ آخر میں روزنامہ ڈان لکھتا ہے "تمام عظیم ادب عدم تقلید کی بنیاد پر تخلیق ہوا ہے۔ ادب یا فن سے یہ توقع کہ وہ کسی سرکاری اصول کا پابند ہو، جمہوری تقاضوں کے منافی ہے۔ حضرت جوش ملیح آبادی ایک شاعر ہیں، عظیم شاعر اور ان کا مرتبہ سرکاری ذرائع ابلاغ سے انھیں خارج کر کے کم نہیں کیا جا سکتا بلکہ یہ اقدام نتیجتاً ان کے لیے ایک اعزاز بن جائے گا کیونکہ انسانی تہذیب کی تاریخ ایسے شاعروں ادیبوں، صوفیوں اور فلسفیوں سے بھری پڑی ہے جو انتظامیہ کے ہاتھوں پستے رہے مگر جن کے نام اپنے الزام دہندگان کی نسبت آج بھی زندہ و تابندہ ہیں۔

اس زمانے میں جنرل ضیاء الحق پاکستان کے مطلق العنان فوجی صدر تھے مگر وہ بھی جوش صاحب کی فکری عظمت کے معترف تھے۔ اس لیے انھوں نے خود اپنی وزارت اطلاعات کی پالیسی کے علی الرغم جوش صاحب کو ملنے والی مراعات میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہونے دی اور وہ تمام سہولتیں جو ان کو پہلے سے حاصل تھیں وہ جاری رہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ جناب علی احمد تالپور جو اس زمانے میں وزیر دفاع تھے، جوش صاحب کے معتقدین میں سے تھے اور ضیاء الحق صاحب تالپور برادران کی رائے کا بہت احترام کرتے تھے۔

۱۹۷۹ء کے واقعات

کراچی پریس کلب کی رکنیت:

مگر جوش صاحب کے خلاف ایک جماعت کا پروپیگنڈہ جب زیادہ شدت اختیار کرنے لگا تو کراچی پریس کلب کے منتظمین نے اپنی حریت فکر کے ثبوت میں یہ طے کیا کہ حضرت جوش کو کراچی پریس کلب کی دوامی رکنیت دی جائے۔ چنانچہ پریس کلب والوں نے وسط جون ۱۹۷۹ء میں جوش صاحب کو کراچی میں مدعو کیا۔ ان کو ہوٹل جبیس میں مہمان رکھا اور تین دن تک ان کا جشن منایا۔ ۱۸ویں جون ۱۹۷۹ء کو پریس کلب کے صدر جناب حضور احمد شاہ نے اپنے سپاس نامے میں جوش صاحب کی خدمت میں کراچی پریس کلب کی رکنیت پیش کی۔ یہ خطبہ صدارت ایک ایسی دستاویز ہے جس سے اس دور کے حریت فکر کے علمبرداروں کا ذہن آشکارا ہوتا ہے اس لیے اس کے کچھ حصے یہاں نقل کرنا چاہوں گا۔ جناب صدر نے جوش صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

"کراچی پریس کلب آپ کا ممنون ہے کہ اسے آپ نے میزبانی کا شرف عطا کیا۔ کراچی پریس کلب، وطن عزیز پاکستان میں صحافیوں کا سب سے بڑا ثقافتی مرکز اور ان کا سب سے زیادہ فعال جمہوری ادارہ ہے اور یقیناً یہ اسی کا منصب ہے کہ آپ کی مستقل رکنیت کی سعادت سے بہرہ مند ہو۔ شاعر انقلاب! شعر و ادب کی قلمرو میں آپ نے نصف صدی سے زائد عرصے تک حکومت کی ہے۔ آزادیٔ افکار اور بے باکیٔ اظہار کے باب میں آپ کی شخصیت بلاشبہ قبلۂ رندانِ جہاں ہے لیکن روایتی شاعری سے بغاوت اور روایتی طرز فکر و بیان سے یکسر انکار، جناب جوش آپ ہی کی جرأت اور دیانت کا کرشمہ تھا اور ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ

فکر و فن میں اور شعر و ادب میں جس طرح حریت کا پرچم آپ نے سربلند کیا تھا اس پیرانہ سالی کے باوصف وہ پرچم آپ کے ہاتھوں آج بھی سربلند ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اردو شاعری میں آپ نے ایک عہد کا آغاز کیا اور جو رنگ آپ نے اختیار کیا جدید شاعری اور ترقی پسند شاعری نے بالآخر اس کے اثرات قبول کیے اور آنے والے دور میں ایسے متعدد شاعر پیدا ہوئے جن کا شمار صف اول کے نظم گویوں میں ہوتا ہے لیکن ان کا کلام آپ کے افکار کی روشنی سے اسی طرح منور ہے جس طرح سورج کی روشنی سے چاند کی تابانی۔ آپ نے جاگیردارانہ تہذیب کے ناپسندیدہ اثرات کے خلاف مسلسل کاوش کی۔ فکری نکموی، مجہولیت، یاسیت، احساس شکست، بزدلی، منافقت اور فریب کے سارے پردے چاک کیے۔ اپنے آباء کی روایت سے انسان دوستی، احترام انسانی مظلوموں کی پشت پناہی اور ظلم و جبر کی طاقتوں کے خلاف بغاوت کے جذبات اخذ کیے۔ حریت فکر اور جدید افکار و خیالات کو اپنا زاد راہ بنایا اور فن کی ان پرخار وادیوں کی طرف چل نکلے جن کی جانب دوسرے شعرا نے دیکھا بھی نہ تھا۔ آپ نے سب سے پہلے تو اپنے زوال آمادہ معاشرے کے جھوٹے پندار، ریاکارانہ عبادت اور منافقانہ مذہب پرستی کا پردہ چاک کیا۔ پھر برطانوی سامراج کو آگے بڑھ کر للکارا۔ آپ نے انگریز حکمرانوں کو جس سختی کے ساتھ جھنجوڑا تھا وہ آپ ہی جیسے جری شخص سے ممکن تھا اور برطانوی حکمرانوں سے مخاطب ہو کر پوچھا تھا۔

ظلم بھولے راگنی انصاف کی گانے لگے
لگ گئی ہے آگ کیا گھر میں کہ چلانے لگے؟
گونج تاپوں کی نہ آبادی نہ ویرانے میں ہے
خیر تو ہے اسپ تازی کیا شفا خانے میں ہے؟

اور آخر میں یہ اشعار:

وقت لکھے گا کہانی اک نئے مضمون کی
جس کی سرخی کو ضرورت ہے تمہارے خون کی

جب برصغیر میں آزادی کی جدوجہد تیز ہوئی۔ آل انڈیا کانگریس اور کل ہند مسلم لیگ کے جدا جدا موقف کی بنا پر آزادی کا مسئلہ الجھ گیا اور تقسیم کے سوا مسئلے کا کوئی حل باقی

نہیں رہا تو آپ نے وہ معرکہ آرا نظم کہی جس میں مادرِ وطن ۔ کانگریس یعنی بڑی بہن سے مخاطب ہوتی ہے اور اسے چھوٹی بہن یعنی مسلم لیگ کا حق ادا کرنے کی تاکید کرتی ہے۔

کہتی نہیں کہ لعل و گہر اس کو بخش دے
جو گھر وہ مانگتی ہے وہ گھر اس کو بخش دے

جناب جوش! آپ نے قیام پاکستان کی اگر حمایت کی تو کسی دباؤ یا مصلحت کے تحت نہیں بلکہ اچھی طرح سوچ سمجھ کر کی۔ ہمیں افسوس ہے کہ آپ کے سیاسی عقائد پر جنھیں آپ اپنی ذات تک رکھنے کے قائل ہیں اور روش عام کے برعکس دوسروں کے سر تھوپنے پر مصر نہیں کہ حریت فکر اسی کا نام ہے۔ ایسے لوگ معترض ہیں جو قیام پاکستان کے بعد تک اس کے مخالف تھے لیکن آج اپنی پرانی تحریروں اور تقریروں کو چھپانے اور خود کو پاکستان کا بانی ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ یہی وہ منافقت ہے جس کے خلاف آپ نے ہمیشہ جنگ کی اور دل کی بات کو زبان پر لانے میں کبھی تامل نہیں کیا۔ حریت فکر اور آزادیِ اظہار انسان کے بنیادی حقوق ہیں جن کے لیے وہ صدیوں سے جنگ کرتا آیا ہے اور بڑے بڑے حکماء، فلسفی اور دانشور اس کے لیے ایک عمر جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ جو لوگ ان حقوق کو سلب کرنے کے درپے رہے ہیں شاعروں اور فنکاروں نے ہمیشہ ان کا پردہ چاک کیا ہے۔ محتسبوں، واعظوں اور ریاکار زاہدوں کی سخت گیری کے خلاف جہاد اور احتجاج کئی صدیوں تک فارسی اور اردو شاعری کا طرہ امتیاز رہا ہے۔ ہم صحافی جو آزادیِ اظہار کو پورے معاشرے کا بنیادی حق سمجھتے ہیں اور اس بارے میں آپ کی خدمات سے بخوبی واقف ہیں، پریس کلب کی جانب سے آپ کو مستقل رکنیت قبول کرنے کی درخواست کیوں نہ پیش کریں کہ فی زمانہ ہمیں آپ سے زیادہ اس کا مستحق کوئی اور نظر نہیں آتا۔ ہم آپ کے اس بے پایاں جذبۂ انسان دوستی کو سلام پیش کرتے ہیں۔ آپ نے محکوم، مظلوم اور ستم زدہ انسانیت کے لیے آواز بلند کی اور مساواتِ انسانی کی عہد آفریں جدوجہد کو سراہا۔ خدا کی پیدا کی ہوئی تمام حسین اور لطیف چیزوں سے آپ کا یہ پیار اور آپ کی یہ فطری رجائیت بھی ہمیں عزیز ہے۔ پھر آپ نے کہا تھا۔

مٹھیوں میں بھر کے افشاں چل چکا ہے انقلاب
آج اگر روحِ قدامت ظلمت افشاں ہے تو کیا

انقلاب کا یہ تصور بھی آپ ہی نے ہمیں دیا۔ یہ انقلاب خوں ریزی اور دہشت گردی سے عبارت نہیں۔ اس میں انسان کی سربلندی، حسن رعنائی، روح کی بالیدگی اور زندگی کی لطافتیں شامل ہیں۔ ہمیں انقلاب کا یہ تصور بھی عزیز ہے۔

ان الفاظ کے ساتھ، میں آپ کی خدمت میں کراچی پریس کلب کی جانب سے اس کی رکنیت پیش کرتا ہوں۔

منصور احمد شاہ

صدر

کراچی پریس کلب

۱۸۔۹۔۱۹۷۹ء

پریس کلب والوں نے اس تقریب کو بہت شاندار پیمانے پر منایا۔ تین دن تک بڑے بڑے ادیبوں اور دانشوروں نے جن میں پروفیسر کرار حسین صاحب، رئیس صاحب امروہوی، سبط حسن صاحب (جن کے نام مجھے اس وقت یاد ہیں) کے علاوہ اور بہت سے مفکرین نے جوش صاحب کی شاعری، نثر نگاری اور انقلابی فکر پر تقریریں کیں اور بہت سے شاعروں نے انھیں منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ ان کے علاوہ جوش صاحب کے دوستوں نے اپنے اپنے گھروں میں شعری نشستیں منعقد کیں۔

منور عباس صاحب کے گھر:

۲۲ ویں جون کو منور عباس صاحب کے مکان پر پرتکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا جس میں پروفیسر شور علیگ، راغب صاحب مرادآبادی، صبا اکبرآبادی کے علاوہ چند اور شعرا مدعو تھے۔ سب نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ جناب صبا اکبرآبادی کی غزل کی چند اشعار حافظے میں محفوظ ہیں۔ آپ بھی سماعت فرمالیجیے۔

ہم تو مدت کے مرگئے ہوتے　　موت نے زندگی بڑھا دی ہے

دیکھ فطرت کی انجم آرائی　　خاک پر چاندنی بچھا دی ہے

مختلف ہیں تصورات جمال　　یہ عقیدہ بھی انفرادی ہے

آخر میں جوش صاحب نے اپنا کلام سنایا۔ چند رباعیات ملاحظہ فرمائیے۔

بارش ہوتی ہے جب اندھیروں کی شدید
رہتی نہیں جب رات کے ٹھنے طاقت دید
میرے انفاس کے افق سے اے جوش
ہوتا ہے بصد شکوہ طلوع خورشید

زانو پہ جو میں سر کو جھکا لیتا ہوں
افکار کے شعلوں کو ہوا دیتا ہوں
انفاس پہ تولتا ہوں میں عرش و کرسی
کونین کو چٹکی میں اٹھا لیتا ہوں

اس درجہ ہمیں ذلیل و ناچیز نہ جان
اے دوست جو ممکن ہو تو ہم کو پہچان
جب ہانپنے لگتی ہیں کروڑوں صدیاں
جنتی ہے زمین تب کہیں ایک انسان

اس کے بعد جوش صاحب نے ایک تازہ نظم سنائی جس کا عنوان تھا "الا اللہ"۔ اس نظم کا ایک شعر بار بار پڑھوایا گیا اور لوگوں نے دل کھول کر داد دی۔ شعر یہ تھا:

بدل ربودگی وجہ رب ذوالاکرام
کوئی جمال نہیں ہے بقدر ذوق نگاہ

اور مقطع پر تو جیسے ہر شخص چونک اٹھا اور اتنی دفعہ پڑھوایا گیا کہ آخر جوش صاحب خود ہی خاموش ہو گئے۔ نظم یہ تھی:

تمام غمزہ دولت تمام عشوہ جاہ
متاع ہیچ ہے الا دماغ حق آگاہ

بدل ربودگی وجہ رب ذوالاکرام
کوئی جمال نہیں ہے بقدر ذوق نگاہ

حیات اہل ہوس بے سواد و بے منزل
بس اک تکان سفر ہے بس ایک تسلسل راہ

اسے ہجوم خیالات کو کدھر لے جاؤں
بساط ارض و سماوات ہے بہت کوتاہ

نہ ہے نظر کہ مری بارگاہ معنی میں
چہ خشت پارہ، چہ در عدن، چہ کوہ، چہ کاہ

نہ ہے تمول تخئیل و دولت افلاس
نہ شوق چتر و علم ہے نہ فکر تاج و کلاہ

یہ میرے فقر کی سب سے بڑی امانت ہے
مرے قدم کو نہ چوم اے لب جلالت شاہ

میرا صحیفۂ اعمال ہے غلاف حرم
ہزار شکر کہ میں ہوں وہ رند نامہ سیاہ

ادھر رواں ہوں اب اس کرۂ دیار میں میں
نہ مہر و مہ نہ زمان و مکاں نہ شام و پگاہ

میرے طواف میں ہے روح عصمت آفاق
یہ کس مقام پہ لایا ہے اے مذاق گناہ

اے یہ بارگہ "لا الہ" پر اے جوش
کوک رہی ہے کدھر سے کہاں "الا اللہ"

جوش صاحب نے نظم ختم کی تو ایک بزرگ جو مرے قریب بیٹھے تھے کہنے لگے کہ جوش صاحب کا یہ رنگ ان کے ماضی سے مختلف معلوم ہوتا ہے۔ میں نے کہا جی نہیں۔ ان کا رنگ ہمیشہ سے ایک ہی ہے مگر لوگوں نے انھیں غلط سمجھا۔ اس جگہ البتہ وہ کھل کر سامنے آگئے ہیں۔ اس کے بعد شاعری ختم ہوئی تو پر تکلف لذت کام و دہن کا اہتمام شروع ہوا۔ غرض تقریباً دو بجے دعوت سے فارغ ہوئے تو میں نے جوش صاحب کو ہوٹل جبیس پہنچایا۔ شام کو پھر تمام احباب جمع ہو گئے۔ ہوٹل جبیس کا کمرہ نمبر ۲۱۵ تمام دانشوروں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ جناب شوکت حسین رضوی اور ان کی بیگم یاسمین صاحبہ جو یورپ کے سفر پر روانہ ہونے والے تھے وہ مع اپنے بچوں کے جوش صاحب سے الوداعی ملاقات کے لیے تشریف لے آئے اور شام تک بیٹھے رہے۔

خاتون بادہ نوش:

ان ملاقاتیوں میں ایک خاتون بھی جوش صاحب سے ملنے اور کلام شاعر بزبان شاعر سننے کے لیے وہاں آگئیں اور جب دور قدح شروع ہوا تو انھوں نے اپنا پیمانہ بھرا اور بغیر پانی سوڈا ملائے غٹ غٹ پی گئیں۔ جوش صاحب نے پہلے تو حیرت کا اظہار کیا پھر مسکراتے ہوئے فرمایا "Oh, she is a gentle lady" یا تو وہ خاتون بڑی لیے دیے بیٹھی ہوئی تھیں اور شعر کی داد بھی صرف زیر لب مسکراہٹ سے دے رہی تھیں یا جیسے ہی باب میکدہ کھلا پھر تو جان حیا ایسا کھلا ...... ایسا کھلا۔

شوکت حسین رضوی جب رخصت ہونے لگے تو جوش صاحب نے ان کو گلے لگا کر رخصت کیا اور یہ رباعی پڑھی۔

کیا جانیے اب بات ہو یا بات نہ ہو
اس رات کے بعد پھر کوئی رات نہ ہو
ٹھہرو کہ گلے تو مل لیں جانے والو
ممکن ہے کہ اب کبھی ملاقات نہ ہو

میں نے دیکھا کہ شوکت صاحب رومال سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے رخصت ہوتے۔

ان کے جانے کے بعد خاتون بادہ نوشں حضرت جوشں سے مخاطب ہو کر کہنے لگیں کہ "جوش صاحب کیا آپ ہر شخص کو رخصت کرتے وقت اسی طرح سینے سے بھینچ کر رخصت فرماتے ہیں"۔ جوش صاحب سے بڑھ کر اس حسن طلب کا ادا شناس اور کون ہو سکتا تھا، مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "جی ہاں قدیم سے یہ میری سنت جاریہ ہے"۔ تو وہ خاتون جوش صاحب کے قریب جا کر فرمانے لگیں۔ "تو پھر ہمیں بھی رخصت فرمایئے۔ اس کے بعد یہ معلوم کرنا دشوار تھا کہ کون کس کو رخصت کر رہا ہے۔ اجی رخصتی کیسی، وہاں تو دائمی پیوستگی معلوم ہو رہی تھی اور آغوش وداع آغوش وصل بنتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا جوش صاحب، مجھے اس وقت جان صاحب کا ایک شعر یاد آ گیا۔

اے جان ایسا چھاتی سے لپٹایا بھینچ کر
انگیا کا اس کی سارا مسالہ مسل گیا

غرض وہ خاتون رخصت ہوئیں تو ہم سب اپنے اپنے گھروں کو سدھارے۔ چلتے وقت جوش صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ صبح ذرا جلدی آ جانا میں صبح کی پرواز سے اسلام آباد جاؤں گا۔ چنانچہ دوسرے دن صبح ہی صبح میں اور راغب صاحب ہوٹل جبیس پہنچ گئے اور جوش صاحب کو ایرپورٹ پہنچا کر اپنے گھر آ گئے۔

۱۹۸۱ء کے واقعات

جوش صاحب کے آخری ایام:

اس کے بعد جوش صاحب کا آنا کراچی میں بہت کم ہوا۔ کیونکہ جب اہل اقتدار کے تیور بدلے تو موسموں کے رخ تبدیل ہونے لگے۔ رفتہ رفتہ مرحمِ زیست کی تلخیوں کی دارو بالکل بند ہو گئی اور جوش صاحب کے آخری ایام بے حد بے کیف ہو گئے اور وہ جس نے غاصب انگریز حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ دیا کہ۔

تو نے شاعر سے یہ اے غاصب حکومت کیا کہا
تو نہ مانے گا مجھے تو قتل کر دوں گی تجھے؟
قتل سے ڈر جاؤں گا اتنا سمجھتی ہے ذلیل
جا اور ایسی سوقیانہ قسم کی دھمکی نہ دے

اب جب کہ ان کے دوست احباب بھی ان سے کنارہ کش ہونے لگے اور بقول والی آسی:

مل بھی جاتے ہیں تو کترا کے نکل جاتے ہیں
ہائے موسم کی طرح دوست بدل جاتے ہیں

تو دل سے موت کی آرزو کرنے لگے۔ ان کی شاموں کی ویرانی اور تنہائی دیکھ کر مجھے میر انیس کا یہ مصرع یاد آتا تھا۔

"برجِ شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے"

میں کراچی میں رہتا تھا جوش صاحب سے دوسرے تیسرے دن ٹیلی فون پر بات ہوتی رہتی تھی۔ مجھ سے کہتے "ارے خورشید علی خاں نوکری چھوڑ کر یہاں آجاؤ میں تنہائی میں

مرا جا رہا ہوں ۔ میں کہتا جوش صاحب آپ کراچی آجائیے ہم سب ہر وقت آپ کے ساتھ رہیں گے۔ یہاں تمام احباب آپ کو بے حد یاد کرتے ہیں۔ فرمایا۔ میاں اب تو مجھے اللہ میاں یاد کر رہے ہیں اور یہ رباعی پڑھی۔

یاں نقرئی دھوپ ہے گلابی سایہ   رہتا ہے سحاب ابدیت چھایا
جوش آؤ کہ منتظر ہے بزم ارواح   آیا یاران رفتہ۔ آیا ۔ آیا

آخری زمانے میں اپنی یہ غزل اکثر پڑھتے رہتے تھے۔

کس کو آتی ہے مسیحائی کسے آواز دوں
بول اے خونخوار تنہائی کسے آواز دوں
پڑھتے پڑھتے آخر شب تھک گئی ہیں پتلیاں
بجھ رہی ہے شمع بینائی کسے آواز دوں
چپ رہوں تو ہر نفس ڈستا ہے ناگن کی طرح
آہ بھرنے میں ہے رسوائی کسے آواز دوں
ہائے اس غربت کے جنگل میں پکاروں تو کسے
کس سے ہے میری شناسائی کسے آواز دوں
یہ جماہی ہے جماہی الحفیظ و الاماں
اف یہ انگڑائی پہ انگڑائی کسے آواز دوں
اف خموشی کی یہ آہیں دل کو برماتی ہوئی
اف یہ سناٹے کی تنہائی کسے آواز دوں
چل رہے ہیں دل پہ لاکھوں چاندنی کے نیشتر
ڈس رہی ہے دل کو پروائی کسے آواز دوں

آخرت کا سفر:

ایک دن معلوم ہوا کہ جوش صاحب کو خون کے قے ہوئی ہے اور ان کو ہسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے۔ معدے کا السر پھٹ گیا تھا۔ تقریباً ایک ماہ ہسپتال میں رہے۔ خون دیا

گیا۔ گلوکوس چڑھایا گیا۔ ایک ماہ بعد حالت کچھ سنبھل گئی تو گھر آ گئے مگر نہ معلوم زبان پر کیا اثر تھا کہ ٹیلی فون پر بات مشکل سے سمجھ میں آتی تھی۔

جب گھر آ گئے تو میں نے ٹیلی فون پر خیریت دریافت کی۔ بڑی مشکل سے یہ شعر سمجھ میں آیا۔

پوچھتے کیا ہو جوش کی حالت — اب کے بچتے نظر نہیں آتے

میں نے کہا جوش صاحب اگر آپ جیسا بہادر انسان ایسی مایوسی کی باتیں کرے گا تو ہم لوگوں کو کون حوصلہ دے گا۔ فرمایا۔ ایک تم ہو جو میرے جینے کی آرزو کر رہے ہو ورنہ:

تا اہل نظر قبر پہ موتی برسائیں — خوبان صبیح و لالہ رخ پھول چڑھائیں
کہتا ہے مرا وطن کہ از راہ کرم — حضرت اب انتقال فرما جائیں

maablib.org

سنِ رحلت ۱۹۸۲ء

۲۰ فروری ۱۹۸۲ء کو خون کے قے ہوئی۔ ہسپتال میں داخل کر دیے گئے مگر ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ خون کا دباؤ بے حد کم ہو گیا تھا اور پھر ۲۲ فروری بروز پیر ۱۹۸۲ء صبح پانچ بجے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف جوش صاحب کے پوتے کی آواز تھی۔

"چچا۔ بابا کا انتقال ہو گیا"

رات تین بجے یہ آفتاب ادب شاعر آخرالزماں ابدی نیند کی آغوش میں غروب ہو گیا۔

تمھیں آہیں سننے کا شوق تھا مگر اب بتاؤ کرو گے کیا
جو کراہتا تھا تمام شب وہ غریب جوشؔ تو مر گیا

اور یوں راغب صاحب مراد آبادی کا خوف سچ ہو گیا۔

رہ جائیں گے ہم لوگ ملول و غمگیں　　کیا پیر کو سرکار چلے جائیں گے

اور پیر کو سرکار ہم لوگوں کو ملول و غمگیں چھوڑ کر چلے گئے اور اس طرح وہ جوش جو گوشت پوست کا بنا ہوا تھا اس دنیائے فانی سے رخصت ہو گیا۔

جوش لافانی ہے:

مگر وہ جوش جو عظمت انسانی کا نقیب تھا جو خلوص و محبت کا پیکر تھا۔ جو انسانیت کو مقام الوہیت پر فائز دیکھنا چاہتا تھا، جس کے سینے میں جنبش دل پیغمبراں تھی۔ وہی خداؤں کا طلسم توڑنے والا عظیم ترین انقلابی، شاعر، ادیب، فلسفی، حیات، شباب، حسن اور مسرتوں کا پیغامبر۔ بڑے سے بڑے جابر حاکم کے سامنے سر بلند رکھنے والا۔ معمولی سے معمولی آدمی کے

سامنے انکسار سے جھکنے والا۔ اردو زبان کی صحت و ناموس کے تحفظ کا سپاہی، شرافت اور تہذیب کی اقدار کا محافظ۔ قافلہ حریت انسانی کا یہ بطل جلیل ان عظیم راہ نماؤں میں سے ہے۔ جس نے ہمیشہ الوہیت آدم کے خواب دیکھے، جو ہمیشہ کہتا رہا:

جو مضطرب ہے پئے منصب الوہیت
اب آؤ جوش کی اس آرزو کی بات کریں

تو جب تک انسانیت کو راہ نمائی کی ضرورت باقی رہے گی یہ زندہ و تابندہ رہے گا اور نہ صرف زندہ رہے گا بلکہ اپنے تخلیقی عمل کی تمام تر توانائی کے ساتھ نوجوان بھی رہے گا۔ بقول خود،

ہر دور میں جواں ہی نہیں نوجواں ہوں میں
شکر خدا کہ بندہ پیر مغاں ہوں میں
صدیوں کے بعد بھی جو پڑھے گا مرا کلام
آواز دوں گا میں کہ ابھی تک جواں ہوں میں

جوش صاحب! انسانیت کو اس کی منزل اور آپ کو اپنے خوابوں کی تعبیر ضرور ملے گی۔ آپ نے کہا تھا کہ "مستقبل انسانی بے حد روشن ہے اور مجھے یقین کامل ہے کہ یہ دوزخ زمین ایک دن جنت بن جائے گی۔ یہ درندہ آدمی انسان کے مرتبے پر فائز ہو کر دم لے گا۔ نہ عدالتیں ہی رہیں گی نہ فوجیں۔ نہ پولیس نہ اسلحہ سازی کے کارخانے۔ پیری مستقل جوانی بن جائے گی اور موت کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ زندگی کی پیشانی پر حیات ابدی کا تاج رکھ دیا جائے گا۔ شمس و قمر ہمارے پاؤں چومیں گے۔ ہم مشتری میں اگر ناشتہ کریں گے تو زہرہ میں رات کا کھانا کھائیں گے اور قوائے کائنات خدمت گاروں کے مانند ہمارے برآمدوں میں کھڑے رہا کریں گے" اور جوش صاحب! آپ کی یہ دعا بھی انشاء اللہ ضرور پوری ہوگی۔

اک فرد بھی رہے نہ نہ چرخ دردمند
اے جوش وہ زمانہ بھی آئے خدا کرے

تو جب تک انسانیت اپنی منزل پر نہیں پہنچ جاتی۔ آپ ستارہ نور بن کر اس کی راہ نمائی فرماتے رہیں گے۔

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

یہ تو صرف ظاہر بین نگاہوں کے لیے آپ اسلام آباد کی زمین میں آسودہ خواب ہیں مگر آپ کے وجود کے جلال اور اس کی ہیبت کا یہ اثر ہے کہ وہاں کی فضائیں ہمیشہ یہ اعلان کرتی رہیں گی کہ:

اس خاک میں خوابیدہ ہے روحِ عظمت
اس گور میں دفن ہے سخن کی دولت
دزدیدہ نفس آکہ ہے یہ مرقدِ پاک
آرام گہہ جوش علیہ الرحمت

جناب نصیر ترابی نے جوش صاحب کی تاریخ وفات انھیں کے ایک مصرع سے نکالی۔
"میں شاعر آخر الزماں ہوں اے جوش"

۱۹۸۲ء

maablib.org

مرثیۂ جوش

از

کنور مہندر سنگھ بیدی

کلکِ الم طراز ذرا دیکھ بھال کر
کس سانحہ کا ذکر ہے اتنا خیال کر
سن تو بھی ہم نشیں یہ ذرا دل سنبھال کر
کاغذ پہ رکھ رہا ہوں کلیجہ نکال کر
پرواز کون کر گیا پر تولتا ہوا
خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا

روتا ہوا یہ صحنِ گلستاں ہے ان دنوں
ہر برگ و بار دیدۂ گریاں ہے ان دنوں
دامن ہے چاک۔ چاک گریباں ہے ان دنوں
ماتم زدہ یہ روحِ بہاراں ہے ان دنوں
تاریکیوں نے باغ کو گھیرا ہے کیا کریں
سورج ہے سر پہ اور اندھیرا ہے کیا کریں

وہ کج کلاہِ محفلِ یاراں نہیں رہا
جانِ چمن وہ روحِ بہاراں نہیں رہا
پیرِ مغانِ بادہ گساراں نہیں رہا
وہ شہر یارِ شہرِ نگاراں نہیں رہا
یوں اٹھ گیا کہ بزم میں اب زندگی نہیں
ہم دل جلا رہے ہیں مگر روشنی نہیں

سر میں رفاہِ عام کا سودا لیے ہوئے
دل میں خلوصِ دل کا تقاضا لیے ہوئے
ہونٹوں پہ اک طلسمِ مسیحا لیے ہوئے
دنیا سے اٹھ گیا ہے وہ دنیا لیے ہوئے
حسرت، ملال، رنج، الم، غم میں چھوڑ کر
وہ چل دیا ہے قوم کو ماتم میں چھوڑ کر

میٹھے وہ بول بولنے والا چلا گیا
موتی خرد کے رولنے والا چلا گیا
زلفوں کے پیچ کھولنے والا چلا گیا
وہ بوئے گل کو تولنے والا چلا گیا
اس کا وہ طور، اس کا طریقہ کہاں سے لائیں
اس کا شعور، اس کا سلیقہ کہاں سے لائیں

وہ رزم میں تھا جوہر شمشیر بے نیام — وہ بزم میں تھا بادۂ حب وطن کا جام
خلوت میں خوش خیال تھا جلوت میں خوش کلام — آقا تھا سرکشوں کا غریبوں کا وہ غلام

محبوب خاص و عام تھا جان وطن تھا وہ
اپنے جلو میں فرد نہیں انجمن تھا وہ

شبنم، شمیم، پھول کی پتی، رباب و چنگ — فولاد، موم، جذبۂ ایثار، کوہ سنگ
اخلاص، علم، سادگی، قوس قزح کا رنگ — کاشی کی صبح، شام اودھ، موج آب گنگ

ان سب کے امتزاج سے پیدا ہوا تھا جوش
کتنے حسیں افق سے ہویدا ہوا تھا جوش

وہ جاہ وہ جلال وہ چہرہ وہ خال و خد — نا خائف نتائج و انجام نیک و بد
علم و ہنر کا کوئی تعین نہ کوئی حد — دونوں کے درمیان وہ مرد دراز قد

لاکھوں میں ایک فرد عجیب و غریب تھا
اس خوشنشیں کو اوج ثریا نصیب تھا

اب کس زباں سے شکوۂ جور خدا کریں — آہ و بکا و نالہ و شیون بپا کریں
کس در پہ جا کے چارۂ اہل وفا کریں — دل کو جو اس کی یاد ستائے تو کیا کریں

صد حیف ناگہاں اجل آئے وطن سے دور
بلبل کی موت اور ہو وہ بھی چمن سے دور

صد حیف طعنہ زن ہیں غلامان خانہ زاد — جن کے قصیدے اب بھی ہیں افرنگیوں کو یاد
احساس کمتری نے عنایت کیا عناد — دیکھیے ستم ظریفی اہل حسد کی داد

زاغ و زغن بھی بولیاں اب بولنے لگے
شاہیں جو اڑ گیا تو یہ منھ کھولنے لگے

اے رب ذوالجلال، اے داور، اے کردگار — تیری عنایتوں کا تعین نہ کچھ شمار
جب تک ترا کرم ہو میسر نہ ساز گار — جز تیری ذات کس کو گناہوں سے ہے فرار

باب قبول کی اسے خدمت نصیب کر
یارب ہمارے جوش کو جنت نصیب کر

جوش کی وفات پر

از

پروفیسر منظور حسین شور

خون رو اے سرزمیں اے آسماں کر سینہ چاک ہو رہا ہے اک خدائے فکر و فن پیوند خاک

دوش جبریل امیں پر صبحدم کعبہ گیا اک فلک کو آج پھر زیر زمیں دابا گیا

دانش و حکمت کو دفنانے کفن پھاڑا گیا خاک میں تاریخ کے اک دور کو گاڑا گیا

عقل کا ماتم ہے ، مرگ شاعر برصغیر یا ترازو ہے دل فطرت میں خود فطرت کا تیر

ہے یہ کشکول اجل میں کس خدائے فن کی بھیک آج کتنے انبیا ہیں اک جنازے میں شریک

اے سواد ذکر و زہد و دانش و درس و کتاب آج ڈوبا ہے ترے آغوش میں وہ آفتاب

جس کے اعجاز نفس سے عقل انسانی ہے دنگ عرصۂ کون و مکاں، پرواز پر جس کی ہے تنگ

تو نے کس صحرا میں دابا عقل سینہ چاک کو دفن کس مٹی میں تو نے کر دیا ادراک کو

جسکے چھو لینے سے لو دیتے ہیں حرف و لفظ و صوت جسکی اک موج نفس کعبے کے لو جلوں کی موت

اے خدائے آگہی، اے نطق کے پروردگار اب جنون و ہوش دونوں ہیں ترے ماتم گسار

جب ترے اظہار کا اعجاز بن جاتے ہیں لفظ رنگ و خشت و سنگ کی آواز بن جاتے ہیں لفظ

تجھ کو کیا معلوم، اے جہل و تعصب کے جنوں پی گئی سینوں کی ظلمت آہ کس سورج کا خوں

کون پتھر کی چٹانوں سے کرے گا اب کلام کون اب لکھے گا جاکر برف پر آتش کا نام

کون گونگوں کے تکلم کا کرے گا اہتمام کون اب بہروں کی محفل میں بجائے گا ستار

کون اب رکھے گا نبض مکتب و ملا پہ ہاتھ جہل بے پایاں کو دے گا کون حکمت کی زکاۃ

کفر و ایماں پہ یقیں جد و اب سمجھے گا کون — وحدت آدم کی کثرت کا سبب سمجھے گا کون

کون سمجھائے گا الفاظ و معانی کا نسب — کون کھولے گا لب و لہجے کا طومار حسب

درس گاہوں میں کرے گا جہل کی تعظیم کون — اتنے اندھوں میں کرے گا آئینے تقسیم کون

کون اب دے گا اذانیں جا کے گورستان میں — کون تولے گا ہوا کو حبس کی میزان میں

اب بُنے گا کون ایسا حکمت و دانش کا جال — جس سے بچ کر نسل آدم کا نکلنا ہے محال

کارگاہ فکر و فن میں آہ اب کون آئے گا — جو ادب کو وسعت ظرف زباں دکھلائے گا

کافر و دیندار سب ہوں جس کی زلفوں کے اسیر — کون اردو کو کرے گا اس قدر آفاق گیر

پاک کی آنکھوں میں نم ہو یا ہمالہ نالہ کوش

حشر تک اس قوم میں پیدا نہ ہوگا کوئی جوش

maablib.org

مُنکرانِ جوش سے

از

پروفیسر منظور حسین شور

یہ حادثہ بھی نہیں محسنِ حادثات سے کم
ہزار سال میں لیتا ہے ایک جوش جنم

وہ جوش نطق ہو جس کے حضور سر بسجود
وہ جوش، لوح و قلم چومتے ہوں جس کے قدم

وہ قبلہ گاہِ بصیرت، وہ کعبۂ ادراک
وہ جوش، پاؤں پہ جس کے سرِ خیال ہو خم

ہو جس کی گردِ سفر خطِ کہکشاں، وہ جوش
ہوائیں کھاتی ہیں جس کے نقوشِ پا کی قسم

نفس سے جس کے در و بام ہوش جلنے لگیں!
ہو جس کی جنبشِ پر سے فرشتہ سوختہ دم

وہ جوش دیکھ کے ماتھے پہ جس کے ایک شکن
ہزار نطق و خطابت میں مشورے ہوں اہم

وہ جوش، آہ! وہ پروردگارِ فکر و نگاہ
کہ جس کی موت ہے عقلِ سلیم کا ماتم

کسے خبر ہے کہ کفر و یقیں کے زخموں پر
رکھا ہے کس کے ضمیر و شعور نے مرہم

یہ فرقِ شیخ و برہمن سے راز فاش ہوا
کسی کے گھر میں صنم ہیں، کسی کے سر میں صنم

نگاہ و فکر کو تُو نے کیا ہے یوں زنجیر
ادب بھی جیسے ہو تیرا ہی ورثۂ جد و عم

تحیر کے نور کو جغرافیے میں قید نہ کر
کہ حد و حصر سے بالا ہے خیرِ اعظم

محیطِ کعبہ و کاشی ہے ابر کا سیلاب
ہوا کی قید ہمالہ، نہ لالہ زارِ عجم

وہ جوش، آہ! وہ دمسازِ حافظ و خیام
امامِ آفتِ جم، مجرمِ حضرتِ آدم

وہ جوش، آہ! وہ ماتم گسارِ ماہ وشاں
وہ جوش، آہ! وہ صہبائے آبجوانِ حرم

وہ جوش، آہ وہ نباضِ حادثاتِ زماں
وہ آندھیوں کا شناسا چراغ کا محرم

وہ جوش ڈوب گیا رات کے سمندر میں
کہ جس کا نام تھا ماتھے پہ آسماں کے رقم

خدا کے واسطے اے آسماں زمیں پہ ٹوٹ
کہ جنسِ جہل سے گھٹنے لگا ہے عقل کا دم

اُمیدِ صبحِ قیامت نہ صورِ اسرافیل
عجب قتیل ہے، شمشیرِ فکر و فن کا قتیل

ہو فن بھی جہلِ مرتب کا شاہکار تو کیا — غزل سرا بھی ہوئے بولتے مزار تو کیا

ہوا کی موج سے کیا بحرِ بیکراں کو گزند — ہمالیہ سے ہو تیشہ ستیزہ کار تو کیا

کرن کا لمس ہو جس قطرۂ نحیف کی موت — وہ اتفاق سے ہو بحر در کنار تو کیا

ہوا کے ساز پہ اک گیت بھی جو گا نہ سکے — بساطِ برف پہ رقصاں ہو وہ شرار تو کیا

نگاہ و فکر و فراست کے چلتے پھرتے مزار — پیمبرانِ ادب میں ہوں گر شمار تو کیا

نہ کوئی عشق کا مذہب، نہ آگہی کا حصار — کنارِ گنگ و جمن ہو ترا دیار تو کیا

ہوا تو حبس کی زنجیر میں ہے آپ اسیر — ہوا کے دوش پہ تنکا ہوا سوار تو کیا

ہوائے تند سے کچھ اور جس کی لو ہو بلند — گر اس چراغ پہ صرصر کا ہو فشار تو کیا

جنوں تو حرف، ہے چاکِ دل و جگر کا سہاگ — ہزار جیب و گریباں ہوں تار تار تو کیا

لکھا ہو جن کی جبینوں پہ شجرۂ نسبی — امیرِ شہر ہوئے وہ کلاہ دار تو کیا

پیمبری کے لیے شرط ہے نزولِ کتاب — ابو لہب ہوں نبوت کے دعویدار تو کیا

سیاہ فام ہو چہرہ تو کیا کرے صابون! — دُھلا بھی چہرۂ زنگی ہزار بار تو کیا!

رسول و کعبہ و قرآں کی اس میں کیا تقصیر — اگر خدا پہ نہ ہو تجھ کو اعتبار تو کیا

وضو سے کام نہ مرنے کو بندگی سے غرض — ہزار بار اذاں ہو سرِ مزار تو کیا

حسب نسب کو بھی تہذیبِ فکر و فن میں ہے دخل — مگر یہ راز نہ ہو تجھ پہ آشکار تو کیا

جو قبرِ غالب و عرفی پہ کل تھے صرفِ خرام — اگر وہ جوش پہ پھنکارتے ہوں مار تو کیا

وہ آفتاب جو ہو قبر کے افق سے طلوع — غروب بھی ہو وہ سورج تہِ مزار تو کیا

مری نوا پہ ہزاروں سماعتوں کا ہے قرض — مری نوا ہو اگر تجھ کو ناگوار تو کیا

خدائے فکر و نظر سے ہو جس کو بغض و عناد
نمک حرام ادب ہے وہ کور مادر زاد

